پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.paksociety.com

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی، آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

ماہنامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں، کسی بھی فرد یا ادارے کے لئے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

● تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

جلد 23 ❖ شمارہ 04 ❖ فروری 2013ء

ماہنامہ
سرگزشت
کراچی

مدیرہ اعلیٰ : عذرا رسول

مصور : شاہد حسین

شعبۂ اشتہارات
منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789
نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391
رانا محمد حمید 0323-2895528
نمائندہ لاہور فراز علی نازش 0300-4214400

◈◈◈

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زرِ سالانہ 700 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول
مقامِ اشاعت: 63-C، فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن
مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
خط کتابت کا پتا • پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200
Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com
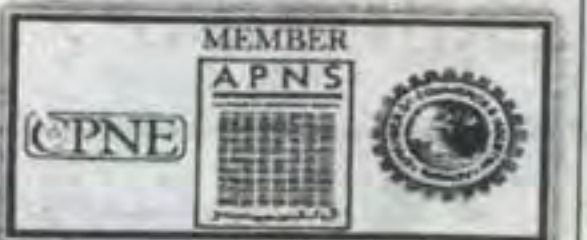
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!
السلام علیکم!

ایسا لگتا ہے کہ وطن عزیز پر ایک کڑا وقت آپڑا ہے۔ عالمی طاقتوں کی بساط بچھ گئی ہے۔ افغانستان سے امریکی انخلا کا نزلہ بھی پاکستان پر گرتا نظر آرہا ہے۔ اس لیے کہ ہماری فوج محفوظ و مربوط ہے، ایٹمی پروگرام محفوظ ہے۔ اس کا توڑ دشمنانِ وطن نے انارکی پھیلانے میں تلاش کیا ہے اور اس کے لیے ایک آسان راہ تلاش کی ہے، موبائل، اس وقت رابطے کا سب سے آسان ذریعہ یہی ہے۔ گاؤں گوٹھ کے چرواہوں تک کے پاس موبائل ہے اور موبائل پر آیا میسج کم پڑھے لکھے اور کچے ذہنوں کے لیے بہت اہم ہے۔ اس کا فائدہ وطن فروش بھرپور انداز میں اٹھا رہے ہیں۔ ٹوئٹر پر اکاؤنٹ بنا کر ایک ساتھ لاکھوں افراد کو میسج فارورڈ کر رہے ہیں۔ ایسے ایسے بے سروپا اور جھوٹ پر مبنی میسج جن سے صرف اشتعال ہی پھیل سکتا ہے اور حکومت خاموش ہے۔ ممبئی میں ایک لڑکی ایک دہشت گردوں کے سردار کو شہر کا ڈان لکھ دیتی ہے تو اسے تین گھنٹے میں تلاش کر کے گرفتار کر لیا جاتا ہے اور ہمارے ہاں فیس بک، ٹوئٹر اور اور موبائل میسجز کے ذریعہ دن بھر اشتعال انگیز پیغامات گردش کر رہے ہیں اور کوئی دیکھنے والا نہیں، پوچھنے والا نہیں کہ ان پیغامات سے انارکی پھیلے گی۔ کشت و خوں کا بازار گرم ہو سکتا ہے۔ جدید پیغام رسانی کا یہ جدید حربہ یقینی طور پر نسلی، صوبائی، لسانی فرقہ وارانہ تعصب کو آخری حدوں تک لے جانے میں اہم ترین کردار ادا کر رہا ہے۔ ایسے وقت میں ڈاکٹر سرور اکرام صاحبہ کا یہ شعر شدت سے یاد آتا ہے

ہزاروں قافلے گم کردہ راہ ہونے لگے
بندھا ہے دیر د حرم کا یہ سلسلہ ایسا

معراج رسول

نمایاں مدرس

سرگزشت

ریاست بھاولپور میں محمد رمضان کے گھر 1941ء میں پیدا ہونے والے اس بچے کے بارے میں کسے خبر تھی کہ معمولی سے گھر میں پیدا ہو کر بھی یہ دنیا کے اس کونے سے اس کونے تک نام پیدا کر لے گا۔ محمد رمضان ریاست کے محکمۂ مال میں قانون گو کہ عہدے پر فائز تھے۔ اس لیے چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا بھی تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو۔ انہوں نے بیٹے کو ابتدائی تعلیم کے لیے گھر کے نزدیک ایک مسجد میں قائم مکتب میں بھیجا۔ عمر کم تھی مگر شرارت میں ثانی نہ تھا پھر بھی وہ بچہ اساتذہ کی آنکھوں کا تارا تھا۔ اس لیے کہ حافظہ غضب کا تھا۔ سبق ملتے ہی ازبر کر لیتا۔ اسی وجہ سے اس کی شرارتیں نظر انداز کر دی جاتیں۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اس کا داخلہ مقامی ہائی اسکول میں کرا دیا گیا۔ اسی ایس ڈی ہائی اسکول سے اس نے میٹرک کیا۔ میٹرک کے بعد اسے صادق ایجرٹن کالج میں داخلہ دلوایا گیا۔ اسی کالج سے ایف اے کیا اور پھر وہ لاہور آ گیا۔ ان دنوں لاہور کو وہ مقام حاصل تھا جو کبھی بغداد کو حاصل تھا۔ علم پرور شہر کہلاتا تھا۔ یہاں کے تعلیمی ادارے ہند بھر میں شہرت رکھتے تھے۔ اس نے کافی تگ و دو کے بعد گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا اور پڑھائی میں دل لگا لیا۔ وہیں سے اس نے بی اے کیا اور پھر ایم اے کی تیاری کرنے لگا۔ 1962ء میں اس نے فلسفے میں ایم اے کیا اور نوکری کے لیے کوشاں ہو گیا۔ بالآخر فورٹ سنڈیمن کالج میں بطور لیکچرار نوکری کر لی۔ لیکن وہاں زیادہ دن ٹک نہ سکے۔ ان کا تبادلہ گورنمنٹ کالج مستونگ ہو گیا مگر وہاں بھی زیادہ دن رہ نہ سکے اور گورنمنٹ کالج کوئٹہ آ گئے۔ یہاں ساڑھے تین سال گزارے اور پھر ان کا تبادلہ نواب شاہ ہو گیا۔ تدریس کے ساتھ سی ایس ایس کی تیاری بھی عروج پر تھی۔ 1966ء میں شکر گڑھ چلے آئے۔ یہاں فراغت بھی زیادہ تھی۔ اس لیے دل لگا کر پڑھتے رہے، تیاری کرتے رہے۔ اسی سال سی ایس ایس کے امتحان میں شامل ہوئے اور کامیابی حاصل کر لی اور سی ایس پی آفیسر بن گئے پھر 1967ء میں پاکستان آڈیٹر کونسل کے رکن نامزد ہو گئے۔ تقریباً دس سال تک اس ادارے سے وابستہ رہے۔ اس ادارے سے سبکدوشی حاصل کر کے حکومت سے سعودی عرب بھیجنے کی استدعا کی۔ 1976ء کے آخر میں حکومت نے انہیں سعودیہ بھیج دیا۔ دورانِ ملازمت ہی انہوں نے عربی میں ایم اے کر لیا تھا اور لاہور کے جامعہ تقویۃ الاسلام سے مروجہ دینی علوم کی سند حاصل کر لی تھی۔ عرب میں دو سال گزارنے کے بعد مدینہ یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسری کے ساتھ ساتھ دارالترجمے کا نگرانِ اعلیٰ کے فرائض انجام دینے لگے۔ حرم نبوی سے درس قرآن و حدیث پر مشتمل پروگرام بیک وقت انگریزی اردو اور عربی میں نشر ہو رہا تھا۔ اس پروگرام کا نام انڈر اسٹینڈنگ اسلام رکھا گیا تھا۔ اربابِ اختیار نے ان کی قابلیت دیکھتے ہوئے اپنے یہاں ملازمت کی پیش کش کی جسے انہوں نے قبول کر لیا۔ 1980ء میں پاکستان واپس آ کر صدر کے ترجمان کی حیثیت سے کام کرنے لگے پھر پشاور آ گئے اور افغان مہاجرین کے لیے عرب ممالک کے تعاون سے قائم کردہ اسلامک اکیڈمی فار سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کے وائس چانسلر بنا دیے گئے۔ لیکن کچھ ہی عرصے بعد وہ لاہور منتقل ہو گئے اور پی ٹی وی سے پروگرام درسِ قرآن و حدیث شروع کر دی، بہت ساری کتابیں بھی تصنیف کیں۔ 2002ء میں انتقال ہوا۔ وہ اہم شخصیت جس نے تدریسی میدان میں نمایاں خدمات انجام دیں اس کا نام ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ ہے۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

شہرِ خیال

✉ اعجاز حسین سٹھار کا اظہار نور پور تھل سے ”ہماری جھولی میں بدنامی، دہشت گردی، مہنگائی، ہنگامے، خوف وہراس اور خودکش حملوں کے نتیجے میں ڈھیروں لاشوں کا تحفہ ڈال کر آخر 2012ء رخصت ہوگیا۔ پڑوسی ملک میں ایک لڑکی سے زیادتی ہوئی تو نئے سال کی خوشی میں ہونے والی تقریبات منسوخ کردی گئیں، کسی ایک فرد نے انفرادی طور پر موم بتی تک نہیں جلائی لیکن ہمارے ہاں روزانہ عورت کی تذلیل، جبر اور زیادتی کے کتنے واقعات ہورہے ہیں، بس ہم بیان بازی میں ضرور نام کمارہے ہیں۔ سب کو ذاتی ذمّے داری سمجھتے ہوئے اس پہلو پر سوچنا چاہئے ورنہ یہ نہ ہو ہماری بے حسی کسی بڑے سانحے کو جنم دینے کا موجب بن جائے۔ ”فلمی الف لیلہ“ میں وحید مراد کے فن، صلاحیتوں اور احساسِ شکست پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ بلندی سے گر کر خود کو سنبھالنا مشکل ہوتا ہے مرحوم نے یہ سب دل پر لے لیا اور شخصیت ٹوٹ پھوٹ گئی یوں جانئے یہ اپنے بس کا سودا نہیں ہوتا۔ ابتدائی دور میں ہنرمندوں نے آلات سے نہیں، جذبے سے کام کیا اور کامیابیاں سمیٹیں۔ اگر وہی جوش اور لگن لوٹ آئے تو اجڑے دیار بسنے میں چند دن لگیں گے۔ ”زور آور“ کا اختتام پُرامن طور پر ہوگیا ورنہ شک، حسد اور رقابت کی معمولی چنگاری خون خرابے کی بنیاد رکھ دیتی۔ یہاں اللہ واریو کا دامن بھی صاف دکھائی دیتا ہے۔ وہاں کی ثقافت اور رواج کو سامنے رکھا جائے تو یہ ممکن نظر نہیں آتا کہ دشمن کو داماد قبول کیا جائے، نہ اتنے بڑے زمین دار کو اعلیٰ ظرفی کی سند عطا کی جاسکتی ہے اس کے باوجود دھنی بخش کی خاموشی اور سگے بھائی سے رنجش پر پردہ پڑا ہوا ہے یہ معمولی راز نہیں ہے شاید تجسس پیدا کرکے کہانی میں دلچسپی بڑھانے کی کوشش کی گئی ہے جس میں وہ مکمل کامیاب رہے ہیں۔ ”سراب“ میں کافی دھوم دھڑکا اور ہنگامہ آرائی ہے۔ شہباز ایک مصیبت سے نکلتے ہیں تو نیا پھندا تیار ہوتا ہے۔ اب پھر شہباز اپنے ازلی دشمن مرشد کے ٹھکانے پر بُرے پھنسے ہیں بڑی نازک صورتِ حال ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ دشمن کو چکما دینے کے لیے کیا کیا پینترے بدلے جاتے ہیں۔ سچی بیانیاں آپ بیتی اور ناقابلِ فراموش واقعات کسی بھی میگزین میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قارئین کی اکثریت انہیں انتہائی شوق سے پڑھتی ہے دوسروں کو رائے دی جاتی ہے اور اپنا محاسبہ کرکے زندگی کی راہیں متعین کی جاتی ہیں۔ ”میں زخم زخم ہوں“ اسی سلسلے کی کہانی ہے جو ظفر اور بشریٰ کے گرد گھوم رہی ہے۔ بشریٰ ایک جذباتی، ضدی اور انتہا پسند لڑکی تھی، ظفر نوعمر اور ناتجربہ کار نوجوان تھے جو اس کے باغیانہ رویے کو سیدھی راہ نہ دکھا سکے بروقت اقدام نہ کرنے سے وہ موت کے منہ میں چلی گئی اس کے باوجود ظفر اپنی زندگی نہ سنوار سکے انہیں پُرخلوص بہن کا ساتھ مل گیا ہے تو گھر بسانے کا سوچنا چاہیے وہ منہ بولی بہن کے ساتھ ایک چار دیواری میں رہے تو یہ رشتہ مشکوک اور غلیظ سوچوں کی زد پر آجائے گا انہیں ایسی انگلیاں اٹھنے سے پہلے گھر میں تیسرے فرد کا اضافہ کرنا ہوگا۔ ”قربانی“ میں لمحہ بہ لمحہ منظر بدلتے رہے اور کسی سسپنس بھرے ڈرامے کا تاثر ملنے لگا شاید یہ واقعات کا تقاضا رہا ہو۔ یہاں محبت میں قربانی دینے کے تعین سے بڑھ کر مجھے یہ خوشی ہے کہ حمیرا کو منزل مل گئی اور ایک خاندان بکھرنے سے بچ گیا ورنہ یہاں والدین کے اعتماد کا خون ہونے کے قریب تھا۔ مانگے کا چراغ، میں بظاہر اظہر علی کا کردار بے غیرتی والا اور غلاظت میں لتھڑا ہوا ہے لیکن ایک دوسرا پہلو بھی ذہن میں رکھنا ہوگا کہ انسان مجبوری میں بھی ذلت کی کس انتہا تک چلا جاتا ہے اس کے باوجود جگ ہنسائی اور بلیک میلنگ کا خطرہ الگ رہتا ہے۔ فٹ پاتھ پر بیٹھے عامل اور فال نکالنے والے، جعلی پیر اور شرطیہ دلی مرادیں پوری کرنے والے کالے جادو کے ماہر غنڈوں کا روزگار ایسے حالات کے مارے لوگوں کے دم سے ہی ہے۔ بس دعا

کرتے رہنا چاہیے کہ اللہ سب کو اپنی رحمت کے سائے میں رکھے تاکہ فراڈیوں کے ڈیرے سنسان ہوجائیں۔ ”راجا اندر“ میں فیاض کی ایک آدھ نفسیاتی گرہ ڈھیلی ہے۔ ”مصلحت محبت“ میں روبینہ جیسی زندگی گزار رہی ہے اس اذیت سے خود واقف ہے ہر لمحہ وجود آرے کی زد پر رہتا ہے وہ جن حالات میں شکیل کے ساتھ نبھاہ کررہی ہے یہ محبت اور مصلحت سے ہٹ کر مجبوری کا سودا ہے۔ چار بیٹیوں کے مستقبل کا معاملہ ہے یہ رشتہ آخری سانس تک نبھانا ہوگا۔ ”شکستہ آئینہ“ میں وقار غیر محسوس طور پر برائی کے راستے پر گامزن ہوگیا۔ ”فنکار“ میں لڑکی کی چالاکی سے زیادہ نفیس کی بے وقوفی کا دخل ہے جب عقل کے بجائے دل کی بات مانی جائے تو سودا نقصان کا ہی ہوتا ہے۔ محبت کے پہلو، میں مضحکہ خیز واقعات ہیں جو احساس کے تار ہلانے سے قاصر رہے ہیں البتہ محبت کے نئے در ضرور وا ہوئے ہیں۔ ”بے وفا“ میں مدیحہ بے وفا نہیں ہے وہ کچھ ایسے حالات اور صدمات کا شکار ہوئی کہ بکھر کر رہ گئی۔ فیصلہ کرنا ایک عذاب ناک لمحہ تھا لیکن عبداللہ بھی اپنے طور پر الزام دینے میں آزاد ہے۔ جذبوں کو آزمائش میں ڈالنے سے بہتر ہے کہ تقدیر کا لکھا جان کر خاموشی اختیار کرلی جائے۔ میں ایک جٹ اور سادہ آدمی ہوں صرف پڑھنے، لکھنے کے شوق سے مجبور ہوکر لکھتا ہوں۔ اس کے باوجود جو مہربان حوصلہ بڑھاتے ہیں سب کا ممنون ہوں۔ خاص طور پر میرے پڑوسی ضلع سے افتخار عثمانی شکریہ قبول کریں۔“

✉ ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی کا مکتوب بروزئی ججھ سے ”قرۃ العین زینب صاحبہ کی والدہ مرحومہ کو اللہ تعالیٰ جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور متعلقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے، آمین۔ محترمہ طاہرہ گلزار صاحبہ صحیح لفظ مسالہ ہوتا ہے مصالحہ نہیں اور اس بات کی تکرار کی وجہ یہ بھی ہے کہ جناب طارق عزیز خان نے بھی اپنے مضمون نئی دنیا کی تلاش میں لفظ مصالحہ ہی استعمال کیا ہے جناب طارق عزیز خان بعد معذرت عرض کررہا ہوں کیونکہ آپ جیسے بڑے اہلِ قلم کی بات سند کے طور پر عوام میں رائج ہوجاتی ہے (مصالحہ لفظ عربی ہے اور صحیح ہے لیکن اردو لفظ مسالا ہے یعنی دونوں لفظ صحیح ہیں) جناب فضل رؤف مروت تعلیم یافتہ اداکاروں کا تجزیہ بہترین کاوش ہے اسے مزید وسعت دے کر مضمون کی شکل دی جاسکتی ہے یا پھر آفاقی صاحب ہی یہ کام سرانجام دیں۔ جناب افتخار عثمانی تبصرہ پسند کرنے اور حوصلہ افزائی کا شکریہ۔ اس ماہ سالانہ تجزیے کی عدم اشاعت اور کئی پرانے ساتھیوں کی غیر موجودگی شدت کے ساتھ محسوس ہوئی۔ قصہ نذیر لکھ کر جناب ساجد امجد نے زبان وبیان کے دریا بہادیے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ علمائے کرام کی ڈپٹی نذیر احمد سے اختلاف کی وجوہات کیا تھیں حضرت گنگوہی کے نام کی وضاحت ہونی چاہیے تھی۔ امریکہ مکافاتِ عمل کا شکار ہورہا ہے جس کا ایک ثبوت سینڈی کا برپا ہونا بھی ہے۔ ایاز راہی صاحب کا مضمون ترک بھی معلومات افزا ہے۔ فلمی الف لیلہ، زور آور اور افریقا افریقا بھی دلچسپ تھے ماہ دسمبر میں آئن فلیمنگ کی داستانِ حیات میں کچھ ادھورا پن کا احساس تھا اس ضمن میں کچھ معلومات شاید قارئین کو پسند آئیں۔ پہلا ناول مکمل کرلینے کے بعد بھی فلیمنگ کو مرکزی کردار کے لیے کوئی نام پسند نہیں آرہا تھا ایک قلم کار ہونے کے ناتے مطالعہ اس کا شوق بھی تھا اور ضرورت بھی تو ایک کتاب فلیمنگ کے ہاتھ لگی جس میں غرب الہند کے پرندوں کا ذکر تھا اس کتاب کے مصنف کا نام تھا ڈاکٹر جیمز بونڈ۔ مصنف کا نام فلیمنگ کو اپنے ناول کے مرکزی کردار کے لئے پسند آگیا۔ جیمز بونڈ کردار پر سب سے پہلے کسینو رائل ناول پر ٹی وی سیریل بنائی گئی جس کے ذریعے سے جیمز بونڈ کا کردار دنیا کے سامنے آیا۔ یہ تھوڑے بجٹ والی سادہ سیریل تھی جو کہ بہت پسند کی گئی اس میں امریکی اداکار بیری نیلسن نے جیمز بونڈ کا کردار ادا کیا تھا۔ جنوبی افریقی ریڈیو نے مقبولیت سے متاثر ہوکر جیمز بونڈ کی ریڈیائی سیریل بنانے کا فیصلہ کیا۔ ریڈیائی سیریل کے مرکزی کردار کے لیے بوب ہولٹس کا انتخاب کیا گیا یہاں پر بھی جیمز بونڈ کو مقبولیت حاصل ہوئی اسی مقبولیت کے باعث رابرٹ بروکلس نے جیمز بونڈ کو پردہ سیمیں کے لیے فلمانے کا فیصلہ کیا جس کے لیے آئن فلیمنگ کے ناول ڈاکٹر نو کو منتخب کیا گیا اس فلم کے لیے جیمز بونڈ کے ساتھ 007 کا اضافہ کیا گیا جیمز بونڈ کی فلموں کی شہرت ومقبولیت اپنی جگہ مگر ایک قسم کی یکسانیت کی وجہ سے یہ فلمیں اور کردار تنقید کا نشانہ بھی بنیں مرکزی کردار کو اداکارانہ جوہر دکھانے کے بھرپور مواقع نہیں ملتے تھے۔ اسی وجہ سے مشہور فلم گلیڈی ایٹر کے نیوزی لینڈ نژاد ہیرو رسل کرو جس نے مذکورہ فلم میں جنرل میکسی مس کا تاریخی کردار ادا کیا تھا جب اسے بانڈ کے کردار کی پیش کش کی گئی تو اس نے یہ کہہ کر اسے ٹھکرا دیا کہ میں خود پر بانڈ کا ٹھپا نہیں لگوانا چاہتا۔“

✉ معروف فلمی کہانی نویس عزیز میرٹھی لاہور سے رقمطراز ہیں ”الیکشن قریب ہیں، یہ انتخابات دس کروڑ پاکستانیوں کے شعور وآگاہی کا امتحان ہوں گے کیونکہ اٹھارہ کروڑ عوام کی تقدیر بدلنا ان ہی عوام کے ووٹ پر مبنی ہے۔ آپ کا اداریہ ہمیشہ ہی نہایت فکرانگیز اور چشم کشا ہوتا ہے۔ ہر لفظ آنسوؤں میں ڈوبا اور ہر سطر جگر خراش۔ گویا سمندر کو سیپ میں سمو دیتے ہیں۔ ناچیز چراغ سحری ہے طویل شب تار میں اس امید پر ٹمٹماتے جاتا ہوں کہ بجھنے سے پہلے کبھی تو سرگزشت کے ادارتی صفحے پر آپ کے خارتر خوں چکاں سے رس کی بوندیں ٹپکتے اور امن وسلامتی کے پھول کھلتے دیکھوں، مگر ملکی حالات پر حق بات کہنے سے آپ کو کون روک سکتا ہے۔ چند ماہ پہلے پہاڑوں پر روشن شمعِ علم کو دہشت گردوں نے گولیوں کی بوچھاڑ سے گل کرنا چاہا تھا۔ لیکن وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے۔ بچانے والا مارنے والے سے زیادہ طاقتور ہے۔ اس الم ناک واقعے پر بھی آپ نے تیرہ سالہ ملالہ کے لیے خون کے آنسو بہائے تھے۔ اس بار بھی ٹی وی پر مدیحہ کی لاش دیکھ کر آپ تڑپ اٹھے ہیں۔ مرحومہ کا جرم 250 روپے کی خاطر گھر گھر جاکر ننھے پود کو عمر بھر کی معذوری سے بچانا تھا۔ اس جرم کی پاداش میں فہمیدہ، کنیز فاطمہ، اور فرزانہ کو بھی موت کی نیند سلا دیا گیا۔ قاتل دندناتے پھرتے ہیں۔ شہریوں کو جائے پناہ نہیں۔ سنگدل صاحبانِ اقتدار و اختیار اور قانون کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

محافظان غفلت شعار مذمت کے روایتی الفاظ کی تکرار کر کے اپنے فرضِ منصبی سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ ''حکومت دہشت گردوں سے ہار نہیں مانے گی'' کے گھسے پٹے لفظوں کی صدا ختم نہیں ہو پاتی کہ شہر ایک نئے خودکش دھماکے سے گونج اٹھتا ہے۔ سیکڑوں بے گناہ ہلاک اور زخمی ہو جاتے ہیں اور بے حس مسیحا اپنے مطالبات منوانے کے لیے اسپتالوں سے باہر ہڑتال پر ہوتے ہیں۔ باڑی مردان کے محمد انور کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ برادر عزیز علی سفیان آفاقی نے بالکل درست لکھا ہے کامیڈین ننذر کا نام شیر گل فلم سسی ہی میں تھا اور اس فلم کا اسکرپٹ میں نے ہی تحریر کیا تھا۔ البتہ ''شیر گل کے مغز میں وٹہ'' کے مہمل تکیہ کلام کا اضافہ ننذر نے خود کیا تھا۔ لیکن یہ بہت مقبول ہوا۔ عوام کا مزاج اور پسند بھی طرفہ تماشا ہے۔ مشہور ہدایت کار محبوب کی کامیاب فلم آن میں دلیپ کمار کے پستول کی گولی سے ریاستی سپاہی کی ایک بھوں اڑ جاتی ہے جیسے حجام نے استرے سے صاف کی ہو۔ تو ہال تالیوں اور قہقہوں سے گونج اٹھتا تھا۔ البتہ آفاقی بھائی نے اداکار ساقی کی سپرہٹ فلم ہزار داستان کا نام لکھنا بھول گئے جس میں ساقی نے سامی جادوگر کا ناقابلِ فراموش کردار بڑی خوبی سے ادا کیا تھا۔ اس بار جناب آفاقی کے گل فشاں قلم سے بھارتی اداکار کشور کمار کا نرالا انٹرویو ہے۔ فلمی الف لیلہ بڑا دلچسپ اور معلوماتی سلسلہ ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ جناب ڈاکٹر ساجد امجد اپنے مفید اور معلوماتی مضامین سے قاری کو ذہنی سکون اور روحانی مسرت بہم پہنچاتے ہیں اللہ خوش رکھے۔ بعض لوگ ملے بغیر دل میں گھر کر لیتے ہیں۔ لکھنا اور بہت کچھ تھا لیکن دوسرے لکھاریوں کی حق تلفی کو میں جائز نہیں سمجھتا۔ سرگزشت میں اتنی جگہ مل جانا بڑے فخر کی بات ہے۔''

✉ طاہر الدین بیگ میرپور سے لکھتے ہیں ''2013ء کی آمد اور کراچی میں حالات جوں کے توں' سیاست میں ایک نئی ہلچل مولانا طاہر القادری صاحب کی طوفانی آمد سونامی سیلاب کے ساتھ ساتھ ن اور ق اور پ سب کے لئے خطرے کی گھنٹی۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ملک پر رحم و کرم کرے۔ کراچی کو نظرِ بد سے محفوظ رکھے آمین۔ نئے سال کی آمد متوالے سی ویو پر پابندیوں کے بعد پہنچ بھی گئے۔ بے تحاشا اسلحہ کی نمائش آسمان کی طرف گولیوں کی بوچھاڑ... یہ سب کس لیے؟ کیا کراچی اور ملک کے حالات ان خرافات کی اجازت دیتے ہیں جس سال کی آمد بارود کے دھماکوں سے ہو وہاں امن اور سکون؟ ہمیں چاہیے تھا کہ اپنے کرتوتوں پر نظر رکھتے توبہ کرتے ملک کی سلامتی اور خاص طور پر کراچی کے لیے دعائے خیر کرتے جیسا دعوت اسلامی نے کیا۔ اللہ ہم سب پر فضل و کرم کرے آمین۔ سرگزشت نت نئے واقعات اور کہانیوں کا مجموعہ۔ سچ بیتیاں بہت ہی خوب رہیں۔ شکستہ آئنہ، محبت کے پہلو، اور میں زخم زخم ہوں، سبق آموز کہانیاں تھیں۔ زور آور واقعی زور آور رہی۔ اتار چڑھاؤ کی زبردست کہانی اور انجام بھی زبردست۔ افریقا وافریقا، اور ترک، معلوماتی کہانیاں تھیں۔ ایسی کہانیاں ہونی چاہیے تاکہ معلومات میں اضافہ ہو۔ آفاقی صاحب کی الف لیلہ زبردست رہی۔ مرحوم وحید مراد پر بہت خوب لکھا، ساقی پر بھی کافی معلوماتی تحریر رہی کشور کمار کا انٹرویو زبردست تھا۔ کیمرا مین نبی احمد صاحب پر بھی اچھا لکھا۔ آفاقی صاحب ابھی کچھ اور آپ کی نگاہِ کرم کے منتظر ہیں۔''

✉ عدنان ذاکر کا ای میل ''کافی عرصے بعد الطاف شیخ کا سفرنامہ پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ سرورق کی کہانی، میں زخم زخم ہوں، بہت عام سی کہانی ہے۔ اس کہانی میں ڈپٹی کمشنر نے اپنے بچوں کا ذکر کرتے ہوئے ''سیل فون'' کو کیسے اپنی کہانی میں گھسایا ہے۔ موبائل فون تو صرف پچھلے 10 سال میں آیا ہے (1994 میں انسٹا فون کئی لاکھ کی تعداد میں آچکے تھے۔ لڑکا او لیول کر رہا تھا یعنی نوکری کے بارہ پندرہ سال قبل) ایک بات اور بتا تا چلوں کہ آپ کی تحریر مسترد تھی اسی وجہ سے نہیں لگی تھی۔ مواد میں کتنی تبدیلی کی گئی آپ کو بھی اندازہ ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ کسی شخص پر مضمون دیا جائے تو پیدائش سے موت تک کی روداد ہو درمیان کا حصہ بھی دیا جاسکتا ہے یعنی معلومات ناقص نہ ہوں بس اسی بات پر نظر رکھی جاتی ہے)''

✉ رانا فیصل جاوید نے علی پور مظفر گڑھ سے لکھا ہے ''ہمارے معاشرے میں پائے جانے والے ناسور پوری تندہی سے ہم کو نیست و نابود کرنے کی کاوشوں میں لگے ہیں مگر سلام ہے باہمت قوم کی قوتِ برداشت کو کہ وہ ان ناسوروں کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے قربانی پہ قربانی دیے جا رہے ہیں۔ فیصل رؤف مروت آپ نے بڑی اہم بات پر توجہ دلائی ہے۔ پاکستان فلم انڈسٹری پڑھے لکھے لوگوں کی وجہ سے ہی کامیاب تھی۔ رانا شاہد صاحب میری رائے سے متفق ہونے کا شکریہ۔ ایم اے ملک صاحب آپ کی تنقید بے وجہ ہی لگی۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ ڈاکٹر ساجد امجد اردو ادب کی جو خدمت کر رہے ہیں ان کو قومی ایوارڈ سے نوازا جانا چاہیے۔ فلمی الف لیلہ میں یہ جان کر حیرت ہوئی کہ عمران ہاشمی بھی پاکستانی خون ہیں۔ زور آور اچھی تحریر تھی محمد ایاز راہی نے برادر اسلامی ملک ترکی کی غیور قوم کے متعلق معلومات دے کر معلومات میں اضافہ کیا۔ الطاف شیخ کی افریقا اوافریقا اس ماہ کی بہترین اسٹوری ثابت ہوئی۔ سطر سطر نے مزہ دیا۔ کینیا کے سردار کتنے باکمال اور اپنی قوم سے مخلص تھے کہ خود تو غلامی برداشت کی لیکن نوجوانوں اور آنے والی نسلوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کر دیا۔ انہی پڑھے لکھے نوجوانوں نے پھر آزادی دلوائی۔ نئی دنیا کی تلاش واجبی تحریر تھی۔ سراب اب بورنگ ہوتی جا رہی ہے۔ اس کا اختتام ہونا چاہیے۔ بیت بازی میں نیلوفر یاسمین کا شعر پسند آیا۔ اقتباسات تمام اچھے تھے۔ جون ایلیا بھی ان کے بارے میں تفصیلاً لکھیے۔ معرکہ کارگل، میاں نواز شریف کی سب سے بڑی غلطی کہ فوج کو واپس بلا لیا ورنہ آج کشمیر ہمارا ہوتا۔ سچ بیتیاں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔ باقی ان شاء اللہ اگلے ماہ، تمام دوستوں کو نئے سال کی مبارک باد۔''

✉ رانا محمد شاہد کا خلوص بھرا خط بورے والا سے ''سالِ نو کا شمارہ ایک خوبرو دوشیزہ کے ساتھ ملا۔ اداریہ انتہائی سلگتے ہوئے موضوع پر تھا۔ سماجی کارکنوں اور خود کو دوسروں کے لیے وقف کر دینے والوں کی اپنی زندگیاں خطرے میں ہیں اور یہ سب ہماری حکومتی پالیسیوں کا نتیجہ ہے۔ فیصل رؤف مروت نے اداکاروں کی تعلیمی صورتِ حال سے آگاہ کر کے معلومات میں اضافہ کیا۔ ویسے میراں صاحبہ کی ایجوکیشن سے بھی آگاہ کر دیے جاتے ''زبردست'' انگلش بولتی ہیں۔ ڈاکٹر ایم آر ای کا خط بھی اچھا تھا، پر نہ جانے وہ اپنا نام کیوں نہیں بتانا چاہ رہے۔ ایم اے ملک کا بھی تنقید سے سجا خط دلچسپ لگا۔ ان سے ایک بات کہیں گے کہ مضامین تحقیقی ہوں یا دوسرے۔ ان میں مماثلت ہونا کوئی حیران کن بات نہیں کیونکہ شخصیات ہوں یا عمارات ان کے متعلق باتیں تو وہی رہیں گی۔ ہاں انداز بیاں اس کو نیا اور منفرد بنا دے گا (صحیح فرمایا) قرۃ العین زینب کی والدہ کی وفات کا سن کر دکھ ہوا، اللہ ان کی والدہ کو جوارِ رحمت میں جگہ دے (آمین)۔ سدرہ بانو، کراچی میں اسٹیٹ لائف کی بلڈنگ سے گر کر ہلاک ہونے والے نوجوان کا سبھی کو دکھ ہوا۔ خصوصاً انتظامیہ کی بے حسی دیکھ کر کہ جب تک بلڈنگ سے لٹکا رہا، اسے اتارنے کا مناسب انتظام کیوں نہ ہو سکا؟ (چار چھ منٹ میں کیا کیا جاسکتا تھا؟) ڈاکٹر محمود فیضانی کو کتاب کی مبارکباد اور ان کی تجویز سے متفق ہوں کہ سرگزشت میں چھپنے والی شخصیات کو کتابی صورت میں چھاپا جائے۔ احمد توحیدی، روبینہ نفیس انصاری اور افتخار عثمانی کا تبصرے کی پسندیدگی پر شکریہ۔ زہرہ گلزار، آپ یقیناً کسی ظالم مرد کا شکار ہوئی ہوں گی۔ یہ بھی سچ ہے کہ مرد عورت پر اکثر بے جا ظلم کرتے ہیں مگر اس بنیاد پر بھی مردوں کو انسان ہی نہ سمجھنا، اس منطق کو سلجھانا چاہیے کیونکہ مرد صرف شوہر ہی نہیں، ایک باپ، بھائی اور بیٹا بھی تو ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد کا تحریر کردہ ڈپٹی نذیر احمد کے زندگی نامے کو پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ معروف ناول نگار کا نام اردو کے بہترین قلم کاروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں معاشرے کے بہت سے عکس دکھائے۔ ان کے دو معروف ناول مراۃ العروس اور توبتہ النصوح انہیں اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔ ابن کبیر نے حال ہی میں امریکا میں آنے والے ایک بڑے طوفان سینڈی کے پس منظر میں دلچسپ کہانی پیش کی۔ سینڈی طوفان کے حوالے سے یہ بات اہم ہے کہ امریکا جدید ٹیکنالوجی اور خود کو ہر شعبے میں سپر پاور کہلوانے کے باوجود اس تباہی سے نہ بچا سکا جو سینڈی طوفان لایا۔ کہا جا رہا ہے کہ اس طوفان سے کم و بیش ایک کروڑ لوگ متاثر ہوئے اور کئی شہروں میں بڑے پیمانے پر تباہی ہوئی۔ ایک ہی بات کہوں گا کہ انسان، انسانوں کی طرح ہی رہے تو بہتر ہے۔ اپنی بنائی ہوئی چیزوں و ٹیکنالوجی پر بڑے بڑے دعوے قدرت کے سامنے کچھ بھی نہیں۔ ٹائی ٹینک کی عبرت بھری مثال تو سبھی کو یاد ہوگی۔ اس دفعہ فلمی الف لیلہ میں پاکستان کے معروف چاکلیٹی ہیرو وحید مراد پہ خصوصی گوشہ شامل تھا۔ وحید مراد پاکستان فلم انڈسٹری کا ایک لازوال کردار تھا۔ اس کا اسٹائل، اس کی اداکاری سبھی کچھ لوگوں میں بے حد مقبول تھی۔ مدھو بالا کی زندگی کے بارے میں پڑھ کر افسوس ہوا کہ باپ کی لالچ نے اس کو زندگی میں محرومی کے سوا کچھ نہ دیا۔ زندگی کے آخری سالوں میں فلم والے اس کو بھول چکے تھے۔ کوئی اس سے ملنے کے لیے نہیں آتا تھا۔ وہ ہر گھڑی، کسی ملاقاتی کی منتظر رہتی تھی مگر کوئی نہ آیا، آئی تو صرف موت۔ یہ پڑھ کر پاکستانی اداکارہ خالدہ ریاست یاد آگئی۔ اس نے مرنے سے پہلے وصیت کی تھی کہ میرے جنازے میں شوبز کا کوئی شخص نہ ہو کیونکہ میں نے اپنی زندگی میں جتنی منافقت یہاں دیکھی ہے اور کہیں نہیں۔ سندھ کے ایک نامور پہلوان کی زندگی کے دوسرے حصے کو بھی ڈاکٹر عبدالرب بھٹی نے بڑے اچھے پیرائے میں لکھا۔ محمد ایاز راہی نے ترک قوم کے حوالے سے معلومات سے بھرپور تحریر لکھی۔ سچ بیانیوں میں ٹائٹل اسٹوری ''میں زخم زخم ہوں'' پڑھی۔ بشریٰ جیسی جذباتی لڑکی کا انجام دردناک تھا۔ اس عمر کی محبتیں اکثر انتہائی جذباتی ہوتی ہیں۔ انسان اپنے محبوب سے صرف ہاں سننا چاہتا ہے۔ ناں کی صورت میں اپنی اور محبوب کی جان لینے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ کچھ عرصہ پہلے لاہور میں ایک کالج کے طالب علم نے اس طالبہ کی جان لے لی جس سے وہ محبت کرتا تھا اور شادی کرنا چاہتا تھا۔ گزشتہ ماہ ہمارے شہر میں بھی ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا لڑکے نے خود کو گولی مارنے سے پہلے لڑکی کو گولی ماری۔ لڑکا فوری جان سے گیا جبکہ لڑکی موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد دنیا سے چلی گئی۔ ایسے واقعات ہمارے معاشرے میں تواتر کے ساتھ ہو رہے ہیں اور اس میں سب سے منفی کردار میڈیا کا ہے۔ اس کے بعد والدین کا اپنی اولاد پر چیک نہ رکھنا ہے۔ آخری بات ایک بچہ آئس کریم شاپ پر گیا اور پوچھا کہ بڑا کپ کتنے کا ہے؟ ویٹر نے جواب دیا۔ ''15 کا'' بچے نے پیسے گنے اور پھر پوچھا ''چھوٹا کپ کتنے کا ہے؟'' ویٹر ''12 کا'' بچے نے چھوٹا کپ خریدا اور 12 روپے دے کر چلا گیا۔ جب ویٹر اس کی ٹیبل سے خالی کپ اٹھانے آیا تو یہ دیکھ کر اس کی آنکھیں نم ہو گئیں کہ بچے نے 3 روپے ٹپ اس ویٹر کے لیے چھوڑ دیے تھے۔ اپنی چھوٹی خوشی ترک کر کے آپ دوسروں کو بڑی خوشیاں دے سکتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ بہت بڑا پیغام ہے ہم انسانوں کے لیے...... آیئے اس نئے سال میں عہد کریں کہ ہم دوسروں کے لیے بھی خوشی کے ذرائع پیدا کریں گے تاکہ ہم آسانیاں تقسیم کر کے اللہ کے محبوب بندے بن جائیں۔''

✉ ایم اے خالق بھٹی رحیم یار خان سے لکھتے ہیں ''موسم سرما کے عروج نے پورے جسم کے ساتھ ہاتھوں کو بھی شل کیا ہوا تھا۔ آج کچھ موسم نے رنگ پکڑا ہے اور سورج میاں نے بھی آنکھیں دکھائی ہیں تو کچھ ہوش آیا ورنہ گزشتہ پندرہ روز سے کہر اور سردی جاندار جسموں کو شل کرنے کے درپے ہو رہی تھی۔ سرگزشت نے جنوری میں ہمارے فیوریٹ رائٹر مولوی نذیر احمد کے بارے میں ڈاکٹر ساجد امجد کی تحریر شائع کر کے نئے سال کا مزہ دوبالا کر دیا ہے (ڈپٹی نذیر احمد کی ذات خود میں انجمن تھی۔ ان پر جتنا بھی لکھا جائے کم ہے۔ ایسے لکھاری صدیوں

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں پیدا ہوتے ہیں) علی سفیان آفاقی کی فلمی الف لیلیٰ میں لیجنڈ اداکار وحید مراد کا ذکر پڑھ کر ماضی کے حسین سپنوں میں کھو گئے، جب ان کی فلمیں سینما گھر میں دیکھتے تھے لیکن اب تو سینما گھر بھی نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ وطن سے محبت نہ کرنے والے مفاد پرستوں کی وجہ سے ہماری کامیاب فلم انڈسٹری ناکام ہوئی۔ ابنِ کبیر کی سینڈی جو سپر پاور کے لیے خدا کا اشارہ تھا اگر اب بھی امریکا نہ سمجھا تو قوم فرعون کا انجام تو آنکھوں کے سامنے ہی ہے۔ ڈاکٹر بھٹی کی زور آور، محمد ایاز راہی کی ترک، الطاف شیخ کی افریقا اوافریقا، طارق عزیز خان کی نئی دنیا کی تلاش سے جو معلومات کا خزانہ میسر آیا ہے اس کے لئے سرگزشت کی پوری ٹیم کا ممنون ہوں۔ محمد ایاز راہی کی ترک کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ سمندر کو کوزے میں بند کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ قلم کو زور آور کرے آمین۔ نوبل انعام کا موجد اور دنیا کی تباہی کے موجد الفریڈ برنارڈ نوبل کی مختصر بپتی پڑھی۔ شہر خیال کے ساتھی اعجاز سٹھار کو کرسیِ صدارت اور فضل رؤف مروت، ڈاکٹر آر ایم ای، سدرہ بانو ناگوری، مدیحہ خان ماریہ خان، انجم فاروق ساحلی، طاہر الدین بیگ، ایم اے ملک گلشن وڈ، رانا محمد شاہد، زہرہ گلزار، احمد توحیدی، ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری، زہرہ گوہر عباس علی ریاض کے خطوط تبصرے سے بھرپور اور دلچسپ تھے، نئے ساتھیوں کے اضافے سے سرگزشت کی مقبولیت عیاں ہوتی ہے، آخر میں اپنی فیورٹ رائٹر ملتان کی وکیل صاحبہ قرۃ العین کو ان کی والدہ کے انتقال پر ہم تعزیت پیش کرتے ہیں۔"

✉ ایم افضل کھرل کی تشریف آوری ننکانہ صاحب سے "جنوری 2013 کا شمارہ میرے ہاتھ میں ہے۔ تمام قارئین کو نئے سال کی آمد پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ سرگزشت ایک انمول رسالہ ہے۔ آپ کی تگ و دو نے ہمارے لیے اسے مشعلِ راہ بنا دیا ہے۔ ہر ماہ نئے رائٹرز کی کہانیاں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ بڑی خوشی ہوتی ہے۔ آخر میں ان الفاظ کے ساتھ قلمبند کرنا چاہتا ہوں کہ ظفر بھائی آپ کی کہانی نے بہت متاثر کیا ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے آپ کے رابطے کا شدت سے انتظار رہے گا۔ آپ کی کہانی میرے لیے ایک اخلاقی سبق کے مانند ہے۔ بے شک آپ نے جو کچھ بیان کیا ہے۔ اس میں مجھے صاف صاف حقیقت نظر آتی ہے۔ باقی رہا آپ کا لڑکپن کہ جو آپ نے بہت مصائب کے ساتھ گزارا۔ خدا کی طرف ایک آزمائش کی گھڑی ہوتی ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ آپ نے بہت بڑا امتحان پاس کیا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو آج کے دور میں بے بس ان مصائب کو برداشت کرنے کا نااہل ہے۔ لیکن آپ نے تو مصائب کو برداشت کرنے کی انمول مثال دنیا کے سامنے رکھ دی ہے۔ امید ہے کہ آپ جیسے ہزاروں شکار مصائب آپ کی کہانی کو پڑھ کر ہمت سے کبھی بھی ناامید نہیں ہوں گے۔ سب قارئین سے التجا کرتا ہوں کہ میری والدہ محترمہ کی صحت کے لیے دعا کیجیے گا۔"

✉ سہیل احمد عباسی کی آمد پنو عاقل سکھر سے "شہر خیال اس مرتبہ عجیب سا لگا جہاں پر اکثریت نوواردوں کی تھی۔ بھئی ہمارے پرانے ساتھی تھک گئے ہیں کیا؟ اعجاز حسین سٹھار، ڈاکٹر آر ایم ای، طاہر الدین بیگ، رانا محمد شاہد، زہرہ گلزار، احمد خان توحیدی، ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری، افتخار عثمانی کے خطوط اچھے تھے۔ روبینہ نفیس انصاری صاحبہ سچ بیانی جلدی سے لکھ لیں ہم بھی پڑھنا چاہتے ہیں (اگلے شمارے میں موجود ہوگی) رانا محمد شاہد کچھ اپنی باتیں کریں یہ کہاں سیاست کی گندگی لے بیٹھے۔ بزرگ صورت نیک انسان نذیر احمد کی داستانِ زندگی ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی عرق ریزی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ سب تخلیقیں یکجا شائع کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ظالم امریکا پر آئے عذاب کی داستان سینڈی بہت معلوماتی ہے۔ وہاں بھی عذاب جھیلا تو غریبوں اور مظلوموں نے۔ اس سے پہلے نیو اور لینز شہر میں آئے سیلاب کے دوران وہاں کالی نسل کے لوگوں کو تعصب کا نشانہ بنایا گیا تھا اور امریکی حکومت ایسی ظالم ہے کہ اپنے کسانوں کو سبسڈی دے کر ان سے اناج وغیرہ خرید لیتی ہے جسے بعد میں لاکھوں ٹن کی مقدار میں سمندر برد کر دیا جاتا ہے مگر افریقا کے قحط زدگان کی مدد میں خرچ نہیں کیا جاتا۔ زور آور اس مہینے اختتام پذیر ہوئی۔ سندھ کے دیہی ماحول کا بہترین عکاس رہا یہ سلسلہ۔ محمد ایاز صاحب نے ترک قوم کے بارے میں بے بہا معلومات مہیا کی ہے۔ مگر سلطنتِ عثمانیہ کا ذکر جو کہ مختصر تھا۔ ریسرچ اور اعداد و شمار سے تاریخ دانوں نے ثابت کیا ہے کہ ترکی اس وقت بہترین ترقی یافتہ حالت میں تھا لیکن بظاہر ہمدرد لیکن در پردہ غدار اور وطن فروش لوگوں نے سیاسی عدم استحکام اور سازشوں سے عثمانی خلافت کو ختم کر کے اسرائیل کے لیے راہ ہموار کی اور اس سے قریبی فوجی تعلقات رکھے اور ترکی فوج برسوں تک امریکی، یہودی آلۂ کار بنی رہی اور غیروں کی غرض پوری کرتی رہی اور عدنان مینڈریس کو شہید اور نجم الدین اربکان کو برطرف اور رجب طیب اردگان کو قید کرتی رہی۔ حالانکہ رجب صاحب نے الیکشن مہم میں ایک نظم پڑھنے کا جرم کیا تھا جس میں عثمانی شاعر نے مساجد کے میناروں کو تلواروں سے تشبیہ دی تھی۔ لیکن جب بعد میں رجب طیب اردگان منتخب ہو گئے اور ترک قوم نے ان کی پرخلوص اور بدعنوانی سے پاک حکومت اور اس کے بے مثال معاشی ترقیات دیکھیں تو انہیں فوجیوں کے ذریعے ایک مرتبہ پھر ہٹانے کی سازشیں کی گئیں۔ وہاں اب بھی اسلام پسندوں کے خلاف یورپی امریکی لابی کی فنڈنگ سے ایک منظم طاقتور مہم چلائی جا رہی ہے اور رجب طیب اردگان کی بے مثال ترقی اور معاشی استحکام کو نظرانداز کر کے انہیں "عثمانیوں کی جدید آمد" کے متعصبانہ القابات سے نوازا جا رہا ہے تاکہ پھر فوجیوں کے ذریعے عدنان مینڈریس شہید والا واقعہ دہرایا جائے۔ اللہ پاک ان سب کی حفاظت فرمائے آمین۔ سندھی سفرنامے کے باوا آدم الطاف شیخ صاحب کے سفرناموں کا کیا کہنے نہایت معلوماتی اور شاندار ہوتے ہیں، ان کے اردو ترجمے میں بھی وہی بے ساختہ انداز ہے اور ابراہیم جمالی نے الطاف صاحب کا وہی رنگ اردو میں بھی برقرار رہنے دیا ہے جو کہ ان کی پہچان ہے۔ زیلم

خان والے اقتباس میں کئی غلطیاں ہیں۔ مثلاً انگلش نہیں بلکہ یہ انگش ہے جو کہ علاقے اور ایک زبان کا نام ہے (انگش ہی تو شائع ہوا ہے۔ غور سے دیکھیں) انغاریہ کے دارالحکومت کا نام گروزنی نہیں گروزنی ہے دارالحکومت دوحہ میں روسی خفیہ کارندوں نے ان کی کار میں بم دھماکے سے شہید کر دیا تھا جہاں وہ جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ (یہ صرف اقتباس ہے مضمون نہیں کہ ہر واقعہ بیان کیا جائے)۔ قطری حکومت نے ایجنٹوں کو پکڑ کر ملک بدر کر دیا۔ چیچنیا کی تحریک آزادی مسلمان ملکوں کی حمایت نہ کرنے کی وجہ سے لاکھوں لوگوں کے شہید ہونے کے باوجود روسی استعمار سے آزادی حاصل نہیں کر سکا۔ اور ایسٹ تیمور جس عیسائی ریاستیں اپنی معمولی جدوجہد سے عالمی کفریہ اتحاد آزاد کروا لیتا ہے۔ چیچنیا میں اب بھی عمر جو کا عیف کی سربراہی میں جنگلوں میں مجاہدین اپنی بقا کی آخری جنگ لڑ رہے ہیں۔ لیکن دنیا میں کوئی حمایت کرنے والا نہیں...... اپنے کشمیر کی داستان تو سب کو پتا ہے کس کس کو روئیے کہ سینہ زخموں سے چھلنی ہو چکا ہے کوئی حل نہیں کوئی علاج نہیں۔ امت مسلمہ کو امریکی موسموں میں الجھا دیا گیا ہے۔ جبکہ عرب بیچارے اس دن کو رو رہے ہیں جب وہ مضبوط اور مستحکم حکومتوں کے خلاف روڈوں پر نکل آئے تھے اور نتیجتاً مصر، تیونس اور لیبیا میں اس وقت معیشت تباہ ہو چکی، سیاست کئی حصوں میں بٹ کر انتشار و بدنظمی کا شکار ہو چکا ہے۔ اور عالمی مغربی طاقتیں اپنی جیت پر خوشی سے پھولے نہیں سماتیں۔ کشمیری، فلسطینی، چیچنیائی اپنے مقدر کو رو رہے ہیں اب پاکستان میں بھی ایسا ڈراما اسلام آباد میں ہونے کو ہے۔ اللہ ہمیں عربوں جیسے انتشار و افتراق سے محفوظ رکھے۔ آمین۔"

✉ صدرہ بانو ناگوری کا خلوص نامہ کراچی سے "سالِ نو کا نیا شمارہ اپنی تمام تر رنگینیوں کے ساتھ ہاتھوں میں آیا۔ خوب لگا، ابتداء اداریے سے کی پولیو ٹیم پر حملے کی خبریں ہم بھی اخبار اور ٹی وی میں دیکھ چکے ہیں۔ ایک طرف اتنے تکلیف دہ واقعات رونما ہو رہے ہیں تو دوسری طرف ملک میں خسرہ کی وبا پھیلتی جا رہی ہے ننھے بچے موت کے منہ میں چلے جا رہے ہیں۔ مریضوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے لیکن مرض کے بجائے مریضوں کا خاتمہ ہو رہا ہے۔ اسپتالوں میں بستر کم پڑنے لگے ہیں ہر طرف موت کا رقص جاری ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ خدا ہمارے حال پر رحم کرے "شہر خیال" میں اعجاز حسین سٹھار مسند صدارت پر براجمان نظر آئے، مبارک ہو آپ کا خط نہایت ہی دلچسپ اور معلوماتی تھا۔ سراب میں ہیرو تھرڈ ڈگری کے چنگل میں جا پھنسا ہے کاشف زبیر صاحب اتنا ظلم اور وہ بھی ہیرو پر ذرا خیال کیجیے مگر اس کے باوجود شوبلی نے جدوجہد تو خوب کی مگر کیا کیجیے کہ مصنف کو منظور نہ تھا سو زہریلی سوئی آخر گردن میں اتر ہی گئی دیکھیے اگلے ماہ کیا چمتکار ہوتا ہے انتظار رہے گا آفاقی انکل کی فلمی الف لیلہ میں ماضی کے چاکلیٹی ہیرو "وحید مراد" کا زندگی نامہ پڑھا اس سے یہ نصیحت حاصل ہوئی کہ بدلتے موسموں کے ساتھ آدمی کو خود بھی بدل جانا چاہیے۔ یعنی کمپرومائز ہی بہتر رویہ ہوتا ہے۔ سمندری طوفان، سینڈی، کے پس منظر میں ابن کبیر انتہائی دلچسپ مغربی ماحول میں مشرقی لو اسٹوری لے کر آئے اور چھا گئے۔ ابن کبیر صاحب اگر یہ ترجمہ ہے تو خوب اور طبع زاد ہے تو بہت ہی خوب بلکہ واہ واہ۔ میں زخم زخم ہوں، لہو رلا دینے والی پہلی سچ بیانی پڑھی بہت پسند آئی۔ ظفر صاحب کو ایک اعلیٰ عہدے پر پہنچنے کے بعد بھی بشریٰ کی موت سکھی نہ رکھ سکی کاش کہ وہ جنونی لڑکی صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے اچھے وقت کا انتظار کر لیتی تو اپنے ساتھ ساتھ ظفر کی خوشی کا باعث بھی بنتی "راجا اندر" منظر امام حسبِ معمول ایک دلچسپ اور منفرد کردار لے کر آئے اور فیاض کی داستان سنا کر حیران کر گئے "فنکار" ایک مزاحیہ تحریر ہے۔ نفیس صاحب نے ایک لڑکی کے ہاتھوں دھوکا کھانے کے بعد یقیناً فنکاری کو خیرباد کہہ دیا ہوگا۔ کسی نے درست ہی کہا کہ سیر کو آخر سوا سیر مل ہی جاتا ہے۔ "محبت کے پہلو" انیسہ صاحبہ کی تحریر پڑھ کر حیرت کے ساتھ ساتھ تعجب بھی ہوا۔ محبت کا ایسا عجب پہلو اور وہ بھی دو عورتوں کے درمیان ہم نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا "افریقا اوافریقا" اور باقی شمارہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔"

✉ احمد خان ناگوری کراچی سے لکھتے ہیں۔ "14 دسمبر کو میری 60 ویں سالگرہ ہے پھر دس دن بعد ریٹائرمنٹ کی کاغذی کارروائی ہوگی۔ 24 دسمبر سے ملٹی کمپنی میکینکل انجینئر جاب شروع کر دی ہے۔ رسائل سے تاحیات ریٹائرمنٹ کا خیال نہیں ہے۔ نیا سال مبارک ہو ساتھ ہی قلبی دعا ہے کہ اللہ اس ملک میں امن و امان قائم کر دے۔ معراج رسول وایدھی جیسے حکمران عطا فرمائیں، (آمین ثم آمین)۔ سال 2012ء کی کرسیِ صدارت اس طرح رہی جنوری، خالد کبیر۔ فروری اعجاز سٹھار۔ مارچ، ایم اے خالق بھٹی۔ اپریل، رانا سجاد۔ مئی راجہ ثاقب نواز۔ جون، ایم اے خالق بھٹی۔ جولائی، رانا سجاد۔ اگست، اعجاز سٹھار۔ ستمبر، اختر صبا۔ اکتوبر، انجم فاروق ساحلی۔ دسمبر انجم فاروق ساحلی۔ نومبر، اعجاز سٹھار اعجاز سٹھار سرفہرست رہے۔ نئے سال کے ساتھ دوبارہ ڈبل مبارک۔ معراج رسول صاحب 21 دسمبر کو قیامت کا صدق دل سے انتظار کیا کیونکہ کلام پاک کی دو نشانیاں یعنی۔ سب کھا جانے والے یاجوج ماجوج اور دجال سے تو پاکستان بھرا پڑا ہے۔ پولیو سے پاک کرنے والے مسیحا کی لاشیں تو لٹیرے خود ہی چاہتے ہیں۔ پی آئی اے، ڈاک، ریلوے کا آپ نے ذکر کیا اسٹیل مل بھول گئے۔ ماہانہ ایک ارب من وسلوئی ہڑپ ہوتا ہے۔ موجد کے بارے میں صرف اتنا کہوں گا کہ کاش موجد بارود نہ پھٹنے والا گولی نہ چلنے والی کے بجائے لیٹروں کی گردن پر یاجوج ماجوج والا دانہ ایجاد کر دیتا۔ شہر خیال میں چھلانگ لگائی۔ اعجاز سٹھار کرسیِ صدارت اور نیا سال مبارک۔ اعجاز سٹھار، فضل رؤف ڈاکٹر ایم آر ای۔ امبرین زہرہ، ایم اے ملک، رانا شاہد، طاہرہ گلزار، اتنے طویل تبصرے پر معذرت اور رانا شاہد، طاہرہ گلزار، اتنے طویل تبصرے گذر رہے مگر میرا تبصرہ کبھی پورا شائع نہ کیا۔ (آپ اردو سلیس لکھیں) مدیحہ خان، ماریہ خان راولپنڈی۔ میں کب بوڑھا ہوا ہوں ثبوت دو۔ 30 فیصد زیادہ تنخواہ پر نئی نوکری کر رہا ہوں انجام تک جانے کے لیے زور آور سے ملاقات کی روشو کی منافقت

WWW.PAKSOCIETY.COM

خیر بخش کی کامیابی کا ذریعہ بن گئی۔ دھنی بخش کی رحلت کا افسوس ہوا۔ فلمی الف لیلیٰ میں یہ آفاقی صاحب نے قلعہ گجر دسنگھ کے لاہور ہوٹل کو طویل سکونت کی تھی۔ لکشمی چوک رائل پارک میں بڑے اداکاروں سے آمنا سامنا ہوتا تھا۔ کشور کمار کا انٹرویو پڑھ کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔ مدھو بالا، جیسی عظیم ہستی کا انجام قلبی دکھ کا باعث بنا۔ ڈپٹی کلکٹر نذیر احمد کی کہانی خود ان کی زبانی اسکول اور رسائل میں پڑھی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے تفصیل سے پیش کیا، شکریہ۔ ترکوں کے بارے میں رسول پاک کی پیش گوئی سچ ثابت ہوئی، گڈ اسٹوری۔ افریقا او افریقا اور نئی دنیا کی تلاش اچھی معلوماتی کہانیاں تھیں۔ فرقان ترمذی ملتان، زاہد خٹک راول پنڈی اچھے اشعار لے کر آئیے مگر سراب ابھی پڑھی نہیں ہے۔''

✉ محمد ایاز راہی نے گلی باغ مانسہرہ سے لکھا ہے۔ ''بدھ 2 جنوری 2013ء کو 23 سالہ خوبرو سرگزشت سے ملاقات ہوئی تو بے اختیار اس کی بلائیں لے ڈالیں۔ چھیل چھبیلا، بانکا سجیلا۔ مدیر سردبیر کی انتھک محنت سے چہرے پر تازگی اور رنگ ہجوم کر رہے تھے۔ تخلیقی، معلوماتی اور دلچسپ مضامین کی خوشبوئے دلنواز تھی کہ بے خود کیے دے رہی تھی سو دیر تک اسے سینے سے لگائے رکھا۔ زندگی کی حرارت سے بھرپور سرگزشت اور سرما کی گنگناتی دھوپ نے وہ خمار بخشا کہ روح بھی گنگنا اٹھی۔ مرحبا، مرحبا سرگزشت دل رُبا۔ شہر خیال کے ہم خیالو' آپ بیتی اور جگ بیتی کے حسین رنگوں سے سجی میری کتاب، یادوں کی بستی شائع ہو گئی ہے۔ جس میں آپ اپنے اردگرد پھیلے کرداروں کو محسوس کریں گے۔ بقول ڈاکٹر اجمل نیازی ''یادوں کی بستی میں آوارہ گردی کرنے کو جی چاہتا ہے۔'' اور بقول علی سفیان آفاقی ''کتاب کے مطالعے میں قاری گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ کتاب الوقار پبلی کیشنز، لاہور نے شائع کی ہے۔''

✉ کراچی سے نامعلوم قاری کا اظہاریہ۔ ''اداریہ پڑھا افسوس ہوا کہ آپ پانچ چھ ڈائجسٹوں کے مالک ہونے کے باوجود حکمران پارٹیوں کے گورکھ دھندوں سے واقفیت حاصل نہ کر سکے۔ آپ نے بڑے مزے سے ایک سادہ سی فگر کوٹ کر دی کہ 25 لاکھ افراد ٹیکس پینٹ میں ہیں (ٹیکس پینٹ اسے کہتے ہیں جو مروج ہو مع نام پتا) 16 کروڑ عوام روزمرہ کے استعمال کی اشیا کے ذریعے کھربوں ڈالر ٹیکس ادا کر رہے ہیں۔ ٹیکس جبراً عوام سے لیا جا رہا ہے اور وصول کرنے کے بعد بندر بانٹ ہو رہی ہے۔ 17 گریڈ کا بیوروکریٹ 10 کروڑ ماہانہ کا غبن کرتا ہے۔ 18 گریڈ کا بیوروکریٹ 25 کروڑ یہی حال دوسری بیوروکریسی کا ہے۔ یہ بندر بانٹ اس طرح ہوتی ہے کہ ترقیاتی پراجیکٹ ایک کروڑ کا ہوتا ہے لیکن بندر بانٹ کی وجہ سے دس بارہ کروڑ کا ہو جاتا ہے پھر اگلے بجٹ میں دوسرے ڈاکو کو چانس دیا جاتا ہے اسی طرح عوام سے چھینا ہوا وسیع ترین ٹیکس مندرجہ بالا افراد کی جیبوں میں جا رہا ہے اور آپ کو فکر ہے کہ عوام ٹیکس نہیں دے رہے۔ میں کہتا ہوں کہ عوام پر سے ٹیکسوں کا بوجھ ختم کیا جائے اگر نہیں تو بندر بانٹ کو ختم کرنے کے لیے آپ اپنی صحافتی ذمے داریوں کو ادا کرتے ہوئے ٹیکس پیچ کو عوام پر آشکار کریں۔ عوام کو بتائیں کہ 2500 روپے سالانہ ٹیکس دینے والا بسوں میں دھکے کھا کر زندگی گزار رہا ہے اور ٹیکس وصول کرنے والا راشی اور اس کی اولاد کس طرح ان کے دیے ہوئے ٹیکسوں سے عیش کرتا ہے۔ 17 گریڈ سے 20 گریڈ کے افسر جو کہ ٹیکس دیتا نہیں وصول کرتا ہے۔ 17 لاکھ کی سرکاری گاڑی استعمال کرتا ہے۔ 2000 ء لیٹر ماہانہ پیٹرول حاصل کرتا ہے۔ ڈرائیور لیتا ہے۔ صرف گاڑی پر 2 لاکھ ماہانہ خرچ ہوتا ہے کیونکہ بیوی اور بچے بھی سرکاری گاڑی کو ہر منٹ رگڑتے ہیں۔ مرمت کے تمام اخراجات سرکاری محکمہ برداشت کرتا ہے۔ غرض کہ ماہانہ خرچہ 5 لاکھ سے زیادہ 10 لاکھ روپے ہو رہا ہے۔ یہ کہاں سے ہو رہا ہے۔ 16 کروڑ عوام کے قطرہ قطرہ ٹیکس جمع کروانے سے جبکہ بیوروکریٹ کی تنخواہ ہے 50 ہزار ماہانہ۔ آپ اعزازی نمائندے بنائیں جو محکمانہ کرپشن کی نیوز آپ کو رپورٹ کریں گے۔ انہیں مہینے میں ایک اجتماع کے ذریعے ایک پارٹی کے ذریعے خوش کریں۔ جہاں بیٹھ کر تحریری تجاویز کا تبادلہ ہو۔ آپ کو کیسی کیسی کرپشن سننے کو دیکھنے کو ملے گی۔ (ہمارے معزز اراکین محفل تجاویز، آرا اور خبروں کے ذریعے محفل کو مطلع کرتے رہتے ہیں سرگزشت معلومات کے لیے مختص نیوز میگزین نہیں ہے۔ اس لیے اس انداز میں انفارمیشن دینا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے) عوام کا ایک ایک فرد ٹیکس ادا کر رہا ہے اور مسائل پر قابض افراد مزے سے اڑا رہے ہوتے ہیں اور شور مچا رہے ہیں کہ عوام ٹیکس نہیں دیتے۔ ٹیکس نیٹ بڑھاؤ یہ ایک فراڈ نعرہ ہے۔ 20 روپے امپورٹ شدہ ڈیزل پر 6 روپے نہیں آتے بلکہ 60 روپے ٹیکس آتے ہیں کیونکہ اس ڈیزل کی قیمت کے اثرات آٹے، ٹرانسپورٹ، کریانہ کی اشیا، جنرل اسٹور کی اشیا پر پڑتے ہیں اور قیمتوں کے تعین کے بعد مزید سیلز ٹیکس...... یہ ڈبل ٹیکس ہے جو عوام دینے پر مجبور ہیں۔ آپ کہہ رہے ہیں کہ لوگ ٹیکس نہیں دے رہے۔ یہ سرمایہ داروں کی حکومت ہے اس نے امیروں کو رعایت اور غریبوں کو ٹیکس نیٹ میں ڈالا ہوا ہے۔ روزمرہ کا ہر آئٹم کسی نہ کسی صورت میں ٹیکس پیڈ ہوتا ہے۔ آپ صرف یہ لکھ دیں کہ ٹیکس کس شے پر نہیں۔ افواجِ پاکستان 60 فیصد جمع شدہ ٹیکس وصول کرتی ہے جبکہ اگر ڈیفنس اتھارٹی بنگلوں کو تین منزلہ، چار منزلہ بنانے کی اجازت دے تو پورے پاکستان سے 10 ارب روپے کی اضافی آمدنی ہو سکتی ہے لیکن اتھارٹی کو آسان آمدنی چاہیے۔ بس آپ سے درخواست ہے کہ پاکستان کے تمام ٹیکس وصول کرنے والے اداروں سے معلومات حاصل کریں۔ ٹیکس دہندگان کی تعداد لیں اور پھر اندازہ لگائیں۔ 100 فیصد تعداد ٹیکس دیتی ہے۔ 30 فیصد تعداد کا ٹیکس بیوروکریسی جمع کراتی ہے باقی 70 فی صد ہڑپ یہ ہے کہانی حکام کہتے ہیں تمہارا 2 لاکھ ٹیکس بنتا ہے۔ ایک لاکھ جمع کرو اس طرح ایک لاکھ ہم کھائیں گے۔ یہ ٹیکس پریکٹس پورے پاکستان میں چل رہی ہے۔ 10 کروڑ ٹیکس کا فارمولا ڈھائی کروڑ کا چالان۔ 5 کروڑ پارٹی کو بچت۔ ڈھائی کروڑ حکام کی جیب میں۔ ٹیکس دہندہ نے ادا کیے 5 کروڑ جبکہ اس کے پیچھے اس کی بہت بڑی انویسٹمنٹ ہے اور ڈھائی کروڑ لینے والے ٹیکس وصول کرنے والے ہیں۔ چوری کون کروا رہا ہے اور کون کر رہا ہے متعارف ہو گئے؟ اس لیے اپنے میگزین میں عوام کو

ٹیکس دے دینے کی بات نہ کریں بلکہ یہ پوچھیں کہ 6 ہزار ارب وصول ہونے والی رقم کہاں گئی کیونکہ 2 کروڑ میں بننے والا برج 10 کروڑ میں کیوں بنتا ہے۔ عوام کے ٹیکسوں سے برج نہ بنے بلکہ انوسٹر کو پل بنانے کے بعد گزرنے والے ٹریفک سے قیمت وصول کرنے کی اجازت دے دی جائے۔ کسی بھی ادارے کا عمل دخل نہ ہو ان کی آمدنی میں عوام کو سہولت مل جائے گی۔ انوسٹر کو بھی منافع بچے گا۔ ایسی اسکیمیں چل جائیں تو عوام کو جدید ترین سوسائٹی میسر آ جائے گی لیکن عیار، مکار بیوروکریسی محکموں کی آڑ لے کر ترقیاتی کاموں میں رکاوٹ ڈالیں گے۔ اس فراڈ نظام کے خلاف اپنی تحریروں میں عوامی رائے شامل کریں۔ فراڈ نظام کے خلاف عوامی رائے کی اشاعت بہت ضروری ہے۔ جیسا کہ آپ کا ایک مضمون ہے فلمی الف لیلیٰ اسے بھی آپ اپنے خرچے پر چلا رہے ہیں۔ بس آپ قارئین کی آرا چھاپنے کے لیے 10 روپے کا کراسڈ چیک مانگ کر اپنے لیے سہولت پیدا کر سکتے ہیں۔ جناب معراج رسول صاحب اس وقت عوام بدترین لوٹ مار کا شکار ہیں ان پر سیلز ٹیکس کا بدترین نظام نافذ ہے جو پاکستان کے 10 کروڑ عوام سے روزانہ 10 روپے اور زیادہ کی کوئی حد نہیں یعنی 1/5 ارب روپے روز لیکن عوام کا 80 فی صد طبقہ علاج، تعلیم کی نسبتی سہولتوں سے محروم ہے۔ آج تمام سرکاری محکمے ناکارہ ہو چکے ہیں۔ رشوت، کرپشن زوروں پر ہے۔ کیوں اس لیے کہ فراڈیے بے نقاب نہیں ہوتے۔ یہ آپ کا کام ہے کہ ٹی وی چینل کے ساتھ مل کر انہیں بے نقاب کریں۔ چائے پانی جیسا ذلیل کلچر جڑیں پکڑ چکا ہے۔ امید ہے معاملہ اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے۔ اپنا فریضہ ادا کریں اور آخرت میں صلہ پائیں۔ بجلی، گیس کے ذریعے ہر حکمرانوں کی لوٹ مار۔ ہمارا ملک ایٹمی ہے۔ ایٹمی بجلی حکومت 5 روپے یونٹ بھی بیچے تو 4.50 روپے نیٹ آمدنی ہے لیکن حکومت کو تو عوام کو لوٹنا ہے۔ کچھ نہیں تو بجلی کو آمدنی کا ذریعہ بنایا ہوا ہے۔ ہائیڈل پاور کے کھلے سیکڑوں چانس ہیں۔ گیس کے وسیع ذخائر ہیں لیکن صنعتی بدانتی پھیلی ہوئی ہے۔ ملک بجلی کے بحران میں پھنسا دیا گیا ہے۔ اپنے لوٹ مار کے لیے آج بجلی، گیس حکومتی عملداری سے نکل جائے تو وافر مقدار میں بجلی گیس موجود ہو گی، روزگار ہو گا۔ لوگ بھوکے نہیں مریں گے۔ وسائل پر حکومت کا قبضہ غلط ہے۔ حکومت کا زمین پر قبضہ ہوتا ہے۔ حکومت اپنی زمین نہ بیچے اس زمین پر دس دس منزلہ عمارتیں بنائے۔ بڑے بڑے شاپنگ کمپلیکس بنائے ان کے کرائے کھائے۔ اس طرح لوگ بھی زیادہ سے زیادہ روزگار سے لگیں گے۔ حکومت چھوٹے چھوٹے شہروں میں تجارتی کمپلیکس نہیں بنا رہی بڑے شہروں میں بلڈر تجارتی کمپلیکس بنا کر آبادی کو شہروں سے گاؤں کی طرف منتقل کر رہے ہیں اور حکومت اپنی آمدنی کھو کر ضروریات کے ذریعے عوام کو لوٹنے میں مصروف ہے۔ پورے پاکستان کی زمینوں پر بلڈنگوں کی تعمیر سے اتنا کرایہ آئے گا کہ کبھی حکومتی اہلکاروں نے اس کا تخمینہ نہیں لگایا ہو گا۔''

✉ ڈاکٹر ایم اے ملک گلن اوڈ یوایس اے کا خط اسلام آباد سے۔ ''ہم نے تو سرگزشت اور سسپنس کو حرزِ جاں بنا رکھا ہے۔ اس لیے جب اپنی سمجھ کے مطابق اس کی کمی نظر آ جائے یا معیار سے لڑکھتا ہوا نظر آئے تو بے حد ذہنی تکلیف ہوتی ہے۔ ماشاء اللہ سرگزشت کا معیار ہمیشہ ہی اس قدر اعلیٰ ارفع اور عمدہ رہا ہے کہ اس کے مقابلے میں کوئی بھی اردو زبان کا جریدہ نہیں آ سکتا۔ میرے خیال میں اردو زبان کے رسائل میں اس کا مقام بہت اونچا ہے۔ اردو زبان کے ارتقا کے لیے جو جہاد آپ نے شروع کر رکھا ہے وہ نہ صرف قابلِ تحسین ہے بلکہ قابلِ تقلید بھی ہے۔ جنوری 2013ء کے شمارے میں تحریروں کے بارے میں رائے کے مطابق ماسوائے ایک آدھ تحریر کے باقی تمام شمارہ دلچسپ، عمدہ اور خوب صورت مضامین کا مرقع ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے بارے میں مضمون دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ اگر ڈاکٹر صاحب اپنی تحریر کے فورمیٹ کو ذرا تبدیل کر لیتے تو یہی مضمون اور دلچسپ ہو جاتا۔ (مشورہ بھی دے دیں، قارئین کے مشورے پر ہی پرچا ترتیب دیا جاتا ہے) سنڈی کے بارے میں ابن کبیر نے بہت عمدہ پیرایے میں لکھا۔ یہ ایک انتہائی دلچسپ اور معلوماتی سچ بیانی ہے۔ ابن کبیر صاحب کو میری طرف سے اتنی شائستہ، شگفتہ اور بھرپور مضمون لکھنے پر مبارک باد۔ اس مضمون میں جو واقعات ابن کبیر صاحب نے لکھے ہیں میں ان کا چشم دید گواہ ہوں۔ فلمی الف لیلیٰ کے بارے میں اتنا ہی لکھوں گا کہ سرگزشت کا سینٹر پیس ترک پڑھ کر اپنے برادر اسلامی ملک کے بارے میں جان کر بہت اچھا لگا۔ الطاف شیخ صاحب کا افریقا او افریقا ایک منفرد سفرنامہ ہے۔ نئی دنیا کی تلاش بس ایویں واجبی سا مضمون تھا۔ کاشف زبیر صاحب سے کہیں کہ بے چارے شہباز ملک کو ایک ہی قسط میں دشمنوں کے نرغے میں دو تین مرتبہ نہ پھنسایا کریں۔ سچ بیانیوں میں زخم زخم ہوں کی اٹھان اچھی تھی۔ ستم تو بہرحال اس میں ضرور تھا مگر اچھی لکھی گئی کہانی تھی۔ باقی سچ بیانیاں دلچسپ بھی تھیں اور سبق آموز بھی۔''

تاخیر سے موصول خطوط:

محمد ارسلان اکبر رند (خضدار بلوچستان)۔ نعیم اختر، حیدر شیرازی، کوثر حسنین (حیدرآباد) وسیم بادلا (کراچی) شیراز خان (خوشدار) ارباب خان، محمد مجم، ذیشان چنگیزی (کوئٹہ) ماجد ملک، یاسمین فراز، قرۃ العین، کاظم پاشا (لاہور) نسیم حسن (حیات آباد) زاہد خان نیازی، فاخر حسن (ملتان) اقبال آفریدی (ہنگو) نعمان بخش (پشاور) سائرہ ریاض (ساہیوال) رباب بانو ترمذی (چکوال) اقرا سلطان (ایبٹ آباد) منظر وسان (سمبڑیال) راحت حیات (گوجرانوالا) مہر افروز (منڈی بہاؤالدین) سیدہ امبر نقوی، ثمرہ اختر (رحیم یار خان) عنبر شاہ (کوہاٹ) نسرین (ہٹیاں آزاد کشمیر) حبہ خان (چنیوٹ) شاہین فرح (میانوالی) دعا (ہری پوری) صبا نواز اختر (جوڑہ) سلمٰی شبیر (اٹک) گل فرید (کھاریاں) کامران مرزا (مری) صباحت فیصل (ٹیکسلا) شجاعت حسین (سرگودھا) صنم ناز (جڑانوالہ) ام ثمامہ (اسلام آباد)

WWW.PAKSOCIETY.COM

وحیدِ عصر

ڈاکٹر ساجد امجد

ایسے وقت میں جب دیوار ودر اداس تھے۔ افکارِ غلامی نے ذہن وفکر پر زہراب انڈیل دیا تھا۔ شعلہ گر عہدِ ظلمت بننے کی للك تھی۔ اس نے قلم وقرطاس سے ذہنوں کو بیدار کرنے کی تمناکی اور مضامین کے انبار لگادیے۔ احساسِ الم بھی اسے روك نہ سکے اور وہ تہذیب کے رعنا پیکر تراشنے کی سعی میں لگا رہا۔ اگر وہ یورپی زبان کا لکھاری ہوتا تو موتیوں میں تولا جاتا لیکن اردو کا قلم کار تھا ناں اس لیے آج کی نئی پود بہت کم اس کے نام سے بھی واقف ہے۔ افتارِ زمانہ کہ اپنی بیاض بچانے کے لیے وہ جلتے کمروں میں کود گیا، اپنی جان دے کر اپنا کلام بچالیا مگر مکمل کلام آج تك قارئین تك پہنچ نہ سکا بس لوگوں کو اتنا پتا ہے کہ وہ اکبر الہ آبادی کا استاد تھا۔

اردو کے ایک بڑے شاعر کے حالاتِ زیست

''کڑا'' کتنا عجیب نام تھا مگر تھا۔ کسی آدمی کا نہیں الہ آباد کے قریب ایک بستی کا نام تھا۔ مجاہدینِ اسلام کے جس لشکرِ جرار نے 1203ء میں کڑا فتح کیا اس کے سرخیل سید احمد شہید کے جدِ امجد سید قطب الدین محمد مدنی تھے۔ اس کے بعد مختلف اسلامی گروہ، افراد واشخاص اس آبادی میں آکر بستے رہے۔

ہندو روایت یہ تھی کہ ستیلا دیوی نے سرزمین کڑا میں اپنا پنجہ رکھا۔ یہ دیوی وندھیا چل سے اڑی تھی اور وہاں سے اڑنے کے بعد اس نے اپنا پنجہ جس آبادی میں رکھا وہ یہی ''کڑا'' تھا۔ سنسکرت میں ہاتھ کو ''کر'' کہتے ہیں لہٰذا اس آبادی کا نام کڑا مشہور ہوگیا۔ یہاں ایک مندر بھی تعمیر کیا گیا تھا جو ستیلا دیوی کا مندر کہلاتا تھا۔

اس بستی کی قدامت کے سلسلے میں مسلمانوں میں یہ روایت بھی مشہور تھی کہ اس بستی کی بنیاد حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے سے ہے۔ روایت ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں ایک بڑے سرکش ومغرور دیو کو گرفتار کرکے لے جایا جارہا تھا۔ قیدی دیو کا گزر کڑا سے ہوا تو اس نے سرزمین کو دیکھ کر کہا جب میں پہلی مرتبہ یہاں سے گزرا تھا تو یہاں کی عمارات سونے کی تھیں دوسری بار گزر ہوا تو یہی عمارات چاندی کی نظر آئیں مدت ہائے دراز کے بعد جب میرا گزر تیسری بار ہوا تو یہ خطہ زمین ویران ہے اور اینٹ پتھر کے مکان نظر آرہے ہیں۔

راجاؤں اور بادشاہوں کے ادوار گزرتے رہے۔ یہاں تک کہ نصیر الدین ہمایوں کا دورِ حکومت آیا۔ یہی وہ دور ہے جب ایک صاحبِ دل بزرگ نے اس بستی کو شرفِ اقامت عطا کیا۔ ان کی برکت اور ان کی اولاد کے کارناموں نے اس بستی کو تارے سے مہتاب بنادیا۔

شہنشاہ ہمایوں نے کمال خان کھوکھر کو ''کڑا'' کا گورنر مقرر کیا۔ یہ شخص نہایت ذی علم اور خداترس تھا۔ کمال خان کھوکھر دہلی سے کڑا آتو گیا لیکن یہ احساس اسے ہمیشہ ستاتا رہتا تھا کہ وہ اپنے پیرِ طریقت اور ان کے فیوض و برکات سے دور ہوگیا ہے۔ اسے یہ فکر کھائے جارہی تھی کہ پیرِ طریقت سے ملاقات سے محروم ہوگیا ہوں۔ اب اتنی حیثیت بھی ہے کہ ان کی خدمت کرسکتا تھا۔ وہ دہلی نہیں جاسکتا تھا انہیں تو ''کڑا'' میں بلاسکتا تھا۔

پیرِ طریقت حضرت اسماعیل فاروقی تھے جو یمن سے ہجرت کرکے آئے تھے اور اہلِ خانہ کے ساتھ دہلی میں سکونت اختیار کرلی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

کمال خان کھو کھر دہلی گیا۔ حضرت اسماعیل فاروقی اپنی خانقاہ میں مریدوں کے ساتھ بیٹھے تھے کہ کمال خان کی سواری خانقاہ کے سامنے پہنچی۔ خادم جب تک اطلاع دیتا کمال خان سرِ نیاز جھکائے خانقاہ میں داخل ہو چکا تھا۔ حضرت اسماعیل کے ہونٹوں پر تبسم آ گیا۔

''کمال خان مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ تمہارے چہرے پر اقتدار کا غرور نہیں ہے۔''

''حضرت اگر ہوتا بھی تو آپ کے رُو برو کہاں ہوتا۔''

''عہدِ ہمایوں یادگار رہے گا اس اعتبار سے کہ اس کے امیروں میں تم جیسا شخص بھی تھا۔ جس بستی کے تم حاکم بنے ہو کوشش کرنا کہ وہاں اہلِ علم کا طبقہ موجود ہو۔''

''اسی لیے تو آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ آپ کے قدموں کی برکت ہی سے تو وہ موضع آباد ہو گا۔''

''کبھی میں تمہاری شانِ امارت دیکھنے ضرور آؤں گا۔''

''میں تو کچھ اور سوچ کر آیا تھا۔''

''کہو کمال خان کیا بات ہے۔''

''حضرت میں کڑا جا کر آپ کے ارشادات سے محروم ہو گیا ہوں۔ اگر آپ کڑا تشریف لے آئیں تو مجھے آپ کی خدمت کا موقع مل سکتا ہے۔''

''اب ہجرت کا یارا نہیں۔ پھر یہاں جو لوگ ہیں وہ کب مجھے جانے دیں گے۔''

''اور میں آپ کو لیے بغیر نہیں جاؤں گا۔ یہ دہلی ہے۔ بڑا شہر ہے، تشنگانِ علم کی سیرابی کے لیے بہت سے دریا ہیں۔ بستی کڑا کو آپ کی ضرورت ہے۔''

اس نے حضرت اسماعیل فاروقی کو دوسری ہجرت کے لیے آمادہ کر لیا۔ وہ نہایت تزک و احتشام کے ساتھ انہیں کڑا لے کر آیا اور کڑا سے متصل ایک قطعہ اراضی شاہ صاحب کو مددِ معاش کے طور پر عطا کیا۔ اس زمین پر شاہ صاحب نے ایک موضع آباد کیا جو اسماعیل پور کے نام سے مشہور ہوا۔

حضرت اسماعیل کے آ جانے سے کڑا میں علم و فضل کا چرچا ہونے لگا۔

جب ان کا انتقال ہوا تو اسماعیل پور ہی میں آپ کا مزار مبارک تعمیر کیا گیا۔

حضرت اسماعیل کی اولاد میں بڑی بڑی نامور ہستیاں گزریں جنہوں نے کڑا کی مقبولیت میں اضافہ کیا۔ اس کی رونق الہ آباد کو آنکھیں دکھاتی تھی۔

وقت کروٹیں بدلتا رہا۔ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو گیا۔ علم و فضل کی گرم بازاری کی وہ حالت نہ رہی لیکن پھر بھی نامور ہستیاں پیدا ہوتی رہیں۔ زیادہ تعداد شاہ صاحب کی اولاد اور ان کی اولاد کی تھی۔

شاہ صاحب کا خاندان وقت کے ساتھ ساتھ دو شاخوں میں منقسم ہو گیا۔ ایک شاخ خاندان متولیان کے نام سے موسوم ہوئی۔ دوسری شاخ خاندان مولویان کڑا کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس شاخ کے اکثر افراد علمائے عصر میں شمار ہوئے۔

مولوی عبدالقادر اس خانوادۂ علم و فضل کے نمائندہ تھے۔ انہوں نے اپنے بیٹے امراللہ کی تعلیم و تربیت کا نہایت معقول انتظام کیا۔ کڑے میں اس وقت دینی تعلیم کا اچھا خاصا انتظام تھا۔ ہر طرف فارسی اور عربی کا غلغلہ تھا۔ امراللہ بھی اسی راہ لگ گئے۔

دینی تعلیم کی اہمیت اپنی جگہ لیکن زمانے کی روش اب تبدیل ہونے لگی تھی۔ زمیندار گھرانے کا تھا۔ دولت کی ریل پیل تھی طبیعت میں حسن پرستی تھی۔ پڑوس میں الہ آباد تھا اور الہ آباد بھی کیسا، ناچ گانے اور طوائفوں سے آباد۔ ایسا الہ آباد کسی بھی نوجوان کے لیے دل کھینچنے کو بہت تھا۔ یہاں کا مشہور وسیلۂ روزگار وکالت تھا۔ بڑے بڑے پائے کے وکیل یہاں موجود تھے۔ امراللہ کا جو دو ایک مرتبہ الہ آباد جانا ہوا تو پاؤں میں زنجیریں سی پڑ گئیں۔ کڑا کے علمی ماحول نے شاعر بنا دیا تھا۔ شاغل تخلص کر کے شعر بھی کہنے لگے تھے۔ ایک مرتبہ جو الہ آباد گئے تو ایک مشاعرے میں شرکت کا موقع ملا۔ اس مشاعرے میں ایک شاعر کے کلام نے انہیں مضطرب کر دیا۔ معلوم کرنے پر معلوم ہوا کہ موصوف مصحفی کے شاگرد ہیں۔ اس وقت مصحفی کی شاعری کے ڈنکے بجے ہوئے تھے۔ جی میں سمائی کہ مصحفی کی شاگردی کا شرف حاصل کیا جائے۔ مصحفی لکھنؤ میں تھے اور امراللہ الہ آباد میں۔ امراللہ نے ایک روز اپنی اب تک کی کہی ہوئی غزلیں سمیٹیں اور لکھنؤ پہنچ گئے۔

میاں کچھ سناؤ۔ مصحفی کی طرف سے تقاضا ہوا۔

بے قراری سے مری آہ وہ آگاہ نہیں
جس کا میں چاہنے والا ہوں اسے چاہ نہیں
یونہی ایامِ جدائی جو رہیں گے شاغل
ہے یقیں میں نہیں یا نالۂ جانکاہ نہیں

استاد نے شاگرد کی ذہانت کو بھانپ لیا۔ اصلاحِ سخن کا دروازہ کھل گیا۔ امراللہ واپس کڑا آ گئے لیکن سندِ شاعری ساتھ لائے۔ مصحفی کے شاگرد ہو کر آئے تھے۔ خود تو نہ اترائے لیکن قلم نے اترانا شروع کر دیا۔ ایسی ایسی غزلیں ظہور میں آئیں کہ کڑا اور الہ آباد میں شہرت ہو گئی۔ بہت سے شاعر یہاں موجود تھے لیکن شہرت شاغل کے حصے میں آئی۔

تعلیمی استعداد بڑھا کر وکالت کا امتحان پاس کیا اور الہ آباد میں وکالت کرنے لگے۔ ایسے کامیاب وکیل ثابت ہوئے کہ دور دور شہرت ہو گئی۔ لکھنؤ، کان پور، بنارس، اعظم گڑھ اور قرب و جوار میں شہرت کے جھنڈے گڑے تو دولت ماتا نے بھی گھر دیکھ لیا۔ امراللہ کی وکالت اتنے عروج پر تھی کہ ایک ایک دن میں سیکڑوں کی آمدنی ہوتی۔ آمدنی کی زیادتی، زمیندارانہ ذہنیت اور لوگوں کے مراسم نے یار باش بنا دیا۔ ہر وقت دوستوں کا جمگھٹا لگا رہتا۔

وسطِ شہر میں محلہ بوچڑ کی حویلی میں قیام تھا۔ جہاں احباب کی محفلیں جماتے اور شاعری کی محفلیں برپا کرتے۔ محلہ سرگنج قریب تھا۔ طوائفوں سے ربط ضبط رکھنا اس دور میں معیوب نہیں تھا۔ امراللہ ان گلی کوچوں میں نکل جاتے یا اپنے مکان ہی پر رقص و سرود کی محفلیں آراستہ کرتے۔ طوائفوں کی فرمائش پر غزل لکھ کر دیتے۔

دریا آباد اور دائرہ شاہ اجمل میں شعر و سخن کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں۔ اور جب ناسخ الہ آباد تشریف لے آئے تو گویا ان محفلوں میں جان سی آ گئی۔ آتش کے شاگرد جو الہ آباد میں موجود تھے ان کی ناسخ سے معرکہ آرائیاں شروع ہو گئیں۔ شاغل بھی ان معرکہ آرائیوں میں شامل رہے کیونکہ آتش بھی مصحفی کے شاگرد تھے اور شاغل بھی۔

☆☆☆

امراللہ شاغل جب ایک دن کڑا سے الہ آباد جانے لگے تو چھوٹا فرزند وحیدالدین ضد کرنے لگا کہ وہ بھی ان کے ساتھ الہ آباد جائے گا۔ ماں نے بہت سمجھایا کہ کہاں باپ کے ساتھ جاؤ گے۔ پڑھائی کا الگ حرج ہو گا لیکن وہ ضد پر اڑا ہوا تھا۔ چھوٹا تھا، باپ کو عزیز بھی بہت تھا۔ اس کی ضد دیکھی نہیں گئی۔ امراللہ نے اس کی ماں سے کہا اسے تیار کر دو۔ دو چار دن وہاں رہ لے گا۔ پھر چھوڑ جاؤں گا، ماں نے تیار کر دیا۔

وحیدالدین کی عمر اس وقت سات آٹھ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ خوشی خوشی تیار ہوا اور باپ کے ساتھ الہ آباد چلا آیا۔ بھونرے میں پلا تھا۔ کڑا سے باہر کبھی نکلا نہیں تھا اور پھر الہ آباد بڑا شہر تھا۔ یہاں کی رونق دیکھی تو خیال گزرا کہ شہر ایسے بھی ہوتے ہیں۔ باپ کے دوست آنا شروع ہوئے تو یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں۔ ابھی اس کی حیرتوں کے سامان مزید موجود تھے۔ شام ذرا ڈھلی تو باپ نے کہا، چلو تمہیں باہر لے کر چلتے ہیں۔

وہ یہی سمجھا ہو گا کہ بازار کی سیر کو لیے چلتے ہیں۔ وہ بازار ہی تھا لیکن یہ کیسے گھر تھے جہاں ہر گھر سے گانوں کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ اس کے باپ نے ایک دروازے پر دستک دی۔ اس گھر سے نہ جانے کیوں کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ پھر کسی نے دروازہ کھولا۔ وہ باپ کی انگلی تھامے تھامے اندر چلا آیا۔ جس شخص نے دروازہ کھولا تھا وہ باپ بیٹوں کو ایک بڑے سے کمرے میں بٹھا کر چلا گیا۔ وحید آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کمرے کی سجاوٹ کو دیکھ رہا تھا۔ دل میں سوچ بھی رہا تھا کہ یہ مکان کس کا ہے۔ ابا اسے کہاں لے آئے ہیں۔ کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ کمرے میں پڑے پردوں کو جنبش ہوئی اور ایک عورت جسے لڑکی کہنا زیادہ مناسب ہو گا کمرے میں داخل ہوئی اور بڑی ادا سے لچک دار سلام کیا اور سوال طلب نگاہوں سے وحید کی طرف دیکھا۔

''نصیبن، یہ میرا بیٹا ہے وحید۔ بڑی ضد کر کے الہ آباد آیا ہے۔ سوچا تم سے ملوانے لے آؤں۔''

''اس لیے آپ نے کہلوایا تھا کہ میں آج مجرا نہ کروں۔ صاحبزادے کو لانا تھا۔''

''جی ہاں، اور آپ نے میری لاج رکھی۔''

''اس امید پر کہ نقصان تو پورا کر ہی دیں گے۔''

''صرف نقصان پورا نہیں کروں گا منافع میں کچھ دوں گا بھی۔''

''مجھے معلوم ہے وہ غزل مکمل کر لی ہو گی جس کے لیے میں نے آپ سے گزارش کی تھی۔''

''درست اندازہ لگایا۔''

ایک ملازم خشک میوہ جات لے کر آ گیا تھا جو اس نے مہمانوں کے سامنے رکھ دیے۔

''نصیبن کیا اب ہماری اوقات یہ رہ گئی ہے۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

"یہ تو بچّے کے لیے ہے۔"

"ہماری روح کی بالیدگی کے لیے بھی تو کچھ فراہم کیجیے۔"

"مجھے معلوم تھا۔ ابھی جاکر سازندوں کو بھیجتی ہوں۔"

"ہماری قسمت میں صرف سازندے۔"

"بے قراری کاہے کی ہے۔ بندی کو یہ اجازت تو مرحمت فرمائیے کہ پیروں میں گھنگرو باندھ لے۔" نصیبن نے کہا اور جھپاک سے باہر چلی گئی۔

"ابا یہ عورت کون تھی۔"

"ابھی تم خود دیکھ لو۔"

"میں نے دیکھ تو لیا لیکن یہ معلوم نہیں کہ یہ ہیں کون۔ ہماری کوئی رشتے دار معلوم ہوتی ہیں اسی لیے تو آپ سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں۔"

وہ ابھی کچھ اور پوچھنے والا تھا کہ چھم چھم کی آواز نے اس کی توجہ پردے کی دوسری جانب مبذول کردی۔ پردے کو پھر جنبش ہوئی۔ وہی عورت پھر اندر داخل ہوئی۔ یہ آواز اس کے قدموں کی تھی۔ اس کے پیچھے پیچھے کچھ اور لوگ آئے جو مختلف ساز اٹھائے ہوئے تھے۔ وہ ایک طرف بیٹھ گئے۔ نصیبن چلتی ہوئی آئی اور وحید کے سامنے دوزانو بیٹھ گئی۔

"وحید میاں، آج آپ کے والد گرامی نہیں آپ ہمارے مہمان ہیں۔ فرمائیے ہم آپ کے حضور کیا پیش کریں، کیا سنیے گا۔"

نصیبن نے شرارت سے پوچھا تھا لیکن وحید تو ایسا سنجیدہ ہوگیا جیسے برسوں سے یہاں آتا رہا ہو اور یہ سوالات سنتا رہا ہو۔

"ہمارے کڑا میں ایک شاعر ہیں بشیر علی بشیرؔ۔ ان کا ایک شعر ہے وہ سنادیں۔

ہم پاؤں اٹھائے ہوئے صحرا میں چلیں گے
کانٹوں نے اگر بوجھ سنبھالا کفِ پا کا

نصیبن کی آنکھیں پتھر کی ہوگئیں لیکن پھر فوراً سنبھل بھی گئی۔

"ماشاءاللہ! اس ذوقِ سخن کے میں واری، میں صدقے۔ سچ کہا ہے بڑوں نے مچھلی کے جائے کو کون تیرنا سکھائے۔ وکیل صاحب، آثار بتارہے ہیں کہ ننھے میاں بڑے شاعر بنیں گے" پھر وحید سے مخاطب ہوئی "ہمیں بشیر صاحب کی تو کوئی غزل یاد نہیں۔"

"پھر آپ جانیں، جو آپ کا جی چاہے۔"

نصیبن اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور الٹے قدموں چلتی ہوئی سازندوں کے قریب جاکر بیٹھ گئی۔ سازندوں کو کچھ ہدایات دیں اور اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ کسی شاعر کی غزل اس کے ہونٹوں پر تھی اور پاؤں رقص میں تھے۔ کبھی دائرہ بناکر گھومتی کبھی اٹھکیلیاں کرتی ہوئی وحید تک آتی۔ اس کے گال پر ہلکی سی چٹکی لیتی اور پیچھے ہٹ جاتی۔

وحید بہ غور اس کی حرکات وسکنات کو دیکھ رہا تھا۔ اسے شاید یہ معلوم نہ ہو کہ اس عورت کو طوائف کہتے ہیں لیکن یہ معلوم تھا کہ جو کچھ وہ کررہی ہے اچھا کررہی ہے۔

وہ بڑے اشتیاق سے اس کے رقص کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی ایک ایک ادا اس کے دل میں اترتی جارہی تھی۔ اس نے ایک ایک کرکے کئی غزلیں سناڈالیں۔ وحید محویت سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ ہمیشہ یہاں بیٹھا رہے۔ اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہوئی۔ ساز تھم گئے رقص رک گیا۔ چمکنے والی بجلی اس کے قریب آکر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر باتیں ہوئیں اور پھر اس کے والد اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ اسے بھی اٹھنا پڑا۔

دوتین دن الہ آباد میں گزارنے کے بعد اس کے والد اسے کڑا لے آئے۔ عجیب یادیں تھیں جو وہ اپنے ساتھ لے کر واپس آیا تھا۔ اس نے آتے ہی اپنی والدہ سے نصیبن کا ذکر کیا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا انہیں کچھ معلوم نہیں ہوگا لیکن انہیں سب معلوم تھا۔ انہوں نے اس سے کچھ بھی نہیں کہا تھا لیکن اپنے شوہر سے ضرور کہا تھا کہ بچوں کو ایسی جگہوں پر لے کر نہ جایا کریں۔ جواب میں وہ مسکرادیے تھے۔

"اگر ان محفلوں میں نہیں بیٹھے گا تو مجلسی آداب سے کیسے واقف ہوگا۔ اٹھنے بیٹھنے کے طریقے بڑے بڑے شرفا ان محفلوں میں ہی سے سیکھتے ہیں۔"

"میں تو یوں کہہ رہی تھی کہ کچا ذہن ہے۔ ان خرافات میں پڑ گیا تو لکھنے پڑھنے سے بھی جائے گا۔"

"ارے لکھنے پڑھنے سے یاد آیا۔ اس کی پڑھائی کا بہت حرج ہوگیا ہے۔ کل اسے میاں جی کے پاس ضرور بھیج دینا۔ میں تو کل صبح ہی صبح الہ آباد کے لیے روانہ ہوجاؤں گا ورنہ خود چھوڑ کر آتا۔"

وحید فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کررہا تھا۔ اس کے استاد میاں جی بخشش علی تھے جو قصبے کے بڑے عالم و فاضل شخص تھے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس روز وہ میاں جی کے پاس پہنچا تو کچھ گم صم تھا۔ پڑھنے بیٹھا تو رہ رہ کر اسے الہ آباد یاد آرہا تھا۔ الہ آباد کی یاد آتے ہی نصیبن کا خیال آجانا لازمی تھا۔

چند روز اس کا یہی حال رہا اور پھر نصیبن کا خیال دل سے نکل گیا۔

ایک سال گزر گیا تھا کہ اس کے والد چند طوائفوں کو کڑا لے کر آئے اور مکان کے ایک حصے میں ٹھہرایا۔ ان میں نصیبن بھی شامل تھی۔ وحید کی یادیں پھر تازہ ہوگئیں۔

ایک بڑے میدان میں شامیانہ لگایا گیا تھا جہاں ان طوائفوں کو مجرا کرنا تھا۔ وحید کو ایک مرتبہ پھر موقع مل رہا تھا کہ وہ ان طوائفوں سے غزلیں سنتا اور رقص دیکھتا۔ قصبے کے تمام لوگ مجرا دیکھنے آئے تھے لیکن وحید جیسی محویت کسی میں نہیں تھی۔ یہ مجرے تین دن تک برپا رہے۔

طوائفیں وحید کے گھر میں ٹھہری تھیں لہٰذا اسے یہ موقع بھی مل رہا تھا کہ وہ تنہائی میں ان کے پاس جاکر بیٹھے اور ان سے باتیں کرے۔

اسے ان دنوں کوئی کام نہیں رہا تھا۔ کتابیں طاق میں رکھ کر ان عورتوں کے پاس بیٹھا رہتا تھا۔ جنہیں اب وہ طوائف کہنے بھی لگا تھا اور طوائف سمجھنے بھی لگا تھا۔

تین دن بعد یہ میلا اجڑا تو وہ اداس ہوگیا۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ پھر اپنی دنیا میں مگن ہوگیا۔

ایک دن کڑا میں مشاعرہ ہوا۔ وہ باپ کے ساتھ اس مشاعرے میں چلا گیا۔ یہ مشاعرے اس کے لیے نئے نہیں تھے لیکن اس رات جو مشاعرے سے لوٹا تو دل میں ایک امنگ سی اٹھی کہ وہ بھی ان شاعروں کی طرح شعر کہے جنہیں وہ مشاعرے میں سن کر آیا تھا۔ اس نے سوچنا شروع کیا۔ ذرا سی کوشش کے بعد ایک مصرعہ موزوں ہوگیا۔ شعر میں تو دو مصرعے ہوتے ہیں۔ اس نے ایک مصرعہ اور کہہ دیا۔ شعر مکمل ہوگیا۔ اس کی خوشی دیدنی تھی لیکن اس کی خوشی کو دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ سب لوگ سو رہے تھے۔ وہ اس شعر کو خود ہی گنگناتا رہا خود ہی سنتا رہا، اور پھر سو گیا۔

اب وہ گاہے گاہے کوئی نہ کوئی شعر موزوں کرلیتا تھا لیکن یہ خیال تک نہ آیا کہ ان شعروں کو اپنے پاس محفوظ کرتا رہتا۔ دن دن بھر شعر کہنا اور شعر کہتے کہتے سو جانا وحید کا مشغلہ ہوگیا تھا۔

بڑے بھائی زین العابدین جو اس سے عمر میں پانچ سال بڑے تھے، دینی علوم میں مکمل دستگاہ حاصل کرچکے تھے

سوانحی خاکہ

نام......وحید الدین
تخلص......وحید الہ آبادی
والد......امراللہ شاغل
مولد......کڑا ضلع الہ آباد
استاد......بشیر علی بشیر کڑادی، خواجہ حیدر علی آتش
وقتی قیام......لکھنو، الہ آباد، عظیم آباد
سن پیدائش......1822ء
وفات......9۔ اپریل 1892ء
تدفین......اسماعیل پور نزد کڑا ضلع الہ آباد

اور ان کا قصبے کے عالم و فاضل اشخاص میں شمار ہونے لگا تھا۔ انہوں نے وحید کی تعلیمی تربیت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ وہ اپنے استاد میاں جی بخشش علی کے پاس سے اٹھ کر بھائی کے پاس پڑھنے بیٹھ گیا۔ چھپ چھپ کر شعر بھی کہتا رہا۔

وہ بھائی کے پاس پڑھنے بیٹھ ضرور گیا تھا لیکن اس کے لیے مشکل تھا کہ وہ علم فقہ، حدیث، تفسیر اور تراجم کی دنیا میں کھو جاتا۔ اس کے حساس دل و دماغ نے اپنے والد کی رنگین زندگی کا وہ عروج دیکھا تھا کہ جس میں طوائفوں کے مجرے، مشاعروں کے غلغلے اور راگ رنگ کی محفلیں اپنی پوری جلوہ سامانیوں کے ساتھ منعقد ہوتی تھیں۔ ایسے میں شعر گوئی کے سوا اسے کچھ نہ سوجھا۔

اب وہ نوجوانی کی حدود میں داخل ہورہا تھا۔ عربی و فارسی میں مہارت تامّہ حاصل کرلی تھی۔ اس مطالعے سے ادب کی طرف کافی لگاؤ ہوگیا تھا۔ اب وہ تفسیر و حدیث کو چھوڑ کر والد کے ذاتی کتب خانے میں داخل ہوگیا۔ یہاں فارسی و عربی کتب کا ایک جہان آباد تھا۔ وہ ان کتب کے مطالعے میں مصروف ہوگیا۔ والد کے پاس ادبا و شعرا کا مجمع رہتا تھا۔ والد خود شاعر تھے۔ چچا بھی شاعر تھے، ان سب باتوں نے مل کر اسے باقاعدہ شاعر بنادیا۔

قصبے سے باہر دریا نہیں تھا، جنگل تھا اور کچھ پرانی حویلیاں۔ وہ ایک روز ٹہلتے ٹہلتے ادھر جانکلا۔ اسے مشق شعر گوئی کے لیے اچھا موقع مل گیا۔ طبیعت پر ذرا زور ڈالا تو کچھ شعر اس کے دامن میں آگرے۔

کچھ اس نے کہہ کے پھر مجھے دیوانہ کردیا
اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کردیا

وہ شب کو بے حجاب جو محفل میں آگئے
کیا نور تھا کہ شمع کو پروانہ کردیا
اس دل کی ہے بہار و خزاں اس کے ہاتھ میں
گلشن بنادیا کبھی ویرانہ کردیا
کیا میرے دل کے ساتھ کیا عشق نے سلوک
اِک آشنا تھا اس کو بھی بے گانہ کردیا

............☆.....☆............

فلک کا نہ رکھا زمیں کا نہ رکھا
تری عاشقی نے کہیں کا نہ رکھا
پھرایا جسے در بدر آسماں نے
اسے رفتہ رفتہ کہیں کا نہ رکھا
وحید ان کی الفت نے سب لطف کھویا
وہ ... رنگ آسمان و زمیں کا نہ رکھا

جب وہاں جاتے غزلیں کہتے۔ بہت دن ہوگئے تو تنہائی کاٹنے لگی۔ احباب کو بھی معلوم ہوگیا تھا کہ وحید کبھی بازار گھاٹ کبھی بندرا بن گھاٹ جاتے ہیں اور شعر کہتے ہیں۔ رفتہ رفتہ احباب بھی ان کے ساتھ جانے لگے۔ یہ احباب بھی شاعرانہ ذوق رکھتے تھے لہٰذا فی البدیہہ شعر کہنے کے مقابلے بھی ہونے لگے، کوئی مصرع تجویز کیا جاتا اور سب اس مصرع پر طبع آزمائی کرتے۔ اس سے نہ صرف مشقِ سخن بڑھی بلکہ غزلوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔

یہ محفلیں صرف شعر گوئی تک محدود نہیں تھیں بلکہ فنِ شعر پر بھی بحثیں ہوتیں۔ علوم و معارف کے دریا بہنے لگتے۔ کبھی شطرنج کی بساط بچھ جاتی، کبھی گنگا پار کرنے کی شرط لگتی۔ تیراکی کے مقابلے ہوتے۔

امر اللہ شاغل کی وکالت کا شہرہ عام تھا۔ انہوں نے اپنے بڑے بیٹے کی طرح وحید کو بھی وکالت کے پیشے سے منسلک کرنا چاہا تھا لیکن وحید کا ذہن وکالت کی طرف منتقل نہ ہوا۔ دولت کی افراط تھی اور فرصت ہی فرصت تھی۔ دن رات شعر گوئی کا شغل رہنے لگا۔

☆☆☆

وحید کے بڑے بھائی زین العابدین بھوپال کی ایک سرائے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس وقت تصوف کی کسی فارسی کتاب کا مطالعہ کررہے تھے کہ کوئی ایسا مقام آیا کہ بار بار پڑھتے اور سمجھنے کی کوششیں کرتے مگر سمجھ میں نہ آتا۔ اتفاق سے ایک شخص کپڑا بیچتا ہوا اُدھر سے گزرا۔ اس نے دیکھا کہ کوئی مسافر کسی ذہنی الجھن میں مبتلا ہے۔

"اے بھائی مسافر تمہیں کیا دشواری ہے۔" کپڑے والے نے پوچھا۔

"فارسی کی ایک کتاب کا مطالعہ کررہا ہوں۔ ایک مسئلہ ایسا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"اچھا پڑھو تو سہی کیا مسئلہ ہے۔"

"تم ٹھہرے پارچہ فروش، اس دقیق مسئلے کو کیا سمجھو گے۔ جاؤ اپنا کام کرو۔"

"آپ پڑھیں تو سہی۔ شاید میں آپ کی کچھ مدد کرسکوں۔"

آخر اس پارچہ فروش کے بے حد اصرار پر زین العابدین نے اس کے سامنے عبارت پڑھی۔ عبارت سن کر وہ شخص تھوڑا سا مسکرایا۔

"یہ کون سی مشکل ہے" پارچہ فروش نے کہا اور عبارت کی ایسی جامع تشریح کی کہ ایک ایک نکتہ سمجھ میں آگیا۔ اب تو زین العابدین کی آنکھیں کھل گئیں۔ سمجھ گئے کہ یہ کوئی عام پارچہ فروش نہیں ہے بلکہ پوشیدہ ولی ہے۔

"آپ کوئی ولی اللہ ہیں۔ آپ ہی کی تو مجھے تلاش تھی۔"

اس شخص نے بہت بہانے کیے لیکن زین العابدین نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا اور ان سے بیعت ہوگئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ صاحب عبدالقادر مدراسی ہیں اور یہیں بھوپال میں رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ذکر و فکر سے تعلق ہے۔ نہایت عالم و فاضل شخص ہیں۔ زین العابدین جب بھوپال سے رخصت ہونے لگے تو ان بزرگ کو بھی بہ اصرار "کڑا" لے آئے۔

کڑا آنے کے بعد زین العابدین نے کچھ اس انداز سے ان کا تعارف کرایا کہ خاندان مولویانہ اور قصبے کے دیگر افراد بھی ان بزرگ سے بیعت ہوگئے۔ بھائی کے کہنے پر وحید نے بھی ان کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔

پیرِ طریقت کو معلوم تھا کہ وحید کو شعر و شاعری سے بڑی رغبت ہے۔ کچھ زین العابدین نے بھی کہا کہ وحید شاعری میں پڑ کر کسی کام کے قابل نہیں رہا ہے۔ اسے اس راہ سے ہٹایئے۔ پیرِ طریقت نے ایک دن موقع دیکھ کر وحید کو بلایا اور سورۂ شعرا کی تفسیر کچھ ایسے انداز سے کی کہ وحید کو شاعری سے نفرت ہوگئی۔ سمجھ گئے کہ پیر صاحب کیا چاہتے ہیں۔ خاموشی سے اٹھے اور اپنی بیاض دریائے گنگا میں ڈال آئے۔

اس کے بعد ظاہر ہے شاعری بالکل ترک کردی۔ احتیاط کا یہ عالم ہوگیا کہ اکثر اوقات نثر میں بات کرنا چاہتے تو پہلے اسے تولتے کہ کہیں ان کی گفتگو منظوم تو نہیں۔

یہ خاموشی جبری تھی۔ طبیعت کی جولانی مجبور کرتی تھی کہ شعر کے قالب میں اظہار بیان کیا جائے۔ طبیعت مجبور کرتی تھی کہ شعر کہے جائیں۔ مرشد کا اشارہ تھا کہ شاعری ترک کردی جائے۔ 'ایمان مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر' والا معاملہ تھا۔

وحید نے اپنے ہونٹوں پر خاموشی کی مہر ثبت کرلی تھی۔ نہ قہقہے تھے نہ چہچہے تھے۔ احباب کا ساتھ چھوٹ گیا۔ دریا کی سیر کا لطف جاتا رہا۔ کہیں مشاعرہ ہوتا تو منہ لپیٹ کر پڑ جاتا کہ کہیں کوئی بلانے نہ آجائے۔ کہیں ملازمت تو تھی نہیں کہ دل بہل جاتا، فرصت میں تنہائی مارے ڈالتی تھی۔

ایک جگہ طرحی مشاعرہ ہوا۔ کچھ احباب دعوت نامہ لے کر اس کے پاس بھی آئے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ "اب میں کہاں اور مشاعرہ کہاں۔"

"آپ شاید ہمارے مشاعرے میں شرکت کو برا سمجھتے ہیں۔"

"ایسی بات نہیں بھائی بلکہ بات یہ ہے کہ میں نے شاعری ترک کردی ہے۔"

"شاعری کوئی اختیار کی چیز ہے جو آپ نے ترک کردی ہے۔ آپ ضرور بہانہ کررہے ہیں۔"

"بہانے کی سکت نہیں لیکن مرشد کا حکم بھی نہیں ٹال سکتا۔ ان کی اجازت نہیں ہے کہ میں شاعری میں اپنا وقت برباد کروں۔"

"اس طرح تو ہم ایک اچھے شاعر سے محروم ہوجائیں گے۔"

"شاید اسی میں میری کوئی بہتری ہو ورنہ مرشد حکم کیوں دیتے۔"

وہ لوگ مایوس و نامراد لوٹ آئے۔ اس رات وحید نے خود کو ایک بڑے کمبل میں لپیٹا اور مشاعرہ گاہ میں پہنچ گیا۔ جان بوجھ کر اتنی دیر سے گیا تھا کہ مشاعرہ شروع ہوجائے اور لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ رک جائے۔ وہ منہ چھپا کے ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ مرشد نے شاعری کرنے کو منع کیا تھا شعر سننے کو نہیں۔ سب اس کے جاننے پہچاننے تھے لیکن وہ اس وقت سب کے لیے اجنبی تھا۔ کسی کو

چند شاگردانِ وحید

اکبر الہ آبادی، بے نظیر شاہ، باقر عظیم آبادی، اکبر داناپوری، مبارک عظیم آبادی، احمد حسین عظیم آبادی، آصف عظیم آبادی، کمال عظیم آبادی، نجم عظیم آبادی، سید عظیم آبادی، لطیف حسین لطیف، باسط عظیم آبادی، فرحت عظیم آبادی، بشیر باڑھوی، ارشاد بہاری، شیر بہاری، امام عظیم آبادی، احمد عظیم آبادی، حمد کاکوی۔

نہیں معلوم تھا کہ کمبل کے اندر کون ہے۔

مشاعرہ ختم ہونے سے پہلے وہ اٹھا اور مکان سے باہر نکل آیا۔ اس رات اس کے اندر چھپے ہوئے شاعر نے بہت شور مچایا۔ کئی مصرعے ذہن میں آئے لیکن اس نے کوئی شعر موزوں نہیں کیا۔

اب کڑا میں ہونے والے مشاعروں میں کمبل میں چھپا ایک آدمی مسلسل نظر آنے لگا تھا۔ قصبہ کے ضعیف الاعتقاد لوگوں میں چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں کہ یہ ضرور کوئی ولی کامل ہے۔ اس سے ملاقات کی جائے۔ یہ کمبل پوش صرف مشاعروں میں نظر آتا ہے۔ اس کے بعد غائب ہوجاتا ہے۔

ایک مشاعرہ ہوا تو چند لوگ اس کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ وہ آیا اور ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ وہ لوگ آئے اور علیک سلیک کے بعد اس کے پاس بیٹھ گئے۔ انہیں دیکھ کر وحید کو کمبل سے منہ نکالنا پڑا۔ سب کے سب حیرت زدہ رہ گئے۔

"وحید یہ تم ہو۔"

"جو تم دیکھ رہے ہو وہی ہوں۔"

"لیکن اس حال میں۔"

"مرشد نے شاعری ترک کرنے کا حکم دیا تھا۔ اب یہ اور پوچھ لوں گا کہ شعر سننا کیسا ہے۔ بس جی نہیں مانا اور شعر سننے چلا آیا۔"

"آپ نے یہ کیا غضب کیا۔ ہم تو آپ کے کلام سے محروم ہوگئے۔"

"کیا کروں مرشد کا حکم ہے۔" وحید نے کہا اور اٹھ کر چلا آیا۔

یہ چرچا عام ہوا تو احباب نے سوچا وحید کے مرشد

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے بات کی جائے۔ انہی کے حکم پر وحید نے شاعری ترک کی ہے انہی کے حکم پر شاعری سے اپنا رشتہ بحال کرے گا۔"

ان احباب نے ایک وفد کی صورت میں شیخ عبدالقادر سے ملاقات کی اور وحید کی حالت کا شکوہ کیا۔

"حضرت، وحید ایسا شگفتہ مزاج، بذلہ سنج اور خوش وخرم شخص ان دنوں بالکل بجھ کر رہ گیا ہے۔ اس پر ایک سکوت طاری ہے۔ صرف اس لیے کہ آپ نے اسے شعر گوئی سے منع فرمادیا ہے۔ اگر یہی حال رہا تو ہم ایک ہونہار شاعر سے محروم ہو جائیں گے۔ وہ اگر شاعری نہیں کرے گا تو کبھی خوش بھی نہیں رہ سکے گا۔"

"ہم نے اسے منع نہیں کیا۔ سورۂ شعرا کی تفسیر ضرور سنائی تھی۔ شاعری کے نقصانات دیکھ کر اس نے خود ہی شاعری ترک کردی ہوگی۔ بہرحال ہم تمہارے دوست کو تم سے ملادیں گے، اب جاؤ۔"

ایک دن پیر صاحب نے اسے بلایا اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد اس سے فرمائش کی۔ "وحید میاں، تم تو شاعر ہو ذرا اپنا کوئی شعر ہمیں بھی تو سناؤ۔"

"حضرت میں نے شاعری ترک کردی ہے۔"

"کیوں بھئی۔"

"آپ نے جو سورۂ شعرا کی تفسیر بیان کی تھی اس کے بعد میں نے شاعری ترک کردی۔ میں یہی سمجھا تھا کہ آپ کا اشارہ ترکِ شاعری کی طرف ہے۔"

"ہم نے یہ بھی تو کہا تھا کہ شاعری مطعون ضرور ہے لیکن وہ شعرا بری الذمہ ہیں جو پاکیزہ شعر کہتے ہیں اور اپنے اعمال درست رکھتے ہیں۔ ہم دیکھیں تو سہی تمہاری شاعری کیسی ہے۔ کچھ سناؤ۔"

"آپ کا حکم ہے تو ایک شعر سن لیجیے۔ باقی تو میں فراموش کرچکا۔"

کونین کا دل جس پہ کہ نادیدہ فدا ہو
بے پردہ جو اس دم نظر آجائے تو کیا ہو

اس شعر کا سننا تھا کہ شیخ صاحب کو حال آگیا۔ کئی مرتبہ یہ شعر پڑھوا کر سنا اور فرمایا کہ تم شعر کہا کرو تمہیں حق پہنچتا ہے کہ شعر کہو۔

وحید نے یہ خوش خبری سنتے ہی فی البدیہہ شعر کہا۔

وحید اب خوف کیا ہے مجھ کو فردائے قیامت کا
کہ میرے ہاتھ میں آیا ہے داماں پیرِ کامل کا

اتنے دن کے سکوت کے بعد بولنے کی اجازت ملی تو طبیعت کی روانی نے سارے بند توڑ ڈالے۔ روزانہ دوغزلے سہ غزلے ہونے لگے۔ وہ پہلے کی طرح پھر ہمہ تن سخن ہوگیا۔ پچھلی غزلوں میں سے جو غزلیں یاد رہ گئی تھیں انہیں ایک کاپی پر اتار لیا۔ نئی غزلیں ایک ایک کرکے اترنے لگیں۔

وحدت کا رنگ کیوں نہ ہو ان شعروں میں وحید
تاثیر فیضِ مرشدِ کامل کی دل میں ہے

وہ شاعری کی طرف لوٹا تو کڑے کے لوگوں نے اس کے لیے ایک مشاعرہ منعقد کیا جس طرح کسی کے صحت یاب ہونے پر غسلِ صحت مناتے ہیں۔ اب اسے کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ شریک بھی ہوا اور غزل بھی پڑھی۔

ہوائے چمن تو نے تکلیف کیوں کی
میاں آپ چلنے کے ساماں میں ہم تھے
وہ کیا وقت تھا دیکھتے تھے جب ان کو
وہ کیا دن تھے جب کوئے جاناں میں ہم تھے
گلوں کی خرابی کا عالم نہ پوچھو
خزاں جن دنوں تھی گلستاں میں ہم تھے
وہ بھڑکانے کو تھے فقط شعلۂ غم
لگانے کو آگ اس دل وجاں میں ہم تھے
جو ہیں پاؤں میں آبلے ان سے پوچھو
ہمیں کیا خبر کس بیاباں میں ہم تھے

شاعری کی گرم بازاری تھی مشاعروں کا زور تھا۔ وہ ہر مشاعرے میں شریک ہو رہا تھا اور اب تو خاص الہ آباد سے بھی اس کے نام دعوت نامے آنے لگے تھے لیکن ابھی تک اس نے اپنے کلام پر کسی سے اصلاح نہیں لی تھی جبکہ اس زمانے کا دستور یہ تھا کہ کسی کو استاد کے بغیر شاعر ہی تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔ خود اپنے والد کی مثال سامنے تھی جو مصحفی کے شاگرد تھے۔ مصحفی کا انتقال ہو چکا تھا ورنہ شاید وہ انہی کی طرف رجوع کرتا۔ آتش تھے وہ لکھنؤ میں تھے۔ اس کے ذہن میں اچانک بشیر علی بشیر علوی کا نام آیا اور پھر جیسے جگنو سے چمکنے لگے، قصبہ کڑا کے وہ قادر الکلام اور استاد شاعر تصور کیے جاتے تھے۔ یہ نام اس کے لیے اس باعث جاذبِ نظر تھا کہ بشیر صاحب آتش کے شاگرد تھے اور آتش کو مصحفی سے شرفِ تلمذ تھا۔ اس طرح اس کا یہ شوق بھی پورا ہو رہا تھا کہ وہ سلسلہ مصحفی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس نے اپنے والد کو مصحفی و آتش کی شاعری کا پرستار دیکھا تھا بلکہ یہ بھی سنا تھا کہ اس کے والد نے ایک سہرے اور ایک غزل پر آتش سے اصلاح

بھی لی تھی۔ بشیر صاحب انہی آتش کے شاگرد تھے۔ وہ بشیر علی بشیر کی خدمت میں پہنچ گیا۔ بشیر صاحب کے لیے وہ اجنبی نہیں تھا۔ یوں بھی وہ نہایت خلیق انسان تھے۔ نہایت اخلاق سے ملے، کلام دیکھا تو یہ مشورہ بھی دیا کہ تمہارے کلام میں اصلاح کی گنجائش نہیں۔ کیوں مجھے تکلیف دیتے ہو۔ شعر تم صفائی سے نکالو گے نام میرا ہوگا کہ میں نے بنادیا۔ وحید بضد رہا تو انہوں نے اسے اپنی شاگردی میں قبول کرلیا۔

وحید ایک ایسے خاندان کا فرد تھا جہاں اخلاق وتمیز، مروت ومحبت کا سبق بچوں کو گھٹی میں پلایا جاتا تھا لہٰذا اس نے بشیر کی استادی کا نہ صرف زبانی اعتراف کیا بلکہ اپنے اشعار میں اس نام کو جگہ بھی دی۔

اب تم وحید واقف کس رنگ سے نہیں ہو
فیضِ بشیر سے یاں کہیے تو کیا نہیں ہے

اصلاح کا یہ سلسلہ محض چند دنوں ہی چل سکا۔ استاد نے شاگرد کی ذکاوت وذہانت دیکھ کر کہا اب بجائے میرے تم میرے استاد آتش لکھنوی سے اصلاح لیا کرو۔

آتش کی شاگردی خود اس کے لیے بھی اعزاز تھی لیکن مصیبت یہ تھی کہ آتش لکھنؤ میں تھے۔ استادی اور فنِ شاعری کے درجہ کمال پر پہنچ چکے تھے اور زندگی کے آخری ایام گزار رہے تھے۔

وحید نے بہت سوچا اور پھر ایک دن وہ لکھنؤ پہنچ گیا۔ اس کا حال وہی ہوا جب وہ اپنے بچپن میں والد کے ساتھ پہلی مرتبہ الہ آباد گیا تھا۔ لکھنؤ بانکوں اور نوابوں کا شہر۔ ہر صورت پر شاعر ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ وہ دو قدم چلتا تھا اور پریشان ہوتا تھا۔ یاالٰہی کیا تمام دنیا کے شاعر اسی شہر میں جمع ہوگئے ہیں۔ تانگے میں بیٹھا تو تانگے والا تک بندی کرتا چلا۔ سرائے میں ٹھہرا تو سرائے کا مالک باتیں کم کرتا تھا شعر زیادہ سناتا تھا۔ رات کو سونے کے لیے لیٹ رہا تھا کہ معلوم ہوا سرائے میں داستان گو آیا ہے۔ پہلے قصہ حاتم طائی سنائے گا پھر جس جس کو نیند آتی جائے گی وہ اٹھتا جائے گا۔ اس نے سوچا قصہ حاتم طائی کون سا نیا قصہ ہے لیکن پھر یہ سوچ کر جا بیٹھا کہ نئی جگہ ہے نیند تو آئے گی نہیں۔ قصہ سننے میں کیا مضائقہ۔ داستان گو نے قصہ آغاز کیا۔ ایسی زبان ایسا اندازِ بیان اس نے پہلے کا ہے کو سنا تھا۔ محاوروں کی قطار، لفظوں کی بوچھاڑ، قصہ وہی لیکن نیا انداز، وہ تو دنگ رہ گیا کہ کہانی اس طرح بھی سنائی جاتی ہے۔ آنکھوں سے نیند جاتی رہی، روح گنگناتی رہی۔

اعلان ہوا بس صاحبو باقی کل۔

اسے اٹھنا پڑا لیکن یہ سوچتا ہوا اٹھا کہ آج یہاں نہ آیا ہوتا تو بہت نقصان ہو جاتا۔ وہ کچھ دیر جاگتا رہا اور پھر نیند اس کے قریب آکر کھڑی ہوگئی۔ صبح سو کر اٹھا اور سرائے سے نکل کر ایک تانگے والے کے پاس جا کر کھڑا ہوگیا۔ شہر میں کون تھا جو حیدر علی آتش کے مکان سے ناواقف ہو۔ تانگے والے نے اسے آتش کے مکان پر پہنچا دیا۔ ایک عجیب قسم کی اداسی تھی جو آتش کے مکان کے سامنے پہرا دے رہی تھی۔ وہ تو یہ سوچ کر آیا تھا کہ آتش کے گھر جا رہا ہے وہاں تو ہاتھی جھوم رہے ہوں گے لیکن یہاں تو چند درویش نما آدمی گھوم رہے تھے۔ انہی میں سے ایک نے بتایا کہ یہ جو دائیں طرف چھپر پڑا ہے یہی آتش کا مردانہ ہے۔ وہیں چلے جایئے ان سے ملاقات ہو جائے گی۔ وہ اس طرف چل دیا۔ آتش وہاں موجود تھے۔ کچھ لوگ ان کے پاس بیٹھے تھے۔

"حضرت میں قصبہ کڑا الہ آباد سے آیا ہوں۔"

"زہے نصیب کہ آپ نے اس فقیر کو عزت بخشی۔"

"میں آپ کے ایک شاگرد بشیر علی بشیر کا شاگرد ہوں۔"

"میاں نصیبوں والے ہو جو اُن کی شاگردی ملی

مالک رام

مولوی وحید الدین وحید خلف مولوی امر الدین، کڑا ضلع الہ آباد کے رہنے والے تھے نہایت عالی اور باوقار خاندان کے نام لیوا تھے۔ شیخ بشیر علی بشیر کے شاگرد تھے اور اپنے زمانے کے اساتذہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ اکبر الہ آبادی انہی کے نامور شاگرد تھے۔ وحید کی موت نہایت افسوس ناک طور پر ہوئی۔ ان کے گھر میں آگ لگ گئی۔ یہ دوڑ کر باہر نکلے۔ یہاں پہنچ کر اپنا دیوان یاد آیا۔ اسے بچانے کے لیے واپس گئے اتنے میں مکان میں اتنا دھواں بھر چکا تھا کہ انہیں باہر نکلنے کا راستہ نہ سوجھا۔ جب بعد میں لوگ تلاش کرتے ہوئے آئے تو دیکھا کہ آپ ایک کرسی پر بیٹھے ہیں۔ دیوان کی بیاض ہاتھ میں ہے اور جاں بحق ہو چکے ہیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہے۔"

"انہوں نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔"

"کس واسطے۔"

"ان کا فرمانا ہے کہ میرے کلام کو آپ دیکھ لیا کریں۔"

"میاں اب ہم دیکھنے کے لائق کہاں رہے۔ مدت ہوئی بینائی جاتی رہی۔ ہم تو اپنے بیٹے کا سہرا نہیں دیکھ سکے تمہارا کلام کیا دیکھیں گے۔"

وحید کے لیے یہ انکشاف تھا کہ آتش کی بینائی جاتی رہی ہے۔ پھر اس نے سوچا وہ دیکھ نہیں سکتے سن تو سکتے ہیں۔

"حضرت میں تو فقط یہ چاہتا ہوں کہ میرے کلام پر آپ کا قلم لگ جائے۔ میرا شمار آپ کے شاگردوں میں ہو۔ میں آپ کو غزل سنا دیا کروں گا۔ آپ جو اصلاح فرمائیں گے اپنے قلم سے لکھ لوں گا۔ جس شعر کو کہیں گے اپنے قلم سے کاٹ دوں گا۔"

"ہاں اب تو یہی رہ گیا ہے۔" آتش نے مایوسی سے کہا اور غزل سنانے کی اجازت دے دی۔

وہ اپنے ساتھ بیاض لایا تھا، ایک غزل نکالی۔

کسی آئینے سے وہ دور ہے کسی آئینے کے حضور ہے
کہیں اک جہان سرور ہے کہیں لاکھ عالمِ نور ہے
کہیں محو حسن و جمال خود کہیں وجد و صاحبِ حال خود
کہیں شغل فکر و خیال خود کہیں شان غیب و حضور ہے
کہیں مضطرب ہے وہ چاہ میں کہیں منتظر ہے وہ راہ میں
کہیں آپ اپنی نگاہ میں کہیں وہ سمجھ سے بھی دور ہے
کہیں بیم و خوف و ہراس ہے کہیں وہ امید ہے آس ہے
کہیں شکل حسرت و یاس ہے کہیں درد و غم کا وفور ہے
جو وحید نام پہ مٹ گیا وہی جانتا ہے یہ ماجرا
کہ جو پہلے نورِ قدیم تھا بس اسی کا سب یہ ظہور ہے

"سبحان اللہ"! آتش کے منہ سے بے اختیار نکلا۔" ہم سمجھیں گے ایک لائق شاگرد ہمیں نصیب ہوا۔ ایک غزل اور سناؤ۔"

وحید نے حکم کی تعمیل کی۔

منزل کا شوق آپ ترا ہوگا رہنما
چلنا جو ہو تو پھر نہ پتا پوچھ یار کا
کیا میکدہ ہے عشقِ حقیقت میں یار کا
بے خود کا جو ہے حال وہی ہوشیار کا
کیا محو عشق ہوں مجھے اتنی نہیں خبر
فرقت کی شب ہے روز ہے یا وصل یار کا

ارشاد ہوا کچھ اور سناؤ۔ وحید نے چند شعر اور سنا دیے۔

وہ مے پلانے کا جس دم ارادہ کرتے ہیں
نگاہِ مست سے مشتاق بادہ کرتے ہیں

عجیب ظرف کے وہ لوگ ہیں زمانے میں
جو حوصلے سے محبت زیادہ کرتے ہیں

جدھر کو دیکھتے ہیں کچھ کمی محبت کی
نگاہِ یاس اُدھر ہم زیادہ کرتے ہیں

جفا و ظلم ہو یا اب شکایتیں ہوں وحید
غرض وہ مجھ پہ عنایت زیادہ کرتے ہیں

آتش وہ شاعر تھے جنہوں نے کہا تھا" آتش کبھی ہے تو نے غزل عاشقانہ کیا" لکھنوی شاعری کے برعکس صوفیانہ چاشنی بھی ان کے کلام میں موجود تھی۔ وحید کے کلام میں بھی جب یہ دونوں خوبیاں انہوں نے دیکھیں تو متاثر ہونا لازمی تھا۔ پے در پے کئی غزلیں سن ڈالیں۔ آخر استاد تھے، کہیں کہیں ٹوکتے بھی رہے۔ اس ٹکڑے کو یوں کرلو۔ اس لفظ کو بدل دو۔ یہ مصرع کاٹ کر دوسرا کہو۔ وحید اپنے قلم سے ان کی اصلاحیں لکھتا رہا۔

"میاں تم ٹھہرے کہاں ہو۔"

"قریب کی ایک سرائے میں۔"

"پھر ٹھیک ہے۔ تمہارے کلام سے جی بھرا نہیں مگر اب دماغ نہیں کہ مزید سنیں جب تک لکھنؤ میں ہو تمام غزلیں سنا ڈالو۔ اب روز روز تو کڑا سے آنے سے رہے۔ جب کچھ نئی غزلیں کہہ لو تو پھر آجانا۔ ابھی تک کی جو غزلیں ہیں وہ دو چار دن میں سنا دو۔"

اس نے تسلیمات عرض کی اور پیدل ہی سرائے کی طرف چل دیا۔ مقصد یہ تھا کہ ذرا بازار کی سیر بھی ہو جائے۔ وہ دکانوں کی سج دھج دیکھتا ہوا سرائے تک آگیا۔

دوسرے دن وہ پھر آتش سے ملنے ان کے مکان پر پہنچ گیا۔ چند غزلوں پر مزید اصلاح ہوگئی۔

اسے دوست بنانے میں ملکہ حاصل تھا۔ ایک ہفتہ لکھنؤ میں گزارہ تو کئی شاعر اس کے دوست بن گئے۔ جس روز وہ کڑا جانے کی تیاری کر رہا تھا اسی دن اس کے ایک دوست نے اسے ایک مشاعرے کی نوید سنائی۔ اسے جانے کی جلدی تھی۔ مشاعرہ شروع ہونے تک رک نہیں سکتا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

دوست مخلص تھا۔ دل سے چاہتا تھا کہ وحید کا تعارف ہو جائے اور مشاعروں کے بہانے اس کا لکھنؤ آنا جانا لگا رہے۔

یہ مشاعرہ ایک دولت مند بیگم صاحبہ کے گھر تھا۔ وہ شاعروں کو نوازتی بھی تھیں اور ان کے گھر اکثر مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ وہ وحید کو مشاعرہ شروع ہونے سے قبل ہی بیگم صاحبہ کے دولت کدے پر لے گیا۔ بیگم صاحبہ ایک پردے کے پیچھے بیٹھی ہوئی تھیں۔ دوست شاعر نے وحید کے کلام کی بے حد تعریف کی۔ یہ تک کہا کہ آتش جیسے شاعر نے ان کے کلام پر داد دی ہے۔ ساتھ میں یہ گزارش بھی کی۔

"یہ دیہات کے رہنے والے ہیں چونکہ واپس جانے والے ہیں مشاعرے میں شرکت نہیں کر سکتے۔ آپ ان کا کلام سن لیں تاکہ انہیں آیندہ مشاعرے میں بلایا جا سکے۔ آپ دیکھیں گی کہ اس پائے کا شاعر لکھنؤ میں بھی ملنا مشکل ہے۔"

بیگم صاحبہ نے پردے کے پیچھے سے کہا۔ "مجھے کلام سننے کی فرصت نہیں۔ میں ایک مصرع دیتی ہوں یہ اس پر مصرع لگائیں، کلام کا اندازہ خود ہو جائے گا۔"

بیگم صاحبہ نے مصرع دیا۔

"دور سے آئے ہیں مشتاق تماشا ہوکر"

وحید نے برجستہ کہا۔

"ہم سے پردہ نہ کرو شاہد رعنا ہوکر"

مصرع سننا تھا کہ بیگم صاحبہ نے پردہ الٹ دیا اور سامنے آگئیں۔

"ان کا کلام واقعی سننے کے لائق ہوگا۔ اب ہمارے پاس وقت ہی وقت ہے۔ جتنا کلام چاہو سناؤ۔"

"بیگم صاحبہ، اب میرے پاس وقت نہیں ہے۔ غریب قصباتی ہوں مجھے اپنے گھر بھی جانا ہے۔"

"چند شعر تو عنایت کرتے جائیے تاکہ ہم آیندہ مشاعرے تک انہیں دہراتے رہیں۔"

"آپ ضد کرتی ہیں تو میں حاضر ہوں۔ چند اشعار سن لیجیے۔"

"صرف چند اشعار؟"

"بلکہ صرف دو اشعار، پھر کبھی لکھنؤ آنا ہوا تو یہ کمی پوری کر دوں گا۔"

وحید نے شعر پڑھا۔

ہم نے جب وادیِ غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

ماہر القادری

حضرت وحید الہ آبادی مرزا غالب کے خردسال ہم عصر تھے۔ افسوس ہے شاعری میں جس شہرت کے وہ مستحق تھے اتنی شہرت انہیں نہیں ملی۔ یہ مشہور شعر

ہم نے جب وادیِ غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

جو اردو زبان میں ضرب المثل بن چکا ہے وحید الہ آبادی کا ہے۔ تقسیم ہند سے قبل اس شعر کو پڑھ پڑھ کر خیالی طور پر لطف لیا کرتے تھے مگر تقسیم ہند کے بعد یادِ وطن ہمیں بھی دور تک سمجھانے کو آئی اور وادیِ غربت بھی ہم نے دیکھ لی۔ عملی تجربہ اور ذاتی مشاہدے کے بعد اس شعر کو پڑھتے ہیں تو اس کی تاثیر اور لطف کو صحیح طور پر محسوس کرتے ہیں۔ جناب اکبر کو حضرت وحید الہ آبادی جیسے عظیم شاعر کی شاگردی اور تربیت کے مواقع میسر آئے۔ شاگرد کی طرح استاد بھی خوش قسمت تھے جن کو ایسا شاگرد ملا جسے قوم نے لسان العصر کا خطاب دیا۔

شعر کا سننا تھا کہ بیگم صاحبہ پر وجد سا طاری ہوگیا۔ ایک نہیں کچھ نہیں تو دس بار اس شعر کو سنا اور ہر بار اپنا سر دھنتی رہیں۔ ذرا کچھ ہوش آیا تو وحید دوسرا شعر پڑھ رہا تھا۔

آج پھر شہر کے کوچے نظر آتے ہیں اداس
کس طرف لے گئی وحشت ترے دیوانے کو

اس شعر پر بھی بیگم صاحبہ کا وہی حال تھا۔

وحید اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

"اب مجھے اجازت دیجیے۔ دو شعروں میں دو غزلوں کا وقت ضائع ہوگیا۔"

"واقعی کمال کے شاعر ہو۔ ہم تم سے التجا کریں گے کہ آج کے مشاعرے کے لیے رک جاؤ۔ رات ہماری مہمانی میں رہو صبح ہوتے ہی رخصت ہو جانا۔"

وہ شاید رک بھی جاتا لیکن بیگم کی طرف سے ابھی خفگی دور نہیں ہوئی تھی۔ اشعار سننے سے پہلے انہوں نے جس خفگی کا مظاہرہ کیا تھا وہ اسے یاد تھا۔ اب اپنی اہمیت جتانے کا وقت تھا۔ اس نے اجازت چاہی اور وہاں سے نکل آیا۔

☆☆☆

انتخابِ کلام

نقشِ پا کہتے ہیں چھٹ چھٹ کے قدم سے ان کے
ہم رہے جاتے ہیں اور آپ چلے جاتے ہیں

..........☆......☆..........

رنج فرقت کی کون دے گا داد
اس فسانے کو آپ ہی سے کہوں

..........☆......☆..........

عشق کا نام لیا ہے تو ہو بہتر انجام
اب تو بدنام نہ ہونے میں بھی رسوائی ہے

..........☆......☆..........

جب خدا سے شرم آتی ہی نہیں وقتِ گناہ
دیدۂ انساں سے انساں کو حجاب آیا تو کیا

..........☆......☆..........

محبت بھی ہوا کرتی ہے دل بھی دل سے ملتا ہے
یہ سب ہوتا ہے لیکن آدمی مشکل سے ملتا ہے

..........☆......☆..........

فقط اظہارِ الفت سے ہوئے وہ جان کے دشمن
اسی قصے کو ان سے اور پیرائے میں کہنا تھا

..........☆......☆..........

مٹھیوں میں خاک لے کر دوست آئے وقتِ دفن
زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے

..........☆......☆..........

کس قدر ہے عاجزی درگاہ میں اس کی پسند
سنتے ہیں ٹوٹا ہوا دل ہے مقام اللہ کا

..........☆......☆..........

وقت مجھ پر دو کٹھن گزرے ہیں ساری عمر میں
اک ترے آنے سے پہلے اک ترے جانے کے بعد

..........☆......☆..........

جو ہیں پاؤں میں آبلے ان سے پوچھو
ہمیں کیا خبر کس بیاباں میں ہم تھے

..........☆......☆..........

کڑا میں دریا کے کنارے ایک سنسان عمارت تھی۔ وحید ضروری کاموں سے نمٹ کر اس عمارت میں جا بیٹھتا تھا۔ دنیاوی جھمیلوں سے دور امن وعافیت کے ساتھ شعر کہنے میں مشغول ہو جاتا تھا جیسے کوئی صوفی عبادت کے لیے جنگل کی راہ لے۔ اس دن بھی اس کا قلم الہامی قطروں کو اشعار کا روپ دے کر کاغذ پر اتار رہا تھا کہ بستی کے کچھ لوگ اسے ڈھونڈتے ہوئے آئے۔

''لکھنؤ سے کوئی بیگم صاحبہ تام جھام میں سوار آئی ہیں۔''

''آئی ہیں تو چلی بھی جائیں گی۔ مجھے بلانے کیوں چلے آئے۔''

''وہ آپ ہی سے تو ملنے آئی ہیں۔ آپ کے زنانے میں بیٹھی آپ کی منتظر ہیں۔''

''مجھ سے ملنے آئی ہیں؟ مگر یہ کون ہو سکتی ہیں۔'' پھر اسے خیال آیا یہ وہی بیگم صاحبہ ہو سکتی ہیں جو لکھنؤ میں ملی تھیں۔ لیکن وہ کڑا کیوں آئی ہیں۔ چل کر دیکھتا ہوں۔ اس نے بکھرے ہوئے کاغذات سمیٹے اور گھر چلا آیا دیکھا تو وہی تھیں اور اماں کے پاس بیٹھی تھیں۔

''وحید ہمارے مکان پر ماہانہ مشاعرہ ہے۔ ہم تمہیں مدعو کرنے خود چل کر آئے ہیں۔ اس باعث کہ تم انکار نہ کر دو۔''

''آپ اگر اپنے کسی ملازم کو بھیج دیتیں تو بھی میں انکار نہ کرتا۔ آپ کی زحمت سر آنکھوں پر۔''

''اس مشاعرے میں لکھنؤ بھر کے شعرا جمع ہوں گے۔ تعارف کا اچھا موقع ہے۔ آیئے گا ضرور۔''

''میں شہرت وناموری سے بے نیاز ہوں لیکن آپ کے حکم کے بموجب شرکت ضرور کروں گا۔ اس بہانے اپنے استاد سے بھی ملاقات کر لوں گا۔''

''کچھ رقم زادِ راہ کے لیے اپنے ساتھ لائی تھی۔''

''اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں تو اپنے کام سے لکھنؤ آ رہا ہوں۔ غزلیں جمع ہو گئی ہیں استاد کو دکھا لوں گا۔''

بیگم صاحبہ کچھ دیر بیٹھ کر رخصت ہو گئیں لیکن بستی میں دھوم مچ گئی کہ اب وحید اتنا بڑا شاعر ہو گیا ہے کہ لکھنؤ سے اس کے لیے بلاوے آتے ہیں۔

دوسرے دن وہ کنارِ دریا اسی سنسان عمارت میں پہنچ گیا جو اس کی ''مشق گاہ'' تھی۔ بیگم صاحبہ کا دیا ہوا طرحی مصرع اس کے سامنے تھا۔

''آجاؤ تم بھی جانِ چمن آ گئی گھٹا''

اسے اپنی ذمہ داری کا احساس تھا۔ اسے غزل کہنی تھی اور لکھنؤ جیسے شہر میں پڑھنی تھی۔ وہ کچھ دیر ٹہلتا رہا پھر بیٹھ گیا۔ اٹھ کر پھر ٹہلنے لگا۔ پھر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر آنکھیں بند کر کے سوچتا رہا۔ پھر جیسے دریا بند توڑ کر باہر آ گیا۔ کاغذ پر مولسری کے پھولوں کے ڈھیر لگ گئے۔ یہ وہ اشعار تھے جو وہ کہتا جا رہا تھا۔

چلتے ہیں ہم بھی سوئے چمن چھا گئی گھٹا
ساقی شراب لے کے پہنچ آ گئی گھٹا
جلوہ جو اگلے لطف کا دکھلا گئی گھٹا
بجلی کے ساتھ داغ بھی چمکا گئی گھٹا
پانی برس چکا تھا ابھی خوب باغ میں
دورِ شراب دیکھ کے پھر آ گئی گھٹا
اس سال آ کے دیکھیے کرتی ہے کیا سلوک
اگلے برس تو خوب سا رلوا گئی گھٹا
اب بھی نہ مے کشی کا کروں شغل اے وحید
آئی بہار، پھول کھلے، چھا گئی گھٹا

وہ اس سنسان عمارت سے نکلا تو اس کی جیب قیمتی سکوں سے بھری ہوئی تھی۔ غزل مکمل ہو گئی تھی۔ اب اسے ایک ہفتے بعد لکھنؤ جانا تھا۔

وہ لکھنؤ پہنچا تو اسی سرائے میں اترا جہاں پہلے ٹھہرا تھا۔ سامان سرائے میں رکھا اور استاد آتش کے مکان پر پہنچ گیا۔ تازہ غزل پر اصلاح لی جو اسے اسی رات مشاعرے میں پڑھنا تھی۔ اس کے بعد چند غزلیں اور خدمتِ استاد میں بہ غرض اصلاح پیش کیں۔ پیش کیا کیں، استاد کو سنائیں، کہیں کہیں قلم لگا اور مہرِ اصلاح ثبت ہو گئی۔

رات ہوئی تو سرائے میں کچھ لوگ اسے لینے کے لیے آ گئے۔ وہ بیگم صاحبہ کے دولت کدے پر پہنچا تو لکھنوی شعرا بڑے جمائے بیٹھے تھے۔ استادوں کی ٹولیاں تھیں جو اپنے اپنے شاگردوں کے ساتھ جمی ہوئی تھیں۔ وہ اکیلا ایک طرف بیٹھ گیا۔ اس کا نہ کوئی استاد تھا نہ شاگرد، کئی لوگوں نے اس کی طرف دیکھا اور اجنبی سمجھ کر چپ ہو رہے۔ مشاعرے کا آغاز ہوا تو وہ لکھنؤ کے لوگوں کی سخن فہمی کا قائل ہو گیا۔ ایک ایک لفظ پکڑ کر داد دی جا رہی تھی۔ اسے بھی یقین ہو گیا کہ اس کے کلام کی قیمت وصول ہو گی۔ جب شمع سخن اس کے سامنے آئی اور لوگوں کو معلوم ہوا کہ تو وارد شاعر قصبہ کڑا سے آیا ہے تو چہروں پر معنی خیز تبسم دوڑ گیا لیکن دوسرے ہی

انتخابِ کلام

ہم نے جب وادیِ غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

..........☆......☆..........

پڑے ہیں صورتِ نقشِ قدم نہ چھیڑ ہمیں
ہم اور خاک میں مل جائیں گے اٹھانے سے

..........☆......☆..........

دل میں وہی کھٹک نظر آتی ہے آج تک
ہم جانتے تھے خارِ تمنا نکل گیا

..........☆......☆..........

دل تھام لوں ہاتھوں سے وحید اپنا ذرا میں
یوں نام نہ لے بیٹھو فی الفور کسی کا

..........☆......☆..........

رخصت کی سناتے ہو دہلتا ہے مرا دل
تم ہاتھ سے دیکھو تو اچھلتا ہے مرا دل

..........☆......☆..........

اس دم تو پتا پوچھتے پھرتے ہیں کسی کا
پوچھیں گے کوئی دم میں وحید اپنا نشاں ہم

..........☆......☆..........

جہاں سے جلوہ نما ہے خیال آمدِ یار
چلے گئے ہیں وہیں آج انتظار میں ہم

..........☆......☆..........

میں کب سے پوچھ رہا ہوں شراب ہے کہ نہیں
کچھ اس سوال کا ساقی جواب ہے کہ نہیں

..........☆......☆..........

آ گئے آپ، میں کہتا تھا کوئی آتا ہے
آج کچھ دل کو مرے صبح سے بے تابی تھی

..........☆......☆..........

WWW.PAKSOCIETY.COM

لمحے توجہ اس کی طرف مبذول ہوگئی کیونکہ تعارف کرانے والا یہ بھی بتا رہا تھا کہ وحید الدین وحید خواجہ حیدر علی آتش کا شاگرد ہے۔ آتش ہر ایک کو شاگرد نہیں بناتے تھے۔

وحید نے مطلع ہی پڑھا تھا کہ داد کے ڈونگرے برسنے لگے۔ وہ تو یہ سمجھا کہ سب مل کر اس کا مذاق اڑا رہے ہیں لیکن مطلع کئی مرتبہ دہرانے کے بعد جب اس نے دوسرا شعر پڑھا تو داد کی آواز کچھ اور تیز ہوگئی۔ تیسرے شعر پر مکمل خاموشی تھی۔ چوتھا شعر سبحان اللہ کے شور میں ڈوب گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا جو شعر داد کے قابل تھا اسی پر داد مل رہی تھی۔

اس نے داد و تحسین کے شور میں غزل مکمل کی۔ طرحی مشاعرہ تھا ورنہ شاید کئی غزلیں اسے سنانی پڑتیں۔ دوسرے دن کا سورج طلوع ہوا تو اس کی غزل لکھنؤ میں گردش کر رہی تھی۔

وحید نے سرائے کا بستر ابھی چھوڑا بھی نہیں تھا کہ بیگم صاحبہ کا بلاوا آگیا۔ انہوں نے اسے ناشتے پر بلایا تھا۔ اسے یہ قطعی اچھا نہیں لگا تھا لیکن ان کا اصرار تھا اور اسے استاد کی خدمت میں بھی پہنچنا تھا لہٰذا مجبور ہوگیا۔ بیاض اٹھائی اور ملازم کے ساتھ ہولیا۔

بیگم صاحبہ نے ناشتے کا اچھا خاصا اہتمام کرلیا تھا۔ خود بھی بناؤ سنگھار سے تیار تھیں۔ اپنی عمر سے قدرے کم لگ رہی تھیں۔ یوں بھی وہ جوانی میں بیوہ ہوگئی تھیں۔ خود شاعرہ نہیں تھیں لیکن ذوقِ شاعری بے پناہ تھا۔ اس شوق کی تسکین کے لیے مشاعرے برپا کرتی تھیں۔ فیاض تھیں لہٰذا بہت سے غریب شاعروں کی مالی امداد کرتی تھیں۔ تنہا رہتی تھیں لیکن پاکبازی کی شہرت تھی۔

"وحید جب تک میں کڑا نہیں گئی تھی سوچتی تھی تمہیں ملازم رکھ کر تم سے فارسی پڑھوں گی لیکن تم کھاتے پیتے خاندان کے فرد ہو یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔"

"بیگم صاحبہ، میں تو ملازم ہوئے بغیر آپ کو فارسی پڑھا دیتا لیکن میں کڑا میں ہوں آپ لکھنؤ میں۔"

"تو لکھنؤ آ کر رہ لیجیے۔ اتنا بڑا مکان خالی پڑا ہے۔"

"کبھی لکھنؤ آنا ہوا تو ضرور ٹھہروں گا۔"

"آنا ہوا کیا مطلب۔ ابھی جا کر سرائے سے سامان لائیے اور جب تک لکھنؤ میں ہیں یہیں رہیے۔ میرے ہوتے ہوئے آپ سرائے میں رہیں مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

"ابھی تو مجھے استاد کی طرف جانا ہے۔"

"ہمیں شاگردی کا شرف کب بخشیں گے۔"

"آپ شاعری کب فرماتی ہیں۔"

"آپ کا ساتھ رہا تو شاعری بھی کرنے لگیں گے۔ آپ کسی بہانے لکھنؤ آ کر رہنے لگیں۔ قسم سے ہم آپ کو چاہنے لگے ہیں۔" وحید جوان بھی تھا رنگین مزاج بھی لیکن بیگم صاحبہ کی باتیں اسے پریشان کر رہی تھیں۔ وہ اس وعدے کے ساتھ اٹھ گیا کہ سرائے سے اپنا سامان لے آئے گا۔

آتش کے گھر کی طرف جاتے ہوئے اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ آج ہی کڑا واپس چلا جائے گا یا پھر کسی دوسری سرائے میں منتقل ہوجائے گا جہاں بیگم صاحبہ اسے تلاش نہ کرسکیں۔

استاد کی خدمت میں حاضری دی۔ چند غزلیں سنائیں چند مشورے لیے اور وہاں سے اٹھ گیا۔ آتش کے گھر سے واپسی میں وہ "چوک" کی طرف سے گزرا۔ یہ لکھنؤ کا بازارِ حسن تھا۔ دو رویہ طوائفوں کے مکانات تھے۔ دن کا وقت تھا اس لیے بازار میں بھیڑ نہیں تھی۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اس کی نظر ایک کوٹھے پر پڑی جس کی بالکنی میں ایک طوائف بیٹھی خربوزہ تراش رہی تھی۔ وحید کو شرارت سوجھی۔ ایک شعر موزوں کیا اور اس کی طرف اچھال دیا۔

مصروف ہیں جو آپ بنانے میں قاش کے
رکھ لیجیے گا دل بھی ہمارا تراش کے

لکھنؤ کی طوائف، ایسے برمحل شعر تڑپ ہی تو گئی۔ اک ادائے خاص سے اوپر آنے کی دعوت دی۔ وہ طوائف بھی تھی اور حسین بھی۔ اس سے حجاب کیسا۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچ گیا۔ طوائف سراپا اشتیاق بنی ہوئی تھی۔

"حضور سے تعارف کا شوق دامن گیر ہے۔"

وحید نے اپنا ایک شعر پڑھ دیا۔

ہر شکل کا شیدا ہوں میں دیوانہ ہوں کس کا
ہر شمع پہ سوزاں ہوں میں افسانہ ہوں کس کا

"اللہ آپ تو غضب کی باتیں کرتے ہیں"

وحید کی زبان پر پھر ایک شعر آگیا۔

وہ مجھ سے کہتے ہیں تری آہیں غضب کی ہیں
اس کی خبر نہیں کہ نگاہیں غضب کی ہیں

"باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ آپ میرے لیے نہیں خربوزے کے لیے آئے ہیں۔ یہ لیجیے۔" طوائف نے خربوزے کی ایک قاش اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دی۔

وحید نے مسکراتے ہوئے خربوزے کی پھانک لے لی۔

خود اس نے دیا ہاتھ سے پیمانہ مجھے آج
کرتے ہیں کئی سجدۂ شکرانہ مجھے آج

"اللہ آپ کے پاس تو شاعری کا کارخانہ ہے۔ آپ ضرور شاعر ہیں۔"

"بیمار کی تو صورت ہی جواب ہوتا ہے۔ آپ نے ٹھیک پہچانا۔ سنا ہے لکھنؤ کے سنگریزے بھی شعر بولتے ہیں۔ ہو نہ ہو آپ بھی شاعری ضرور کرتی ہوں گی۔"

"اگر تک بندی کو شاعری کہا جائے تو ضرور ہوں۔ میرا ایک قیافہ اور ہے اگر پیش کروں۔"

"ارشاد۔"

"آپ لکھنؤ کے نہیں لگتے اگر ہوتے تو اس سے پہلے میرے پاس آگئے ہوتے۔ نصیبن نام ہے میرا۔ کون ہے جو میرے پاس نہ آتا ہو۔ گلے میں کوئل پیروں میں مور رکھتی ہوں۔"

"آپ کا یہ قیافہ بھی درست ہے۔ کہیے انعام میں کیا پیش کروں۔"

"اپنی کوئی غزل۔ اس اجازت کے ساتھ کہ میں اسے گاؤں گی۔"

وحید نے غزل لکھ کر دے دی اور اجازت چاہی۔

"اس شرط پر جانے دیں گے کہ آپ آتے رہیں گے۔ لکھنؤ آپ کا وطن نہ سہی لیکن کبھی کبھی تو آتے ہوں گے۔"

"کبھی کبھی کی تاب کسے۔ میں کل پھر حاضر ہوجاؤں گا۔"

"سچی! اللہ آپ کتنے اچھے ہیں۔ کل میں آپ کی غزل آپ کو سناؤں گی۔"

وحید کوٹھے سے نیچے اترا تو سوچنے لگا کہاں جائے۔ بیگم صاحبہ کی پیش کش اسے یاد تھی۔ وحید میاں جب تم ایک طوائف کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرسکتے ہو تو ایک خاندانی بیگم کے گھر ٹھہرنے میں کیا حرج ہے۔

وہ یہ سوچ کر بیگم صاحبہ کے گھر سے نکلا تھا کہ سرائے بدل دے گا یا کڑا واپس چلا جائے گا لیکن اب وہ سرائے اس لیے جا رہا تھا کہ سامان اٹھا کر بیگم صاحبہ کی طرف چلا جائے گا۔ سامان تھا ہی کیا۔ ایک چھوٹا ٹرنک تھا جس میں چند کتابیں اور کچھ کپڑے تھے۔

بیگم صاحبہ کے حویلی نما مکان کے سامنے اس کا تانگا رکا اور ملازموں نے اندر خبر کی تو بیگم صاحبہ نہال ہوگئیں۔

غزل

جز روئے یار آنکھوں میں کچھ جلوہ گر نہیں
سوتا ہوں میں کہ جاگ رہا ہوں خبر نہیں

محرومیِ نصیب کی کس کو خبر نہیں
خود نالہ کہہ رہا ہے کہ مجھ میں اثر نہیں

بے عاجزی حریمِ خدا تک گزر نہیں
سر خاک پر نہیں تو قدم عرش پر نہیں

وہ دل میں ہیں سنا بھی نہیں دیکھا تو کیا
اس کی تو کانوں کان کسی کو خبر نہیں

تھے ہوش میں وحید تو دل کا بھی تھا خیال
اب کس کو ہوش ہے وہ کدھر ہے کدھر نہیں

☆ ☆
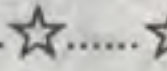
غزل

ہر سمت لیے پھرتی ہے مجھے بے فائدہ کیوں اس عالم میں
بہتر ہے یہی اب کھول کر اے ہستیِ موہوم ایک طرف

یہ آئینہ خانہ ہے کس کا کہتے ہیں جسے سب لوگ جہاں
آتا ہے نظر ہر سمت وہی ہوتا ہے جو معلوم ایک طرف

آنکھوں سے مقابلہ ہے دل کا کیا فیصلہ ہوتا ہے دیکھیں
دو سحر کا حاکم ایک طرف سو ناز کا محکوم ایک طرف

کچھ بندۂ مجبور آپ کے ہیں ہاتھوں سے کلیجا تھامے ہوئے
آلودۂ خوں آتے ہیں نظر کچھ کشتۂ مظلوم ایک طرف

مے خوار بھی اپنی مستی کا دکھلاتے ہیں اک جانب عالم
اچھا تو ہے آ کر ابر سیہ تو سوئے چمن جھوم ایک طرف

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس کے لیے کمرے کا بندوبست پہلے ہی کر دیا گیا تھا۔ ٹرنک وہاں پہنچ گیا اور وہ بیگم صاحبہ کی خدمت میں پیش ہو گیا۔

”میرا دل کہتا تھا کہ آپ ضرور آئیں گے۔“

”اس دل کی مت پوچھیے“ وحید نے کہا اور اپنا ایک شعر معمولی سے تصرف کے ساتھ پڑھا۔

اس دل کی ہے بہار و خزاں تیرے ہاتھ میں
گلشن بنا دیا کبھی ویرانہ کردیا

دو دن تک لطف میزبانی اٹھانے کے بعد وہ رخصت ہوا اور کڑا آ کر دم لیا۔

بیگم صاحبہ کا کڑا آنا قیامت ہو گیا تھا اور پھر وحید کے بار بار لکھنؤ جانے سے والدین شک میں مبتلا ہو گئے۔ وہ لکھنو آتش کی محبت میں جاتا تھا لیکن دو محبتیں اور بھی تھیں۔ بیگم صاحبہ کے گھر ٹھہرتا تھا اور نصیبن کے گھر کے چکر کاٹتا تھا۔ اور پھر آئے دن لکھنؤ جانے سے طوائفوں کے کئی اور کوٹھے اس پر کھل گئے۔ اس کی غزلیں ان کوٹھوں سے اتر کر لکھنؤ کے گلی کوچوں میں پھیلنے لگیں۔

اس کی آوارگی جب زیادہ بڑھنے لگی تو دیوانے کے لیے زنجیر کی ضرورت پیش آئی۔ وحید کی ماں کو کھٹکا ہوا کہ لکھنؤ والی بیگم صاحبہ کہیں مستقل طور پر کڑا نہ آ جائیں یا وحید کو لکھنؤ بلا لیں۔ شوہر کی رنگین مزاجیوں کو وہ پہلے ہی دیکھ چکی تھیں۔ یہ صدمہ بھی جھیل چکی تھیں کہ شوہر نے ایک طوائف کو گھر میں ڈال لیا تھا۔ اب وہ دیکھ رہی تھیں کہ باپ نے الہ آباد فتح کیا تھا بیٹا لکھنؤ پر حملہ آور ہو رہا تھا۔ انہوں نے شوہر سے کہا شوہر نے اپنے بھائی عطا اللہ عاقل سے ذکر کیا۔

وحید کے لیے عطا اللہ عاقل کی لڑکی فاطمہ بی بی کو منتخب کر لیا گیا۔

وحید کے والد امر اللہ شاغل کا ستارۂ وکالت عروج پر تھا۔ الہ آباد میں ان کی وکالت کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ دولت کی ایسی ریل پیل تھی کہ مثالیں دی جاتی تھیں۔ بیٹے کی شادی کا موقع آیا تو خزانوں کے منہ کھل گئے۔ الہ آباد اور لکھنؤ سے طوائفیں ہفتوں پہلے کڑا میں آ کر مقیم ہو گئیں۔ ہر محلے میں چار دیگ بریانی اور گوشت کے ساتھ ساتھ طوائفوں کے مجرے کا انتظام تھا تا کہ کھانے کا بھی انتظام رہے اور تفریح کا بھی۔ مہمانوں کی کثرت جگہ کی قلت تھی۔

عین شادی والے دن لکھنؤ والی بیگم صاحبہ آ گئیں مگر بس اتنی دیر کے لیے کہ وحید کو دولھا بنے ہوئے دیکھ لیں۔

”وحید تمہیں شادی مبارک ہو۔ اب تو ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ہم تمہیں چاہنے لگے ہیں۔ لکھنؤ آنا ہو تو گھر اب بھی حاضر ہے۔“

شادی کے دن آئے اور گزر گئے لیکن شادی ایسی ہوئی کہ لوگوں کو برسوں یاد رہی۔ قصبہ کڑا میں ایسی دھوم دھام کی شادی نہ اس سے پہلے ہوئی تھی نہ اس کے بعد ہوئی۔

”ہماری ایک شادی اور ہو چکی ہے۔“ شادی کے بعد وحید نے اپنی زوجہ سے کہا۔

”ہائے اللہ! یہ آپ نے کیا کہہ دیا۔ اگر ایسا تھا تو ہم سے شادی کرنے سے پہلے آپ کو بتانا چاہیے تھا۔“

”سب کو معلوم ہی تھا اس لیے بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔“

”غلط بات ہے۔ کم از کم ہمارے گھر میں کسی کو معلوم نہیں تھا۔“

”کیا کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ہم شاعری کرتے ہیں۔“

”یہ تو معلوم تھا۔“

”شاعری ہی سے تو ہماری شادی ہوئی ہے۔“

”توبہ ہے! آپ نے تو ڈرا ہی دیا تھا۔“

”ڈرنے کی تو بات ہی ہے۔ شاعری ہماری پہلی بیوی ہے۔ اس کے بغیر ہم زندہ نہیں رہ سکتے، تمہیں اس بیوی کی دل جوئی کے لیے قربانیاں دینی ہوں گی۔ ہم تمہارے پاس کم اور پہلی بیوی کے پاس زیادہ رہیں گے۔ تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ ویسے ہم تمہیں خوش رکھنے کی پوری کوشش کریں گے۔“

”آپ نے یہ سوچا بھی کیسے کہ ہمیں آپ کی شاعری پر کوئی اعتراض ہوگا جبکہ میرے والد بھی شاعر ہیں اور آپ کے والد بھی۔“

”میں مشاعروں کے سلسلے میں اکثر باہر رہتا ہوں۔ تمہیں یہ جدائی گزارنی ہوگی۔“

”اچھا تو یہی ہے کہ آپ ہمارے پاس رہیں لیکن اگر جاتے بھی ہیں تو ہم آپ کی خوشی میں خوش ہیں۔“

والدین سمجھ رہے تھے کہ شادی کے بعد اس کے جنون شاعری میں کچھ کمی واقع ہو جائے گی لیکن یک سوئی ملی تو اس شوق نے مزید سر ابھارا۔ بیوی کی اطاعت شعاری نے حوصلہ بڑھایا۔

وحید کا زمانہ اردو شاعری کے اس رنگ کا دور تھا جسے لکھنوی رنگ کہا جاتا تھا۔ دہلی میں ذوق و غالب اور لکھنؤ میں اسیر لکھنوی اور ان کے ہم نوا داد سخن وری دے رہے تھے۔ غالب کی نکتہ سنجی نے سنجیدہ افراد کو اپنی طرف متوجہ کر رکھا تھا۔ ذوق کی محاورہ بندی اپنا جواب نہ رکھتی تھی اور اکثر و بیشتر شعرائے لکھنؤ کے یہاں ناسخ کی تمثیلی شاعری کے بہتر سے بہتر نمونے موجود تھے۔ ایک خواجہ آتش تھے جن کی ڈگر الگ تھی۔ وحید آتش کے شاگرد بشیر کا شاگرد تھا اور براہِ راست آتش سے بھی اصلاح لی تھی لہٰذا وہ آتش ہی کے رنگِ شاعری کو ابھارنے میں سرگرداں تھا۔ تصوف کی چاشنی، درد و اثر کی آمیزش اور لکھنو کے عام رنگ سے ہٹ کر سادگی کی طرف میلان۔

یہ وہ باتیں تھیں جو لکھنؤ میں بعض کو پسند تھیں لیکن بیشتر کو ناپسند تھیں۔ ناسخ اور ان کے شاگرد ایسی شاعری کو نشانۂ تنقید بناتے رہتے تھے۔

وحید کے چچا زاد بھائی رفیع الدین جو اس کے برادر نسبتی بھی تھے جب لکھنؤ میں وکالت کرنے لگے تو وحید کو لکھنؤ جانے کا بہانہ بھی مل گیا اور ٹھکانا بھی۔ لکھنؤ کی فضا ادبی بھی تھی اور رنگین بھی۔ لکھنو میں اس کا قیام طول پکڑنے لگا۔ الہ آباد تو خیر گھر آنگن تھا لیکن لکھنو میں بھی وہ مہینوں قیام کرنے لگا۔ یہاں کے مشاعروں میں اس کی غزلوں نے دھوم مچائی تو حاسدوں کا پیدا ہو جانا لازمی تھا۔ اساتذۂ وقت نے طرح طرح سے اس کے امتحان لیے۔ وہ ہر امتحان سے سرخرو نکلا۔ برسرِ مشاعرہ اس کے اشعار پر اعتراضات کیے جاتے۔ اس کے احباب ان اعتراضات کے جواب دیتے۔ وہ اجنبی تھا لکھنو کا نہیں تھا۔ اہلِ لکھنو کا اس سے کدورت رکھنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس کے اور اساتذۂ لکھنو کے درمیان ہونے والے جھگڑوں نے انشا اور مصحفی کے زمانے کی یاد دلا دی تھی۔

اب اس کے لیے اور بھی ضروری ہو گیا تھا کہ وہ لکھنؤ میں زیادہ سے زیادہ قیام کرے۔

وہ آتش کا شاگرد تھا لیکن لکھنو کے طویل قیام اور اہلِ لکھنو سے برابری کے جذبے نے اسے لکھنوی رنگ کی... خارجیت کی طرف میں راغب کیا۔ اس کے کلام میں یہ رنگِ شاعری بھی ابھر آیا۔

پوشاک تیری اے گلِ خنداں ہے سرخ سبز
یا فصلِ گل سے رنگِ گلستاں ہے سرخ سبز
یا سرخ سبز رنگ ہے فانوس پیرہن
جس میں یہ نور شمع فروزاں ہے سرخ سبز
یا آج پھولی ہے انہی دو رنگوں کی شفق
جس میں ظہور مہر درخشاں ہے سرخ سبز
آیا ہے یاسمٹ کے یہ قوسِ قزح کا رنگ
جس میں یہ شعلہ برق کا تاباں ہے سرخ سبز
جس سے تمام گلشن دوراں ہے سرخ سبز
یا ہے یہ سرخ سبز لباس نسیم صبح
جس سے تمام گلشنِ دوراں ہے سرخ سبز
یا سرخ و سبز رنگ ہے آئینے کا غلاف
جس سے نگاہ دیدۂ حیراں ہے سرخ سبز
یا سرخ و سبز رنگ کی یہ دھوپ چھاؤں ہے
اس میں یہ جلوۂ مہ تاباں ہے سرخ سبز
رنگِ چمن سے کیا اسے تشبیہ دے وحید
اس سے ترا لباس دوچنداں ہے سرخ سبز

..........☆......☆..........

صحرا کے خار خشک زمانے میں ہیں نہال
گلشن کے نخل حسنِ نمو پا کے مست ہیں
جب زخم تھا تو اس سے تھا روح کو سرور
اب چاکِ دل پہ اپنے رفو پا کے مست ہیں

..........☆......☆..........

نواب امداد امام اثر

اس عاجز نے اپنے زمانے میں بھی ایک ایسے غزل گو شاعر کو دیکھا ہے کہ جن کی زیارت ثواب سے خالی نہیں تھی۔ یہ حضرت ہمارے مولوی وحید الہ آبادی تھے۔ شاعر کے لیے جتنی صفتیں درکار ہیں ان کی ذات بابرکات میں موجود تھیں۔ حضرت کو نہ لباس سے شوق تھا نہ کھانے سے ذوق، جہاں نیند آئی سو رہے جہاں جی چاہا چلے گئے۔ دنیا میں کیا ہوتا ہے اس سے بحث نہ تھی۔ کسی کی برائی میں کبھی زبان نہ کھولی۔ اگر کسی نے برا کہا تو اس کا جواب نہیں دیا۔ سال ہا سال کی ملاقات میں اس عاجز نے انہیں کسی کو بد کہتے نہ سنا۔ اہلِ انصاف کے نزدیک ان کا کلام سرمایۂ افتخار ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس نے آتش سے بہ مشکل دو سال اصلاح لی ہوگی کہ آتش کا انتقال ہوگیا۔ اب اسے اپنی طبعِ رواں پر بھروسا کرنا تھا۔

شاعری کے ساتھ اس کا جو خلوص تھا اس کا نتیجہ یہی ہونا تھا کہ ہر طرف اس کی شاعری کی دھوم مچ گئی۔ اس کا شمار اساتذہ میں ہونے لگا۔ اس کے استاد بشیر علی بشیر کا انتقال ہوگیا تو ان کے بہت سے شاگرد وحید کے دامنِ تربیت سے وابستہ ہوگئے۔ پھر کڑا کا میدانِ شاعری اس کے لیے چھوٹا پڑنے لگا تو وہ الہ آباد جاکر رہنے لگا۔ یہاں اس کے والد پہلے سے تھے۔ پیشہ وکالت خوب چمک رہا تھا۔ وحید کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے والد کو یہ ڈھارس بہت تھی کہ وحید ایک لائق شاعر ثابت ہوا ہے۔

الہ آباد آنے کے بعد اس نے اس شہر کو اپنے نام کا حصہ بنالیا۔ اب وہ وحید الہ آبادی تھا۔

ان دنوں الہ آباد بھی لکھنؤ سے کم نہیں تھا لیکن لکھنؤ کی تو بات ہی اور تھی۔

بتانِ لکھنؤ میں کیا وحید اسرار دیکھا ہے
یہ کیوں جاتے نہیں سوئے الہ آباد کیا باعث

بتانِ لکھنؤ تو الہ آباد آنہیں سکتے تھے لیکن وہ تو جاسکتا تھا۔ کبھی مشاعروں میں کبھی دوستوں سے ملاقاتوں کے سلسلے میں۔ کبھی بلایا جاتا کبھی خود چلا جاتا۔

یہی روز و شب تھے کہ وہ روزِ بد آپہنچا جس کا خدشہ تھا۔ انگریزوں کی بڑھتی ہوئی طاقت نے پہلے لکھنؤ کا چمن تاراج کیا۔ واجد علی شاہ گرفتار کرکے مٹیا برج لے جائے گئے۔ پھر 1857ء کا ہنگامۂ غدر برپا ہوا۔ وحید کے والد تین سال پہلے ہی انتقال کرچکے تھے۔ اب بربادی کا جشن منانے وہ اکیلا رہ گیا تھا۔ ہر طرف بغاوت کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا۔ دہلی تو خیر لاشوں اور دار و رسن کا گڑھ بنا ہوا تھا لیکن دیگر بڑے شہر بھی محفوظ نہیں تھے۔ وہ گھبرا کر کڑا چلا آیا۔ خبریں یہاں بھی پہنچ رہی تھیں۔ لکھنؤ میں کون بچا کون مرا اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ نازنینانِ لکھنؤ پر کیا گزری ہوگی۔ یہ سوچ کر ہی اس کی آنکھیں خون کے آنسو رونے لگیں۔ وہ شاعر تھا۔ یہی کرسکتا تھا کہ قلم خونِ دل میں ڈبولے۔ غزل کا شاعر لکھنؤ کا مرثیہ لکھنے بیٹھ گیا۔

لالۂ خوش رنگ تھا جانِ چمن کیا ہوگیا
جلوۂ شمعِ شبستانِ چمن کیا ہوگیا

کیا ہوئی وہ نرگسِ شہلا کی چشمِ سرمہ سا
دیدۂ شوخِ غزالانِ چمن کیا ہوگیا

بلبلوں کے غنچۂ دل میں نہیں بوئے نیاز
عشوۂ رنگیں ادایانِ چمن کیا ہوگیا

آب و تاب چہرۂ گلہائے خنداں کیا ہوئی
جلوۂ روئے حسینانِ چمن کیا ہوگیا

غنچہ و گل یار و ساقی شیشہ و جام شراب
اے وحید اپنا وہ سامانِ چمن کیا ہوگیا

یوپی کے تمام علاقوں میں بھگدڑ سی مچی ہوئی تھی۔ ٹھکانے بے ٹھکانے ہوگئے تھے۔ دنیا کی ناپائیداری وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا اثر اس کی شاعری پر پڑا، یا یوں کہیے کہ اس کا مزاج تبدیل ہوا جس سے اس کی شاعری متاثر ہوئی۔ تصوف کا رنگ پہلے بھی تھا لیکن اب غالب آگیا۔ اشعار کیا تھے خون کی بوندیں ٹپکنے لگیں۔ جب دنیا کا اعتبار جاتا رہا تو معرفت ہی کا سہارا رہ جاتا تھا۔ اچھے اچھے دل بجھ گئے تھے، اس کے در و بام پر بھی اداسی چھا گئی۔ اب اس کے شعر معرفت کے پیمانے بن گئے۔

لیے پھرتی تھی جب دیر و حرم میں دل کی بے تابی
تجھے کو ہر جگہ پر جلوہ فرما دیکھتے تھے ہم
کسی عالم میں ہوں پر دید سے خالی نہیں رہتے
ابھی تو خواب میں بھی اس کا جلوہ دیکھتے تھے ہم

..........☆......☆..........

رہے نہ چین سے دم بھر تلاشِ یار میں ہم
بہ رنگِ خاک نہیں کون سے غبار میں ہم

وہ ملے ہم کو فنا کا رنج دکھلانے کے بعد
راہ پر تقدیر کبھی آئی تو مٹ جانے کے بعد

..........☆......☆..........

قبر میں کیا کیا فرشتوں کا تھا ارمان سوال
کچھ نہ پوچھا مجھ سے تیرا نام بتلانے کے بعد

..........☆......☆..........

اجڑا چمن پھر سے آباد ہونے لگا۔ موت اپنا کام دکھا چکی تھی اب زندگی زندہ ہو رہی تھی۔ برباد گھر پھر سے آباد ہو رہے تھے۔ بہت کچھ بدل گیا تھا مگر زندگی تو وہی تھی۔ انگریزوں کی عملداری تھی۔ وحید کے لیے یہ سب کچھ نیا بھی تھا ناگوار بھی۔ اس کے مزاج میں وہ شوخی نہیں رہی تھی لیکن وہ کون سا لباس ہے جس میں رفو نہ ہوسکے۔ وہ بھی آہستہ آہستہ رنگ پر آتا جا رہا تھا۔

شہروں میں زندگی پھر سے آباد ہوئی تو سخن سنجی کی رونقیں بحال ہونی شروع ہوئیں۔ سونی بستیوں میں مشاعرے پھر سے ہونے لگے۔ مشاعروں کی محفلیں کیا تھیں مرثیوں کی مجالس تھیں۔ کہیں شہروں کے اجڑنے کے قصے تھے کہیں بجھے دلوں کی داستانیں۔

آہستہ آہستہ یہ صدمے بھی کم ہوئے۔ زندہ دلی نے پھر ہاتھ پاؤں پھیلائے۔ لکھنؤ اور الہ آباد کے چکر پھر کاٹے جانے لگے تھے۔

اس نے الہ آباد کو پھر اپنا مستقر بنالیا۔

سترہ سال کا دبلا پتلا نوجوان، دبتا ہوا قد، پیشانی کی رگیں ابھری ہوئی۔ آرام کرسی پر بیٹھا ہے۔ بائیں بازو پر میز ہے جس پر کتابیں رکھی ہیں۔ ایک میز سامنے ہے اور اس کے سامنے چند کرسیاں اور مونڈھے پڑے ہیں۔ یہ اکبر ہے جو بعد میں اکبر الہ آبادی بننے والا ہے۔

وہ آرام کرسی سے اٹھا اور بے قراری سے برآمدے میں ٹہلنے لگا۔ کوئی چیز تھی جو اسے بے چین کر رہی تھی۔ وہ تیز آندھی کے درمیان گھرا ہوا تھا۔ اس کا ذہن چیخ رہا تھا۔ پھر وہ بے اختیار ہوگیا۔ کئی خیال آئے اور گزر گئے بالآخر ایک زمین پر اس کے قدم جم گئے۔ اس نے مطلع کہا۔

چشمِ عاشق سے کریں لختِ دل بے تاب و اشک
آپ یوں دیکھیں تماشا جان کر سیماب و اشک

اس نے ناسخ کا مطالعہ بڑے شوق سے کیا تھا۔ اس شعر میں بھی ناسخ کا رنگ صاف نظر آرہا تھا۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ مضمون کی ہر کروٹ کو اپنی گرفت میں لے سکتا ہے۔ کئی غزلیں کہہ رکھی تھیں لیکن اتنی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ ان موتیوں کو مشاعروں میں لے کر جاتا۔

الہ آباد کا ماحول کسی بھی نوجوان کے دل میں ذوقِ شعر پیدا کرنے کے لیے کافی تھا۔ طرحی اور غیر طرحی مشاعرے ہوتے تھے۔ اکبر کو بھی ان مشاعروں میں شرکت کرنے کی خواہش پیدا ہوئی مگر مشاعروں میں شرکت سے پہلے ایک اور شرط کی تکمیل ضروری تھی۔ وہ اپنے اردگرد جو ماحول دیکھ رہا تھا اس میں یہ روایت عام تھی کہ ہر نوجوان شاعر کسی معروف یا پختہ عمر کے شاعر سے اصلاح لیتا تھا۔ استادی شاگردی کی اس روایت پر بڑی سختی سے عمل ہو رہا تھا۔ اکبر کو بھی ایک ایسے استاد کی ضرورت تھی جو اس کی افتادِ طبع کے مطابق اس کے اشعار پر اصلاح دے سکے۔

ایک دن اس کا ایک دوست اس سے ملنے آیا۔ دورانِ گفتگو یہ شعر دوست کی زبان سے ادا ہوا۔

ہم نے جب وادیِ غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

اکبر یہ شعر سن کر پھڑک گیا۔ اسے محسوس ہوا جیسے بہت دن سے وہ اسی اسلوبِ شعر کی تلاش میں تھا۔

"کس کا شعر ہے؟" اکبر نے پوچھا۔

"وحید الہ آبادی کا۔ ان دنوں الہ آباد اور نواحِ الہ آباد میں استادی کا درجہ رکھتے ہیں۔ آتش کے شاگرد رہ چکے ہیں۔"

"اسی لیے کلام میں اتنی صفائی ہے۔"

"یہ سب تو مجھے نہیں معلوم پر اتنا جانتا ہوں کہ ان کے بہت سے شاگرد ہیں۔"

"یہیں الہ آباد میں رہتے ہیں۔"

"رہنے والے تو کڑا کے ہیں لیکن اب تو الہ آباد ہی کے ہیں۔ محلہ پوچڑ کی حویلی میں رہتے ہیں۔ ان کے والد مشہور وکیل تھے مگر یہ شاعری کے سوا کچھ نہیں کرتے۔"

"تم امر اللہ وکیل کی بات تو نہیں کر رہے ہو۔"

"ہاں ہاں وہی۔ وہی تھے ان کے والد۔"

"ان کے تو میں نے اپنے ابا سے بہت سے قصے سنے ہیں۔ یار وحید صاحب کے کچھ اور شعر سناؤ۔"

"مجھے بس ان کا ایک شعر اور یاد ہے۔"

"وہی سنا دو۔"

وقت مجھ پر دو کٹھن گزرے ہیں ساری عمر میں
اک ترے آنے سے پہلے اک ترے جانے کے بعد

اس شعر پر تو اکبر بے خود سا ہوگیا۔

"معمولی سے مضمون کو کس ترکیب سے ادا کیا ہے۔"

دوست تو اٹھ کر چلا گیا لیکن اکبر کو وحید صاحب سے ملنے کی دھن سوار ہوگئی۔ اس نے خاص طور پر غزل تیار کی اور وحید الہ آبادی سے ملنے پہنچ گیا۔

چالیس اکتالیس سال کا ایک خوش شکل شاعر اس کے سامنے تھا۔ اس نے مدعا بیان کیا۔ وحید کوئی جواب غزل سننے کے بعد ہی دے سکتا تھا۔

"کچھ سنائیے۔" وحید نے فرمائش کی۔

اکبر نے ساتھ لائی ہوئی غزل جیب سے نکالی اور مطلع پڑھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

آج آرائشِ گیسوئے دوتا ہوتی ہے
لو مری جان گرفتارِ بلا ہوتی ہے

’’دوسرے مصرعے میں ’’لو‘‘ کی جگہ ’’پھر‘‘ کر لیجیے۔‘‘ وحید نے مشورہ دیا۔

ہاں کسی کام کا باقی نہیں رہتا انسان
سچ تو یہ ہے کہ محبت بھی بلا ہوتی ہے

’’ہاں کی جگہ اگر ’’پھر‘‘ کہا جائے تو مناسب ہوگا۔‘‘

کئی شعر پڑھنے کے بعد وہ اس شعر پر پہنچا۔

ہوں فریب نگۂ ناز کا قائل اکبرؔ
مرتے دم تک نہ کھلا یہ کہ جفا ہوتی ہے

’’مرتے دم تک مناسب نہیں ہے۔ اسے ’’مرتے مرتے کر لیجیے اور پھر مصرع پڑھیے۔

’’مرتے مرتے نہ کھلا یہ کہ جفا ہوتی ہے۔‘‘

اکبر کو یہ اندازِ اصلاح پسند آیا۔ اکثر اساتذہ پورے شعر کو تبدیل کر دیتے ہیں۔ لفظ تو لفظ مضمون بھی بدل دیتے ہیں۔ وحید صاحب نے صرف ایک لفظ بدلا اور شعر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ وحید کہیں جانے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

’’آپ کہیں تشریف لے جا رہے تھے؟‘‘

’’بھئی تمہاری غزل تو تیار ہو گئی۔ اب ہمیں بھی تو کچھ اشعار کہنے دیجیے۔‘‘

’’لیکن آپ تو باہر جا رہے ہیں۔‘‘

’’استاد کے پاس نہیں جائیں گے تو شعر کیسے ہوں گے۔‘‘

’’آپ کا بھی کوئی استاد ہے؟‘‘

’’اگر کوئی شک ہے تو چلیے آپ کو بھی لے چلتے ہیں۔‘‘

اکبر کو یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی۔ اسے تو یہ معلوم تھا کہ وحید صاحب حضرت آتش کے شاگرد ہیں۔ آتش کا انتقال ہو چکا ہے۔ اب یہ کس استاد کے پاس جا رہے ہیں۔ آتش کی تو قبر تک لکھنؤ میں ہے پھر ان کا ارادہ کہاں کا ہے۔

’’کیا سوچنے لگے۔ ملنا ہے ہمارے استاد سے تو چلیے۔‘‘

’’مجھے تو خوشی ہوگی آپ کے استاد سے مل کر۔ سوچ یہ رہا ہوں کہ الٰہ آباد میں کون ہے جو آپ کا استاد ہو سکتا ہے۔‘‘

’’آپ خود ہی دیکھ لیجیے گا۔‘‘

اکبر کی نوعمری نے ابھی تک ’’اس بازار‘‘ کا رخ نہیں کیا تھا لیکن الٰہ آباد کا تھا۔ اسے یہ تو معلوم ہو ہی گیا کہ وحید صاحب کس طرف جا رہے ہیں۔ یہ راستہ بازارِ حسن کی طرف جاتا تھا۔ اس نے سوچا، دن کا وقت ہے۔ اس وقت مجرا تو ہو نہیں سکتا۔ ہو سکتا ہے اس بازار سے گزر کے وحید صاحب کسی اور طرف جا رہے ہوں لیکن جب انہوں نے ایک دروازے پر دستک دی تو وہ چونک اٹھا یہاں تو سب مکان طوائفوں کے ہیں۔ انہیں کس سے ملنا ہے۔ اگر کوئی طوائف اتنی بڑی شاعرہ ہے کہ وہ وحید صاحب کی استاد ہو سکتی ہے تو کمال ہے۔

وہ ابھی اپنے خیالوں میں گم تھا کہ ایک شخص نے دروازہ کھولا۔ وحید پر نظر پڑتے ہی اس نے تین عدد فرشی سلام کیے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وحید صاحب یہاں پہلی مرتبہ نہیں آئے ہیں۔ وہ شخص انہیں اچھی طرح جانتا ہے۔

یہ پرانی طرز کا مکان تھا۔ صحن کے بیچ میں چبوترا۔ ایک رخ پر برآمدہ اور دوسرے رخ پر کمرے بنے ہوئے تھے۔ برآمدے میں چاندنی کا فرش تھا اور گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔

وحید اسے لے کر فرش پر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے گاؤ تکیے سے پشت لگالی۔ اکبر کی نظریں فرش پر جمی ہوئی تھیں اور سوچ رہا تھا دیکھیے کیا ظہور میں آتا ہے۔

ظہور میں آیا تو یہ کہ ایک موم کی پتلی، کلی سے نازک، بنی نہ سنوری، کمرے میں یوں داخل ہوئی جیسے نیند میں حسین خواب آتا ہے۔ اکبر کو دیکھا تو چونکی ضرور لیکن جہاں وہ تھی وہاں شرم کہاں۔ ملازم نے پاندان لا کر رکھ دیا اور وہ وحید کے سامنے بیٹھ گئی۔

’’حضور کی تعریف؟‘‘ اس نے اکبر کی طرف دیکھتے ہوئے وحید سے پوچھا۔

’’یہ ہمیں دیکھ کر شاعری کی مشق کر رہے ہیں۔‘‘

’’اچھا تو برخوردار شاعر ہیں۔‘‘

’’ہمارے ساتھ اور کون رہ سکتا ہے۔‘‘

’’اچھا یہ فرمائیے کیا سناؤں۔‘‘

’’آج اتنا وقت نہیں۔ سامنے بیٹھی رہو۔ کچھ شعر کہنے ہیں وہ کہہ لیں۔‘‘

’’میں تیار ہو کر آتی ہوں۔ شعر کچھ اچھے نکلیں گے۔‘‘

وہ اٹھی اور کمرے سے نکل گئی۔

’’اچھا تو آپ کی استاد یہ ہیں۔‘‘ اس کے جانے کے بعد اکبر نے کہا۔

’’بس یہی سمجھو اکبر میاں۔ ایسے موقعوں پر ہم اپنا یہ شعر پڑھ دیتے ہیں تم بھی سن لو۔

لب پہ کیا عذر گنہ لائیے آہوں کے سوا
عمر بھر ہم نے کیا کیا ہے گناہوں کے سوا

وہ تیار ہو کر آئی اور وحید کے سامنے اس طرح بیٹھ گئی جیسے کوئی ماڈل ہو۔ وحید تصویر بنانے لگا۔ اشعار کی بارش ہوئی اور وہ بھیگنے لگا۔

دکھلا رہے ہو لطفِ بہار و خزاں تمہی
گل ہو تمہی چمن ہو تمہی باغباں تمہی
کیسا حجاب کہتے ہیں دنیا میں کس کو حسن
در پردہ لے رہے ہو مرا امتحاں تمہی
دریائے غم میں ڈوبنے دو گے کسی کو کب
ہو ناخدائے کشتیٔ بے بادباں تمہی
کس سے کہوں تمہارے سوا دل کی بات میں
میرے تو ہو انیس تمہی رازداں تمہی
اب جسم و جاں کو بھی نہیں پہچانتا وحیدؔ
رہتے ہو اس کے جسم میں مانندِ جاں تمہی

اس دوران وہ خاموش نہیں رہی تھی۔ اکبر سے باتیں کرتی رہی تھی اور وحید شعر کہتا رہا تھا۔ جب مطلوبہ اشعار کہہ چکا اور دیر بھی کافی ہو گئی تو اس نے اجازت چاہی۔

’’اچھا بو جان اب ہم چلیں گے۔ ایک پان کھلوا دو۔‘‘

’’آپ کو تو پان کھلا دوں گی۔ اکبر میاں پہلی مرتبہ آئے ہیں۔ ان کی کیا تواضع کروں۔‘‘

’’اب تو یہ آتے رہیں گے خوب تواضع کر لینا۔‘‘ وحید نے کہا اور اکبر کو اٹھنے کا اشارہ کر دیا۔

اس کے بعد اکبر باقاعدگی سے شاعری کرنے لگا۔ ایسا کامل استاد ملا تو مشاعروں کی جھجک بھی دل سے نکل گئی۔ الٰہ آباد کے مشاعروں میں وحید کا طوطی بولتا تھا۔ وہ بھی استاد کے ساتھ مشاعروں میں جانے لگا۔

الٰہ آباد میں آتش کے شاگرد بھی موجود تھے اور ناسخ کے بھی۔ دونوں کے درمیان تاریخی معرکے یہاں بھی اپنا رنگ دکھا رہے تھے۔ اس بزمِ سخن میں اکبر کے داخل ہونے کے بعد ان معرکوں میں اور بھی تیزی آگئی۔ اب وہ وحید کے مخالفوں کو جواب دینے کے لیے موجود تھا۔

استادیٔ وحید میں جس کو کلام ہو
تیار اس سے بحث کو اکبرؔ ہے آج کل

....

شاعر ہے داغ اور ہے استادِ فن امیرؔ
اکبر وحید قبلۂ اہلِ کمال ہے

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ
فروری 2013ء ...... گلابی جاڑوں میں دلوں کو گرمانے والی کہانیاں

آشوبِ وفا
آخری صفحات پر محی الدین نواب کا ایک اور شاہکار
زندہ رہنے کی آرزو مار ڈالنے کی قوت رکھنے والوں سے زیادہ قوی ہوتی ہے ...... یہ طاقت در آرزو سنسنی خیز حالات اور خونیں واقعات کو جنم دیتی ہے ...... سال نو کے دوسرے شمارے کی خصوصی کہانی ...... دوسرا اور آخری حصہ

سود و زیاں
سندھ کی سرزمین ...... جہاں کتنے ہی حکمران آئے اور ماضی کے اوراق پر اپنا عہد رقم کر کے تاریخ کا حصہ بن گئے۔ ابتدائی صفحات پر ڈاکٹر ساجد امجد کی عرق ریزی ...... حجاج بن یوسف تاریخ کے آئینے میں

خیر خواہ
محبوب قلم کار طاہر جاوید مغل کے قلم سے
کہیں دلربا جذبات اور کہیں مضمحل احساسات سے گندھی ایک سبق آموز تحریر

اس کے علاوہ
انوار صدیقی کے قلم سے کشکول اور
ناصر ملک کے قلم سے مسافر ...... اپنے اندر سنسنی خیز لمحات سموئے سطر بہ سطر اپنے سفر پر گامزن
ملک صفدر حیات کی خطرناک تفتیش،
محفل شعر و سخن اور آپ کے خط

مزید
کاشف زبیر، ضیا تسنیم بلگرامی،
مریم کے خان، تنویر ریاض اور
ڈاکٹر شیر شاہ سید کی رنگارنگ
دلچسپ تحاریر آپ کی منتظر

WWW.PAKSOCIETY.COM

اکبر استادِ وحید کا قائل ہوا تو الہ آباد کے مشاعروں میں رونق سی آگئی۔ اب تک وحید کا چراغِ شاعری بجھا بجھا سا چمک رہا تھا لیکن اکبر نے اس کی لو کو تیز کر دیا۔ اس کی جسارت نے وحید کے دوسرے شاگردوں کو بھی بھڑکا دیا۔ الہ آباد دوسرا لکھنو بن گیا۔ جی لگنے کے دوسرے سامان بھی موجود تھے۔ وہ جما رہا۔

وقت تیزی سے تبدیل ہو رہا تھا۔ انگریزی عمل داری میں زمینداری سے ہونے والی آمدنی گھٹ گئی تھی۔ وحید عملی آدمی نہیں تھا کہ زمینداری کے بکھیڑوں میں پڑتا۔ روز بہ روز مالی مشکلات میں مبتلا ہوتا گیا۔ زندگی بھر کوئی نوکری نہیں کی تھی تو اب کیا کرتا؟ شاعری تھی اور شاگردوں کا سلوک۔ کوئی کسی بیرونی مشاعرے میں بلا لیتا تو نذرانے آجاتے۔ وہ خوش لباسی رخصت ہوگئی جو کبھی تھی۔ طوائفوں سے پرانی شناسائی تھی۔ اس گئے گزرے دور میں بھی وہاں کا جانا نہیں چھوٹا تھا۔ اب تو وہ صرف یہی کہہ سکتا تھا۔

عجب عشرت تھی جب تک تھی جوانی
وہ باتیں ہوگئیں اب سب پرانی

یہ لطف بھی اٹھا چکے کچھ دن کسی کے ساتھ
اب دل میں حوصلہ ہی نہیں رسم وراہ کا

اس کی شاعری کے چرچے تو دور دور تک تھے اب اس کی مالی بدحالی کے قصے بھی زبانوں پر آنے لگے تھے۔ مسلمان ریاستیں شعرا کی قدردانی کے فرائض انجام دے رہی تھیں۔ یہ ریاستیں بڑا مالی سہارا تھیں۔ رام پور اور حیدر آباد دکن ان میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ داغ، امیر، غالب وغیرہ رام پور میں دادِ سخن دے رہے تھے کہ وحید کے کسی عقیدت مند نے نظام حیدر آباد کے سامنے اس کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ اس کے پُرتاثیر اشعار سنے اور یہ بھی سنا کہ وہ ان دنوں ضرورت مند ہے تو نظام نے اسے اپنی ریاست میں بلانے کا فیصلہ کرلیا۔ ریاست حیدر آباد کی طرف سے اسے ریاست آنے کی دعوت دی گئی۔ اس نے اکبر سے مشورہ کیا جو اب الہ آباد میں وکالت کر رہا تھا۔ اکبر کو اس کی جدائی گوارا نہیں تھی لیکن استاد کی ترقی بھی منظور تھی۔ اس کی طرف سے بھی یہی رائے آئی کہ دبستانِ حیدر آباد میں شعرا کی قدردانی کا بازار گرم ہے۔ حیدر آباد جایا جائے تو کوئی حرج نہیں۔

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی لکھنو اور الہ آباد چھوڑ کر حیدر آباد چلا گیا۔ اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ابھی ملازمت کا بندوبست ہونا باقی تھا کہ اس کی خوددار طبیعت نے نوابوں کی جی حضوری سے انکار کر دیا۔ نظام نے خود اسے بلایا تھا لیکن اب ملاقات کے لیے ان کے خوشامدیوں کی خوشامد کرنی پڑ رہی تھی۔ یہاں موجود شعرا میں بھی اتنی کھینچا تانی تھی کہ اس کا دل اچاٹ ہوگیا۔ ابھی نظام سے ملاقات نہیں ہوئی تھی کہ لکھنو اور الہ آباد کی گلیاں یاد آنے لگی۔ الہ آباد سے آتے ہوئے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس شدت سے یادِ وطن آئے گی۔

نہ تھی عزمِ غربت سے پہلے خبر
کہ رلوائے گی خون یادِ وطن

اس نے ایک روز خاموشی سے رختِ سفر باندھا اور الہ آباد آگیا۔ اس نے شکر ادا کیا۔

درگزرے خلد سے ترے در کی زمیں تو ہے
شکر اس کا ہے کہ اپنا ٹھکانا کہیں تو ہے

اکبر کی شاعری عروج پر تھی۔ اس کی وکالت بھی الہ آباد اور اطراف میں دھوم مچا رہی تھی۔ اب وہ اس قابل تھا کہ استاد کی مالی معاونت بھی کرسکتا تھا۔

اس کی شاعری کے تیور دیکھ کر وحید کو اندازہ ہوتا تھا کہ یہ شاگرد اس کے نام کو زندہ رکھے گا۔ اس کا اندازہ درست تھا۔ تاریخ میں اگر کوئی وحید الہ آبادی کو جانتا ہے تو اس لیے کہ وہ اکبر الہ آبادی کا استاد تھا۔

وحید ثابت قدمی سے استادی کے تقاضے پورے کر رہا تھا۔ اس کے اشعار سینہ بہ سینہ ایک شہر سے دوسرے شہر پہنچ رہے تھے۔ مختلف علاقوں کے رئیس اسے اپنے دسترخوان پر طلب کر رہے تھے لیکن وہ اکبر اور الہ آباد کو چھوڑ کر کہیں جانے کو تیار نہیں تھا۔

پڑے ہیں صورتِ نقشِ قدم نہ چھیڑ ہمیں
ہم اور خاک میں مل جائیں گے اٹھانے سے

اب انگریزی تعلیم کا حلقۂ اثر محدود نہیں رہا تھا۔ ہندوستانیوں کی بڑی تعداد انگریزی تعلیم حاصل کر رہی تھی خاص طور پر وکالت کی تعلیم کا چرچا بہت تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے انگریزی داں وکیلوں کا تانتا بندھ گیا۔ قدیم وکلا کے پاس مقدمے بہت کم آنے لگے۔ بہت دن سے اکبر کے پاس بھی کوئی مقدمہ نہیں آیا تھا۔ اس نے دل برداشتہ ہوکر درخواست دے دی کہ اسے منصف بنا دیا جائے۔ اس کی درخواست منظور ہوئی اور اسے مرزا پور میں قائم مقام جج

WWW.PAKSOCIETY.COM

بنا دیا گیا۔ پھر اسے مختلف شہروں میں بھیجا جاتا رہا۔

اکبر کے بغیر اسے الہ آباد سنسان صحرا معلوم ہونے لگا۔ اکبر تو ایسا گیا تھا کہ لوٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ بہت دن گھر میں بیٹھا رہا۔ مشاعروں کے دعوت نامے آتے رہے مگر اس نے تو جیسے قسم کھالی تھی۔ اس کا ایسا دل اچاٹ ہوا کہ الہ آباد سے اپنے موروثی قصبے ''کڑا'' چلا آیا اور یہ سوچ کر آیا کہ زندگی کے باقی دن گوشہ نشینی میں گزار دے گا۔

اردو کے قدیم مراکز پر زوال آیا تو عظیم آباد اور کلکتہ مرکزِ شعرا بن گئے۔ اردو کا ایسا زور بندھا کہ جگہ جگہ مشاعرے ہونے لگے۔ دلی اور لکھنؤ کے بہت سے شعرا عظیم آباد اور کلکتہ میں جمع ہو گئے تھے۔ دہلی اور لکھنؤ کے اندازِ شاعری کی پیروی کی جارہی تھی۔

وحید کے پاس عظیم آباد سے مسلسل خطوط آرہے تھے۔ ایک خط رئیس اعظم پٹنہ مرزا ابو سعید کی جانب سے آیا۔ اس میں انہیں نہایت اصرار کے ساتھ پٹنہ عظیم آباد آنے کی دعوت دی گئی تھی۔ اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا پٹنہ میں لوگ کس شدت سے اس کا انتظار کررہے ہیں۔ پٹنہ پہنچتے ہی رؤسائے شہر نے اس کے استقبال کے لیے بڑی بڑی مجالس منعقد کیں۔ شعرائے عظیم آباد اس کے کلام بلاغت نظام کو سنتے تھے سر دھنتے تھے۔ وہ پہلے ہی مشاعرے میں کامیاب غزلیں پڑھ کر اٹھا تھا کہ کئی شاعر اس کے شاگرد ہو گئے۔

مہینے دو مہینے گزارنے کے بعد وہ کڑا واپس آگیا۔ پاؤں کھلنے کی دیر تھی کہ عظیم آباد اس کے لیے گھر کا آنگن بن گیا۔ ابھی آیا تھا ابھی پھر بلاوا آگیا۔ پٹنہ کا ایسا گرویدہ ہوا کہ شاگردوں کی محبت پر لکھنؤ اور الہ آباد کو قربان کردیا۔ پٹنہ میں قیام کا دورانیہ طویل سے طویل تر ہوتا چلا گیا۔ اس کثرت سے شاگرد بنے کہ مشاعروں میں شاگردوں کے پرے لے کر جاتا تھا۔

مشاعروں میں شاعروں کی تین پارٹیاں تھیں۔ ایک پارٹی صفیر بلگرامی اور ان کے تلامذہ کی۔ دوسری شاد عظیم آبادی اور ان کے شاگردوں کی۔ تیسری پارٹی وحید الہ آبادی اور ان کے تلامذہ کی تھی۔

شہر شعروسخن کا مرقع و مرجع بنا ہوا تھا۔ شعرا کی کثرت تھی۔ برابر مشاعرے ہوا کرتے تھے اور تینوں پارٹیاں شریک ہوتیں۔ گلدستے نکلتے تھے جن میں سب کی غزلیں شائع ہوتی تھیں۔ ایسی پذیرائی اس کی کہیں نہیں ہوئی تھی جیسی عظیم آباد میں ہو رہی تھی۔ اب اسے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں تھی۔

اکثر شام کو پٹنہ سٹی کے منگل تالاب کے کنارے گھاس پر تنہا بیٹھے رہتے تھے۔ پانی کی موجوں اور خوشگوار ہوا کا لطف اٹھاتے اور اشعار لکھا کرتے۔ سر کے بال الجھے رہتے تھے اور اچکن کے بوتام کچھ ٹوٹے کچھ کھلے رہتے تھے۔

اسی عظیم آباد میں اس نے وہ غزل لکھی جس کا مطلع تھا

ادھر آئینہ رکھا ہے ادھر وہ تن کے بیٹھے ہیں
جو اپنا دیکھنا منظور ہے کیا بن کے بیٹھے ہیں

☆☆☆

ایک مرتبہ کلکتہ کی مشہور ڈیرادار منی بائی حجاب رام پور آئی۔ داغ، رام پور کی سرکار سے منسلک تھا۔ طوائف کیا تھی زمین کا منہ چومتا ستارہ تھی۔ داغ کانوں اور آنکھوں دونوں کا رسیا۔ اسے دیکھا اسے سنا تو عاشق ہوگیا۔ جب تک وہ رام پور میں رہی داغ کی آنکھیں تسکین پاتی رہیں۔ وہ بھی آخر طوائف تھی۔ داغ جیسے جہاندیدہ کو مٹھی میں پکڑ کر بیٹھ گئی۔ داغ یہ تو بھول ہی گیا تھا کہ وہ رام پور کی نہیں ہے اسے جانا بھی ہوگا۔ ایک دن منی بائی کا پیغام آگیا کہ اسے رخصت کرو وہ کلکتہ جارہی ہے۔

''جاتی کیوں ہیں یہیں رہ جائیے۔''

کلکتہ کی رہنے والی کو بھلا رام پور کیا بھلا لگتا۔

''اچھا پھر کب آنا ہوگا۔''

''پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔''

حجاب رام پور سے گئی تھی دنیا سے تو نہیں چلی گئی تھی۔ وہ اسے خط تو لکھ سکتا تھا۔ اس نے خط لکھا۔ اس کا جواب آیا۔ خطوں کا سلسلہ چلتا رہا۔

حجاب کا خط آیا۔

''ہمارے تمہارے عشق کے چرچے کلکتہ تک آگئے ہیں۔ لوگ ہمیں طعنے دیتے ہیں کہ اگر داغ تمہارے سچے عاشق ہیں تو انہیں کلکتہ بلا کر دکھاؤ۔ خدارا ہماری لاج رکھ لیجیے۔ خط ملتے ہی کلکتہ کے لیے روانہ ہوجائیے۔''

داغ رام پور سے نکلا پہلے دلی گیا پھر لکھنؤ اور پھر عظیم آباد پہنچ گیا۔ اسے کچھ دن عظیم آباد میں رہ کر کلکتہ جانا تھا جہاں منی بائی اس کی منتظر تھی۔

باقر عظیم آبادی جو وحید کے شاگرد تھے، داغ سے

ملنے گئے۔ دوران گفتگو وحید کا ذکر نکل آیا۔

''استادِ محترم ان دنوں اپنے وطن گئے ہوئے ہیں۔ اگر آپ کچھ دن قبل آئے ہوتے تو ضرور ملاقات ہوجاتی۔''

باقر نے کچھ اس انداز سے استاد کی تعریف کی کہ داغ کو مبالغے کا گمان ہونے لگا۔ انہوں نے استاد کا مرتبہ جانچنے کے لیے وحید کے اشعار سنانے کی فرمائش کی۔ باقر نے اشعار سنانے شروع کیے۔ داغ کہتے رہے اور سناؤ اور سناؤ۔ یہاں تک باقر نے یہ مطلع سنایا۔

ادھر آئینہ رکھا ہے ادھر وہ تن کے بیٹھے ہیں
جو اپنا دیکھنا منظور ہے کیا بن کے بیٹھے ہیں

مطلع سننا تھا کہ داغ پھڑک کررہ گئے۔

''جس شاعر کا یہ مطلع ہے وہ واقعی عظیم استاد ہے۔ اپنے استاد کی قدر کرتے رہو یہ تمہیں بہت کچھ سکھا سکتا ہے۔ کاش! وہ یہاں ہوتے اور ہماری ملاقات ہوجاتی۔''

داغ کسی سرزمین پر پاؤں رکھے اور مشاعرہ نہ ہو۔ اس کے اعزاز میں مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ وحید کی غزل کا مصرع طرح کے طور پر دیا گیا۔

داغ نے اس مصرعِ طرح پر اپنی یادگار غزل کہی۔

بھویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں
کسی سے آج بگڑی ہے جو وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں

داغ نے کہا تھا

کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتہ چلے جائیں
عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

پورے ایک مہینے بعد وہ کلکتہ چلا گیا۔

وہ دو مہینے عظیم آباد میں رہ کر آیا تھا۔ اس کی بیٹی خدیجہ بھی آئی ہوئی تھی۔ رمضان کے دن تھے اس لیے اس نے کہہ دیا تھا کہ وہ اب کہیں نہیں جائے گا اور کم از کم عید تک یہیں رہے گا۔

اس رات وہ کچھ پریشان کچھ مضطرب سا نظر آرہا تھا۔ خدیجہ اس کے پاس بیٹھی تھی۔ وحید اسے عظیم آباد کے قصے سنا رہا تھا کہ اچانک بیوی سے مخاطب ہوا۔

''آپ نے مجھ سے کوئی سکھ نہیں پایا۔ اس شاعری کا برا ہو اس نے گھر میں رہنے ہی نہیں دیا۔ آپ نے تو یوں سمجھو میرے بغیر ہی کاٹ دی۔ آئندہ کی کسے خبر میں رہوں نہ رہوں۔''

''آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ میں نے کبھی کوئی شکایت کی؟''

''شکایت نہ کرنا بھی تو شکایت ہوتی ہے۔''

''اگر میری شکایت کا اتنا ہی احساس ہے تو اب کہیں نہ جائیے گا۔''

''یہ آپ نے اچھی کہی۔ ہمیں تو کل ہی جانا ہے۔ ہمارا جہاز تیار کھڑا ہے۔''

''اب کیا ولایت میں بھی مشاعرے ہونے لگے جو جہاز میں جاؤ گے۔''

''تم دیکھ لینا کل چلا جاؤں گا۔''

''توبہ! آپ کا بھی کوئی ٹھیک نہیں۔ ابھی کہہ رہے تھے عید تک کہیں نہیں جاؤں گا اور اب کل کے جانے کی ٹھہری ہے۔''

''خدیجہ کی ماں، تم بھی ہمیشہ کی بھولی ہو۔ مذاق بھی نہیں سمجھتیں۔''

''آپ نے مذاق کی عادت ہی نہیں ڈالی۔''

''اچھا چلو مذاق نہیں کرتے۔ سنجیدہ ہوجاتے ہیں۔ چھوٹا سا مشاعرہ گھر ہی میں کرلیتے ہیں۔ آپ نے ہمارے بہت سے شعر یاد کررکھے ہیں۔ اس وقت جی چاہتا ہے کچھ اشعار تمہاری زبانی سنے جائیں۔''

خدیجہ بھی ضد کرنے لگی۔ فاطمہ بی بی نے شوہر کا دل رکھنے کے لیے چند اشعار سنا ہی دیے۔

جانے کی سناتے ہو دہلتا ہے مرا دل
تم ہاتھ سے دیکھو تو اچھلتا ہے مرا دل
جب کرتا ہوں اس کوچے کا جانے کا میں کچھ قصد
تب دو قدم آگے مرے چلتا ہے مرا دل

☆☆

کہیں آرام سے وحشت ٹھہرنے ہی نہیں دیتی
بنائیں کون سے صحرا میں یارب ہم مکاں اپنا

''بس ایک شعر اور سن لیجیے۔''

یہ جب آنکھ ان سے لڑی نہ تھی یہ آنسوؤں کی جھڑی نہ تھی
کوئی رات اتنی بڑی نہ تھی کوئی پھانس دل میں گڑی نہ تھی

رات کو دیر تک جاگتے رہے۔ پھر سحری کرنے کے بعد سو گئے تھے۔ بیشتر گھروں کا یہی حال تھا۔ وہ بھی کچھ سو کچھ جاگ رہے تھے کہ یکبارگی ایک شور اٹھا ''آگ لگ گئی آگ لگ گئی۔''

وہ گھبرا کر اٹھا۔ بہت سے لوگ جمع تھے، کچھ لوگ اس طرف بھاگ رہے تھے جہاں آگ لگی تھی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا شیخ محمد علیم رئیس محلہ چوہدرانہ کے گھر میں مسجد

WWW.PAKSOCIETY.COM

جانے کے لیے افطاری پک رہی تھی۔ اتفاق سے کڑھائی میں سے تیل جل کر اڑا۔ ایک لمحے میں پھوس کا چھپر آتش کدہ بن گیا۔ یہ آگ دوسرے محلوں میں پھیل گئی۔ لوگ آگ بجھانے کی کوشش کرتے رہے لیکن ان کی تدبیریں کارگر نہ ہوئیں۔ آگ پھیلتی گئی۔ اس روز ہوا بھی تیز تھی۔ چنگاریاں اُڑتی رہیں گھر جلتے رہے۔

جب آگ محلہ مولویانہ کو چھونے لگی تو وحید بھاگ کر گھر میں آیا۔ مستورات کو مکان کے دوسرے حصے میں پہنچا دیا جس میں ایک بڑا صحن تھا اور پھوس کے چھپر وغیرہ نہیں تھے۔ اتنی دیر میں آگ کے شعلے اس کے گھر تک پہنچ گئے۔ گھر دھڑ دھڑ جلنے لگا۔ بھرا گھر سامان سمیت جل رہا تھا۔ لوگ آگ بجھانے میں مشغول تھے۔ اچانک اسے کچھ یاد آیا۔

''ہائے میرا دیوان، ہائے میرا دیوان۔''

وہ بے تحاشا بھاگا اور آگ کے شعلوں میں گم ہوگیا، لوگوں نے کچھ خیال نہیں کیا، افراتفری ایسی مچی تھی کہ کسی کو کچھ خیال نہیں تھا۔ اس کے بھانجے ابونصر نے کسی کام سے اسے آواز دی۔ وہ باہر ہوتا تو جواب دیتا۔

''ارے بھائی مولانا وحید نظر نہیں آرہے ہیں۔''

ان کی تلاش بھی ہوتی رہی اور آگ بجھانے کے سامان بھی۔ آگ کی شدت میں کمی آگئی تھی۔ چمنیوں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ وحید کو آوازیں دی جارہی تھیں۔ ایک نوکرانی نے بتایا کہ اس نے وحید کو دیوان خانے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ سننا تھا کہ لوگ گھر کی طرف دوڑے۔ آگ بجھ چکی تھی لیکن کمرے میں جانا اب بھی دشوار تھا۔ ابونصر کچھ لوگوں کے ساتھ چھت پر چڑھ گیا تھا۔ یہ لوگ چھت کی کڑیاں کاٹ کر اندر اتر گئے۔ اب دھواں کسی قدر کم ہوگیا تھا لیکن پھر بھی سانس لینا دشوار ہورہا تھا۔ وحید ایک کرسی پر قبلہ رو بیٹھا تھا۔ پاس زمین پر قلم دوات پڑا تھا۔ ایک زانو پر روپوں کا بٹوا رکھا تھا دوسرے زانو پر کھلا ہوا دیوان رکھا تھا۔ چند چنگاریاں اڑ کر دیوان پر بھی جا گری تھیں جس کے نشانات نظر آرہے تھے۔

صورتِ حال پوری طرح واضح تھی۔ وہ شعلوں کو پھلانگتے ہوئے کمرے تک آئے۔ دیوان تو مل گیا لیکن واپسی کا راستہ نہ مل سکا۔ جب موت سامنے نظر آئی تو قسمت پر شاکر ہوکر ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ جلدی جلدی دیوان کھولا اور ایک سادہ صفحے پر یہ تحریر لکھ دی۔

بعد السلام علیکم ''ظاہر ہو کہ اس دیوان پر نظرِ ثانی نہیں ہوئی اور غلطیاں کثرت سے ہیں۔ جو صاحب اس کو چھپوانے یا شہرت دینے کا قصد کریں لازم ہے کہ کسی اچھے شاعر کو دکھالیں۔ اس میں کچھ مضائقہ نہیں۔ مردہ بدست زندہ۔

وحید الدین

یہ اس کی آخری تحریر تھی جو محفوظ ہوگئی۔ موت کے سامنے ہوش وحواس بجا رکھنا اور نصیحت آمیز وصیت نامہ تحریر کرنا آسان کام نہیں۔ یہ وہی کرسکتا ہے جو مرضیِ مولا پر شاکر ہو۔

جو لوگ کمرے میں اترے تھے انہوں نے وحید کو اٹھایا اور باہر لے کر آئے۔ کپڑے سلامت تھے بدن پر جلنے کا کوئی نشان بھی نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ انتقال دم گھٹنے سے ہوا ہے۔

اس کے مرنے کی خبر آناً فاناً پھیل گئی مگر اعزہ کو اس کی موت پر شک تھا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ وحید کو سکتہ ہوا ہے موت واقع نہیں ہوئی۔ اسی خیال سے لاش رات بھر رکھی رہی۔

وحید کی لاش کی زیارت سہ پہر سے لوگ کرتے رہے اور دوسرے دن صبح تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔

یہ یقین کرنا پڑا کہ موت واقع ہوگئی ہے سکتہ نہیں ہوا۔

عزیزوں سے اجازت لی گئی اور اس بے بدل شاعر کی میت کو غسل دیا گیا۔ غسل دیتے وقت اس کی ریش کے کچھ بال نہلانے والوں کے ہاتھوں میں آگئے۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ آگ نے اسے کس طرح جھلس دیا تھا۔

اس کا جنازہ ہزاروں غم گساروں کے کاندھے پر محلہ مولویانہ، قصبہ کڑا سے اٹھایا گیا تو اس کا یہ شعر بہت سے لوگوں کی زبانوں پر تھا۔

لاش کاندھے پہ اٹھائیں گے تو عجلت ہوگی
رنج پہنچائے گا یوں دوش عزیزاں ہم کو

وحید کو آبائی قبرستان اسماعیل پور میں جدِ امجد اسماعیل فاروقی کے مزار کے قریب دفن کیا گیا۔ مزار آج بھی موجود ہے۔

انتقال 1309ھ گیارھویں رمضان بہ مطابق 9 اپریل 1892ء کو ہوا اور اگلے دن دفن ہوئے۔ موت کے وقت عمر ستر سال تھی۔

اس کی موت کی خبر اسی دن شام کے ہوتے ہوتے بذریعہ تار پٹنہ عظیم آباد پہنچ گئی۔ اسی شام افطار کے بعد اس کی یاد میں ایک محفل منعقد ہوئی۔ اس میں ایک شاگرد نے یہ قطعہ پڑھا۔

بزمِ سنسان دیکھ کر یاد آگئے مجھ کو وحید
چوٹ اِک دل پر لگی یہ مشغلہ ہونا نہ تھا

فی الحقیقت شاعری کا وہ مزہ جاتا رہا
گو پئے تفریح یہ چرچا ہوا ہونا نہ تھا
اٹھ گیا دنیا سے جب وہ بلبل گلزار نظم
شغل یہ بعد وحید خوش نوا ہونا نہ تھا

اکبرالہ آبادی ان دنوں آگرے میں تھا کہ اسے اس دردناک سانحے کی اطلاع ملی۔ اس حادثے کی تپش اس نے خود سے بہت قریب محسوس کی۔ یہ دھواں تھا کہ تپش کی تکلیف، اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔

وحید کے انتقال پر دنیائے شعروشاعری میں ہر طرف کہرام مچ گیا۔ ہر کسی نے ایسے خوش نوا شاعر کی اس حسرت ناک موت پر آنسو بہائے۔ تاریخ ہائے وفات لکھی گئیں۔ اخباروں نے مضامین چھاپے۔

شہرت کی بنیاد قسمت پر ہے اور اس کے کچھ اسباب بھی ہوتے ہیں۔ یہ سب اسباب نہ جانے کیوں وحید کے خلاف گئے۔ وہ شہرت کی بلندیوں پر جانے کے بجائے گوشۂ گم نامی میں چلا گیا۔ اردو شاعری میں اس کے مرتبے کا صحیح تعین نہ ہوسکا اور نہ تاریخ شعرا میں جگہ مل سکی حالانکہ اس کی شاعرانہ شخصیت داغ و اکبر اور ان کے معاصرین سے کسی طرح کم نہیں تھی۔ افسوس کہ اس کا مکمل دیوان شائع نہ ہوسکا اور لوگوں نے اسے بہت کم جانا۔ اس کی شہرت صرف یہ رہ گئی کہ وہ اکبرالہ آبادی کا استاد تھا۔

وحید کے انتقال کے بعد اس کے داماد اولادحسن کے پاس بہت سے لوگ صرف اس غرض سے آئے کہ وحید کے اس تاریخی دیوان کی زیارت کریں جس کو بچانے میں اس کی روح قالب سے پرواز کرگئی تھی۔

خاندان والوں کی اس دیوان سے ایسی جذباتی وابستگی تھی کہ اسے گوہر نایاب سمجھ کر لوگوں سے چھپایا جانے لگا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ اسے ایک بکس میں مقفل رکھا جانے لگا۔ بہت سے لوگوں نے اسے چھپوانا چاہا لیکن حد سے زیادہ احتیاط نے ناشرین کو مایوس کردیا۔ اولادحسن اس دیوان کو لے کر پٹنہ بھی گئے۔ یہاں وحید کے عقیدت مند کم نہیں تھے۔ انہوں نے چھپوانے کا قصد بھی کیا لیکن اولادحسن نے دیوان اس خوف سے کسی کے حوالے نہیں کیا کہ کہیں دیوان ہاتھ سے نہ چلا جائے۔

اولادحسن اس دیوان کو لے کر پٹنہ سے لکھنو آئے۔ یہاں انہیں مولانا وحید کی وصیت یاد آئی کہ اشاعت سے پہلے کسی اچھے شاعر کو دکھالیا جائے۔ وہ امیرمینائی کے پاس پہنچے۔

''حضرت، میں اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ اس کی اشاعت سے قبل آپ اس پر ایک نظر ڈال لیں تاکہ غلطیاں صاف ہوجائیں۔''

امیرمینائی نے دیوان اٹھا کر سر پر رکھ لیا اور فرمایا ''میں ایسے استادِ وقت کے کلام پر قلم چلانے کی جرأت کیسے کرسکتا ہوں۔''

''پھر اس کی طباعت اسی حالت میں جلد از جلد کرادیجیے۔''

امیرمینائی نے شاید وعدہ بھی کیا لیکن طباعت نہ ہوسکی۔ دیوان اولادحسن کے پاس رہا۔

اولادحسن کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے محمد قادر عثمانی نے اپنے برادر نسبتی بدرالحسن عثمانی کے پاس حیدرآباد بھیجا۔ بدرالحسن رجسٹرار عثمانیہ یونیورسٹی تھے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق بھی ان دنوں حیدرآباد میں تھے۔ انہوں نے یہ دیوان مولوی عبدالحق کے حوالے کردیا۔ انہوں نے اس کی طباعت کا وعدہ بھی کیا۔

دن گزرتے گئے۔ عبدالحق کی جان کو اور بہت بکھیڑے تھے۔ وعدہ تو کرلیا تھا لیکن وعدہ وفا نہیں ہورہا تھا۔ تقاضے ہورہے تھے لیکن مولوی صاحب ٹالے جارہے تھے۔ نہ دیوان واپس آرہا تھا نہ طباعت ہورہی تھی۔ خاندانِ وحید پر بوکھلاہٹ سی طاری ہونے لگی تھی کہ یا اللہ دیوان ہاتھوں سے گیا۔ مہینوں گزر گئے دیوان کی شکل دیکھنے کو نہیں ملی۔ ادھر سے تقاضے ادھر سکوت بہرحال بدرالحسن کے بڑے بھائی فیاض الحسن نے دیوان واپس لینے کی ذمے داری اپنے سر لی۔ قوی ہیکل آدمی تھے۔ انہیں یقین تھا کہ ان کی دھمکی رائگاں نہیں جائے گی۔ عبدالحق مرعوب ہوکر دیوان واپس کردیں گے وہ ایک دن اس باغ میں پہنچ گئے جہاں مولوی عبدالحق صبح کے وقت ٹہلنے آیا کرتے تھے۔ مولوی صاحب چہل قدمی میں مشغول تھے کہ وہ ان کے سامنے آگئے۔

''مولوی صاحب ہمارے خاندان کی عورتیں جو صبح اٹھ کر دیوان دیکھ کر وحید کو یاد کیا کرتی تھیں اب اس دیوان کے یہاں چلے آنے سے بددعائیں دیتی ہیں۔ یا تو اسے چھپوادیجیے یا واپس کردیجیے۔ واپس کرنا ہے تو یہ کام آج ہی ہوگا۔''

''بھائی مجھے کچھ دن اور دے دو۔ میں اسے چھپوادوں گا۔''

''یہ تو آپ کب سے کہہ رہے ہیں۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

"اس مرتبہ وعدہ ضرور وفا ہوگا۔"
"میں آپ کو صرف پندرہ دن اور دوں گا۔"
"پندرہ دن بہت کم ہیں۔"
"اس سے زیادہ نہیں۔ صرف پندرہ دن۔"
فیاض الحسن پندرہ دن کا وقت دے کر آ گئے۔
مولوی صاحب نے سید علی حسنین زیبا صاحب کو اس کام پر متعین کیا۔
"یہ دیوان ہے اس کا انتخاب کر دیں اور مقدمہ لکھ دیں۔ اور یہ کام پندرہ دن میں ہونا چاہیے۔"
یہ کام پندرہ دن کا نہیں تھا لیکن حسنین زیبا نے نمٹا دیا۔ نہیں کہا جا سکتا کون سے موتی پرو دیے گئے کون سے رہ گئے۔
دیوان پھر بھی شائع نہیں ہوا محض انتخاب شائع ہوا۔ 23 ہزار اشعار کا انتخاب و مقدمہ سب کچھ پندرہ دن میں لکھ کر ترتیب دے دیا گیا۔
اس دیوان کی ایک نقل مولوی فضل احمد صاحب کے پاس تھی جو وحید کی نواسی کے شوہر تھے۔ ان کے فرزند فیض احمد فیضی لکھنو کے ایک بینک میں ملازم تھے۔ شاعر تھے لہٰذا ناطق لکھنوی سے ملاقات ہوئی۔ ناطق صاحب کو معلوم ہوا کہ وہ وحید الہ آبادی کے عزیزوں میں سے ہیں تو بڑے خوش ہوئے۔ اکثر وحید صاحب کا تذکرہ ہونے لگا۔
"بھئی تمہیں جتنے اشعار یاد تھے وہ تو تم نے مجھے سنا دیے۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرحوم کمال کے استاد شاعر تھے۔ اگر ان کا کلام پڑھنے کو مل جاتا تو ذوقِ نظر کو تسکین ہوتی مگر آپ کہتے ہیں دیوان چھپ ہی نہیں سکا۔"
"جی ہاں دیوان تو شائع نہیں ہوا۔ اصلی دیوان کی ایک نقل میرے پاس ہے۔ پڑھنے کے لیے آپ کو دے سکتا ہوں لیکن ایک ہی نقل ہے واپس کرنا نہ بھولیے گا۔"
"میں دن رات کر کے پڑھوں گا اور جلد واپس کر دوں گا۔"
فیض احمد نے دیوان کی نقل انہیں دے دی۔ پھر وہی ہوا آج کل میں دن گزرتے گئے۔ ادھر سیاسی حالات نے کروٹ لی۔ تقسیم ہند کا مرحلہ آ گیا۔ ایسی بھگدڑ مچی کہ کسی کو کسی کا ہوش نہ رہا۔ فیض احمد لکھنؤ سے پاکستان ہجرت کر گئے۔ یہ یاد ہی نہیں رہا کہ دیوان ناطق لکھنوی کے پاس ہے۔
پاکستان آنے کے بعد بھی کچھ ایسی پریشانی تھی کہ دیوان کا خیال ہی نہ آیا۔ جب ذرا فرصت ملی تو فیض احمد نے اپنی شاعری کی کتابیں نکالیں۔ اپنی غزلیں دیکھیں تو اچانک دیوان وحید یاد آیا۔ ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ کسی کی امانت تھی ہاتھ سے جاتی رہی۔
ہندوستان میں کچھ عزیز رہ گئے تھے۔ ان سے رابطہ کیا گیا۔ معلوم ہوا ناطق لکھنوی کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان کے صاحب زادوں سے تقاضا کیا گیا تو وہ منحرف ہو گئے اور لاعلمی ظاہر کی۔
خدا جانے دیوان کہاں گیا۔ وحید کے اشعار کس کس کے کلام میں شامل ہوئے۔
یہی حال وحید کے کتب خانے کا ہوا۔
وحید کے پاس قلمی و مطبوعہ کتابوں کے نایاب نسخے بڑی تعداد میں تھے۔ یہ کتابیں اور نسخے اس نے بڑی تگ و دو ..... اور جدوجہد اور پیسے خرچ کر کے حاصل کی تھیں۔ دیوان تو خیر لیکن یہ کتابیں بھی زندگی بھر کا سرمایہ تھیں۔ شہر شہر گھوم کر جمع کی تھیں۔ اس کتب خانے میں وہ کتابیں بھی تھیں جو اُن کے والد کی یادگار تھیں۔ شاعری کے علاوہ مذہبی علوم کی صدہا کتابیں وحید کے پاس تھیں۔
یہ کتب خانہ وحید کے حقیقی نواسے مولوی محمد عوض کے قبضے میں تھا۔ وہ اس کی اچھی طرح دیکھ بھال بھی کر رہے تھے لیکن پھر انہیں تلاش معاش کے سلسلے میں کانپور جانا پڑا۔ انہوں نے اپنے بہنوئی فضل احمد کو بلایا اور اس تاکید کے ساتھ کتب خانہ انہیں سونپ دیا کہ نانا ابا کی یادگار ہے اس کی اچھی طرح دیکھ بھال کرتے رہنا۔
فضل احمد اچھی طرح دیکھ بھال نہ کر سکے۔ بہت سی نایاب کتابوں کو کیڑا لگ گیا۔ انہوں نے نہ صرف اس پر اکتفا کیا بلکہ جب وہ پاکستان جانے کی تیاری کرنے لگے تو جتنی نایاب کتابیں کیڑا لگنے سے بچ گئی تھیں فروخت کر ڈالیں۔ اس طرح یہ کتابیں ہمیشہ کے لیے تتر بتر ہو کر رہ گئیں۔

کیا ہوا دامانِ گل میں قطرۂ شبنم جو تھا
وہ دُرِ نایاب نسیانِ چمن کیا ہوگیا
شمع کے گل ہوتے ہی پروانے راہی ہوگئے
دفعتاً کیا تھا میانِ انجمن کیا ہوگیا

ماخذات

وحید الہ آبادی...... مرتبہ محمد واصل عثمانی
اکبر الہ آبادی... خواجہ محمد زکریا (ڈاکٹر)
نساخ حیات و تصانیف...... ڈاکٹر محمد صدر الحق

قابلِ فخر کھلاڑی

ابن کبیر

آنسوئوں کی رو میں وہ موتیوں کی کھیپ لے کر اس دیس کی فصیلِ مشرق سے طلوع ہوا جہاں تعصب اوج ثریا پر نظر آ رہا تھا، جہاں سفید فام کے لیے ہر سہولت تھی اور رنگدار کے لیے مصائب ہی مصائب، دشواریاں ہی دشواریاں۔ پھر بھی اس نے اپنی انتھک محنت اور امورِ شرعی کی بجا آوری سے اپنی دنیا تخلیق کی جس کا نتیجہ ہے کہ آج اس کے نام کا ڈنکا چار سو بج رہا ہے۔ اس نے ثابت کیا کہ اللہ پر یقین ہی کامیابی کی سند ہے، بس انسان کو اپنے حصے کا کام انجام دے لینا ضروری ہے۔

عالمی پیمانے کے ایک بلّے باز کی زندگی کا احوال

ڈربن...... جنوبی افریقا کی مصروف ترین بندرگاہ، سیاحوں کا من پسند شہر، جس کی مرطوب ہواؤں میں جادو ہے، جہاں سمندری لہریں ساحل کو چھونے کی خواہش میں بچتی ہیں، جس کے پانیوں پر رنگین روشنیاں رقص کرتی ہیں...... یہی ڈربن میرا آبائی وطن ہے، میرے وجود کا حصہ ہے۔ اور جب اس کی فضاؤں میں موذن کی آواز گونجتی ہے، میری دھڑکن تیز ہو جاتی ہے۔
یہی دھڑکن میری کُل کہانی ہے!
میں، ہاشم محمد آملہ 31 مارچ 1983 کو ڈربن میں مقیم ایک مسلم گھرانے میں پیدا ہوا۔ تین ہزار کلومیٹر پر پھیلا میرا آبائی وطن صوبہ نٹال کا مرکزی شہر ہے، مگر اس کے ساحلوں اور روشنیوں کی تفصیلات میں جانے سے قبل یہ گوش گزار کرنا چاہوں گا کہ میرے اجداد کا تعلق جنوبی افریقا سے نہیں، ہندوستانی ریاست گجرات کے شہر سورت سے ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

آج سورت کا شمار تیزی سے ترقی کرنے والے شہروں میں ہوتا ہے۔ یہ دنیا کا تیسرا صاف ترین شہر ہے، مگر یہ ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا۔ جب میرے اجداد نے ہندوستان سے ہجرت کی تھی، وہاں حالات تھوڑے مختلف تھے۔

میں گجرات کی کہانیاں سنتے ہوئے بڑا ہوا اور وہاں جانے کی خواہش لیے جوان ہوا۔ اور یہ خواہش بڑے ہی عجیب ڈھنگ سے پوری ہوئی۔

میں نے ایک راسخ العقیدہ گھرانے میں شعور کی دہلیز عبور کی۔ ایک ایسا گھرانا، جسے شاید آپ قدامت پسند کہنا پسند کریں لیکن مجھے اِس...... سے شدید اختلاف ہے۔

آپ کو یہ سمجھنا پڑے گا کہ دنیا بھر میں اقلیتیں ایک عمومی رجحان کی حامل ہوتی ہیں۔ خود کو اکثریت کے اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے ہر اقلیت رسم و رواج اور روایات کو خصوصی اہمیت دیتی ہے۔ اِسے اپنی انفرادیت برقرار رکھنے کی کوشش تو قرار دیا جاسکتا ہے، مگر قدامت پسندی نہیں۔ ایک معنوں میں یہ اپنے زرخیز ماضی سے رشتہ جوڑنے کا ایک طریقہ ہے۔

یہ سچ ہے کہ مذہب سے محبت، خدا پر میرا یقین گھر کے ماحول کی دین ہے لیکن اس میں پختگی وقت کے ساتھ آئی۔ جوں جوں میں بڑا ہوتا گیا، مذہب کی جانب میرا رجحان بڑھتا گیا۔ میں دین میں دلچسپی لینے لگا۔ اللہ کی ذات پر میرا ایمان پختہ ہوتا گیا۔

اور اِسی یقین نے مجھے کرکٹ کی دنیا میں درجنوں ریکارڈ بنانے کی قوت عطا کی!

☆☆☆

کھڑکی سے دکھائی دیتے لہراتے، گنگناتے سرسبز درخت۔ گھر کے سامنے سے گزرتی پختہ سڑک۔ بااخلاق محلے دار۔ ہم خیال دوست... اور اس پر مستزاد باورچی خانے سے اٹھتی مسالے دار کھانوں کی خوشبو...... آہ، بچپن ایک حسین یاد کی صورت میرے ذہن میں محفوظ ہے۔

جس مکان میں، میں نے کم سنی کے دن گزارے، وہاں کے باسی کرکٹ کے سحر میں مبتلا تھے۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ مجھے یہ شوق وراثت میں ملا۔ تماشائیوں سے بھرا اسٹیڈیم، سرسبز میدان، تیز پچ...... بچپن ہی سے مجھے پکارتے تھے۔ تحریک دیتے تھے کہ میں بلّا تھام کر میدان میں اتر جاؤں، اُن صلاحیتوں کا اظہار کروں جو ربِ کائنات نے مجھے عطا کیں۔ اور میں نے ایسا ہی کیا۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ میں نے اپنے دل کی آواز سنی۔ اور جیسا کہ صوفی کہتے ہیں، انسان کا دل خدا سے براہِ راست رابطے کا ذریعہ ہے۔

یوں تو میرا پورا گھرانا کرکٹ کا شائق تھا، مگر میں اپنے بڑے بھائی احمد آملہ کو کریڈٹ دینا چاہوں گا۔ اسی کی سرگرمیوں نے مجھے کرکٹ کو کیریئر بنانے کی راہ سجھائی۔

احمد مجھ سے چار برس بڑا تھا لیکن ہمارے درمیان ہمیشہ دوستانہ روابط رہے۔ مجھے یاد ہے، جب پہلی بار میں نے اُسے سفید کٹ میں، پیڈز باندھے اور ہاتھوں میں دستانے پہنے دیکھا تھا، میرے دھڑکن تیز ہوگئی تھی۔

احمد سیدھے ہاتھ کا بلّے باز تھا۔ اُس کے شاٹس میں کمال کی قوت تھی۔ وہ بے حد پھرتیلا اور چوکس تھا۔ گو کہ رنگ دار لوگوں کے لیے اُس زمانے میں مواقع خاصے محدود تھے لیکن اس کی صلاحیتیں کسی رکاوٹ کو خاطر میں لانے کا ارادہ نہیں رکھتی تھیں۔

اُس نے اپنی درس گاہ کی نمائندگی کی۔ پھر کلب کرکٹ کھیلنے لگا۔ ہم اس کے میچ دیکھنے باقاعدگی سے اسٹیڈیم جایا کرتے تھے۔ وہاں پکنک کا سماں ہوتا۔ میری والدہ پھل، کیک اور بسکٹ ساتھ رکھ لیتیں۔ دوران میچ ہم احمد کے حق میں نعرے لگاتے۔ خوب شور مچاتے۔ اور جب کبھی اخبارات کے کسی کونے میں شائع ہونے والی چھوٹی سی خبر میں میرے بڑے بھائی کا ذکر آتا، میں اخبار کا وہ ٹکڑا کاٹ لیا کرتا اور اپنے پاس محفوظ کرلیتا۔

جن دنوں وہ کلب کرکٹ کھیل رہا تھا، فرسٹ کلاس کرکٹر بننے کی خواہش اسے بے کل رکھتی تھی۔ وہ ہر نماز کے بعد اپنے خواب کی تکمیل کی دعا کیا کرتا۔ میں ان دعاؤں میں اس کے ساتھ شریک ہوتا۔ میری بھی خواہش تھی کہ وہ فرسٹ کلاس کرکٹ کھیلے۔

احمد کی محنت رائگاں نہیں گئی۔ فقط اٹھارہ سال کی عمر میں اُس کا خواب پورا ہوا۔ مصائب کا ریگستان عبور کرتے ہوئے وہ فرسٹ کلاس کرکٹر بن گیا۔

جو لوگ جنوبی افریقا کے مسائل سے آگاہ ہیں، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ سفر انتہائی دشوار رہا ہوگا۔ جنوبی افریقا میں ایک طویل عرصے تک تعصب کا آسیب چھایا رہا۔ فقط سفید فام کرکٹرز کو گلے کا ہار بنایا جاتا تھا۔ رنگ دار کھلاڑی تو کسی گنتی ہی میں نہیں تھے۔ ایسے میں ایشیا سے تعلق رکھنے والے ایک مسلمان لڑکے کے لیے فرسٹ کلاس کرکٹ کھیلنا ایک بڑا کارنامہ تھا۔ جس ٹیم کی طرف سے اُس نے اپنا پہلا فرسٹ کلاس میچ کھیلا، وہ اُس میں شامل اکلوتا غیر سفید فام کھلاڑی تھا۔

مجھے کہنے دیجیے کہ وہ ہماری نسل کا رول ماڈل تھا، ہم اسے قابلِ تقلید خیال کرتے تھے۔

آج احمد ڈربن کی مشہور کرکٹ ٹیم ڈولفنز کا کپتان ہے۔ وہ آج بھی میرا ہیرو ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اُس کی اور میری کہانی متوازی چلتی ہے۔

☆☆☆

سفید پوش، متوسط گھرانا۔ سیدھے سادے ملازمت پیشہ والدین۔ اخلاقی و دینی تعلیمات...... شاید اِن ہی عوامل نے میری شخصیت کی تعمیر کی۔

ایک جانب جہاں مجھ پر محنت کی عظمت آشکار ہوئی، وہیں فضول گوئی سے اجتناب برتتے ہوئے اخلاقیات کی پاس داری کا شعور پیدا ہوا۔

ہماری کمیونٹی میں تعلیم پہلی ترجیح تھی۔ والدین کی یہی خواہش ہوا کرتی کہ اُن کا بچہ پڑھے لکھے، اچھی ملازمت حاصل کرے۔ اور پھر کسی سگھڑ لڑکی سے اُس کی شادی کردی جائے۔ ہم نوجوانوں کو بڑے بوڑھوں کی جانب سے ہمیشہ یہی ہدایت کی جاتی کہ اپنی پڑھائی پر توجہ دو، تاکہ کل اپنے پیروں پر کھڑے ہوسکو!

میرے والد معالج تھے۔ اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں طب کے پیشے سے وابستہ ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ اُس کا بیٹا بھی ڈاکٹر بنے۔ میرے والد کے دل میں بھی اِس خواہش کا بگولا گردش کرتا تھا، پر وہ ایک وسیع القلب انسان تھے۔ انہوں نے کبھی کرکٹ کھیلنے پر روک ٹوک نہیں کی۔ ہمیشہ یہی کہا "اپنے خوابوں کا تعاقب کرو۔ کبھی محنت سے جی مت چراؤ۔ منفی خیالات کو پاس مت پھٹکنے دو۔ اور ہمیشہ خدا پر بھروسا رکھو۔"

میں نے پوری زندگی اِسی نصیحت پر عمل کیا۔

☆☆☆

جیسا کہ میں نے کہا، ہمارے ہاں تعلیم پہلی ترجیح تھی۔ اور میں کسی طور اِس شرط سے ماورا نہیں تھا۔ کرکٹ کا شوق اپنی جگہ لیکن مجھے ہر صورت خود کو اچھا طالب علم ثابت کرنا تھا۔

خوش قسمتی سے جس درس گاہ سے مجھے تحصیلِ علم کا موقع ملا، اُس کا شمار شہر کے بہترین اداروں میں ہوتا تھا۔

ڈربن ہائی اسکول نہ صرف علمی نقطۂ نگاہ سے مستند ادارہ تھا، بلکہ نوجوان کرکٹر پیدا کرنے میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ یہی ادارہ وہ اکلوتا فرق ہے، جس کے طفیل میں جنوبی افریقا کی قومی ٹیم کا حصہ بن گیا، جب کہ میرا باصلاحیت بھائی فرسٹ کلاس کرکٹ تک محدود رہ گیا۔

میں نے آپ سے کہا تھا ناں، میری اور احمد کی کہانی متوازی چلتی ہے۔

قصہ کچھ یوں ہے کہ میرے برعکس احمد نے ایک ایسے اسکول سے تعلیم حاصل کی، جو ہندوستانیوں کے لیے مخصوص تھا۔ گو کہ اُس کی اور میری عمروں میں فقط چار برس کا فرق ہے، لیکن جس زمانے میں اُس نے تعلیمی سفر کا آغاز کیا، حالات مختلف تھے۔ ان ہی چار برسوں میں تو انقلابی تبدیلیاں آئیں۔ جنوبی افریقا میں مفید... اصلاحات کا اطلاق ہوا۔ اقلیتوں کے حقوق تسلیم کیے گئے۔ رنگ داروں کو یکساں مواقع ملنے لگے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ احمد میرے مانند خوش قسمت نہیں رہا۔ اُس کے پاس مواقع کی کمی تھی۔ مسائل کے انبار تھے۔ رنگ دار بچوں کے لیے الگ امتحانی نظام تھا۔ الگ نصاب تھا، جس میں کئی خامیاں تھیں، جو ترقی کی راہ میں دیوارِ چین ثابت ہوتیں۔ کسی نے صحیح کہا ہے، تعصب پر مبنی تعلیم فقط بگاڑ ہی پیدا کرسکتی ہے!

خیر، جب میں نے تعلیمی سفر شروع کیا، اصلاحات کا بڑی حد تک اطلاق ہوچکا تھا، جنوبی افریقا کے عظیم لیڈر نیلسن منڈیلا کی کوششوں کے اثرات ظاہر ہونے لگے تھے اور مساوات پر مبنی یکساں تعلیمی نظام کا تجربہ شروع کردیا گیا تھا۔ یوں اپنے بھائی کے برعکس مجھے جدید تعلیمی نظام سے استفادہ کرنے کا سنہری موقع ملا۔ قابل اساتذہ میسر آئے۔

بہ طور کرکٹر بھی احمد کو محدود میدان ملا۔ اُس کی صلاحیتوں کا موازنہ دیگر ہندوستانی کھلاڑیوں ہی سے ہوتا۔ کرکٹ میچ بھی دیگر ہندوستانی یا رنگ دار اسکولوں کی ٹیموں سے رکھے جاتے۔ سفید فام طلبا کے لیے مخصوص درس گاہیں تو رنگ دار کرکٹرز کو درخورِ اعتنا ہی نہیں جانتی تھیں۔ استحصال کا یہ عالم تھا کہ اُن کے ساتھ چھوت کے مریضوں سا سلوک کیا جاتا۔ احمد اور اُس کے ساتھی کرکٹرز کے کارناموں کا ذکر بھی فقط ہندوستانی کمیونٹی کی جانب سے نکلنے والے اخبارات میں ہوتا۔ یہ تو بہت بعد کی بات ہے، جب میرے بھائی نے ڈربن کے سفید فام حلقوں میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔

وسائل کی کمی نے بھی احمد کے لیے کئی مشکلات کھڑی کیں۔ اچھی کٹ کا حصول ایک دشوار مرحلہ تھا۔ سستے پیڈز اور دستانے، غیر آرام دہ ہیلمٹ، دوسرے درجے کے بلّے

WWW.PAKSOCIETY.COM

اور گیندیں اُس کی مجبوریوں کی داستان سناتے تھے۔ اچھے کوچز کا بھی ایک مسئلہ رہا۔ کوئی نامور کوچ ہندوستانی کھلاڑیوں میں دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ ہر ماہر سفید فام کرکٹرز کو تربیت دینے میں ہی خود کو آرام دہ پاتا۔

احمد کے ساتھی طلبا کرکٹ کے شائق ضرور تھے لیکن اُن میں سے کوئی اِس کھیل کو سنجیدگی سے نہیں لیتا۔

"وہ اِسے پیشہ بنانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔" احمد اکثر مجھ سے کہا کرتا تھا۔ "وہ تو بس ڈاکٹر یا انجینئر بننا چاہتے ہیں۔"

سچ تو یہ ہے کہ یہ مسئلہ تاحال موجود ہے۔ جنوبی افریقا میں مقیم ہندوستانی کمیونٹی آج بھی اِس کھیل کو پیشہ تسلیم نہیں کرتی۔ گو کہ احمد ایک بڑی ٹیم کا کپتان ہے، لیکن آج بھی جب عید کے تہوار پر بڑے بوڑھے اکٹھے ہوتے ہیں، تو احمد سے عجیب و غریب سوالات کیے جاتے ہیں۔ "اچھا اچھا کرکٹ کھیلتے ہو۔ کپتان ہو۔ ویسے گزر بسر کے لیے کیا کرتے ہو؟"

اِس سوال پر وہ مسکرا کر رہ جاتا۔ میں جانتا ہوں، یہ معصوم سا سوال اُس کے دل میں چھید کر دیتا ہے۔

مجھے یاد ہے، زمانہ طالب علمی میں جب کلب کرکٹ کے طفیل وہ چار پیسے کمانے لگا تھا، تب بھی جان پہچان والے یہی پوچھتے تھے "ہاں بھئی مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہے؟"

اِن معنوں میں دیکھا جائے تو احمد نے مجھ سے زیادہ جدوجہد کی۔ اسی لیے تو میں اسے اپنا ہیرو کہتا ہوں۔

جن دنوں احمد اِس فکر میں غلطاں تھا کہ مستقبل میں وہ کس درس گاہ میں داخلہ لے گا، کس پیشے کو اپنائے گا، میں اِن تفکرات سے آزاد کرکٹ کے میدانوں میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھا رہا تھا۔

جس اسکول سے میں نے تعلیم حاصل کی، اُس نے ماضی میں کئی بڑے کرکٹرز پیدا کیے، جن میں بیری رچرڈز بھی شامل تھا جسے جنوبی افریقا کا سب سے بڑا بلّے باز تصور کیا جاتا ہے۔ زمانہ طالب علمی میں میں رچرڈز کے انداز ہی کو کاپی کیا کرتا تھا لیکن پھر مجھے ایک ایسے شخص کی سرپرستی میسر آئی جس نے حقیقی معنوں میں مجھے مستقبل کے لیے تیار کیا۔

میرے اُس محسن کا نام ہیلٹن ایکرمین تھا۔

☆☆☆

دھوپ میں چمکتی پچ، سرسبز میدان، گھاس پر ٹھہرے پانی کے معصوم قطرے، جو دن چڑھنے کے ساتھ بخارات میں تبدیل ہونے لگتے، اور تماشائیوں کی تالیاں...... یہ تجربہ انسان کو دوسری دنیا میں لے جاتا ہے۔ مجھے بھی اِس حسین احساس نے دیگر جہانوں کی سیر کروائی۔

میں نے پندرہ برس کی عمر ہی میں ان کھلاڑیوں میں جگہ بنالی تھی، جنہیں ڈربن کا مستقبل تصور کیا جارہا تھا۔ ہر دوسرا شخص میرا کاندھا تھپتھپاتا۔ میرے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کرتا۔

اِسی حوصلہ افزائی کے طفیل میں دھیرے دھیرے آگے بڑھتا گیا اور ایک دن صوبہ نٹال کا ہردل عزیز کھلاڑی بن گیا۔ تعصب کا مہلک وار سہہ چکے لوگ بھی رنگ داروں کا تلخ ماضی بھول کر کہنے لگے:

"یہ لڑکا قومی ٹیم کے لیے کھیلنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔"

اِس نوع کے تبصرے مجھے مغرور بنادینے کے لیے کافی تھے، لیکن والدین کی تربیت میرے خوب کام آئی۔

اسکول کی ٹیم کے لیے کھیلی جانے والی چند لمبی اننگز کے طفیل میں صوبائی کرکٹ ٹیم کے منتظمین کی نظروں میں آگیا۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ میرا بلّا اُن دنوں رنز اُگل رہا تھا لیکن یہ ضرور ہے کہ میں بہت اچھی فارم میں تھا۔

ڈولفنز کا حصہ بننے کے بعد ہی میری اُس شخص سے ملاقات ہوئی جسے قدرت نے میری تقدیر سنوارنے کا فریضہ سونپ رکھا تھا۔

میں ہیلٹن ایکرمین کا ذکر کررہا ہوں جس کا شمار ڈربن کے مشہور ترین کرکٹرز میں ہوتا تھا۔ وہ ماضی میں جنوبی صوبے کی ٹیم کا کپتان رہ چکا تھا اور اُن دنوں کوچ کی حیثیت سے مصروف تھا۔

میں اُسے کرکٹ جینیئس تصور کرتا ہوں۔ وہ بلا کا ذہن تھا۔ کرکٹ کے تمام اسرار و رموز سے واقف تھا۔ میری تکنیک کی درستی میں اُس نے کلیدی کردار ادا کیا۔

"تمہیں اپنی گرپ تبدیل کرنی ہوگی نوجوان!" یہ اُس کی پہلی نصیحت تھی جس نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔

میں نے خود سے کہا۔ "اِسی گرپ کے طفیل تو میں نے ڈھیروں رنز کیے۔"

"اپنے شاٹ میں قوت پیدا کرو۔" اگلی نصیحت۔

"مگر جناب، ٹیسٹ کرکٹ میں تو..." میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

"میری بات سنو نوجوان۔" اُس نے بات کاٹ دی۔ "ٹیسٹ کرکٹ بنیاد ہے لیکن اب زمانہ تیزی سے بدل رہا ہے۔ ون ڈے کرکٹ کی مقبولیت بڑھ رہی ہے۔ اور سنا ہے کہ اب کچھ نئے تجربات بھی کیے جارہے ہیں، تو میں یہی کہوں گا کہ احتیاط اچھی چیز ہے مگر اپنے شاٹس محدود کرنے کی بجائے ذرا کھل کر کھیلنا سیکھو۔"

مجھے اِس نصیحت کی اہمیت کا بہت بعد میں احساس ہوا جب میری آنکھوں نے ٹی ٹوئنٹی کرکٹ کا عروج دیکھا۔

☆☆☆

نوجوانوں پر بھروسا کرنا ایک مہنگا سودا ہے۔ یہ خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔ اور ایکرمین خطروں کا کھلاڑی تھا۔

اُسے میری صلاحیتوں پر پورا بھروسا تھا۔ اُس نے مجھے کئی ایسے مقابلوں میں اتارنے کا رسک لیا جن میں پوری انتظامیہ میری مخالف تھی۔

"یہ ابھی ناتجربہ کار ہے۔" ہمارے منیجر نے اُس سے کہا تھا۔

"کھیلے بغیر یہ تجربہ کس طرح حاصل کرسکتا ہے۔" ایکرمین نے لاتعلقی سے کاندھے اچکائے۔

"مگر یہ میچ اہم ہے۔" منیجر نے قائل کرنے کی کوشش کی۔

"ہاشم خود بھی ایک اہم کھلاڑی ہے۔ مجھے اُس پر یقین ہے۔"

ایکرمین نے مجھے بھرپور موقع دیا۔ جب دوسروں نے تنقید کے حملے کیے، وہ میری ڈھال بنا۔ ابتدائی میچز میں جب مجھے ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا، اُس نے میرا کاندھا تھپتھپایا۔

اُس کی حوصلہ افزائی کے سہارے دھیرے دھیرے میرا اعتماد بحال ہونے لگا۔ میرا بلّا بھی حرکت میں آگیا۔ رن بننے لگے۔ اچھی پرفارمنس کے طفیل میرے مخالفین ایک ایک کرکے خاموش ہوگئے۔ اور جب ستائش شروع ہوئی، میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

جہاں مجھے اچھی کارکردگی کی خوشی تھی، وہیں اِس بات کا بھی سکون تھا کہ میں اپنے کوچ کی توقعات پر پورا اترا۔

ڈولفنز کی جانب سے کھیلتے ہوئے میری کارکردگی متاثر کن رہی۔

اُن دنوں 2002 انڈر 19 ورلڈ کپ کی ٹیم تشکیل دی جارہی تھی۔ مجھے اپنے انتخاب کی امید تھی، لیکن اُس وقت حیرت کا طوفان مجھ سے ٹکرایا جب ٹی وی چینلز سے یہ خبر نشر ہوئی کہ اِس مقابلے کے لیے ہاشم آملہ کو کپتان چنا گیا ہے۔

ابھی میں ٹی وی اسکرین کے سامنے بیٹھا حیرت سے پلکیں جھپک رہا تھا کہ فون بجا۔

میں نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف ایکرمین تھا۔

"کپتانی مبارک ہو نوجوان۔" اُس کی آواز میں اعتماد تھا۔

"شکریہ سر مگر......" میں تذبذب کا شکار تھا۔ "یہ بھاری ذمے داری ہے۔"

"تو ثابت کرو کہ تم ذمے داری اٹھانے کے قابل ہو۔" اس نے فوراً کہا۔ "تیاری پکڑ لو۔ ہمیں بہت کام کرنے ہیں۔"

نیوزی لینڈ میں منعقد ہونے والے ٹورنامنٹ میں انوکھے تجربات ہمارے منتظر تھے۔ بے شک ہم تھوڑے گھبرائے ہوئے تھے، لیکن سینئرز کے مشورے ہمارے خوب کام آئے۔ ابتدائی جیت نے ہمیں حوصلہ دیا۔ دھیرے دھیرے ہم آگے بڑھتے گئے اور فائنل تک پہنچ گئے۔

میچ سے ایک رات قبل، نہ جانے کہاں سے ایک عجیب، پُراسرار خواب میری نیند میں در آیا۔

میں نے دیکھا کہ میں ایک تاریک سرنگ میں کھڑا ہوں۔ میری روح تاریکی سے نکل کر روشنی میں آنے کی آرزومند ہے، لیکن سرنگ میں اتنا اندھیرا ہے کہ راستہ تلاش کرنا تو دُور کی بات، ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ اِس کیفیت نے مجھ پر خوف طاری کردیا۔ یاسیت گہری ہونے لگی۔ التباسات جنم لینے لگے۔ اور میں اپنے رب کو یاد کرنے لگا۔

اچانک مجھے دُور روشنی نظر آئی۔ میں اُس کی جانب بڑھنے لگا۔ جوں جوں روشنی قریب آتی گئی، منظر واضح ہونے لگا۔ روشنی کے قریب پہنچ کر میرا دل خوشی سے رقص کرنے لگا۔ وہ ایک دروازہ تھا، جس کی جھریوں سے روشنی آرہی تھی۔ میں نے جوش اور تجسس کے زیرِ اثر دروازہ کھولا۔ قدم آگے بڑھایا۔ اگلے ہی لمحے میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ دروازے کی دوسری طرف گہری کھائی تھی، نیچے تاریکی بل کھا رہی تھی۔

مایوسی کے زیرِ اثر میں پیچھے ہٹ گیا۔ ایسے میں اچانک میری سماعتوں سے ایک مانوس آواز ٹکرائی۔ یوں لگا، جیسے کوئی اذان دے رہا ہو۔ میں نے سر گھمایا۔ میری دائیں جانب ایک دروازہ تھا، جو پہلے دروازے کی نسبت چھوٹا اور خستہ حال تھا۔ میں ناامیدی دل میں لیے اُس کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

جانب بڑھا۔ اسے دھکیلتے وقت اندیشے میرے اندر رینگ رہے تھے۔ جوں ہی دروازہ کھلا، روشنی سے میری آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ وہاں سبزہ تھا۔ دھوپ تھی۔ سکون کی ندی تھی۔ میں نے قدم آگے بڑھایا اور سرنگ سے باہر آگیا۔

صبح بیدار ہونے کے بعد کچھ دیر تو یہ خواب میرے ذہن پر سوار رہا لیکن پھر فائنل مقابلے کے تجسس نے اُسے میرے لاشعور سے کھرچ ڈالا۔

کئی برس بعد مجھے ایک بزرگ نے اِس کی تعبیر بتائی، جس کے مطابق یہ خواب تلخ ناکامیوں کے بعد کامیابی کی خبر دیتا تھا۔

تلخ ناکامیاں... ہاں، اُن کا آغاز تو اُسی صبح ہوگیا تھا۔ فائنل میں ہمیں آسٹریلیا کے ہاتھوں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ میری کارکردگی بھی مایوس کن رہی۔ جب ہم گھر لوٹے، ہمارا استقبال ٹھیک ویسے ہی کیا گیا، جیسے شکست خوردہ ٹیم کا کیا جاتا ہے۔ کپتان ہونے کے باعث میں میڈیا کے نشانے پر تھا جو میری صلاحیتوں پر انگلیاں اٹھا رہا تھا۔

پہلا شخص جس نے مجھے دلاسا دیا، وہ کوئی اور نہیں، میرا محسن ایکرمین ہی تھا۔ اُس نے میرے کاندھے پر تھپکی دی۔ ”خوب نوجوان! اچھا پرفارم کیا۔“

”مگر......ہم کامیابی حاصل نہیں کرسکے۔“ میری آواز رندھ گئی۔

”یہ کس نے کہا کہ تم کامیابی حاصل نہیں کرسکے؟“ اُس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم نہیں جانتے۔ ہماری قومی ٹیم آج تک ورلڈ کپ کے فائنل تک رسائی حاصل نہیں کرسکی ہے۔ اور تم فائنل مقابلے میں اترے۔ یہ تو بڑی کامیابی ہے۔“

☆☆☆

کہتے ہیں، جب ایک راستہ بند ہوتا ہے تو قدرت دوسرا راستہ کھول دیتی ہے۔

میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ انڈر 19 کے کپتان کی حیثیت سے تنقید کا نشانہ بننے کے بعد مجھے خود کو ثابت کرنے کا ایک اور موقع ملا۔

فقط 21 برس کی عمر میں مجھے کوازولا نتال جیسی ٹیم کا کپتان بنا دیا گیا۔

مجھ پر خاصا دباؤ تھا۔ پھر مقابلہ بھی سخت تھا لیکن میرے پاس ایک ایسی قوت تھی جو پانسا پلٹ سکتی تھی۔ اور یہ تھی دعا کی قوت۔

میں ہر میچ سے قبل اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہوجاتا۔ انکساری سے دعا مانگتا اور پھر ہر منفی خیالات جھٹک کر میدان میں اتر جاتا، جہاں میں اپنی صلاحیتوں کے بھرپور جوہر دکھاتا۔

2004-05 کے سیزن میں نہ صرف کپتان کی حیثیت سے میں نے خود کو منوایا بلکہ بلے باز کی حیثیت سے اپنی بھرپور قابلیت کا مظاہرہ کیا۔ اس سیزن میں میں نے چار سنچریاں بنا کر ناقدین کو اپنی جانب متوجہ کرلیا۔ وہ سنجیدگی سے میری صلاحیتوں کا تجزیہ کرنے لگے۔ اسی زمانے میں مجھے اے ٹیم کے لیے منتخب کیا گیا۔ یوں میں اپنے سپنے کے ایک قدم اور قریب آگیا۔

موسم بدلتے رہے۔ آسمان برسا، برف باری ہوئی، پت جھڑ آیا، مگر یہ تبدیلیاں میری پرفارمنس پر اثر انداز نہیں ہوئیں۔ میرا بلا پُرجوش تھا۔

پھر ایک ایسا وقت بھی آیا جب میری صلاحیتیں دیکھتے ہوئے کرکٹ شائقین کہنے لگے۔ ”ہاشم جنوبی افریقا کا اگلا کپتان ہے!“

ہاں، مجھے یہ سن کر اچھا لگا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے کبھی قومی ٹیم کی کپتانی کا نہیں سوچا تھا...... میرا مقصد تو فقط ٹیم تک رسائی تھا، بس!

☆☆☆

”ہاشم نے اسکول ہی کے زمانے میں بااعتماد بلے باز کی شہرت حاصل کرلی تھی...... اُس نے برق رفتاری سے سفر طے کیا۔ صوبائی ٹیم میں شمولیت، پھر انڈر 19 کی کپتانی، پھر صوبائی ٹیم کی کپتانی، چار سنچریاں۔ بے شک وہ تیزی سے آگے بڑھا، مگر سوال یہ ہے کہ کیا اُسے قومی ٹیم میں منتخب کرنے کا وقت آن پہنچا ہے؟ میرے خیال میں ہمیں تھوڑا انتظار کرنا ہوگا، کیونکہ وہ ابھی ناتجربہ کار......“

میں ٹی وی کے سامنے بیٹھا تھا۔ اسکرین پر ایک معروف کرکٹ ایکسپرٹ کا چہرہ تھا جو دبے الفاظ میں مجھے نیشنل ٹیم کے لیے غیر موزوں ثابت کرنے میں لگا تھا۔

احمد ساتھ والے صوفے پر بیٹھا تھا۔ چہرے پر غصہ تھا۔ ”یہ انتہائی متعصب شخص ہے۔“ لہجے میں واضح ناپسندیدگی تھی۔ ”ہمیشہ رنگ دار کھلاڑیوں کی مخالفت کرتا ہے۔“

میں نے اُس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ٹی وی سے نشر ہونے والی آواز میری سماعتیں زخمی کررہی تھی۔

”...... یہ جلد بازی ہوگی...... وہ ابھی تیار نہیں......

اس کی تکنیک بھی نیم پختہ ہے۔ اگر اسے منتخب کیا گیا تو ایک احمقانہ فیصلہ ہوگا۔“

”تعصب ایک موذی مرض ہے۔“ میں نے دھیرے سے کہا اور ٹی وی بند کردیا۔ میں آزردہ تھا۔ دُکھی تھا۔ میں نے سر جھکا لیا۔ آنکھ بند کرلیں۔ دل کی جانب متوجہ ہوا جہاں ایک قرآنی آیت گونج رہی تھی: ”مشکل کے ساتھ آسانی ہے!“

اس رات بھی میں نے ایک بے رنگ خواب دیکھا، جو اُس خواب سے بڑی حد تک مشابہ تھا، جو میں نے انڈر 19 ورلڈ کپ کے فائنل سے قبل دیکھا تھا۔ صبح جب آنکھ کھلی، تذبذب کمرے میں آسن جمائے بیٹھا تھا۔

جب دوپہر کے وقت ڈرائنگ روم میں لگا ٹیلی فون بجا، میرا اضطراب آسمان کو چھو رہا تھا، لیکن جو پیغام مجھے موصول ہوا، اُس نے نہ صرف میرے گھر میں بلکہ پورے محلے میں خوشی کے حسین رنگ بکھیر دیے۔

مجھے 2004 کے موسم سرما میں ہندوستان کا دورہ کرنے والی جنوبی افریقا کی ٹیم کے لیے منتخب کرلیا گیا تھا۔

جب میں نے یہ خبر اپنے والد کو سنائی۔ اُنہوں نے فوراً کہا۔ ”ہندوستان جارہے ہو، تو گجرات جانا نہیں بھولنا۔“

کچھ ہی دیر بعد یہ خبر ٹی وی چینل سے نشر ہو رہی تھی۔ ”ہاشم آملہ، جنوبی افریقا میں مقیم وہ پہلا مسلمان ایشیائی جسے قومی ٹیم کے لیے منتخب کیا گیا!“

☆☆☆

28 نومبر 2004 کی وہ صبح گرم اور مرطوب تھی۔

سورج سوا نیزے پر تھا۔ گھاس مرجھائی ہوئی اور پژمردہ معلوم ہوتی تھی۔ ماحول میں بوجھل پن تھا۔ حبس کی چادر تنی ہوئی تھی۔

کلکتہ کے ایڈن گارڈن گراؤنڈ میں کیریئر کا آغاز کرنا کسی طور آسان نہیں تھا۔ وہاں بلا کا شور تھا۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ سامنے ہندوستانی ٹیم تھی جو اپنے ہوم گراؤنڈ میں شیر بن جاتی ہے۔ جس کے اسپن بالرز اپنی پچ استعمال کرنے میں ماہر تصور کیے جاتے ہیں۔ دوسری طرف اُن کے جذبات سے لبریز حامی تھے جو فتح سے کم کسی شے پر اکتفا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

سچ تو یہ ہے کہ میں بہت دباؤ محسوس کر رہا تھا اور اس دباؤ نے میری کارکردگی پر براہِ راست اثر ڈالا۔ میں سلیکٹرز کو متاثر کرنے میں ناکام رہا۔

ابتدائی ناکامی نے مجھے افسردہ ضرور کیا لیکن میں مایوس نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ جوں ہی اگلا موقع ملا میں خود کو ثابت کردوں گا۔

بدقسمتی سے یہ ہو نہیں سکا۔

2004 میں انگلینڈ کے خلاف کھیلی جانے والی سیریز جس کا میں بے صبری سے انتظار کررہا تھا، ایک بھیانک خواب ثابت ہوئی۔ میں چار اننگز میں فقط 36 رنز اسکور کرسکا اور یوں ٹیم سے باہر ہوگیا۔

اِس بدترین ناکامی کے بعد مخالفین نے میری بیٹنگ تکنیک کو نشانے پر رکھ لیا۔ میری گرپ، شاٹس کے انتخاب، میرے کھڑے ہونے کے انداز...... الغرض ہر شے میں ناقدین کو خامیاں نظر آنے لگیں۔

متعصب سفید فام کھلاڑیوں اور تجزیہ کاروں کو بھی موقع مل گیا۔ انہوں نے میرے انتخاب کو جلد بازی میں کیا ہوا نیم پختہ فیصلہ قرار دیتے ہوئے اتنی تنقید کی کہ مجھے اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔

مشکل کے اُن دنوں میں دوستوں اور چند سینئرز نے میرا بھرپور ساتھ دیا۔ مجھے مایوسی سے نکالنے کی حتی الامکان کوشش کی لیکن جس قوت کے سہارے میں ابھرا، وہ تھی خدا کی ذات پر میرا کامل یقین۔ جس نے مجھے زندگی کا رخِ روشن دیکھنے کی ترغیب دی۔

میں نے اپنی تکنیک پر خاصی محنت کی۔ اِس عمل میں ایکرمین کے علاوہ چند اور مخلص و ہمدرد سفید فام کرکٹرز اور کوچز نے میری مدد کی۔ یوں دھیرے دھیرے میں سنبھلنے لگا۔

خود کو ثابت کرنے کے لیے فرسٹ کلاس کرکٹ کا پلیٹ فارم بہترین ذریعہ تھا، جسے میں نے پوری طرح استعمال کیا۔ اس سیزن میں میری کارکردگی اتنی شان دار رہی کہ میں خود بھی حیران رہ گیا۔ میرا بلا رنز اُگل رہا تھا۔ میں طویل اننگز کھیل رہا تھا۔ اور ڈولفنز کی فتوحات میں برق رفتاری سے اضافہ ہو رہا تھا۔

اخبارات میں میری کارکردگی کا چرچا ہونے لگا۔ مخالفین کی توپیں خاموش ہونے لگیں۔ جن سلیکٹرز نے ماضی میں مجھے منتخب کیا تھا، اُنہوں نے اٹھارہ ماہ کی خاموشی کے بعد ایک بار پھر ہمت مجتمع کی اور دورے پر آئی ہوئی نیوزی لینڈ کے خلاف مجھے آزمانے کا اعلان کردیا۔

☆☆☆

تیز پچ، بادلوں سے بھرا آسمان، ٹھنڈا موسم...... ایسے

WWW.PAKSOCIETY.COM

حالات میں گیند سانپ کی طرح بل کھاتی ہے اور ایک ایک رن کے لیے خون تھوکنا پڑتا ہے۔

کیپ ٹاؤن میں کچھ ایسی ہی صورتِ حال تھی۔ نیوزی لینڈ ٹیم ٹاپ فارم میں تھی۔ اُن کے بالرز حالات سے بھرپور فائدہ اٹھا رہے تھے۔ ہماری وکٹیں پت جھڑ کے پتّوں کی طرح گرنے لگیں۔ میچ جنوبی افریقا کے ہاتھ سے نکلنے لگا اور ایک شرم ناک شکست کے امکان ابھرنے لگے۔ اور ایسے میں، میں نے میدان میں قدم رکھا۔

سرد ہوا کے جھونکے نے میرا استقبال کیا۔ پھر مخالف ٹیم کے تیز رفتار بالر کی باؤنسر نے حملہ کیا۔ اگلی گیند نے میرے سر کا نشانہ لگایا۔

صورتِ حال مشکل تھی، مخالف ٹیم کے کھلاڑی جملے کس رہے تھے۔ وہ میری توجہ بھٹکانا چاہتے تھے، لیکن اُس روز...... میں نے یکسو رہنے کا عہد کر رکھا تھا۔

میرا آغاز سست تھا۔ کئی ایسے مواقع آئے، جب شاطر بولرز کو یقین ہو چلا کہ انہوں نے مجھے اپنے جال میں پھانس لیا، لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح اپنی وکٹ محفوظ رکھی اور دھیرے دھیرے، خاموشی سے آگے بڑھتا رہا......

جب نصف سنچری اسکور کر کے بلّا ہوا میں اٹھا، میں خوشی سے لرز رہا تھا۔ آنکھوں میں نمی تھی۔ اس پُرمسرت لمحے کے لیے میں خدا کا ممنون تھا۔

پویلین میں بیٹھے کپتان نے مجھے اشارہ کیا کہ وکٹ پر ٹکا رہوں کیونکہ ابھی اُنہیں میری ضرورت تھی۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ ایک بار پھر، ایک ایک رن بناتا ہوا میں آہستگی سے آگے بڑھنے لگا۔ بالآخر وہ لمحہ آن پہنچا، جب اسکور بورڈ پر میرے نام کے آگے سو کا ہندسہ دمکنے لگا۔ میں سجدے میں گر گیا۔ وہ ایک ناقابلِ یقین پل تھا۔ میں اپنے انتخاب کو درست ثابت کر چکا تھا۔ اُس روز میں نے 149 رنز کی اننگز کھیل کر جنوبی افریقا کو شکست کے داغ سے محفوظ رکھا۔

اگلے دن کے اخبارات کرکٹ کے افق پر ابھرنے والے ایک ستارے کے ذکر سے بھرے ہوئے تھے، جس کا نام ہاشم آملہ تھا!!

دلچسپ امر یہ ہے کہ میں نے اپنے کیریئر کی دوسری اور تیسری ٹیسٹ سنچری بھی نیوزی لینڈ ہی کے خلاف اسکور کی اور دونوں ہی بار فتح نے ہمارے قدم چومے۔ نیوزی لینڈ والے تو مجھ سے ڈرنے لگے تھے!

☆☆☆

جہاں میں اپنی بلّے بازی کے باعث خبروں میں رہا، وہیں ایک وجہ اور بھی تھی...... میری داڑھی!

گو کہ پاکستان سے تعلق رکھنے والے چند کھلاڑی مثلاً انضمام الحق، مشتاق احمد اور ثقلین مشتاق بھی باریش تھے، تاہم اُن کا تعلق ایک اسلامی ریاست سے تھا، جب کہ میں ایک ایسے ملک کی نمایندگی کر رہا تھا جہاں مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے بستے تھے، جو بنیادی طور پر ایک سیکولر ریاست تھی۔

اور ویسے بھی...... کسی باریش شخص کی کرکٹ ٹیم میں موجودگی خبروں کی زینت تو بنتی تھی۔ آپ تو جانتے ہی ہیں، 9/11 کے بعد مسلمانوں کے ساتھ تعصب برتا جانے لگا تھا۔ انہیں طنزاً "Terrorist" یعنی دہشت گرد کہہ کر پکارا جاتا تھا۔

اور پھر اِسی افسوس ناک رویّے سے..... ایک تنازعے نے جنم لیا۔

یہ اگست 2006 کی ایک گرم دوپہر کا ذکر ہے۔ کولمبو کے میدان میں سری لنکا اور جنوبی افریقا کے درمیان ٹیسٹ میچ کھیلا جا رہا تھا۔ آسٹریلیا سے تعلق رکھنے والا ڈین جونز ایک نجی چینل کے لیے کمنٹری کر رہا تھا۔

کمارا سنگا کارا وکٹ پر کھڑا تھا۔ گیند شان پولاک کے ہاتھ میں تھی۔ سری لنکا کا اسکور ایک وکٹ کے نقصان پر 94 تھا اور ہمیں فوری وکٹ کی ضرورت تھی۔

سنگا کارا نے پولاک کی گیند کو زوردار ہٹ لگائی۔ گیند ہوا میں تیرتی ہوئی میری طرف آئی۔ اُسے دبوچ لینا کسی طور آسان نہیں تھا، مگر میری چستی نے اُس مشکل کو آسان بنا دیا۔

ایک شان دار کیچ اور سنگا کارا پویلین لوٹ گیا۔

کمنٹیٹرز نے اِس کیچ پر تبصرہ کیا۔ میری پھرتی کو سراہا۔ پھر طریق کے مطابق تمام چینلز بریک پر چلے گئے۔

ڈین جونز کا خیال تھا کہ اُس کے چینل نے بھی نشریات روک دی ہیں اور اب اشتہارات چلائے جا رہے ہیں، سو اُس نے مائیک رکھ دیا اور میری داڑھی کو حوالہ بناتے ہوئے اپنے ساتھی کو مخاطب کیا "دہشت گرد نے ایک اور وکٹ لے لی۔"

ڈین کی بدقسمتی۔ اس وقت مائیک آن تھا۔ اُس کے چینل کے کیمرے تاحال میدان کا منظر نشر کر رہے تھے۔ یوں تعصب کے زہر میں بجھا یہ جملہ جنوبی افریقا سمیت پوری دنیا نے سن لیے جس کے بعد ایک بھونچال آ گیا۔

ڈین کے اس تبصرے کو نسلی تفریق کی بدترین شکل قرار دیا گیا۔ تمام حلقوں نے اِس کی مذمت کی۔ مداحوں نے ڈین کو آڑے ہاتھوں لیا۔

مجھے اِس حرکت کی اطلاع کیسے ملی، یہ بھی ایک دلچسپ کہانی ہے۔ کھانے کے وقفے میں جب میں کمرے میں گیا، تو میرے موبائل فون پر کئی پیغامات آئے ہوئے تھے۔ اُن میں ایک دوست کا پیغام بھی تھا۔ "ایک بڑا واقعہ رونما ہوا ہے۔ ایک کمنٹیٹر نے تمہیں دہشت گرد کہہ کر پکارا ہے!"

میں سمجھا وہ مذاق کر رہا ہے۔ میں نے جوابی پیغام بھیجا۔ "دوست، سنسنی پھیلانے سے باز رہو۔" مگر جب میں کھانے کے لیے نیچے لابی میں گیا، منیجر میرا منتظر تھا۔ اُس نے مجھے واقعے کی تفصیلات سے آگاہ کیا۔ ساتھ ہی متنبہ کیا کہ دن کے اختتام پر کئی صحافی مجھ سے ٹیڑھے سوالات کرنے والے ہیں۔

"اُن کے ہر سوال کا سوچ سمجھ کر جواب دینا۔ بورڈ کی جانب سے مذمتی بیان جاری ہو چکا ہے۔ تمہیں ہر صورت شانت رہنا ہوگا۔"

میں نے ایسا ہی کیا۔ خود کو اس معاملے سے الگ تھلگ رکھا۔ پریس کانفرنس کے کچھ دیر بعد، رات ساڑھے نو بجے کے قریب مجھے ایک ٹیلی فون کال موصول ہوئی۔ دوسری طرف ڈین جونز تھا جو اپنے رویّے پر معافی کا خواستگار تھا۔

"میں تم سے معذرت چاہتا ہوں دوست۔ میرا مقصد تمہارے جذبات کو ٹھیس پہنچانا نہیں تھا۔ وہ فقط ایک مذاق تھا جو میری غفلت کے باعث آن ایئر چلا گیا۔"

میں نے اُس کی معذرت کو قبول کیا، کیونکہ اسلام ہمیں تعلیم دیتا ہے کہ اگر کوئی اپنی غلطی پر ندامت کا اظہار کرے، تو اُسے معاف کر دو۔

ڈین نے میڈیا پر آ کر بھی اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ میرا خیال تھا کہ اب یہ معاملہ ختم ہو جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ آنے والے دنوں میں چٹ پٹی خبروں کے متلاشی صحافیوں نے مجھ سے کئی سوالات کیے۔ باقاعدہ بھڑکایا گیا کہ میں ڈین کے لیے خلاف کوئی بیان دوں لیکن میں نے اپنے جذبات پر قابو رکھا۔

بے شک مجھے اس واقعے سے ٹھیس پہنچی لیکن ایک بات کی خوشی تھی کہ پوری دنیا نے ڈین کے متعصبانہ تبصرے پر یک زبان ہو کر احتجاج کیا اور کھیل کو ہر قسم کی نسلی تفریق سے پاک رکھنے کا مطالبہ کرتے ہوئے میری حمایت کی۔

بعد میں چند صحافیوں نے مجھے بتایا کہ اِس واقعے کے بعد مسلمانوں کے بارے میں پائے جانے والے منفی رویّے پر گہری چوٹ لگی اور انہیں دہشت گرد کہنے کے عمل میں واضح کمی دیکھی گئی۔

☆☆☆

"19 ٹیسٹ میچز میں 1599 رنز......اور 57.10 کی اوسط۔ میرا یقین کریں، یہی نوجوان جنوبی افریقا کا مستقبل ہے۔"

ویسٹ انڈیز کے مایۂ ناز کھلاڑی مائیکل ہولڈنگ کی زبان سے ادا ہونے والے یہ الفاظ میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں تھے۔

میں نے فون کر کے مائیکل کا شکریہ ادا کیا۔

"شکریہ ادا کرنے کی ضرورت ہاشم۔" اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ "میں نے تمہاری نہیں، تمہاری کارکردگی کو سراہا ہے۔"

"میں پھر بھی آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا سر۔" میں نے شرماتے ہوئے کہا۔

"ویسے ایک بات ہے۔" مائیکل کی آواز میں شوخی تھی۔ "تمہارا بیٹ جتنا غصیلا ہے، تم اتنے ہی دھیمے اور خاموش طبع ہو۔ خیر مبارک باد قبول کرو۔ تمہارے کرکٹ بورڈ کے ڈائریکٹر سے چند روز قبل میری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ تم ون ڈاؤن پوزیشن پر اپنی جگہ پکی کر چکے ہو۔"

مائیکل سے یہ سن کر مجھے بہت اچھا لگا لیکن میں مطمئن ہو کر بیٹھنے والوں میں سے نہیں تھا۔ مجھے اپنے بڑے بھائی کی نصیحت یاد تھی۔

"ہاشم، کرکٹ بڑا ہی ظالم کھیل ہے۔ جب تک تم ٹیم میں ہو، ہیرو ہو۔ جوں ہی ٹیم سے باہر ہوئے، لمحوں میں زیرو ہو جاؤ گے۔"

مجھے اِس بات کا بہ خوبی ادراک تھا۔ میرے سامنے ایسی کئی مثالیں تھیں، جب کھلاڑیوں نے ابتدائی میچز میں اچھی پرفارمینس دی اور پھر چند بری اننگز کھیل کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹیم سے باہر ہو گئے۔

میں نے محنت جاری رکھی۔ توجہ کھیل پر مرکوز رکھی۔ جب میرے ساتھی کھلاڑی میچ کے بعد ہلّا گلا کرتے، میں ہوٹل میں ٹھہرتا۔ نماز کے اوقات کی پابندی کرتا۔ فارغ وقت پریکٹس یا وظائف میں گزارتا۔

میں نے اپنے کیریئر کا آغاز ہندوستان سے کیا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

میری خواہش تھی کہ ایک بار پھر اپنے اجداد کے وطن کا دورہ کروں اور وہاں اپنی کارکردگی کی چھاپ چھوڑوں۔ مارچ 2008 میں مجھے موقع مل ہی گیا۔

ہندوستان کا دورہ خاصا مشکل تھا۔ میزبان ٹیم اپنے عروج پر تھی۔ جیت کا حصول اُن کا اکلوتا مقصد تھا۔ چنانچہ میں ہونے والے ٹیسٹ میچ میں حالات کتنے کٹھن تھے، اِسے الفاظ میں بیان کرنا سہل نہیں۔ اُن کے اسپین اٹیک نے ہمیں دیوار سے لگا دیا تھا۔ شکست یقینی معلوم ہوتی تھی۔ ایسے میں، میں ہندوستانی ٹیم اور جیت کے درمیان دیوار بن گیا۔ میرے کیرئیر کی چوتھی سنچری کے طفیل وہ میچ ڈرا ہو گیا۔

سخت ترین حالات میں 159 کی اننگز کھیلنا میرے لیے کئی معنوں میں یادگار رہا۔ ایک تو اِس بات کی خوشی تھی کہ جس سرزمین سے میں نے اپنے کیرئیر کا آغاز کیا، وہیں خود کو ثابت کیا۔ شکست کے آسیب کو ٹالنے کی مسرت بھی تھی۔

2008 کا سال اور بھی کئی حوالوں سے یادگار رہا۔ میں نے مزید دو ٹیسٹ سنچریاں داغیں، جن میں سے ایک روایتی حریف انگلینڈ کے خلاف تھی۔ آسٹریلیا کے خلاف بھی اچھا پرفارم کیا۔ مجموعی طور پر اُس برس میں نے 1012 رنز اسکور کیے۔

☆☆☆

بلّے بازی اور داڑھی کے علاوہ ایک اور معاملے نے بھی مجھے خبروں کی زینت بنائے رکھا۔

جیسا کہ میں نے بتایا کہ میں اسلامی تعلیمات پر کامل یقین رکھتا ہوں۔ مجھے یہ گوارا نہیں کوئی ایسا کام کروں جو میرے عقائد کے منافی ہو۔

جنوبی افریقا میں شراب کی فروخت عام ہے۔ ملک کے دیگر باسیوں کی طرح ہماری ٹیم کے کھلاڑی بھی اِس کا شوق رکھتے ہیں لیکن میں نے خود کو ہمیشہ اِس سے دُور رکھا۔ میرا یہ عمل ذاتی فعل تھا۔ اُس پر کسی نے اعتراض نہیں کیا مگر پھر ایک ایسی صورتِ حال پیدا ہو گئی جس نے مجھے سخت فیصلہ لینے پر مجبور کر دیا۔

مغرب میں شراب تیار کرنے والے ادارے کرکٹ کے بڑے اسپانسرز میں شمار ہوتے ہیں۔ دیگر ممالک کی طرح جنوبی افریقا میں بھی یہ کمپنیاں کرکٹ سیریز کے لیے اشتہارات دیتی ہیں۔ طریقے کے مطابق گراؤنڈ میں اُن کے بل بورڈ آویزاں کیے جاتے ہیں، گھاس پر "لوگو" بنایا جاتا ہے۔

اِس پر تو میں چپ رہا، تاہم جب یہ شرط سامنے آئی کہ ٹیم کے تمام کھلاڑیوں کی قیصوں پر شراب فروخت کرنے والے ادارے کا "لوگو" چسپاں کیا جائے گا، میں نے شدید اعتراض کیا۔

پہلے پہل تو ٹیم کے ارکان میرے اعتراض کی نوعیت سمجھ ہی نہیں سکے۔ بورڈ بھی تذبذب کا شکار نظر آیا۔ اپنی بات سمجھانے کے لیے مجھے اُن کے ساتھ خاصا سر کھپانا پڑا۔

بالآخر وہ سمجھ ہی گئے کہ ایک سچا مسلمان جہاں شراب پینے سے اجتناب برتتا ہے، وہیں وہ اِس کی تشہیر بھی نہیں کر سکتا۔

مجھے خوشی ہے کہ بورڈ نے میرے دلائل قبول کرتے ہوئے میری قمیص اور بلّے کو اِس قسم کی تشہیر کے لیے استعمال نہ کرنے کا تاریخی فیصلہ کیا۔

جس روز اِس فیصلے کا اعلان ہوا، میرے بڑے بھائی نے فون کیا۔ "ہاشم، لگتا ہے کہ ہمارا جنوبی افریقا بدل رہا ہے۔" اُس کی آواز میں مسرت تھی۔

"ہاں۔" میں نے دھیرے سے کہا۔ "میں اِس بات پر خوش ہوں۔"

چند ساعت خاموشی چھائی رہی۔ پھر احمد کی آواز سنائی دی۔ "ہاشم۔ کیا تم جانتے ہو، اِس تبدیلی میں تمہارا بھی ایک کردار ہے، جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے تمہارا بڑا بھائی ہونے پر فخر ہے۔"

☆☆☆

اگلے برس ہمیں بڑی مشکل کا سامنا کرنا تھا۔

2009 میں آسٹریلیا کے دورے پر روانہ ہونے سے قبل یہ کہا جا رہا تھا کہ جنوبی افریقا میزبان ٹیم کے لیے تر نوالہ ثابت ہو گی۔

یہ تجزیے بے سبب نہیں تھے۔ آسٹریلیا کی ٹیم ٹاپ فارم میں تھی۔ وہ دنیا کی ہر ٹیم کو شکست دے چکی تھی۔ اس کے کپتان نے سیریز سے پہلے یہ بیان بھی داغ دیا تھا کہ ماضی کی طرح ایک بار پھر جنوبی افریقا کو منہ کی کھانی پڑے گی۔ یاد رہے کہ آسٹریلیا کی پچز خاصی مشکل ہوتی ہیں۔ میزبان ٹیم کی خوبیوں اور مہمان ٹیم کی خامیوں کو سامنے رکھتے ہوئے بڑی چالاکی سے تیار کی جاتی ہیں۔

اُس سیریز میں ٹیم کی امیدیں مجھ سے وابستہ تھیں اور میں ان پر کھرا اترنا چاہتا تھا۔ میں گھر سے عہد کر کے گیا تھا کہ اِس بار ہم فاتح کی حیثیت سے لوٹیں گے۔

اِس سیریز میں، میں نے 51.80 کی شان دار اوسط

سے 259 رنز اسکور کیے۔ وہاں تاریخی فتح ہماری مقدر بنی۔ ون ڈے سیریز کے ہم فاتح ٹھہرے۔ سیریز کے فیصلہ کن میچ میں، میں نے 80 رنز داغے۔

اپنے کیرئیر کی ساتویں سنچری بھی میں نے اُسی برس انگلینڈ کے خلاف اسکور کی۔

ہر ٹیسٹ کرکٹر کاؤنٹی کرکٹ کھیلنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ میں بھی اس طرز کے مقابلوں میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھانے کا آرزو مند تھا۔

2009 میں Essex سے وابستگی کے بعد میری یہ خواہش پوری ہوئی۔ خوشی اس بات کی ہے کہ نہ صرف ٹیم انتظامیہ بلکہ Essex کے مداحوں نے بھی میرا والہانہ استقبال کیا۔

میرا آغاز شان دار رہا۔ میں نے پہلے ہی میچ میں 181 رنز داغے۔ سیزن میں دو سنچریاں اسکور کیں۔

☆☆☆

نیا سال نہ صرف میرے لیے ڈھیروں خوشیاں لایا، بلکہ جنوبی افریقا نے کرکٹ کی تاریخ پر بھی 2010 نے ان مٹ نقوش چھوڑے۔

فروری میں ہم ہندوستان کے دورے پر گئے جہاں ہمیں دو ٹیسٹ میچ کھیلنے تھے۔

پہلے میچ کی ابتدائی اننگز میں جنوبی افریقا نے 558 رنز اسکور کیے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ آدھے سے زیادہ رنز فقط ایک آدمی نے جوڑے تھا، جس کا نام تھا...... ہاشم آملہ۔

ڈبل سنچری کرنا ہر کھلاڑی کا خواب ہوتا ہے۔ اور اُس روز 253 رنز کی اُس اننگز کے طفیل میرا یہ دیرینہ خواب پورا ہوا۔ ہم نے وہ میچ بھی جیت لیا۔

اگلے ٹیسٹ میچ میں میرے بلّے نے 114 رنز اُگلے۔ بدقسمتی سے میرے آؤٹ ہونے کے بعد ہماری وکٹیں خزاں کے پتّوں کی طرح گرنے لگیں اور پوری ٹیم 296 رنز پر پویلین لوٹ آئی۔ دوسری اننگز میں ہندوستان نے رنز کا انبار لگا دیا جن کا تعاقب کرتے ہوئے ہماری ٹیم 290 رنز پر آؤٹ ہو گئی۔ اِس بار بھی میں نے شکست کو ٹالنے کی بھرپور کوشش کی اور 123 رنز کی اننگز کھیلی۔ لیکن یہ کوشش نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئی۔ ہمیں ہار کا کرب سہنا پڑا۔

ہندوستان کے دورے کے بعد ہم جزیروں کی سرزمین ویسٹ انڈیز کی جانب روانہ ہوئے۔

ناریل کے درختوں میں گھرے اسٹیڈیم میں کھیلے جانے والے پہلے ون ڈے میچ میں، میں نے 102 رنز کی اننگز کھیلی اور اپنے ملک کی فتح میں کلیدی کردار ادا کیا۔

دوسرے میچ میں میرے بلّے نے 92 رنز اسکور کیے۔ چوتھے ون ڈے میں ایک اور سنچری داغ دی اور 129 رنز کی اننگز کی بدولت مین آف دی میچ قرار پایا۔

ویسٹ انڈیز کے خلاف کھیلے جانے والے تین ٹیسٹ میچز میں بھی میری کارکردگی خاصی اچھی رہی مگر بدقسمتی سے میں.... کوئی سنچری اسکور نہیں کر سکا۔

اگلا محاذ زمبابوے تھا۔ پہلے ون ڈے میں، میں نے 110 رنز کی اننگز کھیلی۔ جیت ہماری مقدر بنی۔ دوسرے میچ میں بھی میں نے سو کا ہندسہ عبور کیا۔

پاکستان سے مقابلہ بھی یادگار رہا۔ وہاں میرا شان دار استقبال ہوا۔ مجھے ایسا لگا، جیسے میں اپنوں کے درمیان ہوں۔ ہم نے گرم اور مرطوب ماحول میں پانچ میچز کی سیریز کھیلی۔

سیریز کے دوسرے میچ میں، میں نے نصف سنچری اسکور کی، مگر بدقسمتی سے ہم میچ ہار گئے، کیونکہ عبدالرزاق شان دار فارم میں تھا۔

عبدالرزاق کے حملوں کا جواب میں نے تیسرے ون ڈے میچ میں دیا، جس میں، میں نے 119 رنز کی یادگار اننگز کھیلی۔ مجھے یاد ہے، اُس روز ایک ایکسپرٹ نے کہا تھا۔

"یہ کھلاڑی تیزی سے عظمت کی جانب بڑھ رہا ہے!"

کیا وہ دُرست تھا؟

☆☆☆

شور اتنا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

میرا ہیلمٹ تپ رہا تھا۔ دستانے پسینے سے تر تھے۔ دھڑکن تیز تھی۔ مخالف بالر گیند ہاتھ میں لیے میری طرف دوڑ رہا تھا۔ وہ گیند میری کل کائنات تھی۔ اُس نے ہاتھ گھمایا۔ گیند ہاتھ سے نکلی۔ میری نگاہوں نے اُس کا تعاقب کیا۔ میرا بیٹ بلند ہوا۔ گیند اور بیٹ کے ٹکراؤ کی آواز گونجی۔ اگلے ہی لمحے گیند گھاس پر پھسل رہی تھی۔ میں دوسرے اینڈ کی جانب دوڑا۔

چند پلوں بعد میں اپنے خدا کے حضور سجدہ ریز تھا۔ میں، ہاشم آملہ جنوبی افریقا کی جانب سے ٹرپل سنچری بنانے والا پہلا کھلاڑی بن چکا تھا۔

میری آنکھوں میں آنسو تھے اور اور دل کی فضاؤں میں یقین کی قوت تیر رہی تھی۔

2012 میں انگلینڈ کا دورہ ایک ایسا تجربہ رہا جس

WWW.PAKSOCIETY.COM

نے میری یادداشت پر ان مٹ نقوش چھوڑے۔ پہلا میچ ٹمیٹ کرکٹ کے شائقین کے من پسند گراؤنڈ اوول میں تھا جہاں خدا نے میرے بازوؤں میں ایسی قوت بھر دی کہ میں 311 رنز ناٹ آؤٹ کی ناقابلِ یقین اننگز کھیل گیا اور مین آف دی میچ کے ایوارڈ کا حق دار ٹھہرا۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ ہم نے روایتی حریف کو ایک اننگز اور بارہ رنز جیسے بڑے مارجن سے شکست دی۔

بس، ایک بات کا دُکھ رہا۔ وہ رمضان کا مہینا تھا۔ ٹمیٹ میچ اور گھر سے دوری کی وجہ سے میں روزے نہیں رکھ سکا جس کا مجھے شدید قلق تھا۔ پریس کانفرنس میں اس بابت سوال بھی کیا گیا۔

دراصل جب کبھی رمضان میں مقابلے ہوتے اور روزے چھوٹ جاتے تو میں اُن کی گنتی رکھتا اور گھر لوٹ کر انہیں پورے کرتا۔

خیر، ہم انگلینڈ کے دورے کی بات کر رہے تھے۔

تیسرا ٹمیٹ میچ لارڈز میں کھیلا گیا۔ وہاں بھی میرے بلّے نے خوب رنز اُگلے۔ میں نے 121 رنز کی اننگز کھیل کر اپنی ٹیم کی جیت میں کلیدی کردار ادا کیا۔ ہم نے دو صفر سے سیریز جیت لی۔ میں مین آف دی سیریز ٹھہرایا گیا۔

ون ڈے سیریز بھی کئی معنوں میں یادگار رہی۔ سیریز کے دوسرے میچ میں میں نے 150 رنز کی باری کھیلی جسے کرکٹ ماہرین نے سال کی بہترین اننگز قرار دیا۔

وہاں سے ہم آسٹریلیا کے لیے روانہ ہوئے جہاں سب کی نظریں مجھ پر ٹکی تھیں۔ مخالف کپتان یہ بیان داغ چکا تھا کہ وہ مجھے قابو کرنے کا جامع منصوبہ تیار کر چکا ہے۔

مجھے اُس کے منصوبے کی پروا نہیں تھی۔ خدا میرے ساتھ تھا۔

گابا میں ہونے والے مقابلے میں میں نے 104 رنز کی باری کھیلی۔

میچ کے بعد جب ایک صحافی نے آسٹریلوی کپتان سے اس کے جامع منصوبے کی بابت سوال کیا، اس نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ ”ہاشم آملہ جس قسم کی فارم میں ہے، وہ ڈبل یا ٹرپل سنچری بھی اسکور کر سکتا تھا۔ اُسے 104 پر محدود رکھنا ہماری بڑی کامیابی ہے۔“

اگلے روز جب یہ بیان اخبارات کی زینت بنا، ہمارے منیجر نے ڈریسنگ روم میں موجود تمام کھلاڑیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”کچھ سنا تم لوگوں نے؟ اب مخالف ٹیم ہاشم کو سنچری تک محدود رکھنے کو اپنی کامیابی گرداننے لگی ہے۔ جانتے ہو اِس کا کیا مطلب ہے؟“

”ہاں۔“ ہمارے کپتان نے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے، وہ ایک عظیم کھلاڑی کے سانچے میں ڈھل چکا ہے۔“

میں یہ سن کر جھینپ گیا۔ دل ہی دل میں اپنے رب کا شکر ادا کیا۔ یہ اُسی کا احسان تھا کہ اس مقام پر پہنچا۔ انسان میں تو اتنی قوت نہیں کہ خود سے کوئی مقام حاصل کر سکے۔

”ڈبل سنچری۔“ منیجر کے الفاظ مجھے واپس ڈریسنگ روم میں لے آئے۔ ”اِس سیریز میں ہمیں تم سے ڈبل سنچری کی امید ہے ہاشم۔“

”اللہ مالک ہے۔“ میں نے دھیرے سے کہا۔

گو کہ میں فقط چار رنز کے فرق سے ڈبل سنچری اسکور نہیں کر سکا، لیکن تیسرے ٹمیٹ میچ کی دوسری اننگز میں 196 کی یادگار اننگز کھیل کر میں نے اپنی ٹیم کو فتح سے ہم کنار کیا اور سیریز پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔

یہ اننگز کھیلنے کے بعد مجھے اپنا کوچ ایکر مین بہت یاد آیا جو مجھے تیز کھیلنے کی نصیحت کیا کرتا تھا۔ اس روز میں نے گریم اسمتھ کے ساتھ دوسری وکٹ کے لیے فقط 25 اوورز میں 178 رنز جوڑے۔ چائے کے بعد میں نے تنِ تنہا، فقط 87 گیندوں پر 99 رنز بنائے۔ اس روز میں واقعی بہت تیز کھیلا تھا۔

☆☆☆

”آئی سی سی کی ون ڈے رینکنگ میں ہاشم پہلے نمبر پر ہے...... ٹمیٹ کرکٹ میں اُس کی کارکردگی شان دار ہے...... وہ ٹرپل سنچری کرنے والا پہلا جنوبی افریقی ہے...... اس کی کامیابیوں کا سفر جاری ہے...... تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے...... وہ مستقبل کا کپتان ہے......“

یہ ناقدین کی رائے ہے، مگر میری رائے اس سے مختلف ہے۔ میں تو فقط یہ کہنے پر اکتفا کروں گا کہ ”میرا سفر جاری ہے، بس!“

اور جہاں تک میری کامیابیوں کا تعلق ہے، یہ سب میرے والدین کی دعاؤں کا نتیجہ ہے، میرے رب کا کرم ہے۔

جنوبی افریقا میں مقیم مسلم کمیونٹی مجھے ”رول ماڈل“ کے طور پر دیکھتی ہے، مجھے قابلِ تقلید خیال کرتی ہے، مگر میرے نزدیک...... ہاشم آملہ ایک عام انسان، ایک سیدھا سادہ مسلمان ہے، بس!

عائشہ جونیجو

وہ ایک معمولی سا باورچی تھا اور اتنا کامیاب بھی نہیں تھا کہ بڑے ہوٹل والے اسے ہاتھوں ہاتھ لیتے۔ وہ زندگی کی گاڑی کھینچنے کے لیے، پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے ہوٹل ہوٹل گھوم کر پیش کش کرتا تھا کہ اس سے کھانا پکوالیا جائے۔ کئی قسم کے تجربے کے بعد اس نے ایک خاص ڈش بنالی، اس نے چکن روسٹ کا خاص مسالا تیار کرلیا اور اسی کے بھروسے پر وہ ہوٹل ہوٹل پھرنے لگا۔ اس کا وہ مسالا ایسا کامیاب ٹھہرا کہ دنیا کے ہر ممالک میں مقبول ہوتا چلا گیا۔

دنیا کے سب سے مقبول چکن روسٹ کے بانی کا مختصر سا احوال

فاسٹ فوڈز کا ہم میں سے کون عاشق نہیں؟ جہاں بیٹھے وہاں اسپیشل طریقے سے فرائی کی ہوئی چکن حاضرِ خدمت ہے۔ کھائیے اور مزے اُڑائیے۔ دوست احباب بھی اب اس سے کم بات نہیں کرتے۔ خاندان بھر کی پسند ہے، ابا اماں اور بھیا سب ہی اس کے دیوانے ہیں۔ مگر کیا آپ نے کبھی یہ سوچا کہ اس کا خالق کون ہے؟ خاص طور سے فرائی کرنے کے بعد چکن کی لذت میں اضافہ ہو جاتا ہے، مگر یہ کس نے دریافت کیا اور کیسے؟ ایک سوال یہ بھی

WWW.PAKSOCIETY.COM

ذہن میں در آتا ہے کہ کے ایف سی کیا ہے جہاں بیٹھ کر سب لذت و کام و دہن حاصل کر رہے ہوتے ہیں؟

اس کا جواب ہے ہارلینڈ سینڈرس۔ جی ہاں وہی بڑے میاں، سفید سوٹ میں جن کی تصاویر کے ایف سی کے ریستورانوں میں دکھائی دیتی ہیں۔ انہوں نے ذائقے کی دنیا میں یہ تہلکہ کیسے مچا دیا، آیئے ہم اس راز سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ دراصل کھانا پکانے کی ذمّے داری اسے بچپن ہی سے اٹھانا پڑ گئی تھی۔ ہوا یہ کہ ایک روز ہارلینڈ کا باپ ولبر ڈیوڈ سینڈرس جو ایک کسان تھا کھیت میں کام کرتے ہوئے اپنی ٹانگ تڑوا بیٹھا۔ اس کی کمر میں بھی گہری چوٹ آئی تھی، لہٰذا اس نے چند روز گھر میں آرام کیا اور پھر ایک قصاب کے ہاں ہنری وائل میں کام کرنے لگا۔ (ہنری وائل ریاست انڈیانا میں ہے)۔ دو سال تک گھریوں ہی چلتا رہا اس کے بعد شومیٔ قسمت کہ وہ سخت بیمار پڑ گیا۔ اسے بخار نے آگھیرا اور اترنے کا نام نہیں لیا۔ اسی کرب میں وہ چل بسا تو گھر چلانے کی ذمّے داری ہارلینڈ کے نازک کاندھوں پر آن پڑی۔ اس لیے کہ وہ اپنے تینوں بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ ہارلینڈ کی عمر اس وقت صرف چھ برس تھی، مگر یہ آج کا قصہ نہیں 1895ء کا واقعہ ہے۔

اس کی ماں ٹماٹر کی پیکنگ کرنے والی ایک فیکٹری میں کام کرنے لگی۔ اب گھر کی صفائی کون کرتا اور کھانا وغیرہ کون پکاتا، اس کے لیے ہارلینڈ نے بیڑا اٹھا لیا۔ گویا ہنڈیا میں کفگیر چلانا اس کی کتابِ قسمت میں لکھ دیا گیا تھا۔ پڑھنے والوں کو یقیناً حیرت ہوگی کہ سات برس کی عمر میں ہارلینڈ کو سارے علاقائی کھانے پکانا آتے تھے۔

اس نے بارہ برس کی عمر میں پڑھائی چھوڑ دی۔ ماں فیکٹری کا کام کر کے گزارہ نہیں کر پا رہی تھی، اس لیے اس نے 1902ء میں دوسری شادی کر لی۔ اس کے سوتیلے باپ کو ہارلینڈ سے خواہ مخواہ کی مخاصمت تھی، اس لیے جب وہ نشہ کر لیتا تھا تو اس کی پٹائی کرنا شروع کر دیتا تھا۔ اس کی ماں آخر کہاں تک برداشت کرتی۔ اس نے ہارلینڈ کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے چچا کے ہاں البنی چلا جائے۔

وہاں رہ کر اسے کچھ سکون ملا۔ ماں کی یاد تو بہرحال آتی تھی مگر وہ کر بھی کیا سکتا تھا؟ دس برس کی عمر میں اسے ایک جگہ کام مل گیا، لیکن اسے زیادہ آمدنی نہیں ہوتی تھی، صرف دو ڈالر فی مہینا۔ اس سے بس دال روٹی مل جاتی تھی جس کے سہارے وہ زندہ رہتا تھا۔ جب وہ پندرہ برس کا ہوا تو اس نے بس کنڈکٹری کی۔ اس کے بعد فوج میں درخواست دی۔ اسے بھرتی کر لیا گیا اور کیوبا کے محاذ پر بھیج دیا گیا۔ جب جنگ ختم ہوئی تو اسے چھ ماہ بعد فوج سے رخصت کر دیا گیا۔ وہ اپنے ایک اور چچا کے ہاں شیفیلڈ الاباما چلا گیا۔ اس کے بھائی کلیرنس کو جب معلوم ہوا تو وہ اپنے سوتیلے باپ کے ظلم و ستم سے بچنے کے لیے ہارلینڈ کے پاس چلا آیا۔

ہارلینڈ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو اس نے بیکار بیٹھنے کے بجائے کھیتی باڑی شروع کر دی۔ جب اس کام میں دل نہ لگا تو اس نے بیمہ سیلز مین کی نوکری کی، پھر کشتی رانی کرنے لگا اور پھر ٹرین کا فائر مین بن گیا۔ 1908ء میں جب وہ اکتاہٹ کا شکار ہونے لگا تو اس نے جوزفائن کنگ نامی لڑکی سے شادی کر لی۔ ہارلینڈ کا باس اس کی کارکردگی سے مطمئن نہیں تھا، اس لیے جب وہ کاروباری دورے پر گیا ہوا تھا تو اس نے ہارلینڈ کو ملازمت سے نکال دیا۔ اس کی بیوی کو یہ بات پتا چل گئی تو اس نے گھر کا فرنیچر بیچا اور سارا اثاثہ سمیٹ کر اپنے بچوں کے ساتھ باپ کے گھر چلی گئی۔ جوزفائن کے بھائی نے ہارلینڈ کو خط لکھا کہ وہ تم جیسے نکھٹو کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی جس کو کرنے کا کوئی کام ہی نہیں ہے۔

جوزفائن سے اس کا ایک لڑکا اور دو لڑکیاں ہوئیں۔ لڑکا ہارلینڈ جونیئر تو اوائل عمری میں ہی چل بسا، البتہ لڑکیاں مارگریٹ اور مائلڈرڈ پروان چڑھیں۔ 1930ء میں ہارلینڈ نے کاربن کنٹکی میں ایک پٹرول پمپ کھولا جو اسٹینڈرڈ آئل کمپنی کا تھا اور ہائی وے کے نزدیک تھا۔ اس کے ساتھ ہی ہارلینڈ نے مسافروں کے لیے کھانے کا بندوبست کیا۔ اس کے پاس اتنا سرمایہ نہیں تھا کہ وہ ایک ریستوران کھول سکتا۔ وہ جانتا تھا کہ جب فلوریڈا جانے والے مسافر اپنی گاڑیوں میں پٹرول بھروانے کے لیے آتے ہیں تو انہیں بھوک ستا رہی ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ کھانے کی چیزیں ضرور کھائیں گے۔ اس کا خیال درست نکلا۔ لوگ اس کے ہاتھ کی بنائی ہوئی کھانے کی چیزیں خریدنے لگے۔ یہ چیزیں وہ اپنے کوارٹر میں بٹھا کر انہیں کھلاتا تھا۔ پٹرول پمپ کے عقب میں بہت سے کوارٹر تھے، انہی میں اس کا کوارٹر بھی تھا۔ اس کا نام اس نے 'سینڈرس کورٹ اینڈ کیفے' رکھا۔ جب ہارلینڈ اس علاقے میں مشہور ہو گیا اور لوگ اس کے ہاتھ کی بنائی ہوئی چیزیں کھانے کے لیے آنے لگے تو سڑک پار اس نے ایک موٹیل کھول لیا۔ جہاں 142 افراد کو

بٹھا کر چکن کھلانے کا انتظام تھا۔ یہ موٹیل ایک بار بے احتیاطی کی بنا پر جل گیا تھا۔ ہارلینڈ نے اسے دوبارہ تعمیر کیا اور پھر سے کاروبار شروع کر دیا۔ اس لیے کہ وہ ایک باحوصلہ اور باہمت شخص تھا، جس نے نامساعد حالات سے کبھی ہار نہیں مانی۔

چکن کو فرائی کرنے کا خیال اس کے دماغ میں یوں آیا کہ دیگچی میں چکن دیر میں فرائی ہوتا تھا، لہٰذا اس نے ایک پریشر کوکر خرید لیا۔ جس میں اس سے آدھے وقت میں چکن فرائی ہو جاتا تھا اور دیگچی سے زیادہ مزے دار ہوتا تھا۔ چونکہ اس کا چکن جلدی سے تیار ہو جاتا تھا، اس لیے اسے فاسٹ فوڈز کہا جانے لگا۔ وہ اپنے چکن میں گیارہ جڑی بوٹیاں اور مسالے ڈالا کرتا تھا۔ جب اس کی شہرت سارے علاقے میں پھیل گئی تو کنٹکی کے گورنر روبی لیفون نے 1935ء میں اسے اعزازی 'کنٹکی کرنل' کا خطاب دیا۔ 1939ء میں کھانوں کا سب سے بڑا مبصر ڈنکن ہینز یہ دیکھنے کے لیے اس کے موٹیل پر آیا کہ اس کے پکائے ہوئے فرائیڈ چکن کو کھا کر ذائقہ معلوم کرے تو وہ ہارلینڈ کے فرائی کیے ہوئے چکن سے ازحد متاثر ہوا اور اس نے کہا کہ ہارلینڈ کے چکن کھانا کسی ایڈونچر سے کم نہیں۔

نام کمانے اور شہرت کا تناور درخت لگانے میں ہارلینڈ کو پے در پے ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اگر ہم 1930ء سے پیشتر کی زندگی پر نگاہ ڈالیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ناکام شخص تھا جس نے اپنی زندگی میں کچھ نہیں کیا۔ اسی لیے اس کی بیوی اس سے علیحدہ ہو گئی اور اسے نکھٹو کا خطاب بھی ملا، لیکن قسمت کو جب اس پر رحم آیا اور اس کے دن پھرے تو اس کا شمار دنیا کے دولت مند ترین اشخاص میں ہونے لگا۔ یقیناً وہ اولوالعزم تھا، اسی لیے اس نے ناکامی کا منہ دیکھنے کے بعد خود کو شراب کے جام میں نہیں ڈبویا اور نہ جوا کھیل کر اپنی زندگی ختم کر دی۔ مزے کی بات یہ کہ اس کے پاس تعلیمی ڈگریاں بھی نہیں تھیں۔ بس معمولی سی شد بد تھی اور دماغی صلاحیتیں۔

جب اس کی شہرت دو چند ہو گئی تو ہارلینڈ چیمبر آف کامرس کے روٹری کلب کا ممبر بن گیا۔ جب اس کے بارہا بلانے پر اس کی بیوی جوزفائن گھر واپس نہ آئی تو اس نے 1947ء میں اسے طلاق دے کر اپنی سیکریٹری کلاڈیا سے شادی کر لی۔ 1950ء میں ہارلینڈ نے اپنے حلیے میں واضح تبدیلی کی۔ اس نے ایک مخصوص اسٹائل کی داڑھی اور مونچھیں رکھ لیں، سفید سوٹ پہننا اور اسٹرنگ ٹائی لگانا شروع کر دی۔ اس کے مخصوص لباس اور ظاہری حلیے سے بھی اس کی شہرت میں اضافہ ہوا۔ لوگ اس پر نظر پڑتے ہی پہچان لیا کرتے تھے کہ وہ ہارلینڈ سینڈرس ہے۔ اس کی ناک پر چشمہ لگا ہوتا تھا۔ اس نے آیندہ بیس برس تک اپنا لباس تبدیل نہیں کیا۔ گرمیوں میں البتہ سفید سوٹ سوتی کپڑے کا ہوتا تھا اور سردیوں میں اونی۔ وہ ہاتھ میں ایک چھڑی لے کر چلتا تھا۔ اس کی مونچھیں اور داڑھی کے کچھ بال سیاہ تھے، جنہیں وہ سفید سوٹ سے مماثلت دینے کے لیے پینچ پاؤڈر سے رنگت اڑا کر سفید کر لیا کرتا تھا۔ سرتاپا سفید اور لائقِ تعظیم!

SOLE DISTRIBUTOR
of U.A.E

WELCOME BOOK SHOP

JASOOSI SUSPENSE PAKEEZA SARGUZASHT

P.O.Box 27869 Karama, Dubai Tel: 04-3961016
Fax: 04-3961015 Mobile: 050-6245817
E-mail: welbooks@emirates.net.ae

Best Export From, Pakistan

WELCOME BOOK PORT
Publisher, Exporter, Distributor

All kinds of Magazines, General Books and Educational Books

Main Urdu Bazar, Karachi Pakistan
Tel: (92-21) 32633151, 32639581 Fax: (92-21) 32638086
Email: welbooks@hotmail.com
Website: www.welbooks.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

65 برس کی عمر میں ہارلینڈ کو ایک اور صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ اس کا موٹیل جس جگہ تھا وہاں سے ایک سڑک نکالی جانی تھی۔ شہری حکومت نے اسے اونے پونے دام دے کر رخصت کیا اور اس موٹیل کی جگہ سڑک بنادی۔ ہارلینڈ ایک بار پھر بے کار ہوگیا۔ اس کا گزارا سوشل سیکیورٹی سے ملنے والے ۱۰۵ ڈالروں پر ہونے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر اس نے سنجیدگی سے کچھ نہ کیا تو اسے جھولنے والی کرسی پر بیٹھ کر اپنا وقت گزارنا ہوگا۔

اس نے ایک ریستوران میں جا کر کہا کہ وہ اپنے فارمولے سے اس کے ریستوران میں چکن بنانا چاہتا ہے۔ اگر گاہکوں کو وہ چکن پسند آئیں گے تو وہ فی چکن ایک نکل (ایک ڈالر کا بیسواں حصہ) لے گا۔ پھر اس کے عملے کو فرائی کرنے کی ترکیب سمجھا دے گا۔ لوگوں نے اس کا مذاق اُڑایا اور اسے مصافحہ کیے بغیر رخصت کر دیا۔ بالآخر سالٹ لیک سٹی کے مالک پیٹر ہارمن کو اس کا آئیڈیا پسند آگیا اور اس نے کسی لکھت پڑھت کے بغیر یہ معاہدہ کرلیا۔ وہ اور اس کی بیوی کلاڈیا اپنی پرانی دھرانی سی کیڈی لیک میں ایک پریشر کوکر، آٹے کا تھیلا اور مسالے رکھے الٹی نوائے اور انڈیانا کی ریاست میں گھوما کرتے تھے کہ کوئی ان کا فارمولا لے لے۔ کلاڈیا کار ڈرائیو کرتی تھی تو وہ کار کی عقبی سیٹ پر لیٹ کر سوجاتا۔ صبح اٹھ کر شیو کرتا اور کسی پٹرول پمپ کے غسل خانے میں غسل کر لیا کرتا۔ ہارلینڈ کی محنت رنگ لائی۔ کئی ریستورانوں کے مالکان نے اس سے یہ معاہدہ کرلیا۔ یوں ہارلینڈ کو معقول آمدنی ہونے لگی۔ 1964ء میں اس کو اپنے فارمولے سے 600 ریستورانوں سے آمدنی ہوتی تھی۔

وہ دنیا کے سارے ممالک کا دورہ کرتا پھرتا تھا اور ان چکن کا معیار چیک کرتا پھرتا تھا جو اس کے ریستورانوں میں تیار ہوتے تھے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق وہ ڈھائی لاکھ میل سالانہ سفر کیا کرتا تھا۔ 1964ء میں اس نے کینیڈا کے علاقوں کے ریستورانوں کے علاوہ باقی ماندہ ریستورانوں کے حقوق دو برس کے لیے چالیس لاکھ ڈالر میں ایک بڑے کاروباری کو فروخت کر دیے، اس لیے کہ وہ بہت تھک چکا تھا اور کچھ آرام کرنا چاہتا تھا۔ عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ جب اس کے ہاتھ میں چکن بنانے کے فارمولے کے علاوہ کچھ نہیں تھا تو اس نے محض ایک نکل فی چکن لے کر کروڑوں ڈالر کما لیے۔ مگر اس میں اس کی بھاگ دوڑ اور انتھک محنت کا عمل دخل تھا۔

اس نے کام کرنا نہیں چھوڑ دیا تھا بلکہ وہ اپنی ذمے داریوں کا بوجھ کم کرنا چاہتا تھا۔ اپنی 80 ویں سالگرہ اس نے انٹاریو میں منائی جس میں مشہور و معروف مزاحیہ اداکار جیری لوئس نے شرکت کی تھی۔ 1970ء میں وہ اور اس کی بیوی ایک چرچ میں جا کر باقاعدہ بپتائز ہوئے۔ اس کے معمولات صحت مندانہ تھے۔ وہ آخری عمر تک اپنے ہاتھ میں چھڑی لے کر واکنگ کرتا تھا، پھر غسل کر کے ناشتا کرتا۔ اسے ناشتے میں جو کا دلیا اور سلاد بہت پسند تھا۔ وہ شام کی چائے کے ساتھ شہد کھانا بھی پسند کرتا تھا۔

1975ء میں ہارلینڈ نے ٹرسٹ قائم کردیا جس سے ہونے والی آمدنی غریبوں اور مسکینوں میں تقسیم کی جانے لگی۔ اس سے تعلیمی وظائف بھی دیے جانے لگے۔ بہت سے اسپتال اس کے نام سے کھلے جہاں مفت علاج معالجے کی سہولیات تھیں۔ اس کے ٹرسٹ سے برٹش کولمبیا فاؤنڈیشن کو ہر سال دس لاکھ ڈالر امداد دی جاتی ہے۔

وہ 9 ستمبر 1890ء میں ہنری وائل، انڈیانا میں پیدا ہوا اور 16 دسمبر 1980ء میں اس کا انتقال نمونیے سے لوئس وائل کنٹکی میں ۹۰ برس میں ہوا۔ اس کے جنازے میں تقریباً ایک ہزار افراد نے شرکت کی۔ اسے اپنے مخصوص سفید لباس اور سیاہ ٹائی میں دفن کیا گیا۔ اس کی موت پر کنٹکی میں عمارتوں پر لگائے جانے والے جھنڈے چار روز تک نصف بلندی پر لہرائے گئے۔

ایک برس پیشتر ڈاکٹروں نے اسے لیکومیا (خون کے سرطان) کا مریض بتایا تھا اور احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کی ہدایت دی تھی۔ اسے لوئس وائل کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ اس کی موت کے بعد بہت سے نامور اداکاروں نے اس کی آواز کی نقل اتاری اور ٹیلی وژن پر اس کی کارٹون فلمیں پیش کی جاتی ہیں۔ مرنے کے بعد اس کے سامان سے کھانا پکانے کی ایک کتاب نکلی، جو اَب کے ایف سی آن لائن پیش کر رہا ہے۔ اس کا قائم کیا ہوا فرائیڈ چکن کا کاروبار دنیا کا سب سے بڑا کاروبار تسلیم کیا جاتا ہے۔ ہر سال دو ارب چکن اس کے ریستورانوں سے دنیا کے ۱۰۰ ممالک میں فروخت ہوتے ہیں، جن سے ۲۸۵ بلین ڈالر آمدنی ہوتی ہے (جب ایک کے آگے نو صفر لگاتے ہیں تو ایک بلین بنتا ہے) اس وقت دنیا میں ساڑھے انتیس ہزار کے ایف سی ریستوران ہیں۔

پلے بوائے

شکیل ادریس

جب اس نے رسالہ نکالنے کا لائحہ عمل ترتیب دیا تو اس کے پاس فقط چند سکّے تھے مگر دل میں امنگ تھی۔ حوصلہ تھا۔ کچھ کر دکھانے کا جذبہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ادھار کا کاسہ تھام کر پبلشر بننے کی سعی کرنے والا دیکھتے ہی دیکھتے کھرب پتی بن گیا۔ اس کے پرچے کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ دکانوں پر خریدار پہلے سے منتظر کھڑے رہتے۔ اس کا رسالہ دنیا بھر میں سب سے زیادہ بکنے والا تصور کیا جاتا ہے۔

مشہور امریکی میگزین پلے بوائے کا پہلا شمارہ دسمبر ۱۹۵۳ء میں شکاگو سے شائع ہوا تھا اور اس کا ایڈیٹر ہیو ہیفنر تھا۔ انگریزی اور دوسری زبانوں میں شائع ہونے والے اس میگزین کی اشاعت تقریباً ڈیڑھ لاکھ ہے اور یہ دنیا کے 25 ممالک سے شائع ہوتا ہے اور اب انٹرنیٹ سے بھی پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں صحافت، سیاست اور فکشن پر دلچسپ اور دل گداز کہانیاں شائع ہوتی ہیں۔ ایسی خواتین کی دلکش تصاویر بھی شائع ہوتی ہیں جو قیود و بند سے آزاد ہوتی ہیں، بلکہ اس میگزین کی شہرت کی ایک بڑی وجہ یہی ہے۔ اسے بک شیلفوں میں رکھنے کے بجائے شائقین تکیوں کے نیچے رکھتے اور اپنی آنکھوں کو سینکتے اور دلوں کو گرماتے ہیں۔ ایڈیٹر ہیو ہیفنر کے پاس میگزین کو شائع کرنے کا آئیڈیا تو تھا، لیکن جیب خالی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنی ماں سے ایک ہزار ڈالر قرض لے کر یہ میگزین شائع کیا تھا۔ رفتہ رفتہ اس میگزین نے بڑی اشاعت حاصل کر لی اور یہ ادارہ پلے بوائے انٹرپرائز انکارپوریٹڈ میں ڈھل گیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

اپنی منفرد کہانیوں کے اعتبار سے اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے کہ اس میں امریکا کے نامور قلم کار اپنی تحریر کا جادو جگاتے ہیں، جن میں آرتھر سی کلارک، پی جی ووڈ ہاؤس اور مارگریٹ ایٹووڈ شامل ہیں۔ اس کے کارٹون بھی خصوصیت کے حامل ہوتے ہیں اور امریکا کے بڑے کارٹونسٹ اس میں اپنی فن کاری کے جوہر دکھاتے ہیں۔ پلے بوائے انٹرویوز کو بھی بہت اہمیت دیتا ہے۔ نامور کھلاڑی، سیاست داں، ماہر معاشیات، فلم ڈائریکٹر، مذہبی شخصیات، ناول نویس، ڈراما نویس اور ریس کار ڈرائیور کے انٹرویو شامل ہو چکے ہیں۔

اس کا ایڈیٹر ہیفنر 1926ء میں شکاگو، ایلے نوائے میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی ماں گریس اور باپ گیلن لوسیس ہیفنر تھا۔ دونوں اسکول ٹیچر تھے۔ اس کی ماں سوئیڈش تھی جب کہ باپ جرمن تھا لیکن اس نے انگریزی بولنا سیکھ لی تھی۔ وہ پرانے اور دقیانوسی خیالات کا پیرو کار تھا۔ اس لیے پابندی سے چرچ جایا کرتا تھا۔

ہفنر اپنے تینوں بھائیوں میں سب سے بڑا ہے۔ اس نے ابتدائی تعلیم اسٹینمز ہائی اسکول میں مکمل کی۔ اس کے بعد وہ امریکی فوج کے لیے شائع ہونے والے ایک اخبار میں مضامین لکھنے لگا۔ 1946ء سے آیندہ دو برس تک اس نے یہی کام کیا۔ 1949ء میں ایلے نوائے یونی ورسٹی سے نفسیات کی ڈگری حاصل کی اور پھر سماجیات میں ایک چھوٹا سا کورس کیا۔ اس کے بعد 'اسکوائر میگزین' میں کام کرنے لگا۔ وہ پراڈکٹس کے اشتہارات بنایا کرتا تھا اور بچوں کے ایک میگزین کا سیلز منیجر بھی تھا۔ اس نے جب کام کرنے کے بعد اپنی ترقی کی بات کی اور اپنی تنخواہ میں 5 ڈالر کا اضافہ چاہا تو اسکوائر میگزین کے مالکان راضی نہیں ہوئے۔ ہیفنر بہت دل برداشتہ ہوا۔ ایک روز بیٹھے بٹھائے اس کے دماغ میں آیا کہ کیوں نہ اپنا میگزین شائع کیا جائے اور پڑھنے والوں کو چونکا دیا جائے۔ اس میگزین کا نام اس نے 'اسٹیج پارٹی' تجویز کیا۔ پھر اپنے ایک دوست ایلڈن سیلرز کو بلا کر اپنا منصوبہ بتایا اور کہا کہ وہ سرمایہ لگانے والی کمپنیوں کو تلاش کرے۔ خود اس نے ایک بینک سے 600 ڈالر قرض لیا اور اپنا فرنیچر رہن رکھ دیا۔ اسے اچھی طرح سے یاد ہے کہ اس نے اپنے 45 دوستوں سے تقریباً آٹھ ہزار ڈالر قرض لیا جس میں اس کی ماں کے ایک ہزار ڈالر بھی شامل تھے۔ اس کی ماں کو اپنے سپوت پر اعتماد تھا کہ وہ اس رقم کو ضائع نہیں کرے گا اور اس کا منصوبہ کامیابی سے ہم کنار ہوگا۔

وہ میگزین کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ 'اسٹیج' نامی میگزین کے ایڈیٹر کے کانوں میں بھنک پڑ گئی۔ اس نے ہیفنر کو بلا کر کہا کہ اگر اس نے اپنے میگزین کا نام 'اسٹیج' یا اس سے ملتا جلتا نام رکھا تو وہ اس پر مقدمہ قائم کردے گا۔ ہیفنر اس کی بیوی ملی اور سیلرز نے مل کر سر جوڑا اور نیا نام سوچنے لگے۔ ابتدا میں ان کے دماغ میں جو نام آئے ان میں ٹاپ ہیٹ، جنٹلمین، سر اور بیچلر شامل ہیں۔ بالآخر سیلرز نے 'پلے بوائے' تجویز کیا جسے سب نے منظور کرلیا۔ دراصل سیلرز ایک زمانے میں پلے بوائے نامی آٹو موبائل کمپنی میں کام کر چکا تھا۔ دسمبر ۱۹۵۳ء میں پلے بوائے کا پہلا شمارہ شائع ہوا لیکن اس پر مہینے کا نام نہیں پڑا تھا۔ یہ میگزین اس نے کسی آفس سے شائع نہیں کیا تھا بلکہ اس نے اپنی کچن ٹیبل پر بیٹھ کر اس کا کام کیا تھا۔ ہیفنر کو توقع نہیں تھی کہ اس کا دوسرا شمارہ بھی شائع ہو سکے گا۔ میگزین کے سینٹر فولڈ (بالکل درمیان) میں مارلین منرو کی تصویر تھی، حالانکہ وہ خاص طور پر پلے بوائے کے لیے نہیں کھینچی گئی تھی مگر ہیفنر نے اسے پلے بوائے کے لیے منتخب کرلیا۔ وہ تصویر اس نے ایک کیلنڈر سے لی تھی جو 1949ء میں شائع ہوا تھا۔ ہیفنر کا کہنا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں مارلن منرو سے کبھی نہیں ملا۔

چند ہفتوں میں پلے بوائے کا پہلا شمارہ 53991 کی تعداد میں فروخت ہوگیا۔ اس شمارے کی قیمت 50 سینٹ تھی اور یہ صرف 44 صفحات کا تھا۔ پلے بوائے کا (پہلا شمارہ 2002ء میں 5 ہزار ڈالر میں ایک قدرداں نے خریدا تھا) مارچ، اپریل اور مئی 1954ء کے شماروں میں رے براڈبری جیسے مقبول و معروف ناول نگار کا ایک ناول 'فیرن ہائٹ 451' پلے بوائے میں قسط وار شائع ہوا۔ دلچسپ بات یہ کہ جب پلے بوائے کا پہلا شمارہ بک اسٹالوں پر آیا تو ہیو ہیفنر کی عمر صرف ۲۷ برس تھی۔ میگزین کے پہلے صفحے پر ہیفنر کا نام ایڈیٹر کی حیثیت سے نہیں تھا۔ اس نے پڑھنے والوں کے لیے لکھا تھا کہ میں روز اول ہی سے قارئین کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ پلے بوائے فیملی میگزین نہیں ہے۔ اگر آپ کسی کی بہن، ماں یا ساس ہیں اور آپ نے غلطی سے یہ میگزین خرید لیا ہے تو اسے اپنے بوائے فرینڈ کو دے دیجیے۔

میگزین پر خرگوش کی امتیازی تصویر بوٹائی کے ساتھ شائع ہوئی۔ اسے آرٹ ڈیزائنر پال نے بالکل آخری صفحات کے لیے بنایا تھا، مگر یہ طے ہوا کہ اسے سرورق پر نہایت چھوٹا کر کے شائع کیا جائے۔ یہ امتیازی تصویر آج تک سرورق کی زینت بنتی ہے۔ ہیفنر نے اس کا انتخاب محض اس لیے کیا کہ خرگوش بے حد متحرک ہوتا ہے اور جنس سے اسے دوسرے حیوانوں کی نسبت زیادہ شغف ہے۔

1955ء تا 79ء پلے بوائے کے نام کے انگریزی حرف 'پی' کی اندرونی یا بیرونی طرف تارے چھپے ہوتے تھے۔ اس کے بارے میں قیاس آرائیاں ہونے لگیں کہ یہ سرورق پر شائع شدہ حسینہ کے حسن و جمال کی طرف اشارہ ہے کہ وہ کس مقام پر ہے یا یہ کہ وہ ایڈیٹر کے شبستان کی کتنی بار زینت بنی۔ 1958ء میں ہیفنر نے جب ایک سولہ سالہ لڑکی کی بے لباس تصاویر شائع کردیں تو عدالت میں اس پر مقدمہ چلایا گیا کہ اس نے ایک نابالغ لڑکی کی تصاویر کیوں شائع کیں؟

1960ء میں میگزین کی اشاعت 70 لاکھ ہو چکی تھی۔ اب ہیفنر کے پاس اتنا سرمایہ جمع ہو چکا تھا کہ وہ اپنا آفس بنا سکے۔ اس نے ایک عمارت خریدی اور اس کا نام پلے بوائے مینشن رکھ دیا۔ بڑے اخبارات اور میگزینوں کی طرح سے اس نے اپنا ایک معیار قائم کرلیا تھا۔ اسی عمارت میں اس نے ایک کلب بھی قائم کرلیا جو اپنے پروگراموں کی بنا پر بہت مشہور ہوا۔ رفتہ رفتہ ان کلبوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی اور اس کے ساتھ ہی اس نے ہوٹل، جوئے خانے اور تفریح گاہیں بنائیں۔ جیسے جیسے اس کی دولت میں اضافہ ہوتا چلا گیا، ہیفنر نے ایک ٹی وی چینل کھول لیا اور ایک فلم کمپنی میں بھی سرمایہ کاری کی۔ پھر اس نے ۱۹۷۱ء میں لاس اینجلس، کیلیفورنیا میں ایک اور پلے بوائے مینشن کا افتتاح کیا۔ چند ماہ بعد اس نے فیصلہ کیا کہ وہ مستقل طور پر لاس اینجلس میں قیام کرے گا۔

1966ء تا 76ء پلے بوائے کے تقریباً 20 ایڈیٹر تبدیل ہوئے۔ ان میں سے ہر ایک اپنے فن کا ماہر تھا اور اس نے اپنی استعداد کے مطابق اعلیٰ فکشن پیش کیا۔ فکشن کے علاوہ پلے بوائے میں خوب صورت نظمیں بھی شائع ہوتی ہیں جن کے لیے ایک ایڈیٹر علیحدہ سے رکھا جاتا ہے۔

1970ء تک پلے بوائے کو ایک منفرد میگزین کی حیثیت سے بہت عروج حاصل ہوا، لیکن پھر اسی انداز کے بہت سے میگزین شائع ہونے لگے جن کی وجہ سے اس کی اشاعت روبہ زوال ہوگئی۔ ان میگزینوں نے اخلاقیات کی ساری حدود پار کردیں اور حسن و جمال کو کچھ اس طرح سے بے حجاب کیا کہ قیس پردے میں بھی عریاں نکلا۔ ان میگزینوں میں پینٹ ہاؤس، اوئی اور گیلری شامل ہیں۔ ان میگزینوں کو مثال بنا کر ویڈیو فلمیں بھی مارکیٹ میں آگئیں جو یقیناً ساکت کے بجائے متحرک تھیں۔ ان کا حظ و انبساط میگزینوں سے سوا تھا۔ سب کچھ متحرک تھا اور ویڈیو فلم کی نسبت سے اسے گھروں میں چلایا جاسکتا تھا۔ اپنے اسکرین پر چلا کر اس کے سامنے بیٹھا جاسکتا تھا، کہیں جانے کا کوئی تکلف ہی نہیں تھا۔

1975ء میں ہیفنر کی لیڈی سیکریٹری بوبی ارسٹین نے خودکشی کرلی تو ہیفنر نے وضاحت کی کہ بوبی منشیات کی عادی ہو چکی تھی۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ منشیات کی کھلی خرید و فروخت پر پابندی لگائے۔ لوگ عریانیت سے موت کے دہانے پر نہیں پہنچتے بلکہ منشیات انہیں دوسری دنیا میں پہنچا دیتی ہے۔ یہ پلے بوائے کی فلاسفی ہے کہ وہ منشیات کے سخت خلاف ہے۔ چنانچہ اسی لیے پلے بوائے ہومز قائم کیے گئے جہاں انہیں منشیات سے دور رہنے کی تربیت دی جاتی ہے۔

ہیفنر کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اس کا نام "ہالی ووڈ واک آف فیم" پر لکھا ہوا ہے۔ (یہ ہالی ووڈ کی طرف جانے والی سڑک ہے جس پر سارے معروف اداکاروں، ہدایت کاروں اور کہانی نویسوں کے نام خوب صورت انداز میں لکھے ہوئے ہیں) اس کے علاوہ اس نے بہت سی فلموں میں بھی کام کیا ہے۔ ایک فلم 'مس مارچ' میں اسے اپنی اداکارانہ صلاحیت پر 'بدترین معاون اداکار' کا ایوارڈ بھی ملا ہے۔ اس نے ٹی وی کے لیے بہت سی فلمیں اور قسط وار ڈرامے بنائے ہیں جن میں اس کی معاونت کیوون برن نے کی ہے۔

1949ء میں اس نے نارتھ ویسٹرن یونی ورسٹی کی ایک گرل فرینڈ مالڈرڈ ولیمز سے شادی کرلی جو 1926ء میں پیدا ہوئی تھی۔ اس سے اس کے دو بچے ہوئے کرسٹی (نومبر 1952ء میں) اور ڈیوڈ (اگست 1955ء میں) مالڈرڈ نے اعتراف کیا کہ اس کا ایک معاشقہ اس وقت چلا تھا جب وہ فوج کے اخبار کے لیے کام کر رہا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ میری زندگی کے سب سے واہیات لمحات تھے۔ تاہم میں نے ہیفنر کو اجازت دے رکھی ہے کہ وہ چاہے تو دوسری عورتوں کو اپنے شبستان کی زینت بنا سکتا ہے، میرا خیال ہے کہ اس طرح سے میری ازدواجی زندگی زیادہ مضبوط رہے گی۔ یہ اس کی خام خیالی تھی، ہیفنر کو ادھر اُدھر منہ مارنے کی اجازت دینے کے باوجود ان دونوں میں 1959ء میں علیحدگی ہوگئی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

کرسٹی ہیفنر، پلے بوائے کے مالک ہیو ہیفنر کی بیٹی تھی جس نے پلے بوائے کے شعبۂ ادارت میں 1975ء میں شرکت کی۔ 1980ء میں جب ہیفنر کو دل کا دورہ پڑا تو اس نے بیٹی کو کمپنی کا مالک بنا دیا۔ 1986ء میں اس نے کمبرلے کونارڈ سے شادی کر لی جس کے نتیجے میں اس سے دو لڑکے ہوئے۔ مارسٹن گلین (پیدائش اپریل 1990ء) اور کوپر براڈفورڈ (1991ء)۔ 1998ء اس کی علیحدگی کمبرلے کونارڈ سے بھی ہو گئی۔ اس نے پلے بوائے مینشن سے ملحق سکونت اختیار کر لی۔

جون 1979ء میں پلے بوائے نے نئی نسل کو متوجہ کرنے کے لیے ایک بار پھر نئی راہ نکالی۔ اس نے ہالی ووڈ، لاس اینجلس کے ایک عظیم الشان آڈیٹوریم میں جاز (جدید موسیقی) کا جشن منایا۔ یہ تقریب رات بھر ہنگامہ آرائی پر مشتمل تھی۔ ہاہو ہوتا رہا اور نئی نسل کے جوانوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ جاز کے سارے بڑے فن کار اس روز اسٹیج پر اپنے فن کے کمالات دکھا رہے تھے۔ یہ ہر لحاظ سے یاد رکھی جانے والی ایک دھما چوکڑی تھی۔ اس پہلی تقریب کا ٹکٹ ساڑھے پانچ ڈالر کا تھا اور اس میں پانچ شو دکھائے گئے تھے۔ جب کہ 68 ہزار شائقین نے اس شو میں شرکت کی تھی۔

پلے بوائے نے اپنی اس روایت کو زندہ رکھا اور ہر سال اس تقریب کو اسی والہانہ انداز سے منایا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج 32 برس بعد جاز کی اس تقریب نے بین الاقوامی شہرت حاصل کر لی ہے اور تقریباً دس لاکھ شائقین اس محفل میں شریک ہو چکے ہیں اور انہوں نے مجموعی طور پر 300 گھنٹے موسیقی کی دھنوں پر سر دُھنا ہے۔ ہزاروں فن کاروں نے اپنے فن کا جادو جگایا اور اپنے پروگرام تقریباً ڈیڑھ سو انداز میں پیش کیے۔ اس کی اس خصوصیت کی بنا پر پلے بوائے کا نام زبان پر آتے ہیں جاز فیسٹول کا نام بھی لوگوں کو فوراً ہی یاد آ جاتا ہے۔ پلے بوائے نے تین ریکارڈوں کا ایک سیٹ پہلی تقریب کے بعد جاری کیا تھا جسے شائقین نے از حد پسند کیا اور وہ ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوا۔

اگست 1991ء اور 92ء میں پلے بوائے نے جاز کا بین الاقوامی شو جاپان میں پیش کیا۔ اس سلسلے کا فقید المثال پروگرام یہ تھا کہ ہیفنر نے دو روز کا لائیو پروگرام پیش کیا اور سارے مواصلاتی اداروں کو اس کی اجازت دے دی کہ وہ بلاقیمت اس پروگرام کو اپنے براڈکاسٹنگ اسٹیشن سے سارے امریکا میں نشر کر سکتے ہیں۔ اس حیرت انگیز پیش کش پر تقریباً 200 براڈکاسٹنگ کمپنیوں نے پلے بوائے کے جاز پروگرام کو اپنے اسٹیشنوں سے نشر کیا۔ اس کے بعد یہ ہونے لگا کہ وہ کمپنیاں ایک برس پیشتر ہی ہیفنر کو فون کر کے پروگرام کے بارے میں اطلاعات جمع کرتی رہیں اور اپنے سامعین اور ناظرین تک پہنچاتی رہتی تھیں۔

پلے بوائے جاز فیسٹیول اتنا مقبول ہوا کہ ہیفنر نے 1994ء میں اس پروگرام کو امریکا کی سڑکوں پر منانے کا فیصلہ کیا۔ اٹلانٹا، ڈینور، ڈیٹورائٹ اور واشنگٹن ڈی سی نے اسے بے پناہ پسند کیا اور اس میں دل کھول کر حصہ لیا۔ اس لیے کہ یہ فیسٹیول ایک ہفتے تک چلتا رہا تھا جس میں صرف امریکا ہی کے شائقین نہیں بلکہ دنیا بھر سے جاز کے متوالوں نے شرکت کی۔

ہیفنر کا شروع سے سیاسی جھکاؤ ڈیموکریٹک پارٹی کی طرف تھا اور اس نے سیکڑوں بار پارٹی کے لیے چندہ بھی اکٹھا کیا۔ اس نے ۲۷ ہزار ڈالر اکٹھا کیے۔ اس کے علاوہ اس نے ایک لاکھ ڈالر اس یونی ورسٹی کو عطیہ دیا جہاں کہ اس نے تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ فلموں کی سنسرشپ دانش مندانہ طریقے سے نہیں ہو رہی ہے، لہٰذا یونی ورسٹی میں ایک شعبہ کھلنا چاہیے جس میں اس بات کی تربیت دی جائے کہ فلمیں معقول انداز میں سنسر کی جائیں۔

دسمبر 2008ء میں کرسٹی ہیفنر نے اعلان کیا تھا کہ وہ اب پلے بوائے کی ادارت کا بار اپنے کاندھوں سے اتار رہی ہے اور نائب کی حیثیت سے کام کرنا پسند کرے گی۔ اس لیے کہ وہ صدر بارک اوباما کے منصوبوں سے متاثر ہوئی ہے اور زیادہ سے زیادہ رفاہی کام کرنا چاہتی ہے۔ ملک کو اس کی بہت ضرورت ہے۔ 2009ء سے وہ کمپنی کی سربراہ نہیں رہے گی۔ ملک کو نئی قیادت کی ضرورت ہے، اسی طرح سے میگزین کو بھی نیا دماغ اور نئی سوچ درکار ہے۔ ہو سکتا ہے کہ نیا ایڈیٹر مجھ سے زیادہ فعال اور متحرک ہو اور میگزین کی اشاعت کو دگنا کر دے۔

جنوری 2004ء میں میگزین نے اپنی پچاسویں سال گرہ منائی۔ اس سال گرہ کی تقریبات لاس اینجلس، نیویارک، لاس ویگاس اور ماسکو میں منائی گئیں۔ 2009ء سے میگزین نے امریکی یونی ورسٹیوں اور کالجوں میں پانچ موضوعات پر انعامات دینا شروع کر دیے، جن میں بکنی (غسل کا لباس)، برین (دماغ)، کیمپس (کی سرگرمیاں)، اسپورٹس (کھیل) اور سیکس

WWW.PAKSOCIETY.COM

(جنس) شامل ہیں۔ ۲۰۰۹ء میں یونی ورسٹی آف میامی کو پہلے انعام کے لیے نامزد کیا گیا۔

جون 2011ء میں میگزین نے اپنی اشاعت کم کرنے کے لیے اعلان کیا کہ اب اس کے سال بھر میں صرف گیارہ شمارے شائع ہوں گے۔ ۱۱ اگست 2009ء میں روزنامہ ٹیلی گراف نے یہ خبر شائع کی کہ میگزین کے مالک ہیو ہیفنر نے اپنے آفس کی عمارت تقریباً دو کروڑ ڈالر میں فروخت کر دی۔ اس لیے کہ ہیفنر کو اپنے میگزین کی وجہ سے 2000ء میں ایک ارب ڈالر کا اور 2009ء میں ساڑھے آٹھ کروڑ ڈالر کا نقصان اٹھانا پڑا۔ فی الحال میگزین کی انتظامیہ نے فیصلہ کیا ہے کہ اب وہ سال میں صرف 10 شمارے شائع کریں گے۔ 15 جولائی 2010ء میں پینٹ ہاؤس کے مالک فرینڈ فائنڈر نے 21 کروڑ ڈالر میں پلے بوائے کمپنی کو خریدنے کی پیش کش کر دی۔

پلے بوائے محض اپنی عریانیت کی وجہ سے لوگوں کی توجہ کا مرکز نہیں بنا رہا بلکہ اس کے انٹرویوز بے حد جان دار اور منفرد قسم کے ہوتے ہیں اور لوگ انہیں دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ مشہور تاریخ داں الیکس ہیلے نے پلے بوائے کے لیے متعدد انٹرویو لیے ہیں۔ ان میں مارٹن لوتھر کنگ اور کنگ جونیر (صحافی) اور میلکم ایکس جیسے لوگ شامل ہیں۔ پلے بوائے نے سب سے عمدہ انٹرویو نومبر 1976ء میں صدارتی امیدوار جمی کارٹر کا لیا تھا، جس میں انہوں نے اعتراف کیا تھا کہ ہاں، میں نے دل ہی دل میں کئی خواتین سے جنسی تعلقات استوار کیے ہیں۔

انٹرویو کا ایک دلچسپ سلسلہ 1980ء میں بھی شروع کیا گیا تھا جس میں لوگوں سے صرف بیس سوالات کیے جاتے تھے اور صرف کسی ایک چیز کے بارے میں پوچھا جاتا تھا۔ پلے بوائے کا نومبر 1972ء کا شمارہ سب سے زیادہ فروخت ہوا جس کے سرورق پر ماڈل پام رالنگ کی تصویر شائع ہوئی تھی۔ چوتھائی میگزین کو کالج اور یونی ورسٹی کے طالب علموں نے خریدا تھا۔ پلے بوائے چونکہ شریفوں کا میگزین ہے، لہٰذا اسے بریل میں نابینا افراد کے لیے بھی شائع کیا جاتا ہے۔

اس کی بے لباس تصاویر اور جنس زدہ مضامین کی اشاعت پر بہت سی مذہبی تنظیمیں اس سے ناراض بھی رہتی ہیں اور پُرزور احتجاج کرتی رہتی ہیں کہ اس کی اشاعت پر پابندی لگائی جائے۔ ایشیا کے بہت سے ممالک میں اس کی فروخت پر پابندی ہے جن میں انڈیا، چین، ملائیشیا، سنگاپور اور برونائی شامل ہیں۔ ترکی اور لبنان کے علاوہ بہت سے مسلم ممالک میں اس کی فروخت پر پابندی ہے، جن میں پاکستان، سعودی عرب اور ایران شامل ہیں۔ چین میں بھی اس کی فروخت پر پابندی ہے، لیکن ہانگ کانگ میں اس کی فروخت ہوتی ہے، جاپان کے لیے اس کا علیحدہ ایڈیشن شائع کیا جاتا ہے۔ اپریل 2006ء میں انڈونیشیا کے لیے بھی ایک ایڈیشن شائع کیا گیا لیکن اس سے پہلے کہ یہ بک اسٹالوں پر رکھا جاتا، بہت سی مذہبی تنظیموں نے اس پر احتجاج کرنا شروع کر دیا اور پلے بوائے کے ایڈیٹوریل آفس پر خشت باری بھی کی۔ اس سے پیشتر کہ مقدمہ عدالت میں جاتا، پلے بوائے مارکیٹ کے بک اسٹالوں سے فروخت ہو گیا۔

آئرلینڈ میں 36 برس تک پابندی کے بعد سیاست میں تبدیلی آئی تو وہاں 1995ء سے پلے بوائے بک اسٹالوں پر فروخت کے لیے رکھا جانے لگا۔ پلے بوائے ساری دنیا میں پلاسٹک کے لفافوں میں رکھ کر فروخت کیا جاتا ہے اور کتابوں کے شیلف پر سب سے اوپر رکھا جاتا ہے تاکہ متجسس بچوں کی پہنچ سے دور رہے اور ان کی اخلاقیات پر کوئی برا اثر نہ پڑے۔

حال ہی میں پلے بوائے کے سرورق پر انڈیا کی ایک ماڈل گرل شرلین چوپڑا کی بے لباس تصاویر شائع ہوئیں تو دنیا میں دھوم مچ گئی۔ شرلین کا کہنا تھا کہ ایسے میگزین کے لیے ماڈل بننا کوئی آسان نہیں ہے۔

86 سالہ ہیفنر نے میگزین کی ادارت چھوڑ دی ہے، لیکن اس میں دلچسپی لینا نہیں چھوڑی۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ اس کی اشاعت مرتے دم تک برقرار رکھے گا۔ وہ اب بھی اپنی بیٹی کرسٹی کے پاس بیٹھتا ہے اور اسے نت نئے خیالات سے نوازتا رہتا ہے۔ نومبر 1972ء کا پلے بوائے کا شمارہ 7161561 کی تعداد میں فروخت ہوا جو ایک ریکارڈ ہے۔ اس وقت اس کی اشاعت تیس لاکھ ماہانہ ہے۔

وہ حسینائیں جو پلے بوائے کے درمیانی صفحے کے لیے بے لباس تصاویر بنوانے پر آمادہ ہوتی ہیں انہیں ادارہ 25 ہزار ڈالر ادا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ایسی تمام حسیناؤں کا سال کے آخر میں مقابلہ ہوتا ہے اور ان میں سے شعلۂ جوالہ کو مزید ایک لاکھ ڈالر، ایک کار اور ایک موٹر سائیکل دی جاتی ہے۔ اس کے سرورق کی زینت بننے کے بعد دوبارہ اس حسینہ کو سرورق پر آنے کی زحمت نہیں دی جاتی۔

الطاف شیخ

ترجمہ: ابراھیم جمالی

پُراسراریت کی سرزمین افریقا جہاں قدرت کی فیاضی قدم قدم پر منتظر ہے، جہاں ہرے بھرے انتہائی گھنے جنگل ہیں تو خونخوار درندے بھی۔ جہاں معصوم صفت لوگ ہیں تو آدم خور قبائل بھی مگر کئی شہر ترقی یافتہ اتنے ہیں کہ ان پر یورپ وامریکی شہروں کا دھوکا ہوجائے۔ عام طور پر افریقا کے سفرناموں میں صرف اور صرف جنگل کا ذکر نظر آتا ہے لیکن یہ الطاف شیخ کا کمال ہے کہ وہ روداد سفر سناتے وقت سب سے الگ زاویہ سامنے لاتے ہیں۔ زیرِنظر سفرنامے میں آپ کو افریقا کا ایک نیا رخ نظر آئے گا۔

خوبصورت الفاظ سے سجے سفر کتھا کا دوسرا حصہ

افریقا کے مختلف ملکوں کے سفر کے دوران پیش آنے والے بعض واقعات میں کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ میرا موجودہ سفر انتہائی سہل اور بالکل بے خطر ہے۔ میں تدریس کے لیے یہاں آیا تھا جبکہ ماضی میں جہاز چلاتے ہوئے ان ملکوں کا سفر کیا تھا اور اسی سرزمین پر چلتے پھرتے مجھے وہ دن شدت سے یاد آرہے تھے اور وہ واقعات بھی ذہن میں تازہ ہو رہے تھے۔

اس زمانے میں ہماری کمپنی کے جہاز افریقا کا رخ

WWW.PAKSOCIETY.COM

اسی وقت کرتے تھے جب وہاں کی کسی بندرگاہ کے لیے ''مناسب'' کارگو ملتا تھا جس سے کرائے کی صورت میں ملنے والی رقم اتنی ضرور ہونی چاہیے تھی کہ ایندھن، جہاز کے عملے کی تنخواہ اور دیگر اخراجات پورے ہونے کے بعد کمپنی کو بھی کچھ بچت ہو جائے۔

ان دنوں سوئز کینال بند تھی۔ یہ ساٹھ کے عشرے کے آخری برسوں کا ذکر ہے۔ میں نے انہی ایام میں تعلیم مکمل کر کے جہاز جوائن کیا تھا۔ سوئز کینال کے بند ہونے کی وجہ سے ہمارے جہازوں کو یورپ اور امریکا جاتے اور واپس کراچی آتے وقت براعظم افریقا کا لمبا چکر لگانا پڑتا تھا۔ ان دنوں جہاز بھی اتنے بڑے نہیں تھے۔ ان پر لمبے سفر کے لیے زیادہ مقدار میں ایندھن، پانی وغیرہ اسٹور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ نہ ہی جہاز پر میٹھا پانی بنانے کی مشین ہوتی تھی۔ اس لیے براعظم افریقا کے گرد گھومنے کے دوران مجبوراً دو تین بندرگاہوں پر رکنا پڑتا تھا۔

کبھی کبھی افریقا کی کسی بندرگاہ کے لیے تھوڑا بہت کارگو بھی مل جاتا تھا جو عام حالات میں کبھی اٹھانا پسند نہ کرتے لیکن اس خیال سے وہ سامان اٹھالیا جاتا تھا کہ اس سے جو معمولی سا کرایہ حاصل ہوگا، اس سے کم از کم بندرگاہ میں جہاز کو کھڑا کرنے کی فیس اور دیگر اخراجات کی ادائیگی تو ہو ہی جائے گی۔ یاد رہے کہ بندرگاہ میں جہاز کو کھڑا کرنے اور گزرگاہ کی رہنمائی کرنے والی فیس بہت زیادہ ہوتی ہے۔ آج کل کے حساب سے یہ رقم یومیہ دو سے تین لاکھ روپے کے لگ بھگ بنتی ہے۔

افریقا کے ملکوں کی بندرگاہیں ایسی پُرکشش بھی نہیں ہیں کہ جہازی وہاں تک پہنچنے کے لیے مصائب مول لیں اور نہ ہی افریقا کا پھیرا لگانے کا سفر کچھ دل بہار ہوتا تھا۔ کیپ آف گڈ ہوپ کا دو تین دن کا سفر اور مڈغاسکر کا ڈیڑھ دن آج بھی جہازیوں کا حشر خراب کر دیتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ان علاقوں کا سمندر کبھی کبھی بہتر اور پُرسکون بھی رہتا ہے۔ معلوم نہیں کب رہتا ہے! ہم نے تو ان علاقوں میں سفر کرنے کے دوران ہمیشہ الٹیاں کیں اور اپنے نصیب کو کوسنے کے ساتھ کالج میں ریاضی پڑھانے والے نیول آفیسر کمانڈر اسرار اللہ کو برا بھلا کہتے ہوئے گزارہ۔ جنہوں نے ہمیں اس فیلڈ میں آنے کے لیے گائیڈ، بلکہ مس گائیڈ کیا تھا۔

بہرحال ہم جہاز چلانے والے اور جہاز کے مالکان ہر وقت یہی دعا کرتے تھے کہ کسی طرح سوئز کینال پھر سے کھل جائے اور ہمیں اس قدر لمبے سفر سے نجات مل جائے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہماری یہ دعا رقت انگیز ہوتی چلی گئی۔ کیونکہ جہازوں کے مالکان اپنے فائدے کی خاطر ایندھن اور راشن پانی اسٹاک کرنے کے لیے جہازوں میں بڑے ٹینک اور کولڈ اسٹوریج بنوانے لگے تھے۔ آیندہ چل کر ایسے دن بھی آئے کہ افریقا کو عبور کرنے کے دوران ایندھن اور راشن وغیرہ کے لیے ہمیں کسی بھی بندرگاہ کو کال کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔

بہرحال ابتدائی دنوں میں ہمیں براعظم افریقا کا پھیرا لگاتے ہوئے جن بندرگاہوں میں رکنا پڑتا تھا ان میں سے ایک تو یہی ممباسا تھی جو کینیا میں ہے۔ یہ ملک براعظم افریقا کے مشرقی کنارے پر واقع ہے۔ کینیا پر انگریز سرکار کی حکومت رہی تھی اور ہمارے جانے سے چند برس قبل ہی کینیا کو خودمختاری ملی تھی۔ لیکن وہاں کے کاروبار پر اب بھی برصغیر کے لوگ یعنی بوہری، آغا خانی، میمن، سندھی ہندو، گجراتی وغیرہ چھائے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ موزمبیق کی بندرگاہوں میں بھی ہم جہاز لے جاتے تھے جہاں پرتگالیوں کی حکومت تھی۔ یعنی ہمارے دنوں میں بھی ان کا راج تھا۔ ہم نے برصغیر میں انگریزوں کا راج نہیں دیکھا لیکن موزمبیق میں پرتگالیوں کا رعب و دبدبہ ضرور دیکھا۔ وہ یہاں کے مقامی سیاہ فاموں کو تو کسی خاطر میں نہیں لاتے تھے لیکن ہم ایشین کو بھی اچھوت سمجھتے تھے۔ پرتگال کے گورے لوگ اپنے قریب سے ہمارا گزرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ یہ بات دیگر ہے کہ ہم نے اپنی اس ''توہین'' کا بدلہ اس طرح لیا کہ ان کے اپنے شہر لسبن میں کئی مرتبہ پرتگالی گورے موچیوں سے اپنے جوتے پالش کرائے۔ یہ بات بھی ریکارڈ پر ہے کہ افریقا کے اس ملک موزمبیق کو آزادی ملنے کے بعد ان گورے حاکموں کو لارنزو مارکس اور دیگر افریقی شہروں میں انتہائی زبوں حالت میں خوار و خراب ہوتے دیکھا۔ اس لحاظ سے انگریز زیادہ عقل مند تھے۔ انہوں نے مقامی لوگوں سے براہِ راست پنگا نہیں لیا۔ اس لیے خود بھی ذلت آمیز خواری سے محفوظ رہے۔ وہ خاموشی سے ہر ملک میں کشمیر جیسا مسئلہ چھوڑ گئے تاکہ مقامی لوگ آپس ہی میں برسرپیکار رہیں۔

موزمبیق کو آزادی ملنے کے بعد اس کا دارالحکومت اور سب سے بڑی بندرگاہ ''لارنزو مارکس'' آج کل موپوتو کہلاتی ہے۔

یہ شروع کے دنوں کی بات ہے۔ جہاز کی ملازمت اختیار کیے کوئی ایک ڈیڑھ سال ہی ہوا تھا۔ ہم ایشیا اور یورپ کے چند ملکوں کا سفر کر چکے تھے بلکہ ایک نئے جہاز کو یوگوسلاویہ سے لانے کے لیے کراچی سے بذریعہ ہوائی جہاز بھی گئے تھے اور واپسی پر جہاز کو روس، رومانیہ، ترکی اور لبنان کی بندرگاہوں سے گھماتے افریقا کا پھیرا کراتے اپنے وطن پہنچے تھے۔ پھر اس جہاز کے خالی ہونے پر اسے کراچی سے موزمبیق کی بندرگاہ لارنزو مارکس (موپوتو) لے آئے تھے۔

موزمبیق، افریقا کے جنوبی حصے میں مشرقی کنارے پر واقع ہے۔ اوپر شمال میں تنزانیہ اور نیچے ساؤتھ افریقا ہے۔ موزمبیق کے بالکل دائیں طرف مڈغاسکر نامی ایک بڑا سا جزیرہ ہے، جس کے درمیان والے سمندری حصے کو موزمبیق چینل کہتے ہیں۔ بحراوقیانوس اور بحرہند کے مقابلے میں یہ سمندر کا حصہ واقعی چینل لگتا ہے لیکن یہ چینل اتنا بڑا ہے کہ اس میں ہمارا پورا ملک کراچی سے کشمیر تک سما جائے۔ بائیں سمت میں سینٹرل افریقا کے ممالک، ملاوی، زمبیا اور رہوڈیشیا ہیں۔

کراچی سے موزمبیق کی بندرگاہ لارنزو مارکس تک بیس ناٹ رفتار کے حساب سے آٹھ، نو دن کا سفر ہے۔ لیکن جہاز کے خالی ہونے اور بگڑے ہوئے سمندر کے ساتھ ساتھ مخالف سمت کی تیز ہواؤں کی وجہ سے ایک تو جہاز کافی دیر سے، قریباً پندرہ دن بعد منزل پر پہنچا۔ اس طرح زیادہ ایندھن استعمال ہونے کی وجہ سے جہازراں کمپنی کو خاصا مالی خسارہ ہوا۔ اس کے علاوہ ہم جہاز چلانے والوں کی حالت بھی خراب ہوگئی۔ اس سفر نے تمام عملے کو ادھ موا کر دیا تھا۔ خاص طور پر جونیئرز کو بہت سی سکنیس ہوئی۔ ہمیں دورانِ سفر مسلسل چکر آتے رہے اور نیند کا خمار طاری رہا۔ سونے کے علاوہ کسی کام میں دل نہیں لگتا تھا۔ جہاز چلانے کے لیے جیسے ہی انجن روم میں پہنچتے، الٹیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ ایسے مواقع پر مجھے حیدرآباد کا ایک مزاحیہ مصنف عبدالحلیم بروہی یاد آتا ہے۔ اس نے شادی کے موضوع پر ایک جگہ لکھا تھا۔ ''شادی اچھی چیز ہے بشرطیکہ کسی اور کی ہو۔ ہمیں صرف دعوت کھانے کے لیے بلوایا جائے......''

اسی طرح کوئی مجھ سے پوچھے تو میں یہی کہوں گا کہ سمندری سفر بہت اچھی چیز ہے بشرطیکہ جہاز کوئی اور چلائے۔ ہم جہاز پر پسنجر کی حیثیت سے جب چاہیں سمندر کا نظارہ کریں اور جب دل چاہے کمبل اوڑھ کر سو جائیں۔ سمندر پر خواہ سردی ہو یا گرمی، طوفان ہو یا بارش، جونیئر انجینئر اور ڈیک کیڈٹ سے لے کر جہاز کے چیف انجینئر اور کیپٹن تک دن اور رات کے مقررہ چار چار گھنٹے جہاز چلانے کی ڈیوٹی میں ناغہ نہیں کر سکتے۔

بہرحال ہم اس سفر میں خاصی مشکلات جھیلتے آخرکار موزمبیق کی بندرگاہ لارنزو مارکس پہنچ ہی گئے۔ بین الاقوامی قانون کے مطابق ہم نے بندرگاہ سے پانچ چھ میل دور کھلے سمندر میں جہاز کا لنگر گرایا۔ ہر بندرگاہ میں جہازوں کے انتظارگاہ والے سمندری حصے کو آؤٹر اینکریج کہتے ہیں۔ یہاں تک جہاز کا عملہ اپنے جہاز کو چلا کر لاتا ہے۔ اس کے بعد جہاز کو مزید آگے، یعنی بندرگاہ میں لے جانے کے لیے پورٹ اتھارٹی سے اجازت لینی پڑتی ہے جو اس وقت ملتی ہے جب بندرگاہ میں اس حجم کے برابر جہاز کھڑا کرنے کی جیٹی خالی ہو یعنی پارکنگ اسپیس ہو۔ اس کے علاوہ جہاز پر بار کرنے والا سامان بھی موجود ہو۔ اس کے بعد بندرگاہ کی طرف سے مقامی سمندر اور بندرگاہ کی مکمل معلومات رکھنے والا ایک کیپٹن فراہم کیا جاتا ہے جو جہاز کو اندر لے جاتا ہے۔ اس کیپٹن کا صرف یہی کام ہوتا ہے کہ وہ جہازوں کو بندرگاہ تک لے آئے اور پھر کھلے سمندر تک پہنچائے۔ اسے پائلٹ کہا جاتا ہے۔

ہمارے کراچی پورٹ ٹرسٹ کے پاس بھی ایسے دس بارہ پائلٹ ہیں جو کراچی بندرگاہ کی تفصیلی معلومات رکھتے ہیں۔ وہ ملکی اور غیرملکی جہازوں کو کھلے سمندر سے اندر بندرگاہ میں اور پھر بعد میں کھلے سمندر تک پہنچانے میں جہاز والوں کی مدد کرتے ہیں۔

آؤٹر اینکریج پر پہنچ کر ہر جہازی بندرگاہ پر جانے کے لیے بےتاب ہو جاتا ہے تاکہ گھوم پھر سکے۔ ظاہر ہے کہ ہر وقت سمندر میں رہ کر صرف مچھلیاں ہی خوش رہ سکتی ہیں۔ انسان تو زمین کی طرف ہی بھاگتا ہے۔ ہم تو ویسے بھی اس سفر میں انتہائی کٹھن دن گزار چکے تھے۔ ایسے ہی پریشان کن سفر کے دوران اکثر جہازی دل ہی دل میں فیصلہ کرنے لگتے ہیں کہ سمندر کی ایسی ملازمت سے کنارے پر چھابڑی لگانا زیادہ بہتر ہے۔ پھر کسی اچھی بندرگاہ پر پہنچ کر جہازی سب کچھ بھول کر موج مستی میں مگن ہو جاتے ہیں۔

موزمبیق کی اس اینکریج پر پہنچ کر ہم نے کئی جہازوں کو بندرگاہ میں جانے کے لیے منتظر پایا۔ گویا ہمیں مزید کم

WWW.PAKSOCIETY.COM

ازکم ایک ہفتہ سمندر کی لہریں گننی پڑیں گی۔ اب ہنسی خوشی دن گزارو یا مایوسی میں۔ صبر کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ اس کے باوجود ہم وائرلیس پر بار بار موزمبیق پورٹ اتھارٹی سے اپنے جہاز کا پروگرام معلوم کرنے کے لیے چیختے رہے لیکن دوسری جانب خاموشی طاری رہی۔ یہ بھی ایک مسئلہ تھا کہ موزمبیق، پرتگالیوں کی کالونی ہونے کی وجہ سے کوئی ہماری انگریزی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ ہم وائرلیس پر بار بار یہی پوچھتے رہے کہ کتنے دنوں کے بعد ہم بندرگاہ میں بلوائے جائیں گے...... جواب میں وہ خاموش ہی رہتے یا ٹیلی فون ریکارڈنگ کی طرح ایک ہی جملہ بولتے رہتے۔ ''آپ اور آپ کے جہاز کے لیے فی الحال کوئی ہدایات نہیں ہیں۔ برائے مہربانی چند دن باہر ہی انتظار فرمائیے۔''

ہم چاہتے تھے کہ کم ازکم ہماری آئی ہوئی ڈاک ہی ہمیں جہاز پر پہنچا دی جائے۔ یورپ کے ملکوں میں سمندر پر چلتے ہوئے جہاز پر ہیلی کاپٹر کے ذریعے پہنچائی جاتی ہے۔ بہرحال ہم نے پورٹ اتھارٹی سے یہ درخواست بھی کی کہ ایک لانچ ہی کا انتظام کردیا جائے تاکہ جب تک جہاز کے لیے بندرگاہ پر جگہ بنے، ہم لوگ سیر و تفریح سے دل بہلالیں۔ ویسے کنارے پر جانے کی بے چینی سینئر افسران کو زیادہ تھی جونیئرز کو نہیں۔ کیونکہ چھٹی ہونے پر پہلے وہی جاتے ہیں۔ بہرحال بندرگاہ والوں کی مسلسل بے رخی دیکھ کر ہمارے سینئرز بھی ڈھیلے پڑ گئے اور ہوائی چپل پہن کر جہاز کے عرشے ہی پر ٹہلنے لگے۔

ہمیں کراچی سے روانہ ہوئے کافی دن ہوگئے تھے۔ اس لیے ایک دوسرے سے سن سن کر کراچی کی خبریں بھی کئی دن پہلے ختم ہوچکی تھیں۔ بلکہ کئی بار ایک دوسرے کو سنا چکے تھے۔ اب صرف گالیاں ہی رہ گئی تھیں جو دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے بندرگاہ والوں کو دے رہے تھے۔ جب بندرگاہ میں جہاز کھڑے ہونے کی جگہ نہیں تھی تو ان بے وقوفوں نے ہمیں اتنی دور سے کیوں بلوایا؟ بہرحال جب کئی دنوں کے انتظار کے بعد جہاز بندرگاہ میں آیا تو معلوم ہوا کہ ہمیں بندرگاہ میں تاخیر سے جگہ ملنے کا سبب پارکنگ کا مسئلہ نہیں بلکہ سامان کا دیر سے پہنچنا تھا...... اور سامان کیا تھا؟ لوہے کے ذرات والے پتھر! (Iron Ore) اس کے لیے موزمبیق ریلوے ڈپارٹمنٹ کی مال گاڑیاں پہاڑی علاقوں میں گئی ہوئی تھیں۔ بڑے بڑے پتھروں، جنہیں پگھلا کر ان میں سے لوہا نکالا جاتا ہے، سے بھری ہوئی مال گاڑیاں جب بندرگاہ میں آئیں تو جہاز کے گودام میں آرام اور سلیقے سے پتھر بھرنے کی بجائے کنارے کی کرین پورے ڈبے کو اٹھا کر جہاز کے ہولڈ (گودام) میں الٹ دیتی تھی۔ اس طرح تمام پتھر بلندی سے گرنے لگتے اور اس کی وجہ سے جہاز کی آہنی پلیٹوں کو کافی نقصان پہنچتا تھا۔

بہرحال لارنزو مارکس کے اینکریج پر پہنچ کر پہلا دن تو بہت مایوسی میں گزرا۔ لیکن اگلے دن دوپہر کو ایک عجیب اتفاق ہوا۔ ہمیں سامنے سے ایک بڑی کشتی بندرگاہ سے سیدھی ہمارے جہاز کی طرف آتی ہوئی نظر آئی۔ معلوم ہوا کہ شپ چانڈلر (جہاز پر سامان سپلائی کرنے والا) آرہا ہے جو ابھی سے آرڈر لینا چاہتا ہے تاکہ جہاز کے بندرگاہ میں آنے سے پہلے ہمارا مطلوبہ سامان حاصل کرسکے۔ اسی نے ہمیں یہ خوشخبری سنائی کہ ہماری جہازراں کمپنی کے ہیڈ آفس سے آرڈر موصول ہوا ہے۔ اس کے مطابق مقامی آفس والوں نے ایک موٹر لانچ کا بندوبست کیا ہے۔ وہ روزانہ بندرگاہ سے جہاز تک دو دو پھیرے کرے گی تاکہ ہر جہازی کو باہر گھومنے کا موقع مل سکے۔

''اچھا......!'' ہمارے چیف آفیسر نے یہ سن کر اپنی خوشی پر قابو پاتے ہوئے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ ''وہ لانچ یہاں کب تک پہنچ جائے گی؟''

''صبر کریں چیف صاحب!'' شپ چانڈلر نے جواب دیا۔ ''وہ آج نہیں کل سے آئے گی اور جب تک جہاز بندرگاہ میں نہیں پہنچتا، روزانہ آتی رہے گی۔''

اسی سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ جہاز پر کس قسم کا کارگو چڑھنے والا ہے جسے ہمیں امریکا کی کسی جنوبی بندرگاہ میں پہنچانا تھا۔

موزمبیق کو ابھی خودمختاری نہیں ملی تھی۔ سرکاری ملازمتوں، تجارت، پہاڑ، کانیں، کھیت، فصل تمام چیزوں پر گورے پرتگالیوں کا قبضہ تھا۔ غریب مقامی سیاہ فام باشندے غلاموں والی زندگی گزار رہے تھے۔ مشقت والا ہر کام انہیں کرنا پڑتا تھا۔ ان میں وہ خوش نصیب تصور کیا جاتا تھا جو کسی ہوٹل میں بیرا یا کسی آفس میں کلرک جیسی ''شاہانہ'' جاب کرتا تھا۔

شپ چانڈلر پرتگالی گورا تھا لیکن وہ خوش مزاج ہونے کے ساتھ انگریزی بھی اچھی بول رہا تھا۔ واپس جاتے وقت اس نے کیپٹن سے کہا۔ ''اگر آپ چاہیں تو میں اپنے ساتھ کچھ جہازیوں کو لے جاسکتا ہوں۔ میری لانچ

میں کافی جگہ ہے۔''

''واپس کیسے آئیں گے؟'' کسی نے اہم نکتہ اٹھایا۔

''اس کے لیے میں آپ کے مقامی ایجنٹ کو راضی کرلوں گا کہ وہ کنارے پر جانے والے لوگوں کو کسی کرائے کی بوٹ میں جہاز پر واپس بھیج دے۔''

یہ سن کر ہم بہت خوش ہوئے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ چونکہ جہاز کھلے سمندر میں کھڑا ہے۔ اس لیے تمام سینئر افسر چھٹی نہ کریں تاکہ اگر ہوا کا رخ بدل جائے، سمندر کی لہریں بڑھ جائیں یا گرایا ہوا لنگر اپنی جگہ چھوڑ دے اور جہاز اِدھر اُدھر ڈولنے لگے تو یہاں موجود سینئرز نے جہاز کا انجن اسٹارٹ کرکے اسے ہوا اور لہروں کے رحم و کرم پر اِدھر اُدھر بھٹکنے سے روک سکیں۔ اینکریج یعنی جہازوں کی انتظارگاہ، بندرگاہ سے زیادہ دور نہیں ہوتی۔ وہاں دوسرے جہازوں اور زیرِ آب چٹانوں کی موجودگی کا خطرہ رہتا ہے جن سے جہاز ٹکرا سکتا ہے۔ اس لیے ایسے مقامات اور مواقع پر ایمرجنسی کا مقابلہ کرنے کے لیے کچھ قابل اور تجربہ کار لوگوں کا جہاز پر موجود رہنا ضروری ہوتا ہے۔

کنارے پر جانے کا یہی فیصلہ ہوا کہ سینئر افسران میں سے تیسرا حصہ جائے گا اور اتنے ہی جونیئر اور خلاصی جائیں گے۔ جونیئر آفیسرز میں کیڈٹس، فورتھ آفیسر، جونیئر انجینئر اور ففتھ انجینئر وغیرہ آتے ہیں۔ اس جہاز پر ففتھ انجینئر چار تھے، جن میں ایک میں بھی تھا۔ ان دنوں، یعنی 1969ء میں آج کی طرح کم عملے والے آٹومیٹک جہاز نہیں تھے جن پر بیس افراد بھی زیادہ تصور کیے جاتے ہیں۔ اس زمانے میں جہاز چلانے کے لیے ہر جہاز پر ساٹھ، ستر لوگ ہوتے تھے۔ بیس کے قریب تو کھانا تیار کرنے، کھلانے، برتن اور کمرے صاف کرنے پر مامور تھے۔ ان میں پرسر، پینٹری مین، بٹلر، چیف کک، عرشہ اور انجن روم صاف کرنے والے خلاصی، تیل والے، آگ جلانے والے، سرنگ، کارپینٹر سب شامل تھے۔

بہرحال ہر ڈپارٹمنٹ سے کچھ لوگوں کو کنارے پر جانے کی اجازت ملی۔ تقریباً بیس افراد شپ چانڈلر کی بوٹ میں سوار ہوکر کنارے کی طرف چل دیے۔ بوٹ کافی بڑی تھی۔ ہوا اور لہروں کا رخ پیچھے سے تھا۔ ایک نئے ملک کی نئی بندرگاہ میں جانے کے تصور یا شاید جہاز کی قید سے نجات کی خوشی میں فاصلہ طے ہونے کی خبر ہی نہ ہوئی۔ تھوڑی ہی دیر (تقریباً آدھے گھنٹے) کے بعد شپ چانڈلر کی بوٹ کنارے پر آگئی۔ ہم آپس کی خوش گپیوں میں اس قدر مگن تھے کہ پتا ہی نہ چلا کہ بوٹ کن ''راہوں'' اور Bearings کا سہارا لیتی ہوئی بندرگاہ میں آ پہنچی ہے۔

افریقا کے مشرقی کنارے والے اس خوبصورت شہر لارنزو مارکس (موپوتو) پہنچ کر ہم بہت خوش ہوئے۔ جہاز کے بیزار کن حد تک یکساں اور اکتا دینے والے ماحول سے نجات پاکر ''آزادی'' کے وہ لمحات انتہائی مسرور کن تھے۔

''آپ لوگ سورج غروب ہوتے ہی یہاں پہنچ جائیں۔'' بندرگاہ پہنچتے ہی شپ چانڈلر نے ہدایات دیں۔ ''سات بجے ایک کشتی آپ لوگوں کو واپس جہاز پر لے جائے گی۔ تب تک گھومو پھرو، عیش کرو۔'' اس نے جملہ مکمل کرکے قہقہہ لگایا اور ہم سوچتے رہے کہ اس نے ''عیش کرو'' کن معنوں میں کہا ہے۔

بہرحال جہاز پر واپس جانے کا پروگرام ذہن میں رکھ کر ہر شخص اپنے اپنے گروپ کے ساتھ شہر روانہ ہوگیا۔ ہمارے گروپ میں ایک کیڈٹ اور ایک فورتھ انجینئر شامل تھے۔ میں ففتھ انجینئر یعنی سب سے جونیئر میرین انجینئر تھا۔ ایک سال مکمل ہونے پر میری تنخواہ 55 روپے کے اضافے کے بعد 480 روپے ہوچکی تھی۔ ہر ایک کو تنخواہ کا تیسرا حصہ باہر ملتا تھا باقی رقم اپنے ملک پہنچ کر ملتی تھی۔ 160 روپے کے عوض چالیس ڈالر ملتے تھے۔ اس زمانے میں چار روپے فی ڈالر تھا۔ اب ہندسوں میں یہ تنخواہ بہت کم محسوس ہوتی ہے لیکن ان دنوں میں مہنگائی بھی نہیں تھی یا بالفاظ دیگر روپیا یا ڈالر میں خریداری کی طاقت Purchasing Power بہت تھی۔

بندرگاہ پہنچنے تک ہر چیز ٹھیک ٹھاک رہی۔ کوئی غیرمعمولی بات نہیں ہوئی جس کا ذکر کیا جائے۔ ابھی ہمیں تنخواہ نہیں ملی تھی لیکن ہماری جیبوں میں پہلے کا بچایا ہوا پانچ یا دس ڈالر کا نوٹ موجود تھا۔ جس کے زور پر ہم لارنزو مارکس کی سڑکوں پر اس طرح گردن اکڑا کر چل رہے تھے جیسے دیہات کے شادی بیاہ کی تقریب میں دولہا کی ماں ایک احساسِ تفاخر کے ساتھ چلتی ہے۔

ان دنوں میں ہم جونیئر ضرور تھے۔ جہاز بھی اتنے آرام دہ نہیں تھے۔ ڈیوٹی بھی سخت اور دن رات کرنی پڑتی تھی۔ تنخواہ بھی کچھ خاص نہیں تھی۔ ہر وقت امتحانات کے بھوت سر پر منڈلاتے رہتے تھے۔ اس کے باوجود خوشیوں کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ وہ گھڑی آج بھی یاد ہے کہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

کیسے ہم تینوں ساتھی لارنزو مارکس کے فٹ پاتھ پر ہنسی مذاق کرتے، قہقہے لگاتے ہوئے ایک سستے ریسٹورنٹ میں چائے پینے کے لیے بیٹھ گئے تھے۔ ہوٹل میں کام کرنے والے بیرے وغیرہ مقامی یعنی کالے تھے۔ لیکن وہاں کالوں کا داخلہ ممنوع تھا! وہ سستے قسم کا ہوٹل تھا اس لیے گوروں کے ساتھ ہم "کم کالوں" کو آنے کی اجازت تھی یعنی ایشئنز کو۔ خالص یورپین طرز کے ہوٹلوں میں ہم بھی نہیں جاسکتے تھے جہاں صرف پرتگالی اور ان جیسے گوری چمڑی والے یورپی میموں کے ساتھ جاسکتے تھے۔ سیاہ فام بیرے سفید وردیوں میں ملبوس ان کی خدمت پر مامور تھے۔ ہم فٹ پاتھ سے گزرتے ہوئے ان ہوٹلوں کی شیشے کی دیواروں سے اندر کا منظر دیکھ سکتے تھے۔ بہرحال ان تمام باتوں نے ہمارے ذہن پر، کم ازکم اس وقت کوئی خاص اثر نہیں چھوڑا۔ کوئی ہوٹل یا دکان میں آنے دے یا نہ دے، کوئی ہمیں مسکراہٹ دے یا غصے سے گھورتا رہے۔ ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ گوروں کے سج دھج والے ہوٹل میں کوئی ہمیں کالا یا کم حیثیت سمجھتا ہے تو بھاڑ میں جائے۔

درحقیقت گوروں کے ایسے مہنگے ہوٹل میں ایک ہی Sitting میں اپنے اکلوتے پانچ ڈالر گنوانے کے موڈ میں ہم بھی نہیں تھے۔ اس لیے ہم نے غریب لوگوں کے ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پینے کو غنیمت سمجھا۔ ہم چائے پی کر باہر آئے تو فٹ پاتھ پر ایک نوجوان سیاہ فام لڑکی نظر آئی جو مونگ پھلی بیچ رہی تھی۔ یہ حقیقت جاننے کے باوجود کہ ہماری انگریزی اس کی سمجھ میں نہیں آرہی، پھر بھی ہم اس سے اوٹ پٹانگ باتیں کرتے رہے۔ ہمیں اس کی زبان سمجھ میں نہ آنے کی کوئی فکر نہیں تھی۔ لیکن اس کے اٹھلاتے ہوئے شرمیلے نخرے، ہیر رانجھا ٹائپ فلموں کے ڈائیلاگ سے کئی گنا زیادہ پُرکشش تھے۔

آخر ہمارے سینئر یعنی فورتھ آفیسر نے فیصلہ صادر کرتے ہوئے حکمیہ انداز میں کہا۔ "بس، اب جلدی کرو۔ وقت اور پیسے کم ہیں اس لیے صرف مونگ پھلی خرید کر پیٹ کی آگ بجھاؤ۔ کشتی کے ہچکولوں نے دوپہر کا سارا کھانا ہضم کردیا ہے۔"

ہم اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے پندرہ ایسکیوڈو (نصف امریکن ڈالر) کی مونگ پھلی خرید کر چل پڑے۔ راستے میں بھوکے بندروں کی طرح مونگ پھلی کے دانے ڈُنگتے ہم بندرگاہ کی دوسری سمت میں پہنچے جہاں سمندر کم گہرا تھا۔ دراصل ہمیں وہاں تک لانے میں ہمارے فورتھ انجینئر کا ہاتھ تھا۔ وہ اس بندرگاہ پر پہلے بھی دو تین مرتبہ آچکا تھا۔ موزمبیق پہنچنے سے پہلے وہ ہمارے سامنے اس بندرگاہ کے خاموش، خوبصورت اور صاف شفاف پانی والے کناروں کی بہت تعریف کرچکا تھا۔

اب لارنزو مارکس کے ساحل پر پہنچ کر احساس ہوا کہ ہمارے فورتھ انجینئر کبھی کبھار سچ بھی بولتے ہیں۔ یہاں نہ ہمارے بحرعرب والی بلند لہریں تھیں نہ نمکین اور نم آلود ہوائیں۔ نہ مکرانی اونٹ والے تھے نہ فیکٹریوں میں کام کرنے والے پردیسی تجرد اور نہ ہی عورتوں کو بھوکی نگاہوں سے گھورنے والے! اگر ایسے لوگ تھے تو وہ ہم تین تھے۔ باقی جہاں تک نظر جاتی تھی، ہر طرف پرتگالی اور یورپی مرد عورتیں، لڑکے اور لڑکیاں تھیں۔ ایک میلے کا سماں تھا۔ بہت لطف آرہا تھا۔ دوسروں کو دیکھ کر ہمیں بھی سمندر میں تیرنے کا شوق ہوا۔ ہم سوئمنگ کاسٹیوم ساتھ نہیں لائے تھے لیکن پانی کی طرف اتنی کشش محسوس ہوئی کہ ہم نے قمیص پتلون اتار کر انڈرویئر میں تیرنا شروع کردیا۔

سرد موسم کی وجہ سے پانی کافی ٹھنڈا تھا لیکن مزہ آرہا تھا۔ حالانکہ وہ جون یا جولائی کا مہینا تھا لیکن یہ ملک موزمبیق دنیا کے جنوبی نصف کرۂ زمین پر ہونے کی وجہ سے یہاں کے موسموں کی کیفیت ہمارے شمالی نصف کرۂ زمین سے مختلف ہوتی ہے۔ یعنی یورپ، ایشیا، کینیڈا، یو ایس اے میں نومبر، دسمبر، جنوری وغیرہ میں جاڑا ہوتا ہے اور دنیا کے نچلے نصف دائرے کے ملکوں، ساؤتھ امریکا، آسٹریلیا اور ساؤتھ افریقہ وغیرہ میں گرمیوں کا موسم ہوتا ہے۔ جون، جولائی میں کراچی سے روانہ ہوتے... وقت سخت گرمی تھی۔ لیکن خط استوا پار کرنے کے بعد جوں جوں ہمارا جہاز نیچے آتا گیا سردی کا اثر بڑھتا گیا۔ ساؤتھ افریقا کے شہر کیپ ٹاؤن اور ارجنٹائن، چلی اور نیوزی لینڈ جیسے ملکوں میں ان مہینوں میں برف باری ہوتی ہے۔

کافی دیر سمندر میں نہانے کے بعد ہم نے اپنے گیلے انڈرویئر کے اوپر کپڑے پہن لیے۔ تولیے تو تھے نہیں لہٰذا قمیص ہی سے بال اور منہ خشک کرلیا۔ ریت میں لتھڑے ہوئے گیلے پاؤں صاف کیے بغیر جوتوں میں ڈال دیے اور "دھچک" کی آوازوں کے ساتھ واپس شہر کی جانب چل پڑے۔

راستے میں کچھ بڑی دکانوں کے اندر جا کر جائزہ لیتے رہے تاکہ تنخواہ ملنے پر کیا اور کہاں سے خریداری کی جائے۔ چند دکانیں سندھی ہندو اور بمبئی (ممبئی) کے خوجوں کی تھیں۔ وہ لوگ ہم سے سندھی، گجراتی اور اردو میں باتیں کرنے لگے۔ دنیا کے دوسرے ملکوں کے دکانداروں کی طرح وہ بھی اپنے آپ کو انڈین کی بجائے پاکستانی کہلوا رہے تھے۔ یہ ہمارے لیے عجیب بات تھی۔ فورتھ انجینئر نے ہمیں بتایا کہ گوا کے تنازع کے بعد اب پرتگالی اپنے ہاں کسی انڈین کو برداشت نہیں کرتے۔ انڈیا کا علاقہ گوا انگریزوں کے دنوں سے پرتگال کے قبضے میں تھا۔ وہاں پرتگالی زبان بولی جاتی تھی اور لوگوں کے پاس پرتگال کا پاسپورٹ تھا۔ اب انڈیا نے اس پر قبضہ کرلیا ہے۔ اس کے ردعمل کے طور پر پرتگال حکومت نے نہ صرف پرتگال سے بلکہ اپنی تمام افریقی اور ساؤتھ امریکی کالونیوں سے انڈینز کو نکال دیا ہے۔ اب جو تھوڑے بہت انڈین وہاں رہتے ہیں وہ اپنے آپ کو پاکستانی کہلاتے ہیں۔

ایک دکاندار نے بتایا تھا۔ "انڈین بیوپاری دنیا کے ہر کونے میں موجود ہیں۔ لیکن جہاں پرتگالیوں کی حکومت ہے وہاں موجود ہونے کے باوجود آپ کو ایک بھی انڈین نہیں ملے گا۔" یعنی انڈین اپنی شناخت چھپاتے ہیں۔

شام کو بندرگاہ پہنچنے پر معلوم ہوا کہ ہمارے آفس کے مقامی ایجنٹ نے ہم جہازیوں کو اپنے جہاز پر پہنچانے کے لیے کرائے کی جس لانچ کا انتظام کیا تھا، وہ صرف پندرہ افراد اٹھا سکتی تھی۔ ہر جہاز اور کشتی میں مسافر اٹھانے کی اپنی مقررہ گنجائش ہوتی ہے۔ قانوناً اس سے زیادہ ایک آدمی بھی نہیں اٹھایا جاسکتا۔ یہ بات دیگر ہے کہ بعض مقامات پر اس قانون کی خلاف ورزی ہوتی رہتی ہے۔ کرائے کی اس لانچ میں پندرہ افراد بیٹھ گئے تو ہم تین لوگ بیٹھنے سے رہ گئے۔ ہم نے کشتی چلانے والے کو بہتیرا سمجھایا کہ وہ ہمیں بھی اسی پھیرے میں جہاز پر پہنچا دے۔ جہاز کافی دور کھڑا ہے اور ہم اس کی واپسی کے انتظار سے بچ جائیں گے۔ ہم نے اسے سردی کا واسطہ بھی دیا کہ یہ ڈیڑھ دو گھنٹے ہمیں ٹھٹھرا کر رکھ دیں گے۔ لیکن کشتی چلانے والے سیاہ فام ڈرائیور اور اس کے ماتحت بالکل متاثر... نہ ہوئے۔ انہوں نے کشتی کے انجن کے شور میں چیخ چیخ کر اور اشاروں سے ہمیں سمجھانے کی کوشش کی۔

"آج کل قانون پر سختی سے عمل درآمد ہو رہا ہے۔ خاص طور پر ہم کالوں کو ہرگز معاف نہیں کیا جاتا۔ اگر کچھ ہوگیا تو یہ گورے پرتگالی مالکان ہمیں سزا بھی دیں گے اور نوکری سے بھی نکال دیں گے۔"

یہ کہہ کر انہوں نے ہمیں صبر سے انتظار کرنے کی تلقین کی اور لانچ چل پڑی۔ ہم تینوں منہ لٹکائے جیٹی پر لگے جہاز کے رسے باندھنے والے بولارڈ پر بیٹھ گئے۔ وقت گزارنے کے لیے کیڈٹ نے پہلے تو رقص کی کیفیت پیدا کرنے والے گانے شروع کردیے پھر وہ رقت آمیز گیت گانے لگا۔ فورتھ انجینئر سمجھ گیا کہ اسے عشق کی نہیں بھوک کی آگ ستا رہی ہے۔ وہ اٹھ کر بندرگاہ سے باہر چلا گیا اور معلوم نہیں کہاں سے ٹھیکریوں جیسے سخت بسکٹ خرید لایا جو سر پر مارا جائے تو سر پھوٹے بسکٹ نہ ٹوٹے۔

ایسے بسکٹ سندھ کے گوٹھوں میں پنساریوں کی دکانوں پر بکتے دیکھے تھے جو مٹی کے تیل کے کنستر میں ایک طرف شیشہ لگا کر اس میں رکھتے تھے۔ سکاکائی، چھالیا، ہینگ، آریٹھہ اور ملتانی مٹی جیسی چیزوں کی طرح یہ بسکٹ بھی وزن کے حساب سے بکتے تھے۔ منہ میں کافی دیر تک گھمانے کے بعد جب بسکٹ لعاب کے سہارے کچھ گیلے اور نرم ہوئے تب چبائے اور نگلے گئے۔ شدید بھوک لگی ہوئی تھی اس لیے وہ بسکٹ بہت اچھے لگ رہے تھے۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے بعد کشتی واپس آئی۔ ہمارے آفس ایجنٹ نے ان کشتی والوں کو تمام مسافر جہاز تک پہنچانے کا ٹھیکا دیا تھا۔ کشتی والے سمجھے تھے کہ مسافروں کی تعداد اتنی ہوگی جنہیں وہ ایک ہی پھیرے میں جہاز پر چھوڑ آئیں گے۔ اب تین افراد کے لیے انہیں ایک اور پھیرا کرنا پڑ رہا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ لانچ چلانے والے سیاہ فام ڈرائیور اور اس کے دو کالے مددگاروں کا موڈ آف تھا۔ ان کی واپسی پر سمندر کا مزاج بھی بگڑ چکا تھا جس کی شہادت ان کے بھیگے ہوئے کپڑے اور پانی سے تر لانچ کی بنچیں دے رہی تھیں۔ ہم خود جہازی ہوکر بخوبی یہ اندازہ کرسکتے تھے کہ وہ کافی مصیبت میں آگئے ہیں۔ چونکہ وہ ہمارے آفس والوں سے سودہ طے کرچکے تھے اس لیے وہ ہمیں جہاز پر پہنچانے کے پابند تھے۔ ورنہ ان حالات میں ڈبل کرائے کے عوض بھی ہمیں جہاز تک لے جانے سے انکار کردیتے۔ اگر ہماری جگہ جہاز کے سینئر افسر ہوتے تو وہ بھی ایسے موسم میں لانچ کا سفر کرکے جہاز پر جانے کا خطرہ مول نہ لیتے اور ایک رات کسی ہوٹل میں گزار کر موسم ٹھیک ہونے کا انتظار کرتے۔ لیکن ہم جیب میں بچے کھچے سوا یا ڈیڑھ ڈالر رکھے

WWW.PAKSOCIETY.COM

والے نام نہاد افسر لارنز و مارکس میں کہاں مولوی مسافر خانہ تلاش کرتے۔

لانچ چلانے والے لمبے تڑنگے سیاہ فام کمر پر ہاتھ رکھے ہمیں گھورتے رہے۔ وہ سمجھے کہ ہم لانچ میں نہیں بیٹھیں گے۔ لیکن ہم لوگ ایسی شکل بنا کر لانچ کی بھیگی ہوئی بنچوں پر جا بیٹھے جیسے خطرناک سفر پر جانے کی بجائے کسی باربر شاپ میں حجامت بنوانے آئے ہیں۔ لانچ چلانے والے سمجھ گئے کہ ان کی لانچ میں جو کارگو لوڈ ہو گیا ہے، اب اسے جہاز پر Gracefully یا Disgracefully ڈسچارج کرنا ہی پڑے گا۔

یاد رہے کہ شپ چانڈلر کی کشتی میں آتے وقت سمندر آئینے کی طرح شفاف اور پُرسکون تھا۔ معمولی سی لہریں بھی نہیں تھیں۔ وہ کشتی سائز میں بھی بڑی تھی۔ اس میں پچاس افراد کی گنجائش تھی۔ اب دیکھتے ہی دیکھتے ہوائیں تیز ہو گئیں اوپر سے ہائی ٹائیڈ ہو گئی۔ ان تمام باتوں کے علاوہ ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ لانچ میں پندرہ کی جگہ صرف ہم تین مسافر بار تھے۔ جس کی وجہ سے لانچ خطرناک لہروں پر تنکے کی طرح اچھل رہی تھی۔ ہمیں احساس تھا کہ ڈرائیور بڑی مہارت اور محنت کے ساتھ لانچ کو سنبھالے ہوئے ہے۔ لہروں کی سرکشی عروج پر تھی اور لانچ کسی بدمست سانڈ کی طرح کود رہی تھی۔ آخرکار ہماری لانچ لہروں کے طمانچے کھاتی جہاز کے قریب پہنچ ہی گئی۔

دیوہیکل آہنی جہاز سمندری موجوں کے رحم و کرم پر نہیں تھا۔ اس لیے ایک ہی جگہ رکا ہوا تھا لیکن لہریں کبھی کبھی اس کے ڈیک تک پہنچ رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی ہماری لانچ بھی اوپر اٹھ جاتی تھی۔ پھر دوسرے ہی لمحے اس قدر تیزی سے نیچے آتی کہ جہاز کی سائیڈ کی آہنی پلیٹیں نیچے تک صاف نظر آنے لگتیں۔ لہروں کے ساتھ لانچ جھٹکے کے ساتھ اس طرح نیچے چلی جاتی جیسے کسی گہرے کنویں میں گر رہی ہو۔

لہروں کے ایک دم بلند ہونے اور دوسرے ہی لمحے نیچے آنے سے جہاز کے آس پاس ایک قسم کا خلا (Suction) اور پریشر پیدا ہو رہا تھا اور ہماری لانچ تنکے کی طرح کبھی جہاز کے فولادی جسم کی طرف تیزی سے بڑھتی جس سے تصادم کا خطرہ پیدا ہو رہا تھا اور کبھی جہاز سے ایسے دور چلی جاتی جیسے کسی جناتی ہاتھ نے زور سے دھکا دے دیا ہو۔ ہمیں لانچ کو چھوڑ کر جہاز کی سائیڈ میں لٹکتی ہوئی سیڑھی پر قدم رکھ کر جہاز پر چڑھنا تھا۔

حرکت اور ہلچل سے خالی سمندر اور تیز ہواؤں کی غیر موجودگی میں لانچ کو جہاز کی اس سیڑھی (گینگ وے) کے قریب روکا جاتا ہے تاکہ جہاز پر جانے والے آرام سے اوپر چڑھ سکیں۔ لیکن ایسی صورت میں، جب سمندر بپھرا ہوا ہو اور تیز ہواؤں کی وجہ سے چوبی لانچ کسی پاگل سانڈ کی طرح اچھل رہی ہو تو ایسے میں اس کا انجن بند کر کے روکنا ناممکن سی بات ہے۔ ایسی صورت میں لانچ کا انجن چلتا ہوا رکھا جاتا ہے تاکہ اگر لانچ اور جہاز کے درمیان ایک دم خلا پیدا ہونے کی وجہ سے لانچ کا جہاز سے ٹکرا کر پاش پاش ہونے کا خطرہ پیدا ہو جائے تو اسے فوراً مخالف سمت میں لے جایا جا سکے۔

لانچ کا ڈرائیور حالانکہ تجربہ کار اور سمجھدار تھا لیکن وہ منہ زور لہروں کے سامنے بے بس ہو گیا تھا۔ وہ لہروں کا اتار چڑھاؤ اور ہوا کا رخ اسٹڈی کر کے لانچ کو چند لمحوں کے لیے جہاز کی سیڑھی کے قریب لانے میں کامیاب ہو جاتا تھا...... اور یہ گھڑیاں کافی تھیں جن میں ہم میں سے کم از کم ایک یا دو افراد جلدی سے سیڑھی کے رسوں پر ہاتھ جما کر لانچ سے قدم اٹھاتے ہی جہاز کی سیڑھی پر رکھ سکتے تھے۔ لیکن ہم اس قدر خوفزدہ اور سہمے ہوئے تھے کہ وہ چند لمحے سوچنے میں ضائع کر دیتے اور لانچ اچھل کر جہاز سے دور چلی جاتی۔ ہم لانچ کے بالائی کنارے پر کھڑے کے کھڑے رہ جاتے۔ ڈرائیور لانچ اور جہاز کے تصادم کے ممکنہ خطرے کے پیشِ نظر دوبارہ سیڑھی کے قریب جا کر ہمیں اترنے کا موقع دینے سے کترا رہا تھا۔

ڈرائیور کا پارا چڑھنے لگا۔ اب وہ ہمیں خونخوار نظروں سے گھورنے لگا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہم کچھ عقل سے کام لے کر ہمت اور حوصلہ مجتمع کر کے تھوڑا سا رسک لیں اور اپنے جہاز پر جا کر اس کی جان چھوڑیں۔ یہ ہمارے لیے بالکل نیا تجربہ تھا۔ تاریک رات اور انتہائی سرد موسم، پورے دن کی تھکاوٹ اور لہروں سے اٹھنے والے ٹھنڈے پانی نے ہمیں شرابور کر دیا تھا۔ سردی سے ہمارے جسم کانپ رہے تھے۔ خاص طور پر ہمارے ہاتھ سن ہو گئے تھے۔ اس خیال سے ہماری کپکپی میں اضافہ ہو رہا تھا کہ اگر ان چند لمحوں میں ہمارے ہاتھ جہاز کی سیڑھی کو اپنی گرفت میں لینے میں کامیاب نہ ہوئے تو ہم نیچے جا گریں گے اور تیرنے کا موقع ملنے سے پہلے لانچ اور جہاز کے درمیان کچلے جائیں گے۔

ہمیں اپنی جان پیاری تھی اور اسی طرح سیاہ فام ڈرائیور کو اپنی لانچ عزیز تھی جو معمولی سی غفلت سے جہاز سے ٹکرا کر پاش پاش ہو سکتی تھی۔ اس طرح تمام لوگوں کے ڈوبنے کا خطرہ تھا۔ ہم اس قسم کے حادثوں کے بارے میں کئی مرتبہ سن چکے تھے اور شاید اب ہم خود اسی قسم کے حادثے کا شکار ہونے والے تھے۔ بہرحال ہماری سستی اور رسک نہ لینے پر لانچ کے ڈرائیور کا غصہ انتہا کو چھونے لگا۔ وہ اسٹیئرنگ وہیل سنبھالے چیخ چیخ کر ہمیں ڈانٹ رہا تھا۔ ممکن ہے گالیاں بھی دے رہا ہو۔ ہم اس کی زبان نہیں سمجھ سکتے تھے لیکن اس کا مفہوم بہ آسانی ہماری سمجھ میں آ رہا تھا۔ جب ڈرائیور سمجھ گیا کہ ہم بوکھلائے ہوئے بیلوں کی طرح صرف کھڑے رہیں گے اور ہم سے کچھ نہیں ہو سکے گا۔ تب اس نے غصے سے لانچ کا وہیل 180 ڈگری پر گھمایا اور واپس بندرگاہ کی طرف جانے لگا۔

ہم اس کی منت سماجت کرنے لگے۔ اس کے معاون بھی ہماری طرفداری کرتے ہوئے اسے سمجھانے لگے کہ ہم اس یخ بستہ رات میں شہر میں کہاں دھکے کھاتے پھریں گے۔ آخرکار اس کا دل پسیجا اور وہ لانچ کو دوبارہ جہاز کے قریب لے آیا۔ لیکن ہماری حالت وہی سرکس کے مسخرے جیسی تھی۔ کشتی نے جہاز سے ٹکرانا شروع کر دیا تھا۔ سیاہ فام ڈرائیور نے چیخ کر اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ان گدھوں کو اٹھا کر لانچ سے باہر پھینک دو۔

اس کی یہ بات ہم نے اس کے لہجے اور خونخوار اشاروں سے سمجھ لی تھی۔ لیکن جب اس کے ساتھیوں نے کوئی ایکشن نہ لیا تو خود اسٹیئرنگ وہیل کو چھوڑ کر ہماری طرف لپکا۔ اس کا قد سات فٹ کے قریب تھا۔ میں چھ فٹ کا ہوں۔ وہ مجھ سے کافی لمبا اور سانڈ کی طرح مضبوط تھا۔ وہ سیدھا ہماری طرف آیا۔ اس نے ایک بغل میں مجھے دبوچا اور دوسری میں کیڈٹ کو۔ وہ ہم دونوں کو سمندر میں پھینکنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس دوران لانچ جہاز سے تقریباً نصف میل دور جا چکی تھی۔ ظاہر ہے جہاز سے اس قدر فاصلے پر سمندر میں گرنے کے بعد سخت سردی میں تیر کر جہاز کی سیڑھی تک کون پہنچ سکتا تھا۔

ہمارے سینئر فورتھ انجینئر نے خطرے کو بھانپ لیا اور وہ سمجھ گیا کہ سیاہ فام ڈرائیور ہمیں سمندر برد کرنے والا ہے۔ وہ گویا اپنا فرض نبھانے کے لیے ہمارے پیچھے آیا۔ ہم غصے سے پاگل ہو جانے والے گوریلے نما شیدی کی بغلوں میں دبے بے بسی سے ٹانگیں چلا رہے تھے۔ وہ لانچ کے بالائی کنارے پر چل کر پیچھے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ فورتھ انجینئر قدرے محفوظ فاصلے پر رہ کر اسے انگریزی میں دھمکا رہا تھا کہ وہ آفس میں اس کی شکایت کرے گا۔ میں نے دل میں سوچا کہ انجینئر صاحب! تم نے تو ہمیں مروا ہی دیا۔ یہ نیم جنگلی انسان تمہاری انگریزی کہاں سمجھ سکتا ہے۔

آخرکار وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ ہمارے فورتھ انجینئر صاحب کی ڈانٹ ڈپٹ نے گوریلے کا غصہ اور بڑھا دیا۔ اس نے فلمی ولن کی طرح ایک زوردار چیخ ماری۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور خود کو سمندر میں گرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کر لیا۔ اچانک ہم دونوں ''دھم'' سے لانچ کے فرش پر گرے۔ گوریلے نے یکایک بغلیں ڈھیلی کر دی تھیں۔ اس کا سبب ہمارے فورتھ انجینئر کی مسلسل چیخ و پکار تھی۔ جس نے سیاہ فام گوریلے کے غصے کا رخ بدل دیا تھا۔ اس نے ہمیں چھوڑ کر فورتھ انجینئر کو پکڑ لیا۔ یعنی ہم لوگوں کی جان فی الحال آزاد ہو گئی یا پینڈنگ میں رہنے دی گئی، بے چارے فورتھ انجینئر ہمیں بچانے کے چکر میں خود مصیبت میں گرفتار ہو گئے۔ پھر کیڈٹ اور میں نیگرو ڈرائیور کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے اس کی منت سماجت کرنے لگے جس کے منہ سے جھاگ اڑ رہا تھا۔ ہمارے فورتھ انجینئر بھی کمال کے آدمی تھے۔ موت کو سامنے دیکھ کر بھی وہ کلمۂ شہادت پڑھنے کے بجائے سیاہ فام ڈرائیور کو برا بھلا کہے جا رہے تھے۔ یہ بات بھی ہمارے حق میں جاتی تھی کہ ڈرائیور انگریزی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ ہم نے اشاروں سے ڈرائیور کو باور کرانے کی کوشش کی کہ یہ شخص، یعنی فورتھ انجینئر دماغی طور پر ٹھیک نہیں ہے۔ اس دوران باقی کالوں کو بھی مداخلت کا خیال آیا اور انہوں نے آگے بڑھ کر گوریلے کی گرفت سے فورتھ انجینئر کو آزاد کرایا۔

وہ فورتھ انجینئر کو چھوڑ کر پھنکارتا ہوا دوبارہ اسٹیئرنگ پر آ گیا۔ اس نے ایک دفعہ پھر لانچ کو جہاز کے قریب لانے کی کوشش کی۔ مرتا کیا نہ کرتا والا معاملہ تھا۔ اب ڈرائیور لانچ پر ہمارے وجود کو برداشت کرنے پر بالکل آمادہ نہ تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ کسی بھی طرح یہ بوجھ جہاز پر منتقل ہو جائے۔

اس مرتبہ لانچ جیسے ہی جہاز کی سیڑھی کے قریب پہنچی، ہم تینوں نے بیک وقت اللہ کا نام لے کر لانچ سے سیڑھی کی طرف جمپ لگایا۔ ڈرائیور کے خوفناک تیور دیکھ کر ہم نے

WWW.PAKSOCIETY.COM

زندگی کے لیے خطرہ مول لینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ یہ بھی ہماری بوکھلاہٹ کا نتیجہ تھا کہ ہم تینوں نے ایک ساتھ لانچ سے چھلانگ لگائی تھی۔ بس اللہ نے مدد کی۔ کسی کے ہاتھ میں سیڑھی کا رسا آگیا اور کسی کے پاؤں جم گئے۔ بے چارے کیڈٹ کے ہاتھ پھسل گئے اور وہ "شڑاپ" سے پانی میں جاگرا۔ ہم دھک سے رہ گئے۔ ہمارا ایک ساتھی موت کے منہ میں جاگرا تھا۔ ہم اس کی مدد کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ ہمارے جوتے اور ہاتھ پہلے ہی گیلے تھے اوپر سے سیڑھی بھی پھسلنے والی تھی۔ یہی سبب تھا کہ کیڈٹ کا ہاتھ سیڑھی سے پھسل گیا تھا۔ اچانک معجزہ رونما ہوا...... میں اسے معجزے کے علاوہ دوسرا کیا نام دوں، میری فہم سے بالا ہے۔ اسی لمحے جبکہ ہم اپنے ساتھی کی زندگی سے مایوس ہوگئے تھے اور خود کو پانی میں گرنے سے بچانے کے لیے ہلتی ہوئی گیلی اور پھسلواں سیڑھی پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے کی جدوجہد میں مصروف تھے...... یکایک اسی ثانیے میں لہر تیزی سے بلند ہوئی اور چند ہی سیکنڈ کے بعد جیسے ہی پانی اوپر آیا، کیڈٹ بھی اس کے ساتھ اوپر آیا اور اس نے جلدی سے سیڑھی کو پکڑلیا۔ حالانکہ ہمارے ہاتھوں میں بھی طاقت نہیں رہی تھی لیکن اپنے ساتھی کو قریب پاکر ہم نے اس کے باقی جسم کو پانی سے کھینچ کر باہر نکالا اور اس کے پاؤں سیڑھی کے سب سے نچلے اسٹیپ تک پہنچادیے۔ اب وہ بھی سیڑھی پر قدم جمائے ہمارے ساتھ بری طرح ہانپ رہا تھا۔

جب ہم سیڑھی چڑھ کر جہاز کے عرشے پر پہنچے تو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ ہم زندہ سلامت ہیں۔ لانچ کے سیاہ فام ڈرائیور نے ایک دفعہ پھر فلمی ولن کی طرح بڑک ماری اور لانچ کو فل اسپیڈ سے بندرگاہ کی جانب لے گیا۔

کئی سال گزرنے کے بعد اس واقعے کا تجزیہ کرنے پر محسوس ہوا کہ اس میں سارا قصور ہمارا تھا۔ وہ غریب سیاہ فام لانچ والا تو کیا ایسی حالت میں کوئی چینی، انگریز، جاپانی یا ہمارا امکرانی...... ہانگ کانگ، لیورپول، اوساکا یا کراچی کے آؤٹر اینکریج پر ہماری اس قسم کی کوتاہی اور سستی کو ہرگز برداشت نہ کرتا۔ کوئی بھی اپنی لاکھوں روپے مالیت کی لانچ کو ایسے خراب سمندر میں جہاز کے قریب لے جاکر اسے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کا خطرہ مول نہیں لے گا۔ کیونکہ یہی لانچ ایک غریب خاندان کے روزگار کا واحد وسیلہ ہوتی ہے۔ بہرحال اپنی حماقتوں کے باوجود ہمیں نئی زندگی مل گئی۔ یہ بات دیگر ہے کہ ہم آج بھی طوفانی رات کے اس واقعے کو فراموش نہیں کرسکے ہیں۔

اس کے بعد بھی براعظم افریقا کا پھیرا کرنے کا موقع ملتا رہا۔ موزمبیق چینل کے قریب لارنز و مارکس کے آؤٹر اینکریج پر پہنچ کر ماضی میں پیش آنے والا وہ حادثہ ضرور یاد آتا تھا اور اس کے ساتھ ہی جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ جاتی تھی۔ ہم تینوں دوست بعد میں چیف انجینئر اور کیپٹن بن کر مختلف جہازوں پر رہے۔ لیکن جب بھی ہم کسی ملک میں سمندری زندگی پر ہونے والی کانفرنس یا سیمینار میں ملتے ہیں تو دنیا کے نقشے پر موزمبیق چینل کی طرف اشارہ کرکے ایک دوسرے کو یاد دلاتے ہیں کہ ہم اس وقت گریس پیریڈ میں جی رہے ہیں، ورنہ 1969ء کے دنوں میں ہم اس سمندر میں ڈوب مرتے اور مچھلیوں کی خوراک بن جاتے۔

براعظم افریقا کے جو سب سے مہذب، ماڈرن اور بہتر امن وامان والے ملک ہیں، اور جن میں کئی اقوام اور مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ آزادی سے رہتے ہیں، کینیا ان میں ایک ہے۔ اس کے دارالحکومت نیروبی کی ہر طرف دھوم ہے۔ یہ افریقا کے ساتھ ساتھ ایشیائی اور برطانوی شہر معلوم ہوتا ہے۔ یہاں عرب، سکھ، انگریز، پارسی، آغا خانی، مسلمان اور ہندو بھی نظر آتے ہیں۔ سینما اور تھیٹرز کے سامنے انگریزی، عربی اور ہندی فلموں کے پوسٹر بھی نظر آتے ہیں۔

نیروبی بلند عمارتوں اور خوبصورت پارکوں کا شہر ہے، جن کی Sky Line دیکھنے کے لائق ہے۔ شہری سہولیات سے پُر یہ شہر لندن، ممبئی، لاہور اور قاہرہ کی طرح قدیمی لگتا ہے لیکن آپ کو حیرت ہوگی کہ جب انگریزوں نے سندھ فتح کیا تھا، یعنی 1843ء میں بھی اس ملک "کینیا" کا وجود نہیں تھا۔ ظاہر ہے اسی طرح اس کا موجودہ دارالحکومت نیروبی شہر اور اس کا نام تک نہ تھا۔ 1843ء تو ماضی بعید ہوا...... جسے 157 برس گزر چکے ہیں جبکہ 120 سال پہلے تک بھی کینیا ملک کا وجود نہ تھا۔

1899ء میں انگریزوں نے ممباسا سے کمپالا تک ریلوے لائن بچھائی تو ان دونوں شہروں کے درمیان دریائے نیروبی کے مقام پر ریلوے ڈپو قائم کیا تھا۔ جو بعد میں ایک مختصر آبادی سے رفتہ رفتہ چھوٹے سے شہر کی صورت اختیار کرتا چلا گیا۔ وہ شہر نیروبی کہلانے لگا۔ 1920ء تک ملک کینیا کا نام تک نہ تھا۔ یہ آج کا کینیا اور یوگنڈا والا علاقہ انگریزوں کے قبضے میں تھا اور "برٹش ایسٹ افریقا پروٹیکٹوریٹ" کہلاتا تھا۔ اس کے بعد اس حصے کا نام یہاں کے مشہور جبل "ماؤنٹ کینیا" کے نام سے "کینیا" رکھا گیا۔

ملک کینیا ایک بہترین جگہ پر واقع ہے۔ بحر ہند کے قریب خط استوا پر ہونے کی وجہ سے یہاں کا موسم بہترین رہتا ہے۔ جب انگریزوں نے اس علاقے پر قبضہ کیا تو ان کے اطراف میں آج کے ملکوں کی سرحدیں تھیں نہ ملک! ممباسا، دارالسلام اور زینزیبار جیسے شہر اور بندرگاہیں پرانی ہونے کے سبب ان کی دور دور تک شہرت پھیلی ہوئی تھی۔ آج کے اس ملک کینیا کے شمال میں ایتھوپیا اور سومالیہ واقع ہیں، جنوب میں تنزانیا، مغرب اور شمال مغرب میں یوگنڈا، دنیا کی مشہور وکٹوریا جھیل اور سوڈان ہے۔

پرتگالی پہلے یورپین تھے جو مشرقی افریقا کے کنارے پر پہنچے۔ 1498ء میں پرتگالی جہازی اور Explorer اپنے بادبانی جہاز کو کیپ آف گڈ ہوپ والا خطرناک سمندر عبور کراکے افریقا کے مشرقی کنارے والی مشہور بندرگاہ ممباسا تک آپہنچے۔ پھر وہاں سے انڈیا روانہ ہوئے۔ اس کے بعد یورپین کو مزید آگے چین تک پہنچنے کا سمندری راستہ معلوم ہوا ہے۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ ایسا ہرگز نہیں تھا کہ یورپین، انڈیا اور چین سے بے خبر تھے۔ مارکوپولو اس سے پہلے چین پہنچ چکا تھا۔ دوسروں کو بھی ان علاقوں کے بارے میں معلومات حاصل تھی وہ یہاں آکر تجارت بھی کرتے تھے لیکن یہ تمام آمدورفت خشکی کے راستے ہوتی تھی۔ وہ عرب ملکوں اور ایران سے ہوتے ہوئے چین پہنچتے تھے اور اونٹوں پر قافلوں کی صورت میں سفر کرتے تھے۔ کہیں کہیں ایرانی نار اور بحر احمر جیسے سمندر، جہازوں کے ذریعے عبور کرتے تھے۔ انہیں یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ میڈیٹرینین سمندر سے جبرالٹر کے مقام پر باہر نکل کر جہاں اٹلانٹک سمندر آتا ہے، وہاں سے افریقا کے گرد چکر لگانے کے بعد افریقا کے مشرقی کنارے (ممباسا، دارالسلام اور زینزیبار وغیرہ) پہنچا جاسکتا ہے۔ پھر وہاں سے سیدھا مشرق کی جانب رخ کیا جائے تو انڈیا جا پہنچیں گے۔

ترکی کی سلطنت عثمانیہ نے جب یورپین کی خشکی کی راہیں مسدود کردیں اور ترکی، ایران، عربستان، مصر میں ان کی تجارت پر پابندی عائد کردی تو یورپین مجبور ہوگئے کہ کوئی متبادل راہ تلاش کی جائے۔ اس کوشش کے نتیجے میں سب سے پہلے پرتگالی کامیاب ہوئے۔ واسکوڈی گاما براعظم

کیا آپ
لبوب مقوی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے۔ اعصابی کمزوری دور کرنے۔ ندامت سے نجات، مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے۔ کستوری، عنبر، زعفران جیسے قیمتی اجزاء سے تیار ہونے والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ یعنی ایک انتہائی خاص مرکب خدارا۔۔ ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے اور خاص لمحات کو خوشگوار بنانے کیلئے۔ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ آج ہی صرف ٹیلیفون کرکے بذریعہ ڈاک VP وی پی منگوالیں۔

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)

(دیسی طبی یونانی دواخانہ)

ضلع وشہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061
0301-6690383

فون صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک کریں

WWW.PAKSOCIETY.COM

افریقا سے گھوم کر ممباسا پہنچ گیا۔ بس پھر کیا تھا۔ پرتگال نے گویا میدان مار لیا تھا۔ پرتگالی کئی برسوں تک ممباسا اور مشرقی افریقا کے کنارے کی دیگر بندرگاہوں پر تجارت کی غرض سے آتے رہے لیکن انہوں نے وہاں تک پہنچنے کا نقشہ راز میں رکھا۔ انہوں نے کسی کو بھی ان سمندری راستوں کی ہوا نہ لگنے دی۔

لیکن آج دنیا کے تمام سمندروں کے نقشے موجود ہیں۔ سمندر کے ایک ایک میل کی پیمائش ریکارڈ ہے۔ سمندر میں کسی بھی جگہ جہاز غرق ہوتا ہے تو نقشے پر اس کی نشاندہی ہو جاتی ہے کہ فلاں مقام پر سمندر اتنا گہرا ہے اور اسی جگہ پر غرق شدہ جہاز کا ڈھانچا زیرِ آب موجود ہے۔ لہٰذا سفر کے دوران اس مقام پر احتیاط برتی جائے۔

سال بھر کے چارٹ بہ آسانی دستیاب ہوتے ہیں جنہیں ''المناک'' کہا جاتا ہے۔ اس میں معلومات درج ہوتی ہے کہ فلاں دن، فلاں وقت پر سمندر میں مد کی کیفیت ہوگی اور فلاں وقت جزر کی حالت ہوگی۔ ان باتوں کو دھیان میں رکھ کر جہاز کی سمت درست کی جاتی ہے۔ نہ صرف کاغذی نقشے بلکہ الیکٹرانک میپ بھی دستیاب ہیں۔ آپ کو بندرگاہ پر پہنچ کر آئندہ سفر کے لیے نئے نقشے حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کمپیوٹر پر آٹو میٹکلی نئی معلومات اور رہنمائی ظاہر ہوتی ہے...... لیکن واسکوڈی گاما کا زمانہ مختلف تھا۔ اس دور میں لوگوں کو خبر ہی نہیں تھی کہ براعظم افریقا کہاں تک پھیلا ہوا ہے۔ اور اٹلانٹک سمندر کن منزلوں کی راہ ثابت ہوسکتا ہے۔ واسکوڈی گاما پر ''اندھے کے ہاتھ بٹیر لگنے'' والی مثال صادق آتی ہے۔ ہم تصور کرسکتے ہیں کہ کس طرح بے سمت آوارہ گردی کرتے ہوئے اتفاقیہ طور پر اس نے آبی گزرگاہ دریافت کرلی ہوگی اور اپنے اس ''کارنامے'' پر اس نے کس قدر داد سمیٹی ہوگی۔ دوسرے یورپی ملکوں کے ناخدا (نیوی گیٹرز) حیران ہوئے ہوں گے کہ یہ کس طرح انڈیا پہنچتے ہیں!

واسکوڈی گاما نے یہ راز صرف اپنے بادشاہ کے سامنے عیاں کیا کہ ''حضور! میں یہاں پرتگال سے جنوب کی سمت میں ناک کی سیدھ میں گیا، پھر بائیں سمت مشرق میں دو تین دن سمندر میں سفر کرنے کے بعد شمال کا رخ کیا...... اور اس طرح ممباسا جا پہنچا۔ پھر جناب! میں نے ممباسا سے مشرق کی جانب سفر کا آغاز کیا۔ تین ہفتے سمندر جھیلنے کے بعد انڈیا کا کنارہ کوچین (یا کالیکٹ) میرے سامنے تھا......''

بہرحال آج کے دور میں یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اس زمانے میں صرف لکڑی کے بادبانی جہاز ہوا کرتے تھے۔ راشن وغیرہ کا مسئلہ بھی اپنی جگہ اہم ہوتا تھا۔ سمندروں کی معلومات بھی انتہائی ناقص اور نامکمل تھی۔ سو ایسے میں دوسرے یورپین اس قسم کا خطرہ مول لینے پر آمادہ نہ تھے۔ ان میں سے بعض ایڈونچر پسند یا دلیر ناخدا ہمت کر کے اپنے جہاز براعظم افریقا کے انتہائی سرے تک لے بھی جاتے تو وہ بے چارے کیپ آف گڈ ہوپ کے خطرناک سمندر میں غرق ہو جاتے۔

میں یہاں یہ وضاحت بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ ممباسا کو پرتگالیوں نے دریافت نہیں کیا تھا۔ البتہ انہوں نے پرتگال سے ممباسا تک پہنچنے کا راستہ ضرور تلاش کرلیا تھا۔ جہاں تک ممباسا بندرگاہ کا تعلق ہے...... یاد رہے کہ یہاں واسکوڈی گاما کی آمد سے دو صدیاں قبل عرب، ایرانی، کچھی، سندھی، ملباری اور گجراتی خانہ بدوش آتے جاتے رہے ہیں۔ کیوں کہ وہ یہیں، یعنی بحرِ ہند کی بندرگاہوں کے باسی تھے۔ چوماسی کی ہواؤں کا ایسا بہترین سسٹم ہے کہ سال کے چند ماہ مقرر تھے۔ لوگوں کو معلوم تھا کہ کس مہینے میں کس رخ کی ہوا چلے گی اور انہیں کس سمت کا سفر اختیار کرنا چاہیے۔

واسکوڈی گاما کسی نہ کسی طرح ممباسا تک تو پہنچ گیا لیکن اسے آگے کی خبر نہیں تھی۔ پھر ایک ہندوستانی ناخدا نے اس کی مدد کی اور وہ اسے لے کر انڈیا کے مغربی کنارے پر پہنچا۔ اس کے بعد وہ اس قدر ''ماہر'' اور ''سیانا'' ہوگیا کہ اس نے پرتگال پہنچ کر کیے بعد دیگرے انڈیا کے کئی سفر کیے۔ اس حد تک کہ سات سال کے اندر یعنی 1505ء میں ڈان فرانسکوڈی المیڈا کی کمانڈ میں پرتگال کے جنگی جہاز افریقا کے مشرقی کنارے پر پہنچ گئے۔ انہوں نے مقامی لوگوں کے ساتھ جنگ شروع کردی اور ''قلوا'' فتح کرلیا۔ (قلوا آج کے تنزانیا کے جنوبی حصے میں واقع ایک جزیرے کا نام ہے)

یہاں واسکوڈی گاما کے بارے میں چند سطریں لکھنا ضروری خیال کرتا ہوں۔ اسے جہاں اس کے ملک پرتگال میں ہیرو کا درجہ دیا جاتا ہے، وہیں ہمارے ہاں برصغیر اور افریقا کے مشرقی کنارے پر اسے ایک وحشی، ظالم اور بدمعاش کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ اس حد تک کہ ساؤتھ افریقا کے ایک میوزیشن ''ماسکیلا'' نے سامراجوں کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

خلاف Anti colonialist گیت ترتیب دیا ہے جس کا عنوان ہے ''واسکوڈی گاما، دی سیلر مین۔'' اس گیت کا ایک مصرع ہے: "Wasco da Gama Was no friend of mine" بعد میں اسی موسیقار نے قبضہ کرنے والے غاصبوں کے خلاف ایک دوسرا گانا "Colonial Man" بھی ترتیب دیا۔

واسکوڈی گاما نے جہاں اپنے ملک کے لیے جہاز رانی کی راہیں تلاش کیں، انڈیا اور افریقا سے جی بھر کر ریشم، سونا، ہاتھی دانت اور مسالے لوٹ کر پرتگال کو امیر کیا اور اپنے لوگوں میں ہیرو کا درجہ حاصل کیا...... وہیں عرب، انڈین، مسلمان اور افریقا کے سیاہ فام اسے گالیاں بھی دیتے ہیں۔ اس شخص نے ان لوگوں کے گھروں کو بارود کے ذریعے آگ لگادی تھی۔ بندرگاہ پر کھڑے جہازوں کو نذرِ آتش کیا، اس قدر مظالم ڈھائے کہ ایک مرتبہ حاجیوں کے جہاز کی آمد کا سن کر واسکوڈی گاما گجرات کے مقام پر سمندر میں انتظار کرنے لگا۔ مکہ سے آنے والا ''مری'' نامی جہاز حاجیوں کو لے کر جیسے ہی ہندوستان کے کنارے کے قریب پہنچا، ان پرتگالیوں نے ان کو اپنی بندوقوں کے نشانے پر رکھ لیا۔ تمام مال ومتاع لوٹ لیا گیا...... اس کے بعد تمام حاجیوں کو جہاز کے ایک گودام میں بند کر کے پورے جہاز کو آگ لگادی۔

☆☆☆

کینیا کی بندرگاہ ممباسا میں پہنچنے والے پہلے یورپی واسکوڈی گاما کا تعلق پرتگال سے تھا۔ وہ 1469ء میں پرتگال کی جنوبی بندرگاہ سائینس (Sines) میں نوسا سینہورا کلیسا کے قریب واقع ایک گھر میں پیدا ہوا جہاں آج کل اس کا قدِ آدم مجسمہ بھی نظر آتا ہے۔ ان دنوں میں یہ بندرگاہ مچھیروں کی ایک بستی تھی۔ اس نے بنیادی تعلیم قریبی شہر ایوورا (Evora) سے حاصل کی جہاں سے معلوم ہوتا ہے اس نے میتھس اور نیوی گیشن کی تعلیم بھی ضرور حاصل کی ہوگی۔ اس کے علاوہ بستی کے مچھیروں اور ماجھیوں سے اس نے ستاروں کی معلومات (Astronomy) بھی سیکھی ہوگی۔ کیونکہ ان دنوں میں راستہ تلاش کرنے اور سمت کی شناخت کے لیے سب سے اہم آلہ نسوار کی ڈبیا کے برابر قطب نما ہوتا تھا جس میں گھومنے والی سوئی کا رخ ہمیشہ شمال

کی جانب اشارہ کرتا تھا۔ باقی سارا کام ستاروں کی پوزیشن اور ان کی حرکت کو مدِنظر رکھ کر انجام دیا جاتا تھا۔

کمال کی بات یہ ہے کہ آج بھی ہمارے کئی مچھیرے صرف اور صرف ستاروں پر نظر رکھ کر دبئی، ایران اور بھوج، کھمبھات تک جا نکلتے ہیں۔ کمزور کشتیوں اور سمندر میں اٹھنے والے طوفان کے سبب وہ خاصی پریشانیاں بھی اٹھاتے ہیں۔ ان کی کشتیاں غرق بھی ہو جاتی ہیں لیکن وہ راستہ اور منزل نہیں بھولتے۔ کراچی کے علاقے ماری پوری، یونس آباد، گریکس اور شمس پیر میں کچھ ایسے ناخداؤں سے بھی ملا ہوں جو بغیر کسی Navigation Aid (سمندر میں سمت کی رہنمائی کرنے والے آلات) کے صرف ستاروں کی مدد سے جبوتی اور مساوا (سومالیہ) تک جا پہنچتے ہیں۔ انہیں اپنے بزرگوں اور استادوں سے یہ معلومات حاصل ہوتی ہے کہ کون سی بندرگاہ کہاں واقع ہے۔

واسکوڈی گاما کے کیس میں اسے ستاروں کے ذریعے راستہ تلاش کرنے اور اپنی پوزیشن معلوم کرنے کا علم ضرور حاصل تھا۔ لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ ممباسا اور انڈیا کہاں ہیں، بلکہ اسے یہ بھی یقین نہیں تھا کہ اٹلانٹک سمندر کے ذریعے وہاں تک پہنچا جا سکتا ہے۔

1492ء میں پرتگال کی بندرگاہ سیتوبل میں کچھ فرنچ جہاز آ کر رکے۔ ان کے عزائم ٹھیک معلوم نہیں ہوتے تھے اور وہ واقعی لوٹ مار کی غرض سے وہاں پہنچے تھے۔ یہ بندرگاہ لسبن کے جنوب میں واقع ہے۔ اس وقت کے پرتگالی بادشاہ جان دوم نے واسکوڈی گاما کو طلب کیا اور اسے فرنچوں کو سبق سکھانے کی ہدایت کی۔ وہ فوج کو ساتھ لے کر وہاں پہنچا اور اپنی اس ذمے داری کو بخیر و خوبی انجام دیا۔ اس نے فرنچوں کے تمام جہاز اپنے قبضے میں لے لیے۔ اس کے اس کارنامے کی ہر طرف دھوم مچ گئی کہ واسکوڈی گاما نہ صرف بہترین جہازراں بلکہ ایک لڑاکا بھی ہے۔

یورپ کے لوگوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ چین، انڈیا، ملایا اور مشرقِ بعید کی اطراف میں نہ صرف مسالے بلکہ ریشم، سونا، ہاتھی دانت، ہیرے جواہر اور دوسرا قیمتی سامان موجود ہے۔ وہ یہ بھی جان چکے تھے کہ ان علاقوں کے لوگ نہ تو آتشیں اسلحہ رکھتے ہیں اور نہ ٹیکنیکلی طور پر ہوشیار ہیں۔ جس قسم کے ماڈرن جہاز یورپیوں نے تیار کر لیے تھے، ان کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتے ..... بس، اب وہ اس چکر میں تھے کہ کسی طرح انڈیا اور مشرقِ بعید کے ملکوں تک پہنچنے کے لیے سمندری راستہ تلاش کیا جائے۔ آیا ایسا کوئی راستہ ہے بھی یا نہیں، اگر ہے تو اس پر کس رخ اور کس سمت میں سفر کر کے منزلِ مراد پر پہنچا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے ان ایام میں آج کی طرح نقشے اور اٹلس نہیں تھے جنہیں دیکھ کر ایک بچہ بھی بتا سکتا ہے کہ کیسے پہنچا جا سکے گا۔ اور نہ اس زمانے میں ہوائی جہاز اور سیٹلائٹ تھے جن کے ذریعے معلوم ہوتا کہ دنیا کے گولے پر کہاں کہاں سمندر ہے اور کہاں زمین ہے۔

انڈیا کے کامیاب سفر سے پہلے کے سفر میں واسکوڈی گاما ایک مہینا سمندر میں جھک مارنے کے بعد واپس لوٹ آیا تھا۔ اس سفر میں وہ 120 ساتھیوں کے ساتھ روانہ ہوا تھا اور جب واپس آیا تو اس کے ساتھ صرف 50 افراد تھے...... باقی لوگ سفر کے دوران پیش آنے والے مصائب کا شکار ہو گئے تھے۔

اس کے بعد 8 جولائی 1497ء کو واسکوڈی گاما چار جہازوں کا بیڑا ساتھ لے کر لسبن سے روانہ ہوا۔ یاد رہے کہ اس زمانے میں سمندری جہازوں کا طویل سفر خودکشی کے مترادف تھا۔ کیونکہ نہ تو مناسب خوراک کا بندوبست ہوتا تھا اور نہ حادثات سے خود کو محفوظ رکھنے کا معقول انتظام تھا۔

واسکوڈی گاما اپنے ساتھ جو چار جہاز لے کر ایک طویل سفر کے لیے نکلا تھا، ان کی پیمائش اور وزن کا ریکارڈ آج بھی موجود اور محفوظ ہے۔ آج مشینوں کے ذریعے چلنے والے آہنی جہاز ہیں۔ ان میں جس جہاز کو چھوٹا سمجھا جاتا ہے وہ بھی کم از کم 600 فٹ طویل ہوتے ہیں۔ یہ کم و بیش بیس تا پچیس ہزار ٹن وزن اٹھا سکتے ہیں۔ یہ چھوٹے سے چھوٹے جہاز کی مثال ہے۔ بڑے جہاز ایک لاکھ ٹن اور اس سے بھی زیادہ وزن کے ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں واسکوڈی گاما کے چاروں جہازوں کو دیکھا جائے تو ان میں سب سے بڑا جہاز "Sao Gabrel" تھا جسے واسکوڈی گاما خود چلا رہا تھا۔ وہ جہاز صرف 178 ٹن کا تھا اور بمشکل 90 فٹ لمبا تھا۔

اٹلانٹک اور بحرِ ہند میں موسم خراب ہوتا ہے تو کیپ آف گڈ ہوپ کے مقام پر ہمارے آہنی جہازوں کی بھی ''چیخیں'' نکل جاتی ہیں۔ بدمست لہریں دیوہیکل جہاز سے اس طرح کھیلتی ہیں کہ اس کی چرچراہٹ کی آوازیں سن کر ہم خوفزدہ ہو جاتے ہیں کہ شاید جہاز نے ہمت ہار دی ہے اور اب درمیان میں سے دو ٹکڑے ہو جائے گا۔ لہریں جہاز کو اٹھا کر بڑی بے رحمی سے پٹخ دیتی ہیں۔ سرکش لہریں جہاز کو

بلند کر کے خود اچھالتی ہوئی آگے نکل جاتی ہیں تو جہاز ''دھم'' سے نیچے آتا ہے اور پھر دوسری بلند لہریں اس کے ساتھ اٹکھیلیاں کرنے لگتی ہیں۔ ایسے میں ہماری کیا حالت ہوتی ہے... اس کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس تجربے سے گزرے ہوں۔ بہرحال ہر ایک کی حالت ابتر ہوتی ہے۔ سی سکنیس کے زیرِ اثر رہتے ہوئے ایسی کیفیت ہوتی ہے کہ پیٹ میں موجود ہر شے گویا حلق کے راستے باہر آنے کو مچل رہی ہے۔ جب تک جہاز اس علاقے سے نہیں گزر جاتا، اس دوران (تقریباً دو دن) جہاز میں موجود تمام افراد سکون سے نہیں رہ سکتے۔

آج کے جہاز چونکہ انجنوں کے ذریعے چلتے ہیں۔ اس لیے ان کی رفتار بھی خاصی تیز ہوتی ہے۔ لیکن اس زمانے میں بادبانی جہاز تھے۔ ہم سوچ سکتے ہیں کہ ان کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ جہازیوں کو دن بھر میں بمشکل ایک وقت کا کھانا نصیب ہوتا تھا۔ پینے کے پانی کی ہمیشہ کمی رہتی تھی۔ ان کے جہاز بادبان کے زور پر چلتے تھے جو ہوا کے پابند تھے۔ رفتار بھی بہت کم ہوتی تھی۔

اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب واسکوڈی گاما ممباسا... مالندی بندرگاہ سے 23 دن میں انڈیا کی بندرگاہ کالیکٹ پہنچ گیا۔ واپسی پر اس نے چوماسی کی ہواؤں کا خیال نہیں رکھا اور عجلت میں کالیکٹ سے روانہ ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے کالیکٹ اور مالندی کے درمیان 23 دن کا سفر 132 دن میں طے کیا۔ یعنی انہیں سمندر میں ساڑھے چار مہینے گزارنے پڑے تھے۔ اس سفر میں واسکوڈی گاما کے 90 ساتھی لقمۂ اجل بن گئے۔ 170 میں سے صرف 80 افراد زندہ بچ پائے تھے۔ ان میں سے بھی کئی لوگ ہڈیوں اور جلد کی بیماری Scurry میں مبتلا ہو گئے تھے۔ یہ بیماری سمندر میں درست غذا نہ ملنے کے سبب آج بھی عام ہے۔

واسکوڈی گاما کے جہاز کے علاوہ باقی تین جہازوں میں سے دو انتہائی چھوٹے جہاز تھے۔ ان دو چھوٹے جہازوں میں سے ایک پر کھانے پینے اور دیگر ضروریات کی اشیا بار کی گئی تھیں اور وہ جہاز کیپ آف گڈ ہوپ سے تو گزر گیا لیکن مشرقی افریقا کے کنارے پر خلیج ساؤ براس (Sao Bras) میں ناخداؤں سمیت غرق ہو گیا۔

یورپ سے روانہ ہوتے ہوئے اٹلانٹک سمندر میں کیپ وردی نامی ایک جزیرہ آتا ہے، جہاں آج بھی پرتگالیوں کا قبضہ ہے۔ ہم نے بھی یورپ سے امریکا جاتے ہوئے ایک دو مرتبہ کیپ وردی جزیرے پر ٹھہر کر جہاز کے لیے ایندھن اور عملے کے افراد کے لیے راشن وغیرہ خریدا تھا۔ واسکوڈی گاما کے زمانے میں بھی یہ روٹ عام تھا۔ یعنی یورپ سے نکل کر کیپ وردی جزیرے پر دم لے کر افریقا کے مغربی کنارے کے لیے جہاز روانہ ہوتے تھے۔ واسکوڈی گاما اس جزیرے کے بعد آج کے افریقی ملک سیرالیون تک کنارے کنارے سفر کرتا ہوا پہنچا اور پھر اس نے جنوب کی سمت بالکل سیدھ میں سفر کا آغاز کیا۔ وہ مسلسل تین مہینے تک کھلے سمندر میں تقریباً 6000 میل کا سفر طے کر کے کیپ آف گڈ ہوپ کی جانب مڑا۔ وہیں کنارے پر ٹھہر کر انہوں نے 25 دسمبر کے دن کرسمس ڈے منایا۔ انہوں نے اس جگہ کا نام ناتال رکھا۔ آج ساؤتھ افریقا میں واقع ''ناتال'' شہر وہی ہے۔

کیپ آف گڈ ہوپ کو عبور کرنے کے بعد وہ افریقا کے مشرقی کنارے کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا شمال کی جانب بڑھنے لگا۔ موزمبیق بعد میں پرتگالیوں کی کالونی بنا۔ لیکن اس زمانے میں وہاں کا سلطان ایک مسلمان تھا۔ واسکوڈی گاما کو معلوم تھا کہ افریقا کی ان کنارے والی بندرگاہوں میں عربوں کا اثر و رسوخ زیادہ ہے۔ اسے یہ خوف بھی تھا کہ کہیں مقامی لوگ عیسائیوں کے خلاف نہ ہوں۔ اس خیال کے تحت واسکوڈی گاما نے خود کو مسلمان ظاہر کیا اور موزمبیق کے سلطان سے ملاقاتیں کرنے میں کامیاب ہوا۔ لیکن جلد ہی مقامی لوگ ان کی مشکوک حرکتوں کو دیکھ کر محتاط ہو گئے۔ جس طرح لارنس آف عربیہ (رچرڈ برٹن) ایک مسلمان کی حیثیت سے حاجیوں میں شامل ہو گیا تھا۔ کسی کو اس پر شبہ نہیں ہو سکا تھا کہ وہ عیسائی ہے۔ پھر ایک دن وہ مکہ شہر میں جبہ پہنے ہوئے کھڑے ہو کر پیشاب کرنے لگا۔ دور ہی سے ایک بچے نے اسے یہ حرکت کرتے ہوئے دیکھا اور چیختے ہوئے دوسرے لوگوں کو مطلع کیا۔ اسی طرح واسکوڈی گاما کی حرکتیں بھی اسے ظاہر کر بیٹھیں جو اسلامی اور عرب کلچر سے مختلف تھیں۔ پھر بپھرے ہوئے لوگوں نے اسے موزمبیق سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ بندرگاہ چھوڑتے وقت اس نے مقامی لوگوں کو خوفزدہ کرنے کے لیے توپوں کا رخ شہر کی جانب کر کے کئی گولے برسائے۔

اس کے بعد وہ موزمبیق سے نکل کر موجودہ ملک کینیا کے کنارے کے قریب لنگر انداز ہوا۔ یہاں اس نے تنزانی

WWW.PAKSOCIETY.COM

شروع کردی۔ واسکوڈی گاما وہاں سے گزرنے والے عرب سوداگروں کے ان جہازوں کو لوٹنے لگا جو ممباسا سے موزمبیق کی جانب آرہے تھے۔ اس طرح اس نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے خاصا مال جمع کرلیا۔ پھر وہ ممباسا بندرگاہ میں داخل ہوئے۔ وہاں مقامی لوگوں میں اپنے لیے نفرت کو محسوس کرکے بھاگ نکلے۔ اس کے بعد وہ مشرق کی جانب مالندی بندرگاہ جا پہنچے جہاں دوستانہ انداز میں ان کا استقبال کیا گیا۔ کیونکہ اس بندرگاہ کے سردار، ممباسا کے لوگوں سے اختلافات رکھتے تھے۔ اس قسم کی صورتِ حال یورپی لٹیروں کو بہت پسند تھی۔ وہ علاقائی تنازعات میں مداخلت کرکے کسی ایک پارٹی کی حمایت کے نتیجے میں فائدہ حاصل کرتے تھے۔ حالانکہ وہ کسی سے مخلص نہیں ہوتے تھے۔ جو آج بھی نظر آرہا ہے۔

بہرحال مالندی بندرگاہ میں رہنے کے دوران واسکوڈی گاما نے ایک ایسا ملاح تلاش کرلیا جو بحر ہند اور اس میں چلنے والی ہواؤں سے واقف تھا، یعنی اسے موسم کی معلومات حاصل تھی اور وہ ان علاقوں کے درمیان کئی سفر کرچکا تھا۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ عرب نیوی گیٹر ابن مجید تھا جبکہ بعض کی رائے کے مطابق وہ ملاح ایک گجراتی مسلمان تھا جس نے انڈیا کی بندرگاہ کالیکٹ تک واسکوڈی گاما کی رہنمائی کی تھی۔

اس زمانے میں کالیکٹ کا حاکم زمورین تھا۔ پرتگالیوں کی خواہش تھی کہ انہیں گجرات میں تجارت کرنے کی اجازت دی جائے۔ لیکن مقامی اور عرب سوداگر اس کے سخت مخالف تھے۔ آخرکار واسکوڈی گاما وہاں اپنے کچھ لوگ چھوڑ کر واپس اپنے وطن روانہ ہوگیا۔

وہ 8 جولائی 1497ء میں اپنے ملک کی بندرگاہ لسبن سے روانہ ہوا تھا اور اگست 1499ء یعنی پورے دو برس کے بعد واپس پہنچا تھا۔ اس کے بعد 12 فروری 1502ء کو وہ دوبارہ ایک نئے سفر پر روانہ ہوا۔ اس سے قبل ایک ناخدا پیڈرو کابرال کو اسی روٹ پر انڈیا بھیجا جاچکا تھا۔ یہ وہ نیوی گیٹر ہے جس نے آگے چل کر برازیل دریافت کیا تھا۔

جب پیڈرو کابرال انڈیا پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ واسکو ڈی گاما اپنے جن ہم وطنوں کو کالیکٹ میں چھوڑ گیا تھا، انہیں مقامی لوگوں نے قتل کردیا ہے۔ اپنے لیے بھی مقامی لوگوں کی عداوت کو محسوس کرکے اس نے کالیکٹ شہر پر زبردست بمباری کی۔ اس کے بعد وہ کوچین پہنچا، جہاں اس کا شاندار استقبال کیا گیا۔ پھر انڈیا سے رخصت ہوتے... وقت اس کے جہاز کو سلک، ریشم اور سونے سے بھر دیا گیا۔

واسکوڈی گاما دوسرے سفر پر جنگی جہاز بھی ساتھ لے چلا تھا۔ اس نے مشرقی افریقا کی بندرگاہ قلوا پر حملہ کرکے اس پر قبضہ کرلیا۔ وہ بندرگاہ عربوں کے قبضے میں تھی جو اُن کے ہاتھ سے نکل گئی۔ اس کے بعد وہ انیا پہنچا اور کالیکٹ بندرگاہ میں موجود 29 جہاز تباہ کرکے اس جارحانہ کارروائی کے بعد کالیکٹ کے حاکم زمورین نے تجارتی سہولیات کے نام پر ہر چیز تحریری طور پر واسکوڈی گاما کے حوالے کردی۔ یورپی لٹیرا خوش خوش پرتگال پہنچا۔ اس کے بعد جب وہ تیسرے سفر پر کالیکٹ پہنچا تو 1524ء میں ملیریا کا شکار ہوکر ہلاک ہوگیا۔ اسے انڈیا کے شہر کوچی میں واقع سینٹ فرانسز چرچ میں دفن کیا گیا۔ بعد میں، یعنی 1539ء میں اس کی قبر سے اس کی باقیات کو سمیٹ کر ہیرے جواہرات سے مزین ایک بکس میں پرتگال پہنچایا گیا۔ جہاں اسے لسبن میں دفن کردیا گیا۔ اب اس کی قبر پر بڑا سا مقبرہ بنا ہوا ہے۔

واسکوڈی گاما کی بیوی کا نام کترینہ تھا اور اس کے چھ بیٹے، ایک بیٹی تھی۔ اس کا ایک بیٹا اسٹیو انڈیا کا گیارھواں گورنر بنا (1540ء تا 1542ء) ایک بیٹا ''اول وارو'' ملاکا (ملایا) کا کیپٹن بھی بنا۔ یاد رہے ملاکا (ملایا) پر پہلے پرتگالیوں کا قبضہ تھا۔ اس کے بعد ڈچ آئے۔ پھر یہ سرزمین انگریزوں کے قبضے میں چلی گی۔

یہ حقیقت ہے کہ پرتگال کو طاقتور اور امیر بنانے میں واسکوڈی گاما کا اہم کردار رہا ہے۔ یہی سبب ہے کہ پرتگالی اسے اپنا ہیرو مانتے ہیں۔ انڈیا کی ریاست گوا کو تقسیم تک پرتگال کا حصہ تصور کیا جاتا تھا۔ آج بھی اس کی ایک بندرگاہ کا نام ''واسکوڈی گاما'' ہے۔ چاند پر موجود ایک گڑھے کو بھی اسی نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ برازیل میں تین فٹ بال کلب ایسے ہیں جن کے نام ''واسکوڈی گاما کلب'' ہیں۔ جنوبی ہندوستان کے صوبے کیرالا میں واقع شہر کوچی میں ایک کلیسا گھر ہے جو اسی پرتگالی ''ہیرو'' کے نام پر ہے۔ کیپ ٹاؤن شہر کے ایک مضافاتی علاقے کا نام بھی واسکوڈی گاما ہے۔ پرتگال کے دارالحکومت لسبن میں ایسی کئی سڑکیں اور چوراہے ہیں جن کو اس نیوی گیٹر کا نام دیا گیا ہے...... ان کے علاوہ اسی شہر میں ایک پل اور ایک ٹاور نما بلڈنگ کا نام بھی واسکوڈی گاما کے نام پر ہے۔

*

سمندر کے مکیں

مختار آزاد

انسان ازل سے خشکی پر بسیرا کرنا پسند کرتاہے۔ مگر یہ دنیا کی واحد قوم ہے جو خشکی کی بجائے بہتے پانی پر رہنا پسند کرتی ہے۔ ان کے بچے بہتے دریا پر پیدا ہوتے ہیں۔ وہیں پروان چڑھتے ہیں اور پیرگی پر پہنچ کرموت کی گود میں جاسوتے ہیں۔ مقامی حکومتیں انہیں خشکی پرلانے کی کوشش کرتی رہتی ہیں مگر انہیں سمندر سے پیار ہے۔

بہتے پانی پر زندگی بسر کرنا اچھا لگتا ہے

وہ پہلے تو ایک چھوٹے سے نقطے کے مانند نظر آئی۔ کچھ دیر بعد لگا کہ ایک نہیں کئی نکتے آگے بڑھ رہے ہیں۔ تھوڑی دیر اور گزری تو صاف نظر آرہا تھا کہ وہ ایک سے زائد نقطے ہیں۔ نیلے سمندر پر نیلا آسمان اور اُس پر بھرپور روشن نارنجی سورج...... ایسے میں ہاتھ سے بنی 'کینگ' سمندر کی لہروں پر ڈولتی آگے بڑھتی صاف نظر آرہی تھی۔ اُن پر موکن سوار تھے۔ مجھے اُن ہی کا انتظار تھا۔

'کینگ' ہاتھ سے بنی چھوٹی سی کشتی ہے۔ سمندری خانہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

بدوشوں موکن کی زندگی میں اس کا وہی مقام ہے جو ہم جیسے باشندوں کے لیے دُکان اور گھر کا ہوتا ہے۔ کبنگ اُن بحری خانہ بدوشوں کی زندگی کا مرکز ہے اور سمندر اُن کے معاش کا محور...... کل کے برما اور آج کے میانمار میں کشتی پہ رہنے اور کھلے سمندر میں بسنے والے ان لوگوں کی سرزمین صرف سمندر ہے۔ جنم سے لے کر موت تک، بس وہ سمندر کے اور سمندر اُن کا ہے۔ موکن خانہ بدوش جن کے قافلے اونٹوں پر نہیں کشتیوں کی صورت ایک جگہ سے دوسری جگہ تک سمندر کے سینے پر تیرتے رہتے ہیں مگر اب اُن کی زندگی سمندر کی طوفانی موجوں سے نہیں بقا کے اہم سوال سے اُلجھ رہی ہے۔

ہم ساحل پر کھڑے تھے اور سامنے سے آنے والی کبنگ ہماری طرف بڑھ رہی تھی۔ ہم اُن سے ملنے اور باتیں کرنے آئے تھے۔ آہستہ آہستہ وہ ساحل کے قریب تر آتے جارہے تھے۔ کبنگ اُن کی پہچان ہے اور اُن کا ڈیزائن بھی بہت منفرد۔ انہیں دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے کہہ رہے ہوں 'ہم اپنی مثال آپ ہیں'۔

وہ کئی کبنگ تھیں۔ جب وہ ساحل پر پہنچ کر تھم گئیں تو میں ایک کی طرف بڑھا۔ اُن کی بولی میں خیریت دریافت کی اور پھر سلام دعا کے بعد اُس پر سوار ہوگیا۔ ایک جست میں، مَیں ایک دنیا سے دوسری دنیا میں پہنچ گیا تھا۔ ساحل سے میری دنیا شروع ہوتی تھی اور کبنگ پر سوار ہو کر میں دوسری دنیا میں تھا۔ دوسری دنیا، جو ساحل سے شروع ہو کر بحرِ بیکراں کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ ایک دنیا سے دوسری دنیا تک کا یہ فاصلہ صرف ایک قدم اٹھاتے ہی طے ہوگیا۔ اب میں سمندر والے موکن کی دنیا میں تھا۔ مجھے اُن کی دنیا دیکھنے کا شوق یہاں لایا تھا۔ اب میں اُن کے درمیان تھا۔ اُن سے باتیں کرنا چاہتا تھا، اُن کا احوال معلوم کرنا چاہتا تھا، اُن کی زندگی کے دکھ سکھ اُن کی زبان سے سننا چاہتا تھا۔ میرے لیے تو وہ لوگ واقعی بہت دلچسپ، انوکھے اور افسانوی تھے...... سمندر کے خانہ بدوش۔

موکن دنیا کی قدیم ترین خانہ بدوش تہذیبوں میں سے ایک کے وارث ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ آسٹرونیشین Austronesian نسل کے ان لوگوں نے تقریباً چار ہزار سال قبل جنوبی چین سے ہجرت کی تھی۔ وہ کئی صدیوں تک گھومتے گھامتے رہے اور پھر ملائیشیا آن پہنچے۔ اتفاق کہیں، بدقسمتی یا باہمی اختلاف...... سترھویں صدی عیسوی میں موکن باشندے ملائشیا میں دوسرے خانہ بدوش گروہوں سے علیحدہ ہوگئے۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں کو الوداع کہا اور مزید سفر کے لیے اپنا رخ بدل لیا۔ اب وہ صدیوں سے سمندر میں رہتے ہیں۔ ان کا گھر میانمار کی بحری سرحد سے متصل انڈمان میں واقع مرگوئی آرچی پلاگو کے جزائر ہیں۔ ڈھائی سو بحری میل کے دائرے میں واقع آٹھ سو کے قریب ان چھوٹے بڑے جزائر پر کئی صدیوں تک موکن باشندوں کا راج رہا مگر اب صورتِ حال ذرا مختلف ہے۔

موکن خانہ بدوش دو تین دہائیوں تک بحری قزاقی بھی کرتے رہے۔ میانمار کی حکومت ان کی مجرمانہ کارروائیوں سے بہت پریشان تھی۔ آخر فوجی آمروں نے اُن کے میانمار کے بحری حدود ہونے میں داخل ہونے پر پابندی لگادی۔ اب وہ صرف خصوصی اجازت نامہ حاصل کرنے کے بعد ہی کام کاج کے لیے میانمار میں داخل ہوسکتے ہیں۔

ایک طرح سے تو میں خود بھی بحری خانہ بدوش ہوں۔ مدتوں سمندر پر کشتی رانی کرتا رہا۔ کئی برس کشتی میں بیٹھ کر، سمندری موجوں پر ڈولتا ہوا موکن خانہ بدوشوں کا پیچھا بھی کیا مگر اب میں جہازی نہیں محقق ہوں۔ اس بار میری تحقیق کا موضوع موکن ہیں۔ میرے لیے اُن کی زندگی ہمیشہ سے پُراسرار رہی تھی۔ مجھے اُن کے لوک قصے سننے کا بہت شوق تھا۔ میرا تجسس اب ختم ہونے والا تھا۔ میں موکن کی دنیا میں پہنچ چکا تھا۔ اب اُن کی ثقافتی اور لوک زندگی کے سربستہ راز، بدلتے وقت میں اُن پر ڈھائے گئے ستم...... سب کچھ مجھ پر طشت اَز بام ہونے والے تھے۔

گت چا ایک معمر موکن ہے۔ میں اُس کی اجازت سے ہی اس کی ذاتی کبنگ میں داخل ہوا تھا۔ ''میں تم لوگوں کے ساتھ کچھ عرصہ گزارنا چاہتا ہوں، تمہاری زندگی کے معمولات کا بغور مشاہدہ کرنا چاہتا ہوں۔ دُکھ سکھ بانٹنے کا جذبہ لے کر آیا ہوں۔'' میں نے رسمی بات چیت کے بعد گت چا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ وہ بہت غور سے میری باتیں سن رہا تھا۔

سمندر، موکن اور میری ایک طویل تاریخ ہے۔ میرے والد پیرے آئیوانوف بحری جہاز راں تھے۔ ہم روسی ہیں مگر میرے والد کی زندگی کا ایک بڑا حصہ برما میں گزرا تھا۔ انہوں نے موکن کے ساتھ 1957ء میں کام کرنا شروع کیا تھا۔ وہ ماہی گیری میں اُن سے مدد لیتے تھے۔ اُن کی موت کے کئی برس بعد 1982ء میں، مَیں نے اس ٹوٹے رشتے کو دوبارہ جوڑا۔ میں نے گت چا کو ابھی پوری تاریخ تفصیل سے سنائی۔ ''میں تم لوگوں کا دوست ہوں، تمہارے ساتھ کچھ دن گزارنے آیا ہوں، ایک مہمان کی طرح۔ آپ مجھ پر بھروسا کرسکتے ہیں۔'' یہ سن کر وہ سوچ میں پڑ گیا۔ شاید وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ مجھے اپنے ساتھ عارضی طور پر رہنے کی اجازت دے یا انکار کردے۔ میانمار کے زمینی باشندوں نے اُن پر کبھی اعتبار نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ انہیں بُرے القابات سے نوازتے رہے ہیں۔ زمین پر آباد میرے جیسے لوگ خود کو ان بحری خانہ بدوشوں سے زیادہ قابلِ بھروسا اور لائقِ احترام سمجھتے ہیں مگر اُس وقت زمین پر رہنے والا ایک پڑھا لکھا شخص ایک ناخواندہ موکن کے ساتھ رہنے کے لیے وضاحتیں دے رہا تھا مگر وہ سوچ میں گم تھا۔ اُس وقت مجھے احساس ہوا کہ ضروری نہیں کہ دوطرفہ باہمی تعلقات میں کسی فریق کی اپنے متعلق رائے دوسرے فریق کے لیے بھی ویسی ہی قابلِ بھروسا ہو۔ سب کے لیے ناقابلِ بھروسا ٹھہرنے والا موکن مجھے قابلِ بھروسا سمجھنے کے لیے اپنے تجربے، ذہانت اور عقل کے مطابق رائے قائم کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ ''مجھے یقین ہے کہ آپ لوگ مجھے اپنا بہترین دوست پاؤ گے۔'' اُسے سوچ میں گم دیکھ کر میں نے امید بھرے لہجے میں اُسے ایک بار پھر یقین دلانے کی کوشش کی۔

میری یقین دہانی سُن کر وہ چند لمحے تک مجھے غور سے دیکھتا رہا اور پھر بیٹھے بیٹھے مڑا۔ پلٹا تو اس کے داہنے ہاتھ میں ایک پلیٹ تھی، جس میں کچھ ثابت اور کچھ کٹی ہوئی چھالیا تھی۔ اس نے وہ پلیٹ میری طرف بڑھائی اور مسکرادیا۔ میں نے پلیٹ سے چھالیا کے کچھ دانے لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور جواباً مسکرادیا۔ میں خاموش تھا۔ نظروں میں اُن کی اجازت پر تشکر کا اظہار تھا۔ گت چا نے مجھے چھالیا کی پلیٹ پیش کی تھی۔ میں اُن کی ثقافت سے شُدبُد رکھتا تھا۔ سمجھ گیا کہ انہوں نے میری درخواست قبول کرلی ہے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ بطور مہمان رکھنے پر رضامند ہوگئے تھے۔ یہ موکن کی قدیم روایت ہے۔ وہ جسے اپنا مہمان بناتے ہیں، سب سے پہلے اسے چھالیا پیش کرتے ہیں۔

''موکن سمندر کی چھاتی پر کبنگ میں پیدا ہوتے ہیں۔'' میں کئی روز سے اُن کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا۔ اُس روز گت چا موکن باشندوں کے متعلق بتا رہا تھا۔ حدِ نظر تک نیلا سمندر اور اوپر اَبر آلود آسمان سایہ فگن تھا۔ وہ اپنی دیومالائی تاریخ سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔ اُس روز کبنگ میں صرف ہم دونوں سوار تھے اور وہ پانی پہ ٹھہری ہوئی تھی۔ ہوا کے سرسراتے جھونکوں کی موسیقی میں ہلکی ہلکی لہروں کی سنگت بھی شامل تھی۔ کبھی کبھار سمندر کی خاص دھاڑ بھی سنائی دیتی تھی۔

''ہمارے بچوں کے لیے سمندر ہی سب کچھ ہے۔'' گت چا موکن باشندوں کے متعلق بتا رہا تھا۔ ''کبنگ میں پیدا ہونے والے ہمارے بچے سمندر میں تیرتے تیرتے جوان ہوتے ہیں۔ اسی لہروں پر کشتیاں کھیتے ہیں اور پھر اُنہی کشتیوں میں ان کے جوڑے بن جاتے ہیں۔ شادی کے بعد اُن کی زندگی ایک اور کشتی میں منتقل ہوجاتی ہے۔ سمندر اور موکن ایک دوسرے کے لیے تھے، ہیں اور رہیں گے۔'' گت چا نے جذباتی لہجے میں کہا۔ میں نے ہاں میں سر ہلادیا۔

'تم دھرتی والوں کے بچے پیدا ہوتے ہیں تو ان کی آنول نال کاٹ کر زمین میں دبادیتے ہونا'' اُس نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں...... ایسا ہی ہوتا ہے۔'' میں نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔

''جب ہمارے نومولود کی آنول نال کٹتی ہے تو ہم اُسے سمندر میں پھینک دیتے ہیں۔ یوں سمندر اور ہمارا بہت ہی مضبوط رشتہ ہے۔'' یہ کہہ کر گت چا نے پانی میں ہاتھ ڈال کر چپو کی طرح چلایا۔ ''یہ آنول نال کا رشتہ ہے بالکل ماں کی طرح۔ آنول نال ماں کے پیٹ میں ہمیں خوراک دے کر پالتی ہے۔ سمندر بھی بالکل ماں کی طرح ہمیں خوراک دیتا ہے، زندہ رکھتا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ کچھ دیر کے لیے رکا اور میری طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''تمہاری آنول نال زمین میں دفن ہے۔ اس لیے تم زمین چھوڑ نہیں سکتے۔ ہماری آنول نال سمندر میں بہتی ہے اسی لیے ہم سمندر کی لہروں پہ، کبنگ میں بیٹھ کر ڈولنا نہیں چھوڑ سکتے۔ یہ آنول نال کا رشتہ ہے۔''

سال کے بارہ میں سے نو مہینے وہ کبنگ پر گزارتے ہیں اور صرف مون سون اور اُس کے بعد کے کُل تین ماہ خشکی پر بسر کرنے کے لیے آرچی پلاگو جزائر کا رُخ کرتے ہیں۔ کبنگ بذاتِ خود بہت دلچسپ کشتی ہے۔ اُس کی بناوٹ بہت منفرد ہے۔ کہتے ہیں کہ کبنگ اُن کی پہچان ہے اور موکن اپنے ہاتھوں سے یہ خاص کشتیاں تیار کرتے ہیں۔ گرمیوں کے وہ تین مہینے جب موکن جزیروں پر قیام کرتے

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہیں، اُس دوران وہ نئی کبنگ بناتے ہیں اور پرانی کبنگ کی مرمت کرتے ہیں۔ ہر کبنگ پر ایک خاندان رہتا ہے۔ کبنگ کی بناوٹ ایسی ہوتی ہے کہ پانی اس کی اونچائی سے بہت کم فاصلے پر ہوتا ہے۔ ہر خاندان کی ایک سے زیادہ کبنگ ہوتی ہیں۔

کبنگ کی ہئیت موکن کی ذہنی اختراع نہیں۔ وہ اس بناوٹ کو ایک بددعا قرار دیتے ہیں اور کشتی پر بسیرے کو اپنی سزا، جسے وہ صدیوں سے کاٹ رہے ہیں۔ سزا کا سفر اتنا طویل ہے کہ قیدی خود اُس کا عادی ہو چکا ہے۔

موکن لوک کتھا کے مطابق اُن کے اجداد ملایا کے بہت سارے جزیروں میں سے ایک بہت بڑے جزیرے پر رہتے تھے۔ وہاں جزیروں کا راجا اور رانی بھی رہتے تھے۔ اُس راجا کا نام گمن اور رانی کا نام سیبان تھا۔ وہ بڑی خوش، خرم زندگی گزار رہے تھے۔ راجا بہت عیش پرست تھا۔ اس کے برعکس رانی بہت رحمدل اور نیک تھی۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ملایا کے ایک دور دراز جزیرے پر رہنے والی سیبان کی کم عمر بہن اُس سے ملنے کے لیے آئی۔ رانی کی بہن بہت خوبصورت تھی۔ اس کا حُسن آنکھوں کو خیرہ کر ڈالتا تھا۔ سیبان کو اپنے شوہر کی عیش پرستی کا علم تھا۔ وہ اسے بہت منع کرتی تھی مگر پھر بھی وہ اپنی روش پر قائم تھا۔ جب رانی کی بہن اُس سے ملنے پہنچی تو اُس نے اپنے شوہر کو بہن کی آمد کی ہوا بھی نہ لگنے دی۔ وہ اسے نہایت خفیہ طور پر اپنے محل میں رکھے ہوئے تھی۔ سیبان جانتی تھی کہ اگر اُس کے شوہر کی بہن پر نظر پڑ گئی تو اس کی ہوس پرست فطرت جاگ اٹھے گی۔ وہ اپنی بہن کو بچانا بھی چاہتی تھی اور یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ وہ اُس کے گھر سے چلی جائے۔ جب سے بہن آئی تھی، تب سے وہ ہر وقت پریشان رہتی تھی۔ وہ ہر قیمت پر اپنی بہن کی عزت بچانا چاہتی تھی۔

رانی سیبان نے کچھ عرصے تک نہایت کامیابی سے اپنی بہن کو شوہر کی نظروں سے دور رکھا مگر کب تک، آخر ایک دن اتفاق سے راجا گمن نے اُسے دیکھ ہی لیا۔ جب سے اس نے اپنی خوبرو سالی کو دیکھا تھا، تب سے اس کا مزاج ہی بدلا بدلا تھا۔ وہ ہر وقت محل میں اِدھر سے اُدھر چکر لگاتا رہتا تھا۔ وہ بہت بے چین تھا۔ ہر قیمت پر حسین سالی کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانا چاہتا تھا مگر اسے اپنے ناپاک عزائم پر عمل کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ کئی روز گزر گئے مگر اس کی خواہش بدستور تشنہ تھی۔ یہ بات اس کو چڑچڑا بنا رہی تھی۔ زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ جو لڑکی اسے پسند آئی، اب تک اُس کی پہنچ سے دور تھی۔

دوسری طرف رانی سیبان بدستور بہن کی نگرانی کر رہی تھی۔ اُس کی بہن بہت معصوم تھی۔ اسے تو اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس کی بہن اور بہنوئی کس کشمکش سے دوچار ہیں۔ وہ خود حیران تھی کہ اتنے روز گزر چکے تھے مگر اس نے ایک بار بھی اپنے راجا بہنوئی کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ اتنی معصوم تھی کہ کئی بار سوچا کہ بہن سے پوچھ لے مگر وہ ہر بار یہ بات بھول جاتی تھی۔

رانی اپنی بہن کے ساتھ سائے کی طرح لگی رہتی تھی مگر کب تک۔ اتفاق سے ایک دن وہ بیمار ہو گئی۔ اسے سخت بخار تھا۔ وہ غنودگی میں تھی۔ طبیب نے دوا دے کر آرام کرنے کو کہا تھا۔ وہ لیٹی ہوئی تھی۔ غنودگی کی کیفیت میں وہ یہ بھی بھول گئی کہ دن چڑھ چکا ہے اور اس کا عیاش شوہر اور معصوم بہن، دونوں محل میں موجود ہیں۔

اُس کی آنکھ کھلی تو سہ پہر کا وقت تھا۔ اس کی طبیعت کافی بہتر تھی۔ وہ انگڑائی لے کر اٹھی۔ خدمت گار کنیزوں نے اس کے سامنے کھانے پینے کی چیزیں رکھیں۔ اُسے بھوک لگ رہی تھی۔ جیسے ہی اس نے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھایا، اسے اپنی بہن کا خیال آیا۔ وہ تیزی سے اٹھی اور اُس کمرے کی طرف بڑھی جہاں اس نے بہن کو ٹھہرایا ہوا تھا مگر وہ وہاں نہیں تھی۔ بہن کو نہ پا کر اُس پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ اُس کا دل انجان وسوسوں اور اندیشوں سے لرزنے لگا۔ اسے بہت ڈر لگ رہا تھا۔ وہ بے تابی سے پورے محل میں بہن کو تلاش کر رہی تھی، آخر وہ اُسے مل ہی گئی۔

وہ راجا گمن کا خاص کمرا تھا۔ اُس وقت بادشاہ کمرے میں اپنے بستر پر اوندھا لیٹا تھا۔ سامنے فرش پر چادر لپیٹے اُس کی بہن بیٹھی رو رہی تھی۔ سیبان نے شوہر کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو وہ ڈھٹائی سے مسکرا دیا۔ سیبان سمجھ گئی کہ اُس کی معصوم بہن کے ساتھ کیا کچھ ہو چکا ہے۔ اُس وقت خود رانی کی حالت بھی غیر ہو رہی تھی۔

”جو تم نے کیا ہے، اب اس کی سزا بھگتو گے۔“ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد رانی نے شوہر کی طرف دیکھ کر بھرائی آواز میں کہا۔ اس کی بہن سب سے لاتعلق، چادر میں لپٹی بدستور روئے جا رہی تھی۔ نیک دل رانی نے شوہر کو گہری نظر سے دیکھا، پھر بہن کی طرف چہرہ کیا اور پھر چھت کی طرف دیکھتے ہوئے دعا مانگی!

”اے میرے سمندر کے دیوتا میں اپنے شوہر راجا گمن کو بددعا دیتی ہوں، تو اُسے عبرت کی مثال بنا دے۔ جب تک دنیا رہے اس کا منہ ہوس سے کھلا رہا ہے اور اس کے جسم کا نچلا دھڑ لوگوں کے لیے مذاق بن جائے۔ جب تک دنیا رہے یہ پیٹ کے بل سمندر پر تیرتا رہے اور لوگ اس کی پیٹھ پر ہمیشہ سواری کرتے رہیں۔ اس کے وجود پر سال کے نو مہینے لوگ بیٹھے رہیں، بعین اُسی طرح جیسے کہ اب نو ماہ تک میری معصوم بہن اس کے گناہ کا پھل اپنی کوکھ میں پالے گی۔ اس کے وجود کو بخشی گئی بدنامی کا پہاڑ اٹھا کر وہ چلیں گے۔ اس بدکردار شخص کے گناہ سے بڑھا پیٹ لے کر وہ لوگوں کے تمسخر کا نشانہ بنے گی۔“

رانی سیبان راجا کو بددعا دے رہی تھی مگر وہ مسکرا رہا تھا۔ اچانک راجا کو احساس ہوا کہ جیسے اس کا جسم سُن ہو رہا ہو۔ وہ اوندھے منہ بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اس نے کروٹ لینا چاہی مگر لے نہ سکا۔ اس نے تکیے پر سے منہ اٹھایا۔ اس کے جسم کا اوپری حصہ سینے تک اوپر تک اٹھ گیا۔ اس نے ٹانگیں اٹھانا شروع کیں۔ دونوں ٹانگیں ایک دوسرے سے کچھ دور ہوئیں اور گھٹنے سے مڑ گئیں۔ اب اس کی حالت یہ تھی کہ وہ بستر پر اوندھا تھا۔ اس کے جسم کا بالائی حصہ سینے تک اوپر اٹھا ہوا تھا۔ پیچھے دونوں ٹانگیں مڑی ہوئی اور اوپر کو اُٹھی ہوئی تھیں۔ تکلیف کی شدت کے باعث اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر نہ تو کچھ بول سکا اور نہ ہی کھلا منہ بند کر سکا۔ اس کا منہ ایسے کھلا ہوا تھا جیسے کئی روز کا بھوکا روٹی کو دیکھ کر بے تابی سے منہ کھولتا ہے۔ دیکھتے دیکھتے اُس کا جسم بالکل ہی سُن ہو کر رہ گیا۔ اب راجا کی ہئیت بڑی ہی مضحکہ خیز تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس طرح اکڑ گیا تھا کہ جیسے کوئی چھوٹی سی کشتی ہو۔ رانی سیبان بھی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

رانی سیبان نے جزیرے کے موکن ملاحوں کو بلایا اور حکم دیا۔ ”یہ کشتی اب تمہاری پہچان ہے۔ تم سال کے نو مہینے اس پر سوار رہو گے۔“

موکن ملاحوں کے لیے رانی کے حکم پر عمل سے انکار ممکن نہیں تھا۔ انہوں نے کشتی اٹھائی اور چلے آئے۔ اُس دن سے اب تک وہ رانی کے حکم پر نو ماہ کشتی پر گزارتے ہیں اور تین ماہ خشکی پر۔

موکن باشندوں کی کم اونچائی والی کبانگ دیکھو تو یہی لگتا ہے کہ جیسے کوئی بھوکا شخص منہ کھولے پیٹ کے بل تیرتے ہوئے آگے بڑھ رہا ہو۔ کبانگ کا عقبی حصہ بالکل ایسا دکھائی دیتا ہے کہ جیسے کسی شخص نے تیرتے ہوئے دونوں پچھلی ٹانگیں گھٹنوں تک اُلٹی موڑ رکھی ہوں۔

بس...... وہ دن گیا، آج کا دن آیا۔ موکن کی کبنگ اسی انداز میں بنائی اور استعمال کی جا رہی ہے۔ اپنی مخصوص ہئیت کی بنا پر یہ چھوٹی سی کشتی نہایت منفرد نظر آتی ہے۔

یہ دیومالائی داستان اُس روز مجھے گت چا نے سنائی تھی۔ میں مبہوت بیٹھا اُس کا قصہ سُن رہا تھا۔

”یہ رانی سیبان کا ہمیں حکم تھا کہ سال کے نو مہینے کبنگ پر سوار رہیں۔“ قصہ ختم ہونے کے بعد اُس نے کہا۔ ”اب تم بتاؤ، ہم کیسے سال کے بارہ مہینے زمین پر رہ سکتے ہیں۔“

مجھے کبنگ کی اس دیومالائی داستان نے بہت متاثر کیا تھا مگر ایک بات سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ معصوم لڑکی سے عیاش راجا کی زیادتی کی سزا کسے ملی؟ راجا کو، جس کی شکل پر اب کبنگ ہے یا پھر موکن لوگوں کو جو سال کے نو مہینے سمندر کی اونچی نیچی لہروں پر ڈولتی اس نچلی سطح والی کشتی میں ولادت سے موت تک کے تمام کام کاج نمٹاتے ہیں۔

میں چاہتا تو اپنی رائے کا اظہار کر سکتا تھا مگر دیومالائی داستان کا تجزیہ سائنسی بنیاد پر نہیں، جذبات کی کسوٹی پر کیا جاتا ہے۔ موکن کے جذبات، رانی سیبان اور اُس کا حکم......

میں نے گت چا کی طرف دیکھا۔ یہ داستان سنانے کے بعد اس کے چہرے پر سکون اور آنکھوں میں محبت کے جذبات تھے شاید رانی سیبان کے لیے...... مجھے گت چا کی صورت میں یہ دیومالائی داستان جیتی جاگتی نظر آ رہی تھی۔ مجھے نہیں لگتا کہ جو دیومالائی قصہ صدیاں گزر جانے کے باوجود اب تک زندہ ہے، اُسے اکیسویں صدی کی جدید سائنسی ترقی کچھ بدل پائے گی۔ مجھے امید تھی کہ یہ داستان اور موکن دونوں زندہ رہیں گے۔ ممکن ہے کہ آنے والی کئی صدیوں بعد کوئی اور گت چا زمین پر رہنے والے کسی مجھ جیسے تجسس پسند بوڑھے کو اپنی یہ لوک داستان سنا رہا ہو۔ ”کاش ایسا ہی ہو۔“ میں نے خود کلامی کی۔ گت چا نے میری طرف حیرت سے دیکھا۔ شاید وہ سمجھ گیا یا شاید کچھ بھی سمجھ نہیں پایا تھا۔

موکن باشندوں کی تمام تر روز مرہ کی معاشی اور خوراک کی ضروریات سمندر پورا کرتا ہے۔ اُنہیں جو کچھ چاہیے، وہ اُنہیں بخش دیتا ہے۔ ان کی غذا کا بڑا حصہ سمندری خوراک پر مشتمل ہے، جس سے اُن کی صحت بھی قابلِ رشک رہتی ہے۔ وہ سمندر سے نہ صرف اپنے لیے

WWW.PAKSOCIETY.COM

خوراک حاصل کرتے ہیں بلکہ وہ سب کچھ بھی انہیں سمندر کی مدد سے ہی ملتا ہے، جس کے لیے نقد روپے کی ضرورت پڑتی ہے، مثلاً کپڑے، جوتے، نمک، تیل، چاول، آٹا وغیرہ۔

موکن، مچھلیاں، جھینگے، کیکڑے، کچھوے اور اسی طرح کی کچھ اور قیمتی سمندری خوراک اپنے جال کے ذریعے پکڑتے ہیں اور پھر انہیں سمندر میں ہی گھوم پھر کر دوسرے کشتی والوں کو فروخت کر دیتے ہیں۔ ان کے زیادہ تر گاہک ملائی اور چینی ماہی گیر ہوتے ہیں۔ وہ زیادہ تر چیزیں نقد رقم کے عوض فروخت کرتے ہیں مگر اکثر وہ شے کے بدلے شے بھی لے لیتے ہیں۔

''یوں ہماری تمام تر ضروریات تو پوری ہو جاتی ہیں مگر ایک شکایت ہے۔'' اُس روز وہ دو پیسے کمانے کا راز بتا رہا تھا۔ ''اکثر گاہک ہمیں بے وقوف سمجھتے ہیں اور بہت ہی کم دام ادا کرنے پر اصرار کرتے ہیں۔ سچ ہے یہ زمین پر رہنے والے بہت چالاک ہوتے ہیں۔'' گت چا بھی ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ وہ لوگ صرف مون سون کے موسم میں ہی زمین پر آکر قدم رکھتے ہیں وہ بھی اپنے سنسان جزیروں پر۔ ورنہ زمین والوں سے ان پانی والوں کا کیا کام؟

موکن تعلیم کے بجائے سینہ بہ سینہ چلنے والے علوم پر انحصار کرتے ہیں۔ ان کے ہاں جدید معیار کے مطابق خواندگی کی شرح صفر ہے۔ ان کے ہاں بزرگوں سے منتقل ہونے والا قدیم علم indiginous knowledge ہی سب کچھ ہے۔ وہ اپنی کشتی اپنے ہاتھوں سے بناتے ہیں۔ جال خود بُنتے ہیں، اس کی مرمت بھی وہی کرتے ہیں۔ اُن کے جال اب تک صدیوں پرانے اصول پر تیار ہوتے ہیں۔ ان کے سوراخوں میں اتنا فاصلہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی چھوٹی مچھلی پھنس جائے تو خود ہی نکل جائے۔ اس لحاظ سے وہ پیشہ ور ماہی گیروں سے بہت مختلف ہیں۔

پیشہ ور ماہی گیر نائیلون سے بنے اتنے چھوٹے سوراخوں والے جال استعمال کرتے ہیں کہ نہایت چھوٹی چھوٹی مچھلیاں تک اُن میں پھنس جاتی ہیں اور پھر جب وہ سرد خانے میں جمع کی گئی مچھلیاں چھنتے ہیں تو چھوٹے سائز کی بے شمار مگر مُردہ مچھلیاں واپس سمندر میں اس لیے پھینک دیتے ہیں کہ مچھلی منڈی میں اُن کا کوئی خاص مول نہیں ملتا مگر ان کے برعکس موکن بہت ماحول دوست ہیں۔ وہ سمندر سے جہاں سب کچھ حاصل کرتے ہیں، وہیں اُس کی صحت کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ ان کے جال میں چھوٹی مچھلی تب تک نہیں پھنستی جب تک وہ بڑی نہ ہو جائے۔ جب اُن کے جال سمندر سے نکلتے ہیں تو صرف بڑی مچھلیوں کے ساتھ، جنہیں چھانٹی کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

''یہ سب ہمارے بزرگوں کا علم ہے۔'' اُس روز گت چا موکن لوگوں کی ماہی گیری کے حوالے سے مجھے بتا رہا تھا۔ ''ہمارے بزرگ کہتے تھے کہ مون سون اور گرمیوں کے تین مہینے مچھلیوں کی افزائش کے ہوتے ہیں۔ اس دوران ہم ماہی گیری نہیں کرتے بلکہ صرف اتنی مچھلی ہی پکڑتے ہیں جو کھا سکیں۔ وہ بھی کبھی کبھار۔ ورنہ ہم پس انداز چیزوں پر بھروسا کرتے ہیں۔ ہم ان تین مہینوں سے پہلے ہی ضرورت کے مطابق مچھلیاں سکھا کر رکھتے ہیں۔ کچھ پیسے بھی بچا کر رکھتے ہیں۔ اگر ہم ایسا کرنا چھوڑ دیں تو ہمارے سمندر کو تکلیف ہوگی۔'' یہ کہہ کر وہ میری طرف خاموش نظروں سے دیکھنے لگا۔

''سمندر موکن کا بہت پرانا دوست ہے۔'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے کہنا شروع کیا۔ ''وہ دوست جب ہمارا اتنا خیال رکھتا ہے تو کیا سال کے صرف تین مہینے ہم اُس کا خیال نہیں رکھ سکتے؟'' اس کا لہجہ سوالیہ تھا۔

گت چا اپنے اجداد کے علم کی بنیاد پر اتنی بڑی بات کہہ گیا جو آج دنیا بھر کے بہت زیادہ پڑھے ماہرین آبی حیات و ماحولیات دنیا بھر کے مہذب اور پڑھے لکھے لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں مگر...... اب تک دنیا کے مختلف ممالک میں ایسے خطرناک جال ماہی گیری کے لیے استعمال ہو رہے ہیں جو مچھلیوں اور سمندری حیات کی نسل کشی کے مترادف سمجھے جاتے ہیں۔ وہ جال جنہیں ہندوستان اور پاکستان سمیت دنیا کے اکثر ممالک میں ممنوعہ قرار دیا جا چکا ہے۔ تجارتی بنیادوں پر فشنگ ٹرالر اُن ایام میں بھی ماہی گیری کرتے ہیں جو سمندری حیات کی افزائش نو کا موسم ہوتا ہے۔ اُس روز میں سوچ رہا تھا کہ زمین والوں کے نکتۂ نظر سے دیکھوں تو موکن ناخواندہ ہیں مگر کیا ایسا ہی ہے۔ گت چا اور موکن، اپنے اجداد کے سینہ بہ سینہ چلنے والے علم کی بنیاد پر مجھے بڑے بڑے ماہرین سے زیادہ باشعور نظر آئے۔

گت چا کا پورا خاندان کئی کبنگ پر رہائش پذیر ہے۔ جب سے میں آیا ہوں، تب سے انہوں نے ایک کبنگ صرف میرے لیے مخصوص کر دی تھی۔ اُس دن گت چا اپنی کبنگ سے چھلانگ مار کر میری کشتی پر آ بیٹھا۔ ہم جزیروں کی سیر کو جانے والے تھے۔ اس نے کبنگ پر لگا انجن اسٹارٹ کیا۔ اس کے گھر والے ہاتھ ہلا ہلا کر ہمیں خدا حافظ کہنے لگے مگر اُس کا جوان بیٹا کپت چپ چاپ اپنی کبنگ کے سرے پر بیٹھا روایتی چلم سے تمباکو کے کش لیتا رہا۔ وہ بالکل خاموش اور سب سے لاتعلق اپنے شغل میں مصروف تھا۔ کپت، گت چا کے سات بیٹے بیٹیوں میں سے ایک ہے۔

گت چا کو اپنے بچوں سے بہت پیار ہے۔ وہ اپنی بیوی سے بھی بہت محبت کرتا ہے۔ وہ اکثر کپت، اپنے ایک اور بیٹے جیل اور لاولد بیوہ بیٹی آئی فم کے ساتھ سفر کرتا ہے۔ بیوہ ہونے کے بعد وہ مرحوم شوہر کی کبنگ چھوڑ کر واپس ماں باپ کے پاس چلی آئی تھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ اس کا بیٹا جیل بہترین ماہی گیر، تیراک اور غوطہ خور تھا۔ بہن ماہی گیری میں ہمیشہ اس کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ ویسے میرا مشاہدہ رہا تھا کہ جیل بہت محنتی نوجوان تھا۔

گت چا کا خاندان بھی دوسرے موکن لوگوں کی طرح کا ہی ہے۔ وہ سب ایک جیسی زندگی بِتاتے ہیں۔ اُن کی ضروریات، رہن سہن حتیٰ کہ خدشات تک ایک جیسے ہی ہیں۔

موکن باشندوں نے ماہی گیری کے لیے بحرِ بیکراں کو متعدد ٹکڑوں میں بانٹا ہوا ہے۔ ایک خاندان تقریباً سات کبنگ پر محیط ہوتا ہے۔ ہر خاندان کا حصہ بٹا ہوا ہے۔ اگر کبھی کوئی ایک خاندان دوسرے کے پانیوں پر چلا جائے تو انہیں خطرہ محسوس ہوتا ہے لیکن یہ خطرہ اتنا بڑا نہیں ہوتا کہ وہ اس بنا پر مہذب دنیا کے باشندوں کی طرح مسلح تصادم پر اُتر آئیں اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جائیں۔ بس ایک خدشہ ہوتا ہے اور تھوڑی دیر بعد دَر انداز کو خود ہی احساس ہوتا ہے کہ کچھ غلط ہو گیا ہے۔ اس احساس کے ساتھ ہی وہ فوراً اپنی حدود میں واپس چلا جاتا ہے اور یوں تشویش ختم، بات صاف۔

ایک وقت تھا کہ موکن میانمار میں بحری قذاق سمجھے جاتے تھے۔ اس میں حقیقت بھی ہے لیکن اب ایسا بالکل نہیں ہے۔ وہ اُن کی زندگی کا ایک دور تھا جو اونچی لہر کی طرح آیا اور گزر گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ موکن غیر سیاسی اور عدم تشدد نظریات کے حامل بے ضرر لوگ ہیں۔ اُن کی زندگی بہت سادہ، خواہشات بہت محدود اور جسم آسائش اور تعیشات کا عادی نہیں ہے۔ اس لیے وہ سیکڑوں سال قدیم رسم و رَواج کے مدار پر گھومتی اپنی سادہ سی زندگی سے بہت خوش ہیں۔ اُن کے لب شاذ ہی شکوے کے لیے کھلتے ہوں۔ اُن کے ہاتھ شاذ ہی اپنے کسی دوسرے بھائی پر حملہ کرنے کو اٹھے ہوں گے۔ وہ باہمی اتفاق سے رہنے والے امن پسند لوگ ہیں۔

اُس دن بڑے خلوص سے گت چا کی فیملی نے ہمیں الوداع کیا تھا۔ ہم قریب کے ایک جزیرے پر جا رہے تھے جو کم از کم گھنٹا بھر کے سفر کی دُوری پر تھا۔ کچھ دیر تک تو ہم بڑے سکون سے آگے بڑھتے رہے لیکن تھوڑا آگے جا کر ہمیں میانمار کے فوجیوں کی ایک کشتی ملی۔ انہوں نے ہمیں روکا۔ ایک غیر موکن کو گت چا کے ساتھ دیکھ کر انہیں کچھ تعجب ہوا۔ انہوں نے مجھ سے اور اُس سے کچھ سوالات کیے اور پھر مطمئن ہو گئے۔ گت چا نے ایک درمیانے درجے کی ٹوکری میں کچھ بڑی مچھلیاں رکھی ہوئی تھیں۔

''کچھ ہے تمہارے پاس؟'' ایک فوجی نے گت چا سے پوچھا۔

''ہاں۔'' اُس نے مچھلیوں کی ٹوکری پر ہاتھ رکھتے ہوئے جواب دیا۔

دو منٹ میں سودا طے ہو گیا۔ اُس سپاہی نے دیسی شراب کی ایک بوتل کے بدلے مچھلیاں خرید لیں۔ ''اس طرح کے لوگ ہی ہمارے گاہک ہیں۔'' فوجی کشتی آگے بڑھی تو اس نے کبنگ میں لگے چھوٹے سے انجن کو اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ ''اکثر ان لوگوں سے ہمیں ضرورت کی چیزیں مل جاتی ہیں۔ مچھلیوں کے بدلے ضرورت کا سامان، ضرورت ہو تو تھوڑی بہت نقد رقم بھی مل جاتی ہے۔''

ہم ایک بار پھر جزیرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اُس کے بعد ہمیں راستے میں کوئی اور نہیں ملا۔ خوش قسمتی سے ہم بحفاظت اپنی منزل اور شام کو وہاں سے واپس گت چا کے خاندان تک پہنچ گئے مگر ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا ہے۔

سمندر میں بھی موکن کی زندگی اسی طرح کی زیادتیوں سے بھری ہوئی ہے، جس طرح کی کچھ زیادتیوں کا مزہ زمین پر رہنے والے اکثر شہریوں کو بھی چکھنا پڑتا ہے۔ جب مجھے ان زیادتیوں کا علم ہوا تو پہلی بار زمین اور سمندر والوں کے مابین انسان ہونے کے علاوہ کوئی اور شے مماثل نظر آئی۔

موکن باشندوں کا سفر اکثر غیر محفوظ رہتا ہے۔ وہ ہر وقت خود کو خطرے میں گھرا محسوس کرتے ہیں۔ موکن، تاریخ

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے مختلف ادوار میں ریاستی زیادتیوں کا شکار رہے ہیں۔ وہ مختلف ادوار میں بڑی طاقتوں کے زیرِ تسلط رہے لیکن کوئی ایک ایسا دور اُن کی زندگی میں نہیں آیا، جب انہیں سکون کا سانس میسر آیا ہو۔ برطانوی، جاپانی، تھائی اور پھر برمی...... ان سب نے اُنہیں ہراساں کیا ہے۔ موکن کی تاریخ، اُن پر روا رکھے گئے ظلم وزیادتی کے مختلف واقعات سے بھری پڑی ہے۔ دنیا پر سے نوآبادیاتی دور کب کا ختم ہو چکا۔ اکیسویں صدی کو سائنس، جدت اور تہذیب کا علمبردار قرار دیا جاتا ہے مگر اس کے باوجود اب بھی موکن باشندوں کے حالات وہی پرانے ہیں۔

کشتیوں کے کارواں پر سوار، پانیوں کے یہ خانہ بدوش ہمہ وقت لہروں پر مصروفِ گردش رہتے ہیں۔ سمندر میں گشت کرتی سرکاری عمل داروں کی کشتیاں انہیں جگہ جگہ ملتی رہتی ہیں۔ سرکار کے کارندے انہیں روکتے ہیں اور ٹیکس طلب کرتے ہیں۔ کبھی انہیں غیر قانونی ماہی گیری کے نام پر گرفتار کیا جاتا ہے تو کبھی سرکاری کانوں میں کان کنی اور بڑے افسران کے کھیتوں میں بیگار کے لیے جبری طور پر پکڑ لیا جاتا ہے۔ ان پر ... ماہی گیری کے اہم تجارتی علاقوں میں داخلے پر پابندی ہے۔ اگر اُن کے پاس سے سرکاری اجازت نامہ نہ ملے تو میانمار کے پانیوں میں داخل ہونے کا الزام لگا کر مہینوں کے لیے جیل بھیج دیا جاتا ہے۔ سمندری خوراک کے کچھ تاجروں نے تو انہیں افیون کی لت لگا دی ہے تاکہ وہ اُنہیں افیون دے کر بدلے میں مچھلیاں، جھینگے، کیکڑے اور کچھوے ہتھیا سکیں۔ استحصال اور ہراساں ہونا تو اُن کا مقدر بن چکا ہے مگر اب اُن سے اپنے روایتی طور طریقوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کا بنیادی انسانی حق بھی چھینا جا رہا ہے۔

تھائی لینڈ کی حکومت کے اقدام کی طرز پر حال ہی میں میانمار کی حکومت نے بھی ایک فیصلہ کیا ہے۔ حکومت چاہتی ہے کہ انہیں جزائر پر مستقل طور پر آباد کرے اور اُن جزیروں کو نیشنل پارک کا درجہ دے دے۔ جس سے غیر ملکی سیاحوں کی برما میں دلچسپی بڑھے۔ سیاحت میں اضافے کا مطلب زرمبادلہ کا زیادہ سے زیادہ حصول ہے۔

''ہم کیا بھیڑ بکریاں ہیں کہ لوگ ہم سے پوچھے بغیر یہ فیصلہ کر رہے ہیں کہ ہم کہاں اور کس انداز میں اپنی زندگی بسر کریں۔'' نیشنل پارک کے قیام اور جزیرے پر مستقل آبادکاری کے بارے میں جب گت چا سے بات ہوئی تو اس نے شدید ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم جانور تو نہیں کہ ایک پنجرے میں بند کر کے ٹکٹ لگا دیا کہ لو جی آؤ، ٹکٹ خریدو، جانور دیکھو اور مزے لو۔ اُنہیں کیا، اُن کی جیب میں تو نوٹ پہنچ رہے ہیں نا۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں بھرا گئی تھیں۔ ''یہ ہمیں انسان سمجھتے ہی نہیں۔ وہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ ہماری بھی کوئی سوچ ہے۔ ہم بھی جیتے جاگتے اور اچھا بُرا سمجھنے والے اُن جیسے ہی انسان ہیں مگر وہ تو ماننے کے لیے تیار ہی نہیں کہ موکن بھی انسان ہو سکتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اُس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے تھے۔ میرا بھی دل بھر آیا تھا۔ میں اُس سے نظر نہیں ملا پا رہا تھا۔ میں نے شرمندگی سے بچنے کے لیے منہ دوسری طرف کر لیا۔ میں زمین پر رہنے والا باشندہ ہوں۔ اُس کے مخاطب بھی زمین والے تھے اور میں یہاں ایک طرح سے زمین والوں کا سفیر تھا مگر بے ضمیر ہرگز نہیں۔ میرے دل میں گوشت پوست کا دھڑکتا دل موکن کے جذبات سمجھ گیا تھا مگر قانون کے سینے میں دل نہیں ہوتا، حکومت کا ضمیر گہری نیند سوتا ہے اور فیصلوں پر عمل درآمد طاقت کے بل پر ہوتا ہے...... اس لیے ایک عام انسان کے جذبوں اور اُن تینوں چیزوں کے درمیان بہت فرق ہوتا ہے۔ یہی وہ فرق ہے جو موکن جیسے لوگوں کے لیے صرف جذبوں کی ہی نہیں وجود کی موت کا سبب بھی بن جاتا ہے۔

موکن زندہ رہنا چاہتے ہیں، اپنی لوک ثقافت، دیومالائی داستانوں، سمندر اور کبانگ کے ساتھ...... یہی وجہ ہے کہ وہ میانمار حکومت کے جبری سکونت کے فیصلے کو ماننے سے انکاری ہیں۔ وہ اپنے لیے جینے کا وہ حق مانگتے ہیں جو انہیں آزادانہ طور پر من پسند زندگی گزارنے کا موقع دے۔ وہ اپنی صدیوں پرانی خانہ بدوش زندگی کا چلن بدلنے کو تیار نہیں۔ وہ نیشنل پارک اور فروغِ سیاحت کے نام پر چڑیا گھر کے اُن جانوروں جیسی زندگی بسر کرنے کو تیار نہیں جن پر ٹکٹ لگا کر پیسا کمایا جاتا ہے۔ اُن کا شدید ردعمل ہی ہے کہ جس کی وجہ سے موکن باشندوں کی آرچی پلاگو جزائر پر مستقل سکونت کا فیصلہ اب تک فضا میں معلق ہے مگر افسوس کہ اسے اب تک واپس نہیں لیا گیا ہے۔ جب تک فیصلہ فضا میں معلق ہے، تب تک اُن کی بقا کے سر پر بھی خطرے کی دو دھاری تلوار لٹکی رہے گی اور گت چا جیسے سیکڑوں موکن باشندے اس فکر میں گھلتے رہیں گے کہ کل اُن کا اور اُن کے بچوں کا مستقبل کیا ہوگا؟ گھلتے جائیں گے تنگ میں پانی کی طرح۔

''ہمیں بچانا چاہتے ہو تو اس فیصلے کو واپس لے لو۔'' اسی روز میں اور گت چا بیٹھے اسی موضوع پر باتیں کر رہے تھے، جب اس نے ہاتھ جوڑ کر بھرائی ہوئی آواز میں نہایت بے بسی سے کہا۔ ''یہ سمندر ہماری زندگی ہے۔ ہم کبانگ پر زیادہ آرام محسوس کرتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے داہنے ہاتھ کو سمندر کے نیلگوں پانی سے تر کیا اور چہرے پر نم ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''ہم اس جل کی مچھلی ہیں۔ اب یہ جل چھین لو گے تو پھر ہمارے پاس بچے گا کیا؟'' یہ کہہ کر وہ کچھ سوچنے لگا۔ ''صرف موت رہ جائے گی اور ہم مٹ جائیں گے۔'' کچھ دیر بعد اس نے رخ میری طرف کیا اور نہایت افسردہ لہجے میں کہا۔

''میں تمہارا پیغام زمین والوں تک پہنچا دوں گا۔'' میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ میری اس تسلی سے اس کی خالی خالی آنکھوں میں زندگی کی رمق ایک لمحے کو اُبھری اور پھر بجھ گئی۔ شاید وہ سمجھ گیا ہوگا کہ ایک ایسے بوڑھے کی بات وہاں کون سنے گا جہاں طاقت کی پوجا ہوتی ہے۔ وہ سمجھ گیا ہوگا کہ میرے پاس لفظ کے سوا کوئی ہتھیار نہیں۔ میانمار کی فوجی آمریت طاقت اسلحے کو سمجھتی ہے۔ چست و توانا فوجی سپاہیوں کو سمجھتی ہے۔ یہ سچ ہے مگر پھر بھی ممکن ہے کہ اُن میں شاید کوئی ایسا ہو جو لفظ کی طاقت اور جذبوں کی اہمیت سمجھتا ہو۔ لفظ جو میرے ہیں مگر اس میں پوشیدہ جذبات گت چا موکن کے ہیں۔

جبری سکونت ہی اُن کی بقا پر سوالیہ نشان نہیں، ایک اور بڑا مسئلہ اُن کی نسل کا تیزی سے ختم ہونا بھی ہے۔ موکن بہت عمدہ تیراک اور غوطہ خور ہوتے ہیں۔ اُن کی غوطہ خوری کی صلاحیت سے وہ لوگ بہت اچھی طرح آگاہ ہیں جو خود سمندر کی تہ میں جائے بنا، اُس کی کوکھ سے دولت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ طاقت ور اور مال دار کاروباری لوگ اُن کی خدمات حاصل کرتے ہیں اور نہ ہونے کے برابر معاوضہ دے کر کھلے سمندر میں اُن سے غوطہ خوری کرواتے ہیں، وہ بھی اُن تمام تر حفاظتی اقدامات کے باوجود جو اس کام کے لیے دنیا بھر میں مروج ہیں مگر غریب موکن یہ بات نہیں جانتے۔ صرف ایک چھوٹا سا آکسیجن سلنڈر کمر پر لاد کر وہ سمندر کی تہ میں اُتر جاتے ہیں۔ کبھی کبھار تو اُن کی آنکھوں پر صرف ایک چشمہ ہی چڑھا ہوتا ہے تاکہ پانی کی تہ میں جھانک سکیں۔ انہیں اس کے سبب تھوڑے تھوڑے وقفے سے باہر آنا پڑتا ہے جس سے ان کی خدمات حاصل کرنے والوں کے مقاصد پورے نہیں ہو پاتے اور دوبارہ وہ غوطہ لگا دیتے ہیں مزید گہرائی میں اُترنے کے لیے۔ یہ غیر محفوظ غوطہ خوری موکن نوجوانوں کی موت کی ایک بڑی وجہ بنتی جا رہی ہے۔ ہر سال موکن نوجوانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد عمدہ تیراک اور ماہر غوطہ خور ہونے کے باوجود موت کے منہ میں چلی جاتی ہے۔

''ہمارے نوجوان جس تیزی سے مر رہے ہیں، اُس سے ہماری نسل کم ہو رہی ہے۔'' گت چا نے غوطہ خوری کا تفصیلی پس منظر بیان کرنے کے بعد کہا۔ اُس کے لہجے میں تشویش نمایاں تھی۔ ''وہ ہمیں مختلف جزیروں پر جبراً سکونت پذیر کر کے ہمیں تقسیم کرنا چاہتے ہیں چیزوں کی طرح۔ اس سے بھی ہماری نسل پر بہت بُرا اثر پڑے گا۔ ایک طرف تو لالچی بڑے بڑے ماہی گیر ہمارے جوان بچوں کی موت کا سبب بن رہے ہیں تو دوسری طرف ہم پر عائد پابندیاں ان کی شادیوں میں رکاوٹ ہیں۔ یہ تو ہماری نسل کو ہی ختم کرنے پر تل گئے ہیں۔''

''پابندی اور شادیاں؟'' میں نے حیرانی سے سوال کیا۔ یہ بات مجھے چونکا گئی تھی۔

''ہاں......'' اُس نے ٹھنڈی سانس بھر کر جواب دیا۔ ''ہم لوگ سمندر میں اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے ہیں۔ ہر خاندان دوسرے خاندان سے کافی فاصلے پر اپنے علاقے میں رہتا ہے۔ ہمیں بچوں کی شادی کے لیے دوسرے خاندانوں میں آنا جانا پڑتا ہے مگر ہم جہاں اپنے علاقے سے نکلے، وہیں جھٹ سے گشت کرتی فوجی کشتیاں ہمیں پکڑ لیتی ہیں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟ ہم لوگ آوارہ گرد ہیں مگر اُن کی پابندیوں نے تو ہمیں قیدی بنا دیا ہے۔ غیر قانونی ماہی گیری کا الزام لگا کر فوجیوں نے ہمارے کئی ایسے نوجوان پکڑ کر جیلوں میں ڈال دیے جو حقیقت میں اپنے لیے لڑکی پسند کرنے جا رہے تھے۔''

میانمار کی تاریخ میں اکثر و بیشتر فوجی حکومتیں قائم رہی ہیں، جن کی وجہ سے بحری حفاظتی نظام میں اُن کی مداخلت بڑھتی گئی۔ اس وقت بھی موکن باشندوں کے اطراف کے جزیروں پر فوج کی بھاری تعداد موجود ہے۔ وہ ہمیشہ انہیں مشکوک نظر سے دیکھتے ہیں جس کے سبب اُن کی آزادانہ نقل و حرکت تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ موکن مزاجاً سمندر کے آوارہ گرد ہیں مگر اب وہ کسی حد تک اپنی کبانگ اور آرچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

پلاگو جزائر کے قیدی بن چکے ہیں۔

پہلے تو وہ صرف گھر سے محروم تھے مگر اب آوارہ گردی نہ کرنے کی پابندی نے تو موکن باشندوں کی زندگی ہی اجیرن کردی ہے۔ نسل کی بقا کا سوال ایک طرف، سرکار کی بے جا پابندیوں نے اُن کا زندہ رہنا مشکل کردیا ہے۔ اُن کی خوراک کا اہم جزو چاول ہے۔ وہ مچھلیوں، کیکڑوں اور جھینگوں کے عوض سمندر میں ماہی گیروں کی گھومتی پھرتی کشتیوں کو یہ دے کر اپنے لیے چاول حاصل کر لیتے تھے۔ کبنگ روایتی انداز میں ہاتھ سے تیار کی جاتی ہے مگر کچھ دہائیوں پہلے انہوں نے ان میں چھوٹے انجن نصب کر لیے تھے۔ یہ انجن پیٹرول اور ڈیزل سے چلتے ہیں۔ یوں اس جدت کے باعث وہ چپو چلانے اور بادبان چڑھانے سے تو بچ گئے مگر اب نئی مشکل میں ہیں۔ فوج نے ایک طرف ان کی آزادانہ نقل و حرکت کو پابند کردیا ہے تو دوسری طرف وہ ماہی گیروں پر بھی کڑی نظریں رکھتے ہیں۔ پہلے سمندری خوراک کے بدلے انہیں اپنی اور کبنگ کی خوراک (پیٹرول، ڈیزل، مٹی کا تیل) مل جاتا تھا مگر اب ان اشیا کا حصول آسانی سے ممکن نہیں۔

"اکثر ہم اتنے مجبور ہوتے ہیں کہ فوجیوں کے پاس جا کر اُن سے چاول کی بھیک مانگتے ہیں تا کہ اپنے اور گھر والوں کا پیٹ بھر سکیں۔ کسی کو رحم آجائے تو اجازت مل جاتی ہے کہ ہم مچھیروں سے رابطہ کرلیں۔ کچھ تو ایسے ہوتے ہیں کہ اجازت کی قیمت مانگتے ہیں...... کیا کریں دینا پڑتی ہے اُن کو اجازت کی قیمت مچھلیوں کی شکل میں۔" گت چا نے لاچاری سے اپنے دکھ بیان کیے۔ "نہ دیں تو پھر کیا کریں؟ آخر ہمیں بھی تو زندہ رہنا ہے۔" اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

کہتے ہیں کہ صدیوں سے سمندر کے سینے پر آباد ان خانہ بدوشوں کی تعداد کبھی بہت زیادہ تھی۔ اُن کی زندگی ہر قسم کی روک ٹوک سے آزاد تھی مگر نو آبادیاتی نظام اور دو عالمگیری جنگوں کے دوران اس خطے میں برطانیہ کی فوجی مداخلت کے سبب موکن باشندوں کی بدقسمتی کا آغاز ہوا۔ اُنہیں مشکوک قرار دیا گیا اور اُن کی سرگرمیوں کو مشتبہ۔ برطانیہ کو خوف تھا کہ وہ جاپان کے لیے جاسوسی کر سکتے ہیں۔ عالمگیری جنگ میں اُن کی مدد کر کے برطانیہ کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ سو، اس خدشے کی بنیاد پر ان کی آزادانہ سرگرمیوں کو محدود کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اُس کے بعد جو بھی برما پر قابض ہوا، اُس نے پابندی کی یہ روش نہ صرف جاری رکھی بلکہ اس میں اضافہ ہی کرتا چلا گیا۔

کہتے ہیں کہ بیسویں صدی میں موکن باشندوں کی اس بحری خطے میں آبادی کا شمار ہزاروں میں تھا۔ اس بارے میں کوئی مصدقہ حتمی اعداد و شمار نہ تو موجود ہیں اور نہ ہی کبھی ان کی مردم شماری کا ریکارڈ رکھنے کے لیے پہلے کوئی باضابطہ کوشش کی گئی۔ موکن، سرکاری ریکارڈ میں اب تک 'بے نام شمار' لوگوں میں شامل ہیں۔

"دوسری جنگِ عظیم کے دوران موکن باشندے بلاشبہ کئی ہزار تھے۔ بہت تھے یہ لوگ۔ اتنے زیادہ کہ اُن پر نظر رکھنے کے لیے کئی سو فوجیوں اور درجنوں کشتیوں کی ضرورت پڑتی تھی۔" برما کے ایک ریٹائرڈ پروفیسر اور محقق نے یہ بات مجھے کئی سال پہلے بتائی تھی۔ یقیناً اُن کی آبادی کبھی ہزاروں میں رہی ہوگی مگر اب وہ تیزی سے ختم ہو رہے ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق دس سال پہلے مرگوئی آرچی پلاگو کے جزائر اور اس سے متصل ساحلی حصے میں تیرتی کبنگوں پر مجموعی طور پر ڈھائی ہزار سے زیادہ موکن باشندے روایتی انداز میں زندگی بسر کر رہے تھے مگر 2011ء میں ایک محتاط ترین اندازے کے مطابق ان کی آبادی سمٹ کر صرف ایک ہزار نفوس تک رہ گئی ہے۔

"کچھ ایسا ہی ہے۔" گت چا نے تصدیق کی۔ "ہم تیزی سے گھٹتے جا رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ بہت جلد ہماری پوری نسل ہی مٹ جائے مگر اس کے ذمے دار ہم نہیں، زمین والے ہیں۔" اس نے سامنے کی طرف اشارہ کیا۔ ایک فوجی کشتی نظر آ رہی تھی، جس پر میانمار اور اس کی فوج کا پرچم لہرا رہا تھا۔ "ہمیں سمندر کے سینے سے مٹانے میں صرف زمین والوں کا ہاتھ ہے۔ شاید اوپر والا ایسا نہیں چاہتا مگر یہ ہیں کہ ہمیں جینے ہی نہیں دیتے۔ یہ ہماری نسل کشی کر رہے ہیں۔" گت چا کے لہجے میں تلخی تھی۔ "میری بیٹی بیوہ ہے۔ اس کا کوئی بچہ نہیں۔ اس کا شوہر جوان تھا۔ بچے پیدا کر سکتا تھا مگر شادی کے ایک ماہ بعد ہی وہ برمی تاجر کے لیے گہرے سمندر میں اُترا مگر سلنڈر میں آکسیجن کم تھی۔ جب اسے یہ بات پتا چلی تو وہ فوراً پلٹا مگر اوپر نہیں پہنچ سکا۔ اب میری بیٹی ہمیشہ یونہی رہے گی...... اکیلی، بیوہ اور بے اولاد۔" وہ باقاعدہ رونے لگا تھا۔ میری بھی پلکیں نم تھیں۔ کافی دیر بعد اس نے پلکیں صاف کیں اور کہنے لگا۔ "اب ایسے میں ہماری نسل ختم نہیں ہوگی تو کیا ہوگا؟ ہم تو مٹ

رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جزیرے پر ہمارا اچھا یا گھر بناتا جا رہے ہیں تا کہ دنیا کو دکھائیں کہ کبھی انڈمان اور برما میں یہ نسل بھی رہتی تھی مگر ہمیں کیا، ہم تو ویسے بھی اب ختم ہو رہے ہیں۔ یہی حال رہا تو چالیس پچاس برس بعد شاید ہی کوئی موکن یہاں زندہ ملے گا۔" ایک بار پھر اُس کی پلکیں بھیگ گئی تھیں۔ اس نے سمندر میں ہاتھ ڈالا۔ "ہم اس کے سینے پر زندہ ہیں، مر کر بھی اس میں سما جائیں گے، پھر ڈھونڈتے پھرنا ہم لوگوں کو۔" یہ کہتے ہوئے گت چا کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ اور میری آنکھوں میں تشویش تھی۔ اُس دن فکر اور تشویش کا آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے ٹکراؤ ہوا تھا۔

موکن باشندوں کی زندگی میں دیو مالائی داستانیں، لوک قصے، روایتی رقص اور ماورائی قوتوں پر پختہ یقین بھی موجود ہے۔ وہ جہاں زمین والوں سے ڈرتے ہیں وہیں ان سے زیادہ ماورائی قوتوں سے خوف زدہ رہتے ہیں۔ گت چا کا باپ عامل تھا۔ موکن باشندوں کو اگر کبھی کسی پر آسیب کا سایہ ہونے کا شبہ ہوتا ہے تو وہ روحانی علاج کے لیے اس سے ہی رابطہ کرتے ہیں۔ گت چا اپنے باپ کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ اس نے بھی اپنے باپ سے یہ روحانی علم حاصل کیا تھا۔ بقول اُس کے "بہت تھوڑا سا سیکھا مگر یہ بھی بہت ہے۔"

گت چا کو موکن باشندوں میں عامل اور سربراہ کا درجہ حاصل ہے۔ موکن جسمانی امراض کا تعلق بھی آسیب سے جوڑ دیتے ہیں اور روحانی علاج کے لیے اُس سے ہی رابطہ کرتے ہیں۔ اب روایت پسند موکن باشندوں کی یہ خوش قسمتی ہے یا اوپر والے کا کرم کہ مریض کو اُس کے علاج سے شفا بھی مل جاتی ہے۔

ایک بار میرے سامنے اُس کے پاس نیم بے ہوش شخص لایا گیا۔ نوجوان کے ورثا کا خیال تھا کہ وہ کسی آسیب کا شکار ہوا ہے۔ اُسے دیکھ کر میرا اپنا خیال تھا کہ بخار اُس کے دماغ پر چڑھ گیا ہے۔ میں نے اپنا خیال دل میں ہی رکھا اور اسے علاج کرتا ہوا دیکھنے لگا۔ وہ کچھ دیر تک مریض کے سر پر ہاتھ رکھے کوئی منتر پڑھتا رہا۔ اب کیا کہیں کہ گھنٹا بھر بعد اُس مریض نے آنکھیں کھول دیں اور پانی مانگا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ضرور تھا مگر اب بھی دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ بخار اُس کے دماغ سے اترا ہے تبھی تو اس نے آنکھیں کھولی ہیں۔

آغا خان سوم

(1878-1957ء)

سلطان سر محمد شاہ بن امام آغا علی شاہ اسماعیلیہ فرقہ کے اڑتالیسویں امام۔ کراچی میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے پہلی عالمگیر جنگ میں برطانیہ کی مدد کی، جس کے صلے میں انہیں سر اور ہز ہائی نس کے خطاب ملے اور گیارہ توپوں کی سلامی مقرر ہوئی۔ فارسی، عربی، انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کے ماہر، عظیم مدبّر اور سیاست دان تھے۔ 1906ء سے 1912ء تک مسلم لیگ کے صدر رہے۔ 1930ء، 1931ء میں گول میز کانفرنس میں ہندوستانی مسلمانوں کی نمائندگی کی۔ 1934ء میں برطانیہ کی پریوی کونسل میں لیے گئے۔ 1947ء میں جمعیت الاقوام کے صدر منتخب ہوئے۔ ان کے مرید تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جنیوا میں انتقال کیا اور وصیت کے مطابق اسوان میں دفن ہوئے۔ ان کے دو بیٹے ہیں۔ شہزادہ علی اور شہزادہ صدر الدین مگر ان کی وصیت کے مطابق شہزادہ علی کے بیٹے شہزادہ کریم ان کے جانشین مقرر ہوئے، جو آغا خان چہارم کہلاتے ہیں۔

آغا خان چہارم: 1936ء...... شہزادہ کریم بن شہزادہ علی۔ اپنے دادا، سر آغا خان سوم کی وفات کے بعد اسماعیلی فرقے کے انچاسویں امام بنے۔ 1957ء میں ملکہ الزبتھ دوم نے ہز ہائی نس اور 1969ء میں شاہ ایران نے ہز رائل ہائی نس کے خطاب عطا کیے۔ 1970ء میں حکومت پاکستان کی جانب سے نشانِ امتیاز ملا۔ 1967ء میں پشاور یونیورسٹی اور 1970ء میں سندھ یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری دی۔ 1969 میں ایک برطانوی لڑکی سے شادی کی جس سے دو بیٹے اور ایک لڑکی ہے۔ 1983ء میں انہوں نے کراچی میں آغا خان یونیورسٹی اور میڈیکل کالج قائم کیے، پیرس میں مقیم ہیں۔

مرسلہ: مہتاب خان، کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

"لے جاؤ اسے، تین دن بعد لانا۔" یہ کہہ کر گت چا ان کی کبنگ سے چھلانگ مار کر واپس اپنی کبنگ پر آ گیا۔

تین دن بعد وہ نوجوان اپنی کبنگ خود چلا کر آیا تو اسے بھلا چنگا دیکھ کر گت چا نے میری طرف فاتح نگاہوں سے دیکھا اور نوجوان کا معائنہ کر کے اسے صحت مند ہونے کی نوید سنا دی۔

گت چا کی اسی روحانی قوت اور بزرگ ہونے کی وجہ سے سارے موکن باشندوں میں بہت زیادہ عزت کی جاتی ہے۔ اسے موکن کے غیر اعلانیہ سردار کی حیثیت حاصل ہے۔

گت چا قدیم روایتوں کا امین ہے۔ کئی روز اُس کے ساتھ گزرنے کے بعد میں اچھی طرح جان گیا تھا کہ وہ رجعت پسند ہے۔ اُسے اپنے پُرکھوں سے پیار ہے۔ وہ جہاں اپنے لوگوں کی بقا کے لیے فکر مند ہے، وہیں وہ اپنے قدیم رسم و رَواج کے بارے میں بھی پریشان ہے۔ اُسے ڈر ہے کہ سرکار کے اقدامات سے ان کے رسم و رواج کی چمک ماند پڑ سکتی ہے۔ وہ آج بھی گمن اور سیبان کی دیو مالائی کہانی پر صدقِ دل سے یقین رکھتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اگر ہم اپنے رسم و رَواج کے بغیر زندہ رہ بھی گئے تو وہ زندہ رہنا نہیں ہوگا۔ "ہماری زندگی اور رسم و رَواج، دونوں ایک دوسرے سے مشروط ہیں۔ ایک کے بغیر دوسرے کا وجود ممکن ہی نہیں۔" میں کئی بار گت چا کے منہ سے یہ بات سُن چکا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ حکومت جو کچھ کرنا چاہتی ہے، اس کے عوض وہ کچھ غیر ملکی پیسا ضرور حاصل کر لے گی مگر روحانی طور پر موکن مرنے لگیں گے۔

"ہمارے ہاں جذبوں، عقیدت اور یقین کی بہت اہمیت ہے۔ سنا ہے شہری ماحول اور زمین والوں میں اب ان باتوں کا کوئی مول نہیں رہا؟" اس نے ایک سہانی رات کھانا کھاتے ہوئے مجھ سے سوال کیا تھا۔

میرے پاس اُس کے سوال کا جواب تھا اور وہ بھی اثبات میں مگر بیچ میں کہیں انا آ گئی تھی زمین والوں کی۔ میں خود زمین والا تھا۔ کیسے اقرار کر لیتا کہ جو متاع تمہارے پاس ہے، اُس سے میں کب کا محروم ہو چکا ہوں۔ آخر کو میں بہت پڑھا لکھا اور جدید مہذب دنیا کا باشندہ تھا۔ شاندار گھر میں رہنے والا مہذب شخص اُس ناخواندہ اور ایک چھوٹی سی کشتی میں زندگی بسر کرنے والے موکن کے سامنے کس طرح اپنے احساسِ محرومی کا اظہار کر لیتا۔ میں نے مسکراہٹ کے پردے میں اپنا کرب چھپا لیا تھا۔

گت چا کی کوشش تھی کہ کچھ ایسا ہو کہ انہیں حکومت اپنی مرضی سے جزائر پر آباد کرنے کے فیصلے سے باز آ جائے۔ "اگر ایسا نہ ہوا تو ہم ایک دوسرے سے بہت دور ہو جائیں گے۔ کچھ شمال میں، کچھ جنوب میں اور کچھ اس کے بیچ، اِدھر اُدھر بس جائیں گے۔ یوں ہماری یک جہتی کا احساس ختم ہو جائے گا۔ اس سے ہمارے قدیم رسم و رَواج پر بُرا اثر پڑے گا۔ موکن چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ جائیں گے۔ ہر گروہ اپنے مطابق رَواج منانے لگے گا۔ اس سے آہستہ ہمارے رَواجوں کے اصل انداز بدلتے جائیں گے۔" اُس شام ہم دونوں کبنگ میں سوار ہو کر ایک جزیرے پر جا رہے تھے جب اُس نے یہ بات کہی۔

میانمار کے محکمۂ سیاحت نے اُس جزیرے پر ایک تقریب کا اہتمام کیا تھا۔ جس میں موکن باشندوں کی ثقافتی زندگی پیش کرنے کے لیے شو کا اہتمام تھا۔ گت چا کو وہاں اپنے کچھ رسم و رَواج کے بارے میں بتانا تھا۔ یہ ثقافتی شو حکومت کے اُسی منصوبے کا حصہ تھا، جس کے تحت وہ کچھ جزائر کو بحری نیشنل پارک کا درجہ دے کر موکن باشندوں کو وہاں بسانا چاہتے تھے۔

تقریب شروع ہونے سے پہلے میری ایک سرکاری افسر سے بات چیت ہوئی۔ میں نے کہا کہ "انہیں دُور دُور بسانے سے موکن ثقافت بکھر سکتی ہے۔"

"ہرگز نہیں۔" یہ سن کر اس نے فوراً دوٹوک لہجے میں کہا۔ "ہم انہیں منتشر صورت میں آباد کر کے سمندر کے خاص ٹکڑے کے قدرتی وسائل پر پڑنے والا بوجھ کم کرنا چاہتے ہیں۔" کتابی باتیں کہتے ہوئے اُن کے لہجے سے صاف ظاہر تھا جیسے وہ مجھے یقین دلا رہے ہوں کہ موکن باشندوں کی وجہ سے اُس حصے کے سمندری وسائل شدید دباؤ میں ہیں۔

یہ بات سُن کر مجھے فشنگ ٹرالر، نہایت باریک جال، مچھلیوں کی افزائش کا موسم اور گت چا کی بات..... سب کچھ ایک ساتھ یاد آئے تھے۔ ایک روز گت چا نے کہا تھا "مچھلیوں کی افزائش کے تین ماہ کے دوران ہم ماہی گیری بالکل نہیں کرتے۔ ہم سمندر کی صحت کی خاطر ایسا کرتے ہیں۔"

گت چا کی بات سو فیصد درست تھی۔ یہ پہلا سچ تھا۔۔ دوسرا سچ یہ ہے کہ ہے کہ فشنگ ٹرالر سمندر کے بجائے صرف مچھلیوں، جھینگوں اور کیکڑوں کے لیے فکرمند ہوتے

ہیں۔ وہ سمندر کی صحت کی رتی بھر پروا کے جذبے سے بھی عاری ہوتے ہیں۔ یہ سچ مجھے نہ تو گت چا نے بتایا تھا نہ اُس افسر نے مگر حقیقت یہی ہے۔ یقین نہ ہو تو اقوامِ متحدہ سے لے کر دنیا کے تمام بڑے بڑے ماحولیاتی اداروں کی وہ رپورٹیں پڑھ لو جو سمندری وسائل اور بڑے بڑے فشنگ ٹرالر کے اندازِ ماہی گیری کے اثرات کے بارے میں تحقیق کے بعد مرتب کی گئی ہیں۔ کسی ایک جگہ پر بھی روایتی ماہی گیری اور موکن کا ذکر نہیں ملے گا اور کوئی صفحہ فشنگ ٹرالر کے اندازِ ماہی گیری کے مضر اثرات سے خالی نہیں ہوگا مگر اُس بری فوجی افسر کو کون سمجھاتا جو سرحد پر ٹینک کے بجائے شہر میں بیٹھ کر محکمۂ سیاحت کو سنبھال رہا تھا۔

'موکن فیسٹیول' نیاوی جزیرے پر منعقد کیا گیا تھا۔ اس میں شرکت کے لیے کافی بڑی تعداد میں غیر ملکی سیاحوں، مغربی سفارت کاروں اور سیاحت سے وابستہ شعبوں کے لوگوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ ایک رات اور دوسرے آدھے دن پر مشتمل وہ میلہ بھی خوب تھا۔

رات کو محفلِ موسیقی ہوئی۔ موکن فن کاروں نے روایتی ملبوسات میں اپنے لوک گیت پیش کیے۔ غیر ملکیوں کے لیے یہ بہت دلچسپ تھا۔ اُن کے چہروں پر ویسے ہی تاثرات تھے جیسے نوادرات کے کسی شوقین کے چہرے پر اُس وقت نمودار ہوتے ہیں جب وہ کسی نئے عجائب گھر میں پہلی بار داخل ہوتا ہے۔

اُن کے رقص والہانہ تھے، گیتوں کے بول سمجھ میں نہ آنے کے باوجود کانوں کو بھلے لگ رہے۔ اُن کے روایتی اور سادہ آلاتِ موسیقی کی سنگت بول کو اور سحر انگیز بنا رہی تھی۔ لیکن صرف اجنبیوں کے لیے۔ اُس وقت گت چا کا چہرہ بے تاثر تھا۔ اُس پر ان گیتوں کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ یہاں بطور رابطہ کار بلایا گیا تھا۔ وہ اپنے فرائض درست طور پر ادا کر رہا تھا لیکن میں محسوس کر سکتا تھا کہ یہ سب کچھ کرتے ہوئے وہ گرمجوشی کے جذبے سے خالی تھا۔

"تم نے دیکھا، وہاں ہر شے بے ربط تھی۔" دوسرے دن واپس آتے ہوئے اُس نے مجھ سے کہا۔

"مگر تمہیں ایسا کیوں لگ رہا تھا؟" میں نے سوال کیا۔

"موکن جوان رقص کر رہے تھے، گا رہے تھے، بجا رہے تھے مگر وہ بات نہیں تھی۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے اپنی دھن میں مگن ہو کر کہا۔ "جب ہم ازخود اپنے کسی خاص تہوار پر ان سب چیزوں کا اہتمام کرتے ہیں تو اُس وقت بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ وہ بری حکام کے کہنے پر آئے تھے، اُن کی خوشی کے لیے سب کچھ کر رہے تھے بالکل مشینی انداز میں۔ وہ اپنے جذبے کے ساتھ کچھ نہیں کر رہے تھے۔ اس لیے مجھے ہر شے منتشر اور ربط سے خالی نظر آ رہی تھی۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہوا اور سمندر کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "یہ لوگ ہمیں جذبوں سے محروم کر کے اسی طرح کی نمائشی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر رہے ہیں۔" وہ مڑا اور میری طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "یہ ہے اصل موت۔"

موکن باشندوں میں قدیم روایت ہے کہ وہ اپنے خصوصی تہوار پر بزرگوں کی روحوں کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے رقص کا خصوصی اہتمام کرتے ہیں۔ جس میں مرد و عورت برابر کا حصہ لیتے ہیں۔ یہ دراصل دعائیہ کلمات سے اجداد کی روحوں کو تسکین پہنچانے کا اُن کا بہت پرانا روحانی طریقہ ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح اُن کے اجداد کی ارواح کو سکون میسر آئے گا۔ اُس سرکاری میلے میں بھی یہی سب کچھ کیا گیا تھا مگر اُس دن گت چا ہی نہیں، شاید سب گانے، ناچنے والے موکنوں کو یقین ہوگا کہ اُن کے گیت کو سننے کے لیے، اُن کے کسی بزرگ کی روح نہیں آئے گی۔ تبھی تو وہ کہہ رہا تھا کہ ہر شے منتشر اور جذبات سے عاری تھی۔ شاید اُس دن فضا بھی اُن کے اجداد کی اَرواح سے بالکل خالی ہوگی۔ یہ بات تو ایک طرف، البتہ جزیرے پر ناؤ نوش کی محفل اور مغربی جوڑوں کے رقص سے بری حکام کی روح کو خاصا سکون مل رہا تھا۔ یہ سکون ان کے بہکتے قدموں اور نشے سے بند ہوتی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں بالکل صاف دکھائی دے رہا تھا۔

میں موکن پر تحقیق کے لیے آیا تھا۔ اُس دن میں کبنگ پہ بیٹھا اپنا بڑا سا چرمی تھیلا کھولے کاغذوں میں کھویا تھا کہ ایک اخباری تراشہ ہاتھ لگ گیا۔ یہ اخباری تراشہ میں نے بہت پہلے ہندوستان سے شائع ہونے والے ایک رسالے فرنٹ لائن سے کاٹا تھا۔ تراشے پر 4 جون 1999ء کی تاریخ تھی۔

یوں تو آج کے موکن اور ہندوستان میں براہِ راست کوئی تعلق نہیں مگر گزرے کل کے برما، اُس وقت کے ہندوستان اور اُن پر حکمراں برطانوی راج...... تینوں میں ایک تعلق ہے۔ اُس وقت یہ سب ایک تھے۔ موکن تب بھی آرچی پلاگو کے جزیروں پر مون سون گزارتے تھے اور اب بھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوا یہ کہ جیسے موکن کو جبراً کبنگ سے بے دخل کر کے جزیروں پر سکونت اختیار کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے، ویسے ہی کبھی بھارت کے ضلع جھابو میں بھی ہوا تھا۔ بات یہ تھی کہ وہاں دریا کنارے آدی واسی باشندوں کا ایک گاؤں جبل سندھی واقع تھا۔ وہ لوگ صدیوں سے دریا کنارے واقع قدرتی جنگل کے ساتھ والی زمین پر آباد تھے اور اپنی روایتی زندگی بسر کر رہے تھے۔ کسی ساہوکار کی نظر اُس جگہ پر پڑی۔ اُسے وہ جگہ بہت قیمتی نظر آئی یوں ریاست کی سرکار نے کچھ اہم فیصلے کیے۔ 1994ء میں مدھیہ پردیش ریاست کے وزیرِ اعلیٰ نے حکم دیا کہ اُن لوگوں کو یہاں سے کسی اور جگہ منتقل کر کے اُس مقام پر جدید بستی بسائی جائے۔ بس! پھر کوششیں شروع ہو گئیں اُن کی منتقلی کی مگر آدی واسی تیار نہیں ہوئے۔ کئی برس گزر گئے۔

سرکار اور آدی واسی دونوں اپنی اپنی جگہ ڈٹے تھے۔ آخر ایک مرتبہ معاملہ بہت گمبھیر ہو گیا تب پہلی بار گاؤں کے ایک بزرگ باوا مہالیہ نے وزیرِ اعلیٰ کو ایک خط لکھا۔ یہ خط 'فرنٹ لائن' نے شائع کر دیا۔ وہی تراشہ میرے ہاتھ میں تھا۔ باوا مہالیہ نے لکھا تھا:

"ہم دریا کے کنارے رہنے والے لوگ ہیں۔ ہم عظیم نرمدا کے کناروں پر رہائش پذیر ہیں۔ آپ کا اور شہر میں رہنے والے تمام لوگوں کا خیال ہے کہ ہم لوگ جو پہاڑیوں میں رہتے ہیں، بن مانسوں کی طرح اُجڈ، غریب اور پسماندہ ہوتے ہیں۔ ہم نسلوں سے جنگل میں رہتے چلے آئے ہیں۔ جنگل ہمارا ساہوکار اور بینکار ہے۔ پریشانی کے وقت ہم جنگل کے پاس جاتے ہیں۔ اس کی لکڑی سے گھر بناتے ہیں۔ سینٹھے کی شاخوں کو تراش کر ہم چھتیں بُنتے ہیں۔ جنگل کی چیزوں سے ہم ٹوکریاں، چارپائیاں، ہل، بیلچے اور استعمال کی دوسری بہت سی مفید چیزیں بناتے ہیں...... ہمیں وہاں سے مختلف قسم کی گھاس ملتی ہے اور جب گرمی میں گھاس خشک ہو جائے تو پتیاں پھر بھی مل جاتی ہیں۔ اگر قحط پڑ جائے تو ہم مختلف پودوں کی جڑیں اور جنگلی پھل کھا کر زندہ رہتے ہیں۔ جب ہم بیمار ہو جاتے ہیں تو ہمارے طبیب جنگل سے پتیاں، جڑیں اور چھالیں لا کر ہمارا علاج کرتے ہیں۔ ہم جنگل سے گوند، ادویاتی پودوں کی پتیاں، بہیرہ، چرونجی اور مہوا اکھٹا کر کے بیچتے ہیں اور ضروریات پوری کرنے کے لیے نقدی حاصل کرتے ہیں۔ جنگل ہماری ماں جیسا ہے۔ ہم اس کی گود میں پل کر بڑے ہوئے ہیں۔

ہم ہر درخت، جھاڑی اور جڑی بُوٹی کا نام جانتے ہیں۔ ہم ان کے استعمال سے بھی واقف ہیں۔ اگر ہمیں جنگلوں سے محروم کسی جگہ پر رہنا پڑے تو ہمارے سینوں میں محفوظ کئی نسلوں پر محیط روایتی علم بے کار ہو جائے گا۔ دریا ہی ہمارا ذریعۂ معاش ہے۔ نرمدا اپنے پیٹ میں انواع و اقسام کی مچھلیاں رکھتا ہے۔ جب اچانک ہمارے ہاں مہمان آ جائیں تو مہمان نوازی کے لیے ہمارے پاس مچھلیاں ہوتی ہیں۔ دریا کی لائی ہوئی بھل کناروں پر جمع ہو جاتی ہے اور ہم سردیوں میں وہاں مکئی اور جوار کاشت کر لیتے ہیں۔ یہی نہیں، گرمیوں میں یہاں متعدد اقسام کے خربوزے بھی اُگاتے ہیں۔ دریا کے کناروں پر ہمارے بچے کھیلتے ہیں، وہ دریا کی چھاتی پر تیرتے اور نہاتے ہیں۔ ہمارے مویشی وہاں سارا سال پانی پیتے ہیں کیوں کہ دریا کبھی نہیں سوکھتا۔ ہم دریا کے دامن میں مطمئن زندگی گزارتے ہیں۔ ہم یہاں کئی نسلوں سے آباد ہیں۔ آپ کے شہر والے لوگ الگ، الگ مکانوں میں رہتے ہیں۔ آپ ایک دوسرے کی خوشیوں اور غم کو نظر انداز کر دیتے ہیں، جبکہ ہم اپنے قبیلوں اور عزیز و اقارب کے ساتھ مل جل کر رہتے ہیں۔ ہم سب اپنی محنت یکجا کر کے ایک ہی دن میں اپنی جھونپڑی بنا لیتے ہیں۔ اپنے کھیتوں میں گھاس پھونس کاٹ کر الگ کر دیتے ہیں اور جب کبھی کوئی چھوٹا موٹا کام آ پڑے تو اُسے بھی مل جل کر کر ڈالتے ہیں۔ آپ ہم سے کہہ رہے ہیں کہ گجرات میں زمین لے لیں اور یہ جگہ خالی کر کے وہاں چلے جائیں۔ آپ ہم سے معاوضہ لینے کو بھی کہہ رہے ہیں۔ معاوضہ، اپنی زمینوں، اپنے کھیتوں، اپنے کھیتوں کے کنارے اُگے ہوئے درختوں سے محرومی کا...... آپ کی بات ٹھیک لیکن یہ بتائیں آپ ہمارے جنگلوں کا معاوضہ کیسے دیں گے؟...... آپ ہمارے دریا، اُس کی مچھلیوں، اُس کے پانی، اُن سبزیوں کا جو اس کے کناروں پر اُگتی ہیں، اُن سب کے پہلو میں ہمارے رہنے کا معاوضہ کیسے دیں گے؟ اُس کی قیمت کیا لگاتے ہیں؟...... ہمارے دیوتاؤں اور ہمارے بزرگوں کی شفقت...... آپ ان سب کا مول کیا دیں گے؟ ہماری آدی واسی زندگی...... آپ ان کی کیا قیمت لگاتے ہیں؟"

اُس دن کبنگ پہ بیٹھا میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ موکن باشندوں کو جزائر پر جبری سکونت پر مجبور تو کر دو گے مگر وہ جو کچھ چھوڑ کر اُن گھروں کو جائیں گے، اُس کا مول سرکار کیا دے گی؟

گت چا خاندان کے ساتھ رہتے ہوئے بہت عرصہ ہو چلا تھا۔ ایک دن گت چا نے اطلاع دی کہ مون سون شروع ہو رہا ہے۔ اب ہم اگلے تین ماہ کے لیے آرچی پلاگو پر جا کر عارضی قیام کریں گے۔ دوسرے دن سورج نکلنے سے پہلے گت چا کا خاندان اور اُن کے ساتھ میں بطور مہمان زمینی پڑاؤ کے لیے چل دیا۔

جزیرے پر کئی اور لوگ بھی پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے ہمارا شاندار استقبال کیا۔ گت چا کے آگے تو وہ بچھے بچھے جا رہے تھے۔ اس کی دو وجہ تھیں، ایک تو احترام اور دوسرا یہ کہ وہ اُس کے رشتے دار بھی تھے۔ ویسے تو سارے موکن آپس میں رشتے دار ہی ہیں مگر یہ اُس کے قریبی تھے۔ وہاں کئی نوجوان گھاس پھوس کی جھونپڑیاں بنا رہے تھے۔ یہ جھونپڑیاں اس جزیرے پر تین ماہ کے لیے اُن کا گھر تھیں۔ سال کے یہی تین مہینے ہوتے ہیں جب وہ زمین پر بنے گھر میں رہتے ہیں، ورنہ کہاں خانہ بدوش اور کہاں گھر......

گت چا نے اپنی بولی میں اُن لوگوں سے میرا تعارف کروا دیا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ میں مہمان ہوں اور ان کی زندگی پر مضمون لکھنے کے لیے کچھ دنوں تک اُن کے ساتھ ہی رہوں گا۔

اُن نوجوانوں نے میرے لیے دیکھتے ہی دیکھتے خصوصی اہتمام سے ایک علیحدہ جھونپڑی تیار کر دی تھی۔ جھونپڑی سمندر کے کنارے تھی اور وہاں ناریل کے بہت سارے درخت بھی لگے ہوئے تھے۔ غروبِ آفتاب سے کچھ پہلے میں اپنی جھونپڑی میں لیٹا ہوا سامنے دیکھ رہا تھا۔ نارنجی رنگ کے بڑے سے گولے میں تبدیل شدہ چمکتا سورج آہستہ آہستہ نیلگوں آسمان سے نیلے سمندر میں اُترتا جا رہا تھا۔ وہ میری زندگی کا سب سے دلکش نظارہ تھا۔ وہ روح پرور نظارہ شاید یہاں سے جانے کے بعد میں کبھی نہیں دیکھ پاؤں گا۔ اُس شام مجھے ایک اور احساس بھی ہوا تھا۔ اپنی جھونپڑی میں لیٹ کر، گزشتہ کئی ہفتوں میں پہلی بار مجھ میں وہ احساس جاگا جو اپنے بیڈروم میں ہوتا تھا...... گھر کا احساس۔

دوسرے دن صبح بیدار ہونے کے بعد منہ ہاتھ دھویا، ناشتا کیا اور اپنا کیمرا اور کاغذات والا بیگ کندھے سے لٹکا کر اکیلا ہی جزیرے کی سیر کے لیے نکل گیا۔

وہ چھوٹا سا جزیرہ تھا لیکن مناظرِ فطرت اور قدرتی حُسن کی دولت سے مالا مال...... ساحل کے کنارے ایک گھنا جنگل بھی تھا۔ وہاں کئی پھل دار درخت بھی تھے۔ جنگلی پودوں کا شمار ہی نہیں تھا۔ میں نے وہاں درجنوں اقسام کے ایسے جنگلی پھول دیکھے جنہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اُس روز اس جنگل میں گھومتے ہوئے مجھے کئی خوبصورت پرندے بھی دکھائی دیے۔ کچھ پرندے تو اتنے خوبصورت اور شوخ رنگوں سے سجے ہوئے تھے کہ دل چاہ رہا تھا کہ بس انہیں دیکھتا ہی رہوں۔ میں نے اپنے ڈیجیٹل کیمرے سے اُس روز جنگل، پرندوں اور پھولوں کی درجنوں تصویریں کھینچی تھیں۔ وہ جنگل بہت حسین تھا۔ بالکل ایسی دوشیزہ کے مانند جس کا حُسن اب تک ہوس کی پہلی نظر سے بھی پاک تھا گلاب کی نوخیز کلی پر پڑے شبنم کے شفاف قطرے کی طرح۔

صبح سویرے کا وہ وقت بہت خوش کُن تھا۔ جنگل سے نکل کر میں اُس طرف بڑھا جسے وہ لوگ ساحل کہتے تھے۔ اُس وقت وہاں بھی زندگی کی بھرپور رونق نظر آ رہی تھی۔ کچھ عورتیں نہا کر گیلے بالوں میں کنگھی کر رہی تھیں۔ کچھ کپڑے دھو رہی تھیں۔ بچے بچیاں ساحل پر کھیل رہے تھے۔ ایک طرف کچھ بڑی عمر کے مردوں کا چھوٹا سا جتھا بیٹھا تھا۔ اُن کے سامنے کچھ لڑکے بیٹھے تھے۔ میں اُن کے قریب چلا گیا۔ بزرگ آنے والے کل کے ان موکن مردوں کو بتا رہے تھے کہ ماہی گیری کیسے کی جاتی ہے، کبنگ کیسے بناتے ہیں...... میں اُن کے پاس سے گزرا تو ساری نظریں میری طرف اٹھیں۔ میں نے مسکرا کر انہیں دیکھا، انہوں نے ہاتھ ہلا کر جواب دیا اور میں آگے بڑھ گیا۔

کچھ موکن نوجوان اپنی کبنگ کی مرمت اور نئی کبنگ بنانے میں مصروف تھے۔ میں اُن کے قریب بیٹھ گیا اور بہت دیر تک یہ دیکھتا رہا کہ وہ اپنی کشتیاں کیسے بناتے ہیں؟ گت چا اور کچھ دوسرے بڑی عمر کے مرد بھی وہاں موجود تھے۔ وہ انہیں ہدایت دے رہے تھے اور بتا رہے تھے کہ ایک مضبوط اور روایتی کبنگ کی تیاری میں کن کن باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔

دن کے گیارہ بجے تھے۔ ایک نوجوان ناریل توڑ کر لایا اور مجھے پیش کیا۔ ناریل کا اتنا تازہ پانی پہلی بار پی رہا تھا۔ وہ مجھے نہایت مہنگے برانڈڈ جوسوں سے بھی لاکھ گنا اچھا لگا۔ میں ناریل پانی پینے کے ساتھ ساتھ گپ شپ بھی کرتا جا رہا تھا اچانک شفاف آسمان پر بادل کی ٹکڑیاں نظر آنے لگیں اور لگ بھگ آدھا گھنٹے کے اندر اندر گھرے بادل چھا گئے۔ ہم وہیں بیٹھے ہوئے تھے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

''لگتا ہے کہ بس بارش ہونے والی ہے۔'' ایک بوڑھے نے آسمان کی طرف نظر ڈال کر خیال پیش کیا۔ کچھ دیر بعد ایک بوند میرے سر پر گری اور پھر تھوڑی دیر میں بارش شروع ہوگئی...... مون سون کی پہلی بارش۔

بارش کے بعد آرچی پلاگو کا حُسن اور بھی نکھر آیا تھا۔ اُس دن بارش میں بھیگنا مجھے بھی بہت اچھا لگا تھا۔ یہ موکن لوگوں کے ساتھ میری زندگی کا پہلا مون سون تھا۔ میرا پروگرام تھا کہ مون سون کی پہلی بارش کے بعد اُن سے رخصت لوں گا۔

اگلے دو دن بہت خوشگوار گزرے۔

میں جان چکا تھا کہ موکن خشکی پر اپنے یہ تین ماہ کیسے بسر کرتے ہیں۔ میری تحقیق مکمل ہو چکی تھی۔ اب مجھے لوٹنا تھا۔ میرے پاس سٹیلائٹ فون تھا۔ میں نے رابطہ کیا۔ مجھے لینے کے لیے دوسرے دن صبح سویرے خصوصی موٹر بوٹ پہنچ رہی تھی۔

اُس شام میں نے گت چا اور اس کے سب گھر والوں کو بتا دیا کہ میرا سفر تمام ہوا۔ وہ میرے لوٹنے کا سن کر اُداس ہوگئے تھے۔ میرے جذبات بھی اُن سے کچھ مختلف نہیں تھے مگر میں چاہنے کے باوجود ہمیشہ اُن کے ساتھ نہیں رہ سکتا تھا۔

وہ گت چا اور موکن باشندوں کے ساتھ میری آخری رات تھی۔ انہوں نے اپنی جھونپڑیوں کے سامنے کھلے میدان میں، میرے اعزاز میں خصوصی تقریب کا اہتمام کیا تھا۔ جزیرے پر موجود سارے مرد، عورتیں اور بچے بچیاں اُس تقریب میں شریک تھے۔ کئی جوان جوڑوں نے کھانے کے بعد گیت گائے اور لالٹین کی روشنی میں روایتی رقص کیا۔ میرے لیے انہوں نے کئی خصوصی دعائیہ گیت بھی گائے۔ اُس رات مجھے سمجھ آگیا کہ سرکاری فیسٹیول میں اور یہاں ہونے والے موکن رقص میں کیا فرق تھا۔ یہ بات کہنے اور لکھنے کی نہیں، صرف محسوس کرنے کی تھی۔ وہ رقص انہوں نے سرکار کی فرمائش پر کیا اور یہ اُن کے دل کی فرمائش تھی۔ سرکار اور دل کی فرمائش...... اُس رات یہ فرق میں نے دیکھا تھا۔ اُسی رات مجھے موکن کی وہ باتیں بھی یاد آئیں جو فیسٹیول سے واپسی پر اُس نے تشویش بھرے لہجے میں مجھ سے کی تھیں۔ تاروں بھرے آسمان تلے، ناریل کے تیل سے روشن دھیمی لو کے چراغوں کی سرخ روشنی میں اُن سب کے سچے اور خالص جذبے پُر جوش تھے۔ میں خود کو اُس وقت سحر زدہ محسوس کر رہا تھا۔

رات گزر گئی اور اگلے دن کا سورج طلوع ہوگیا۔

میں اپنا سامان باندھ کر تیار بیٹھا تھا۔ گت چا اور اس کی فیملی میرے ساتھ تھی۔ جزیرے کے کچھ اور لوگ بھی مجھے رخصت کرنے کے لیے آئے تھے۔ مجھے لے جانے کے لیے موٹر بوٹ بھی پہنچنے والی تھی۔ ہم ساحل پر بیٹھے تھے۔ ٹھیک دو ماہ، تین دن اور آٹھ گھنٹے پہلے، اسی طرح میں ایک ساحل پر کھڑا کبنگ کے آنے کا منتظر تھا۔ آج میں کبنگ والوں کو الوداع کہہ رہا تھا۔

آخر جدائی کا لمحہ آگیا۔ موٹر بوٹ آتی ہوئی نظر آرہی تھی۔

گت چا کے خاندان کو الوداع کہتے ہوئے مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے اپنے خاندان کو الوداع کہہ کر کسی اور ہی دنیا کے سفر پر جا رہا ہوں۔ ہم سب کی آنکھیں نم اور چہروں پر اُداسی تھی۔ میں بوٹ پر سوار ہوا۔

''الوداع میرے دوستو، سدا خوش رہو۔'' میں نے اُن کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ جواب میں ساحل پر کھڑے لوگوں نے داہنا ہاتھ اٹھا کر جواب دیا۔ بوٹ تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی۔ جزیرے پر کھڑے موکن باشندوں کے چہرے دھندلے پڑ رہے تھے۔ میں اب واپس اپنی دنیا میں لوٹ رہا تھا۔ گت چا کے بقول 'زمین والوں کی دنیا۔'

موکن آرچی پلاگو کی روح ہیں مگر کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ اب موکن باشندوں کے جسم اور روح، دونوں وقت کی گردش میں دھندلا رہے ہیں۔ یہ خیال کچھ غلط بھی نہیں۔ اُن کی نسل تیزی سے کم ہو رہی ہے۔ اب دنیا بھر میں ایک ہزار کے قریب ہی موکن باشندے زندہ بچے ہیں۔ واقعی وہ معدوم ہو رہے ہیں۔ اُن کی معدومی صرف ایک نسل کی ہی نہیں بلکہ ایک خانہ بدوش تہذیب، دیو مالائی عہد، اُن کی مخصوص بولی، کبنگ اور موکن ثقافت کی معدومی ہوگی۔ اُس لمحے میں نے دل کی گہرائیوں سے دعا کی کہ اے خدا! آرچی پلاگو کے جزیرے کو ہمیشہ موکن باشندوں کے پُر جوش رقص، دعائیہ گیت، کبنگ اور ان کے رسم و رواج سے آراستہ رکھنا۔

موٹر بوٹ تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ آرچی پلاگو بھی حدِ نظر سے دُور ہو چکا تھا۔ میں عرشے پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ موکن باشندوں کی زندگی کی اس دیو مالائی داستان کو کہاں سے لکھنا شروع کروں۔

تلاشِ ہند

طارق عزیز خان

وہ سب ایک نئی دنیا کی تلاش میں نکلے تھے۔ انہوں نے مصائب کے سمندر کو پار کیا، پچاسوں افراد کی جانوں کا نذرانہ دیا اور بالآخر سمندر میں ایک نئی راہ تلاش کرلی۔ ہند تک کا نیا راستہ تاکہ اس ''سونے کی چڑیا'' کو لوٹ سکیں۔

یہ 6 مارچ 1521ء کی تاریخ تھی۔ رات کی گہری سیاہی صبح کے سانولے پن میں تبدیل ہو رہی تھی۔ ساری رات وقفے وقفے سے برسنے والی بارش کے بعد اب مطلع صاف تھا۔ بھوکے پیاسے تکان سے چُور ملاح، فلیگ شپ ٹرینی ڈاڈ کے کھلے حصوں میں اِدھر اُدھر ٹانگیں پسارے اونگھ رہے تھے۔ ڈیاگو کارینا کی ڈیوٹی سب سے اونچے بادبان کو سنبھالنے پر تھی۔ وہ لکڑی کے ایک بانس کے سہارے نیم دراز ہوا سے پھڑ پھڑاتے بادبان کو دیکھ رہا تھا۔ ایک سناٹا سا

اس کے وجود کو گھیرے ہوئے تھا۔ اسے اپنے وہ دوست یاد آرہے تھے جو سہانے مستقبل کے سپنے دیکھتے دیکھتے پانی کی اس وسیع قبر میں اتر چکے تھے۔ اسے اپنا ننھا بیٹا یاد آرہا تھا۔ دو سال پہلے کا منظر اس کی آنکھوں میں گھومنے لگا۔ سویلی کی بندرگاہ میں اس کا چار سالہ بیٹا اور بیوی اسے الوداع کہنے آئے تھے۔ ڈیاگو کو دیر ہو رہی تھی لیکن اس کا بیٹا ساتھ جانے کی ضد میں اس کی گود سے اتر ہی نہیں رہا تھا۔

"آپ اکیلے نہیں جاسکتے۔" اس کے بیٹے نے ضد کی۔ "میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گا۔"

"دیکھو اپنی ماں کو تنگ نہ کرنا میں بہت جلد واپس آؤں گا۔" ڈیاگو نے بیٹے کو پیار کیا۔

"کیا میرے لیے ایک کشتی لے کر آئیں گے؟" اس کے بیٹے نے بندرگاہ میں لنگر انداز وکٹوریا کی طرف اشارہ کیا۔ "بالکل اس جیسی۔"

"ہاں میں وعدہ کرتا ہوں۔" ڈیاگو نے اس کے بال سہلائے۔ "ضرور لاؤں گا۔"

"نہیں، میں آپ کے ساتھ جاؤں گا۔" اس کا بیٹا گود میں مچلنے لگا۔ "آپ اپنا وعدہ پورا نہیں کرتے۔"

جدا ہوتے بیٹے کے آخری الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے...... اپنے پیاروں کی یاد میں اس کا دل کٹ سا گیا اور آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے سر جھٹکا اور دھیان بٹانے کے لیے یونہی دور مغرب میں دیکھنے لگا ...... وہ کیا ہے؟ ...... شاید ...... کوئی بادل کا ٹکڑا ...... اس نے ذرا غور سے دیکھا۔ نیم تاریکی کے غلاف میں لپٹا ایک جزیرہ دکھائی دے رہا تھا۔ بہت بڑا جزیرہ......

"میں اپنا وعدہ ضرور پورا کروں گا۔" ڈیاگو زیرِ لب بڑبڑایا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور چلّایا۔ "اٹھ جاؤ، زمین قریب ہے...... سب اٹھ جاؤ...... وہ دیکھو، وہ کیا ہے؟"

اس کے قریب لیٹے ہوئے ملاح ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ کچھ شور سا بلند ہوا۔ بادبانوں پر جھولتے کچھ پرندے پھڑپھڑا کر اُڑے۔ ملاحوں کو جزیرہ صاف دکھائی دے گیا۔ وہ چیخنے چلّانے اور خوشی سے نعرے لگانے لگے۔ تینوں بحری جہازوں پر ہلچل سی مچ گئی۔ ملاحوں کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے اور ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے تھے۔ سان مارٹن نے قطب نما اور دیگر آلات سے سر کھپانے کے بعد اعلان کیا کہ وہ اس وقت 14 ڈگری شمال کے خط پر موجود ہیں۔

خدشات اور امکانات کی آنکھ مچولی کا کھیل اپنے اختتام کو پہنچ گیا تھا۔ قدرت کو ان پر رحم آگیا تھا۔ انہوں نے بحرالکاہل کی خوفناک وسعت کو شکست دے دی تھی اور ممکنہ طور پر وہ ایشیا کے مشرقی دروازے پر دستک دے رہے تھے۔

زمین قریب ہونے کی خوشی میں میگلن نے سب سے پہلا حکم یہ دیا کہ ناشتے میں ملاحوں کو خوب پیٹ بھر کر خوراک دی جائے۔ دھیرے دھیرے طلوع ہوتے سورج کی روشنی میں جزیرے کے خدوخال نمایاں ہونے لگے۔ کچھ ہی دیر میں یہ واضح ہو گیا کہ وہاں ایک سے زیادہ جزیرے واقع تھے۔ یہ شمال مغربی بحرالکاہل میں ایشیا کی مشرقی سرحد پر واقع گوام (Guam) اور شمالی ماریانا (Northern Mariana) کے جزائر تھے۔ ہسپانوی ملاحوں نے ماریانا کے جنوبی حصے میں واقع روٹا (Rota) اور گوام کے بڑے جزیروں کو نظروں میں تولا اور ٹرینی ڈاڈ کا رخ گوام کی طرف کر دیا۔ انہوں نے جزیرے کی ساحلی لکیر کے ساتھ ساتھ بے شمار چھوٹی چھوٹی کشتیوں کو لنگر انداز دیکھا۔ وہاں کشتیوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ میگلن نے ان جزائر کو کشتیوں کے جزائر (Islands Of Sails) کا نام دیا۔

ہسپانوی بیڑے نے 98 دنوں کے دوران اوسطاً 8 کلو میٹر فی گھنٹا (4.32 ناٹ) کی رفتار سے آبنائے میگلن سے بحرالکاہل تک سفر کرتے ہوئے قریب 17 ہزار کلو میٹر کا طویل فاصلہ طے کیا تھا۔ اس دوران اُن کے 49 یورپین ساتھی موت کے منہ میں چلے گئے تھے اور اب میگلن کے تین بحری جہازوں پر کل 159 افراد سوار تھے۔ ان میں 151 یورپین، ایک میگلن کا غلام انریق، کاروال ہو کا برازیلین بیٹا اور چھ جنوبی امریکن راہنما تھے۔ 6 مارچ 1521ء کے تاریخی دن میگلن کے بحری جہازوں نے گوام کے مشرقی ساحل پر ٹھیک اس جگہ لنگر گرائے جہاں آج یونا (Yona) کی چھوٹی سی بندرگاہ واقع ہے۔ میگلن نے .... بطور پہلے یورپین کے یہاں قدم رکھا اور جزیرے کو اسپین کا علاقہ قرار دیا۔

☆☆☆

گوام کے جزیرے پر لنگر انداز ہوتے ہی مقامیوں کی ایک بھیڑ نے میگلن کے ساتھیوں کو گھیر لیا۔ وہ سفید فاموں کو دیکھ کر حیران تھے۔ مقامی لوگوں کے رنگ سفیدی مائل گندمی اور قد لمبے تھے۔ انہوں نے جانوروں کی کھالوں سے بنے لنگوٹ کس رکھے تھے۔ انریق نے ان سے بات چیت کی اور میگلن نے یہ دیکھ کر سکون کی سانس لی کہ وہ انہیں اپنی بات سمجھانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ مطلب یہ کہ وہ اپنے ہی لوگوں کے درمیان تھا۔ انریق نے نہ جانے مقامیوں کو کیا پٹی پڑھائی کہ وہ اگلے ایک گھنٹے کے اندر اندر تازے ناریل، کیلے اور اناس سے بھرے ٹوکروں کے ساتھ تازہ و فرائی کی ہوئی مچھلی لے کر ان کے پاس پہنچ گئے۔ میگلن کے بھوکے ساتھی کھانے پر جیسے ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے ہفتوں بعد بعد پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور تازہ پانی پیا۔ طویل عرصے بعد تازے اور میٹھے پھل کھانے کی وجہ سے ملاحوں کے دانتوں میں درد ہونے لگا۔ کھانے کے بعد انریق نے مقامیوں سے قیمتی یورپین اشیا کے بدلے مزید خوراک مہیا کرنے کے لیے کامیاب مذاکرات کیے۔

مقامی بازار کی سیر کے دوران میگلن یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہاں بادبانی بحری جہازوں سے متعلق ہر قسم کا سامان برائے فروخت موجود تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ تجارتی بحری جہازوں کا یہ سامان لوٹا گیا تھا۔ مقامی لوگ جتنے سیدھے دکھائی دیتے تھے اتنے تھے نہیں۔ وہاں لوٹ کا مال اس قدر زیادہ تھا کہ میگلن نے ان جزائر کو دیے گئے اپنے پہلے نام "کشتیوں کے جزائر" کو واپس لیتے ہوئے انہیں "چوروں کے جزائر" (Thieves Islands) کا نیا نام دیا۔

میگلن نے مقامیوں کے کسی معاملے میں مداخلت کرنے کی بجائے یہاں سے ریشمی کپڑے کے چند تھانوں کے بدلے بادبانوں کا کپڑا، چمڑے کے بڑے بڑے تھیلے، لوہے کے کین، بانس، تختے اور مضبوط لکڑی سے بنی کچھ چیزوں کی خریداری کی۔ گوام میں قیام کے دوران مقامی قائیوں کا یورپین کے ساتھ رویّہ دوستانہ رہا۔ انہوں نے میگلن کو بتایا کہ مالے کے جزائر یہاں سے چند دن کی مسافت پر واقع ہے۔ میگلن نے طے کیا کہ وہ ایک دو دن مزید آرام کے بعد اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جائے گا۔

بحرالکاہل کے گرم جہنم میں گزارے دنوں کے مقابلے میں گوام کا ہرا بھرا جزیرہ یورپین کے لیے کسی نخلستان سے کم نہیں تھا۔ وہاں ہر طرف سبزے کے قالین بچھے تھے اور آسمان پر نقرئی بادل مسکرا رہے تھے۔ گوام کی شفاف آب و ہوا، تازے میٹھے رس بھرے پھل، پروٹین سے بھرپور گوشت اور اناس سے کشید کردہ مقامی شراب نے ہسپانوی ملاحوں کو نئی توانائی بخشی۔ ان کی آنکھوں میں چمک آگئی اور بجھے ہوئے چہرے بحال ہو گئے۔ پیٹ کا جہنم سرد ہوا تو رگوں میں دوڑتے خون میں حرارت عود کر آئی۔ انہیں جزیرہ جنت اور وہاں کی گوری چٹی عورتیں حوروں کی مانند دکھائی دینے لگیں۔ چند ایک جلد باز قسم کے عاشقوں نے اپنے کیمپ کے قریب منڈلاتی مقامی دوشیزاؤں کی طرف پیش قدمی کی اور چھپ چھپا کر ہی سہی عجلت بازی کی چور چکاری میں کامیاب رہے۔ وصالِ یار سے فیض یاب ہونے والوں نے مقامی عورتوں کی جنسی کشش سے متعلق قصوں کو کچھ اس پیرائے میں بیان کیا کہ باقی کے عملے کی آتشِ شوق بھی بھڑک اٹھی۔ تاہم اس سے پہلے کہ ان کی ناآسودہ خواہشات بے لگام ہوتیں، ایک ناگہانی واقعہ پیش آگیا۔

یہ میگلن کی گوام میں قیام کی تیسری رات تھی۔ مقامی میزبان اپنے یورپین مہمانوں پر کچھ زیادہ ہی مہربان دکھائی دیتے تھے۔ انہوں نے یورپین کی بھنے ہوئے پرندوں، تلی ہوئی مچھلی، اناس کی رس بھری قاشوں اور دو تین اقسام کی

امریکا کے زیرِ انتظام گوام اور شمالی ماریانا کے جزائر شمال مغربی بحرالکاہل میں 13 سے 18 ڈگری شمال اور 145 ڈگری مشرق پر فلپائن سے 2 ہزار کلو میٹر مشرق، جاپان سے 2400 کلو میٹر جنوب اور نیوگنی سے 1800 کلو میٹر شمال میں واقع ہیں۔ 48 کلو میٹر لمبے اور 13 کلو میٹر چوڑے گوام کے جزیرے کا کل زمینی رقبہ 549 مربع کلو میٹر اور موجودہ آبادی 2 لاکھ (2010) نفوس پر مشتمل ہے۔ گوام کا صدر مقام آگانا (Agana) ہے جو جزیرے کے مغربی ساحل پر واقع علاقے کی اہم بندرگاہ ہے۔ گوام کے پچاس کلو میٹر شمال میں شمالی ماریانا کے جزائر واقع ہیں۔ یہ 4 بڑے اور 10 چھوٹے جزائر ہیں۔ جن کا کل زمینی رقبہ 457 مربع کلو میٹر اور آبادی ایک لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ شمالی ماریانا کے جزائر میں سب بڑا جزیرہ سائے پان (Saipan) ہے جس کا رقبہ 122 مربع کلو میٹر (47 مربع میل) ہے۔ ماریانا کے جزائر کا انتظامی دارالحکومت گاراپان (Garapan) اسی جزیرے کے مغربی ساحل پر واقع ہے۔ شمالی ماریانا کے باقی کے جزائر میں ٹائے نیان (Tinian)، اگوئی جان (Aguijan) اور روٹا کے جزیرے قابلِ ذکر ہیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

شراب سے تواضع کی۔ ہسپانوی ملاحوں نے پیٹ بھر کر مرغن کھانا کھایا اور پھر رات گئے تک شراب نوشی کرنے کے بعد اِدھر اُدھر ٹانگیں پسارے بے خبر سو گئے۔ پیگافی ٹا کے مطابق رات کے پچھلے پہر مقامیوں کے ایک گروہ نے ان کے بحری جہازوں پر لدی پانچ چھوٹی کشتیوں کو کھول لیا اور انہیں اپنے ساتھ لے گئے۔ خیریت رہی کہ انہوں نے نشے میں دھت عملے کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ اگلی صبح میگلن کو اس چوری کی خبر ملی تو وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے مسلح سپاہیوں کے ایک دستے کو کشتیوں کی بازیابی کے لیے روانہ کیا۔ سپاہی آبادی کے قریب پہنچے ہی تھے کہ گھات لگائے مقامیوں نے ان پر حملہ کر دیا۔ انہوں نے ہسپانوی سپاہیوں پر زہر میں بجھے تیر اور بھالے برسانے شروع کر دیے۔ تاہم وہ تربیت یافتہ سپاہیوں اور ان کے آتشی ہتھیاروں کا مقابلہ نہ کر سکے۔ کچھ ہی منٹوں میں میدان صاف ہو گیا۔ سپاہیوں کو ایک احاطے میں چھپائی گئی کشتیاں مل گئیں۔ کچھ سپاہیوں نے کشتیوں کو سنبھالا جبکہ باقیوں نے مقامیوں کے گھاس پھونس سے بنے جھونپڑوں کو آگ لگا دی۔ وہ گولیاں چلاتے ہوئے بندرگاہ کی طرف پلٹنے لگے۔ سپاہیوں کے بندرگاہ پہنچتے ہی میگلن نے جزیرہ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے عملے نے افراتفری میں اِدھر اُدھر بکھرا سامان جہازوں میں لوڈ کیا اور لنگر اٹھا کر کھلے سمندر کی طرف بڑھے۔ یورپین کو بھاگتے دیکھ کر مقامی لوگ شور مچاتے ہوئے ساحل پر آ پہنچے۔ ان کے جھونپڑوں سے آگ کی لپٹیں اٹھتی صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ مقامی سخت طیش میں چیخ چلا رہے تھے۔ انہوں نے گہرے پانی کی طرف بڑھتے بحری جہازوں پر تیر برسانے شروع کر دیے۔ بدقسمتی سے ایک تیر کون سیپ سیون کے کھلے حصے میں کھڑے ایک سپاہی کی گردن میں پیوست ہو گیا۔ وہ تیورا کر گرا اور فوراً ہی اس کی موت واقع ہو گئی۔ میگلن کے سپاہیوں نے دور ہوتے جزیرے پر چند ایک فائر کیے۔ اگلے ایک گھنٹے کے دوران بحری جہازوں اور چوروں کے جزیرے کے درمیان فاصلہ بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ میگلن نے بیڑے کا رخ مغرب کی طرف موڑ دیا۔ اب اس کی اگلی منزل مالے کے جزائر تھے۔ مگر اس انوکھے سفر کی روداد سنانے سے پہلے میں ان جزائر کا مکمل تعارف کرا دوں۔

مالے کے جزائر کرۂ ارض پر موجود جزائر کے سب سے بڑے گروپ ہیں جو ایشیا کے جنوب مشرق، آسٹریلیا کے شمال، جاپان کے جنوب اور بحرالکاہل کے مغرب میں واقع ہیں۔ یہاں واقع چھوٹے بڑے جزائر کی کل تعداد 25 ہزار کے لگ بھگ ہے۔ ایک دوسرے سے کسی زنجیر کی طرح جڑے یہ جزائر شمالاً جنوباً تین ہزار کلومیٹر لمبے اور شرقاً غرباً سات ہزار کلومیٹر چوڑے علاقے میں خطِ استواء کے دونوں جانب پھیلے ہوئے ہیں۔ مالے کے جزائر کا کل زمینی رقبہ [illegible] لاکھ مربع کلومیٹر اور آبادی 35 کروڑ (2010) کے قریب ہے۔

یہ جغرافیائی لحاظ سے جزائر کے چار بڑے خطوں، فلپائن کے جزائر، سنڈا کے جزائر، ملوکا کے جزائر اور نیوگنی کے جزائر پر مشتمل ہیں۔ انتظامی لحاظ سے یہ چاروں خطے کل 7 آزاد ایشیائی ممالک فلپائن، انڈونیشیا، ملائیشیا، برونائی، .... مشرقی تیمور اور پاپوانیوگنی کی آزاد مملکتوں کا حصہ ہیں۔

ان آزاد ممالک میں سے فلپائن، پاپوانیوگنی، ملائیشیا کا مشرقی حصہ اور برونائی جغرافیائی اعتبار سے بحرالکاہل کے جزائر مانے جاتے ہیں جبکہ انڈونیشیا، ملائیشیا کا مغربی جزیرہ نما حصہ، سنگاپور اور مشرقی تیمور بحرہند کے جزائر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ پندرھویں صدی عیسوی تک یورپین اقوام عام طور پر مالے کے جزائر کو گرم مصالحوں کے جزائر کے نام سے یاد کرتی تھیں۔ تاہم آج گرم مصالحوں کے جزائر کا لفظ انڈونیشیا کے مشرق میں واقع ملوکا کے جزائر کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

مالین جزائر کے طول و عرض میں درجنوں چھوٹے بڑے سمندر، خلیجیں اور آبنائیں موجود ہیں۔ یہاں واقع کھارے پانی کے ان ذخیروں میں بحیرہ سولاویسی، بحیرہ سولو، بحیرہ جاوا، بحیرہ باندا اور بحیرہ ملوکا قابلِ ذکر ہیں۔ یہاں موجود اہم بحری راستوں میں بحیرہ جنوبی چین کو خلیج بنگال سے ملانے والی آبنائے ملاکا، بحیرہ سولاویسی کو بحیرہ جاوا سے ملانے والی آبنائے ماکاسار، بحیرہ جنوبی چین کو بحیرہ سولو سے ملانے والی آبنائے بالاباک، بحیرہ جنوبی چین کو بحیرہ جاوا سے ملانے والی آبنائے کاری ماتا، بحیرہ جاوا کو بحرہند سے ملانے والی آبنائے لمبوک اور آبنائے سنڈا نمایاں ہیں۔

مالے کے جزائر سرسبز گھنے استوائی جنگلوں سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ یہاں کی آب و ہوا گرم مرطوب اور بارشوں کا اوسط 70 سے 160 انچ سالانہ ہے۔ سارا سال ہونے والی بارشوں اور معتدل آب و ہوا نے مالے کے جزائر کو انواع اقسام کے پودوں اور درختوں کے لیے ایک مثالی مقام بنا دیا ہے۔ یہاں پائے جانے والے درخت سارا سال ہرے بھرے رہتے ہیں اور ان کی تیز ترین نشوونما کی وجہ سے جنگلات میں درختوں کی کمی نہیں ہوتی۔ مالے کے طول و عرض میں پھولوں کی چالیس ہزار اور درختوں کی تین ہزار اقسام پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے بعض اقسام ایسی ہیں جو دنیا میں اور کہیں نہیں ملتیں۔ یہاں ناریل، سنگترے، کیلے اور آم کے درخت عام ملتے ہیں جبکہ ساگوان، صندل اور صنوبر سمیت درختوں کی پچاس ایسی اقسام ہیں جن سے صرف قیمتی لکڑی حاصل ہوتی ہے۔ یہ جزائر پھلوں، سبزیوں، گرم مصالحوں، چاول، چائے، کافی، پام آئل، کاغذ اور ربڑ کی پیداوار کے لیے عالمی شہرت رکھتے ہیں۔ خاص طور پر ملائیشیا اور انڈونیشیا کی نم آب و ہوا ربڑ کے درخت کی نشوونما کے لیے انتہائی موزوں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دونوں ممالک خام ربڑ کی پیداوار میں بالترتیب دنیا میں پہلے اور دوسرے نمبر پر ہیں۔ اس کے علاوہ معدنی وسائل میں یہاں تیل اور گیس بھی وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں۔

مالے کے جزائر کو انواع اقسام کی نایاب جنگلی حیات کا مسکن کہا جاتا ہے۔ یہاں کے استوائی جنگلات میں تیندوا، ایشیائی شیر، لومڑیاں، بندر، لنگور، مگرمچھ، گھڑیال، گرگٹ، خوشنما پرندے، چھپکلیاں، سیکڑوں اقسام کے حشرات اور درجنوں اقسام کے سانپ اور اژدہے عام ملتے ہیں۔ ماہرین حیاتیات کے مطابق دنیا میں اب تک حشرات کی 10 لاکھ کے قریب اقسام دریافت ہو چکی ہیں اور لگ بھگ 50 لاکھ اقسام کے حشرات ایسے ہیں جو ابھی بھی ہماری نظروں سے چھپے ہوئے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان غیر دریافت شدہ حشرات کی قریب آدھی تعداد کے پائے جانے کا امکان مالے کے جزائر ہی میں ہے۔ یہاں گھنے درختوں پر اٹھکیلیاں کرتے ماکاک بندر (Macaque)، گی بون بندر (Gibbon) اور پروبوس بندر (Proboscis) کی نسلوں کو عام دیکھا جا سکتا ہے۔ جبکہ بورنیو کے جزیرے پر خاص انجیر کے درخت پر رہنے والا نایاب بندر اورنگاٹان (Orang-Utan) دنیا میں اور کہیں نہیں ملتا۔ بورنیو کے جزیرے پر بیک وقت بلی اور کتے جیسا نایاب جانور ٹینگلا (Tangla) بھی پایا جاتا ہے۔ بورنیو، جاوا اور سماٹرا میں 18 فٹ لمبا کنگ کوبرا ملتا ہے جو جسم کے بل پر اگلے دھڑ کو زمین سے 3 فٹ تک اوپر اٹھا سکتا ہے۔ بورنیو وہ واحد جزیرہ ہے جہاں ایشیائی ہاتھی

گوام اور ماریانا پر پہلے انسانی قدم چار سے پانچ ہزار سال پہلے پہنچے تھے جب فلپائن سے تعلق رکھنے والے چند بحری قزاقوں نے ان جزائر پر قدم رکھا تھا۔ میگلن کے ہاتھوں دریافت کے وقت یہاں چامورو نسل کے 25 ہزار کے قریب لوگ آباد تھے۔ مقامیوں کا طرزِ زندگی قبائلی تھا اور یہ لوگ لکڑی، پتھر اور گارے سے بنے مکانات میں رہتے تھے۔ ان لوگوں کا ذریعۂ معاش زراعت، ماہی گیری اور قزاقی تھا۔ 1565ء میں اسپین نے ان جزائر پر باقاعدہ قبضہ کر کے انہیں اپنی نوآبادی بنانے کا اعلان کیا۔ اگلے تین سو سال تک یہاں اسپین کی حکومت رہی یہاں تک کہ 1898ء میں معاہدہ پیرس کے بعد اسپین نے گوام پر امریکا کا حقِ ملکیت تسلیم کر لیا۔ 1950ء میں گوام کی مقامی آبادی کو باقاعدہ طور پر امریکی شہریت دے دی گئی۔ ماریانا کی مختصر تاریخ کے مطابق جرمنی نے 1899ء میں ماریانا اور اس کے شمال میں واقع کچھ جزائر کو اسپین سے خرید لیا۔ اگلی ڈیڑھ صدی کے دوران یہ جزائر جرمن مائیکرونیشیا کے نام سے جانے جاتے رہے۔ 1914ء میں پہلی جنگِ عظیم کے دوران جاپان نے ماریانا سمیت مغربی بحرالکاہل کے بیشتر جزائر پر قبضہ کر لیا۔ تاہم دوسری جنگِ عظیم میں جاپانیوں کی شکست کے بعد یہ جزائر امریکا کے کنٹرول میں آ گئے۔ جنگ کے خاتمے پر اقوام متحدہ نے ایک معاہدے کے تحت شمالی ماریانا کے جزائر کو امریکا کے زیرِ انتظام دے دیا۔ 1975ء میں اقوام متحدہ کے تحت کرائے گئے ایک ریفرنڈم میں شمالی ماریانا کے 90 فی صد عوام نے آزادی کی بجائے امریکا کے کنٹرول میں رہنے کو ترجیح دی۔ جس کے بعد مقامی باشندوں کو امریکی شہریت دے دی گئی۔
آج ماریانا اور گوام کے باشندوں کی آدھی تعداد قدیم چامورو نسل سے تعلق رکھتی ہے جبکہ باقی کی آدھی آبادی غیر ملکیوں پر مشتمل ہے جس کا بڑا حصہ امریکی بحریہ سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ جزائر اپنے حسین مناظر اور معتدل آب و ہوا کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں۔ یہاں کے اہم وسائل میں سبزیاں، پھل، ماہی گیری اور فارمنگ نمایاں ہیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

بھی پایا جاتا ہے۔اوسطاً ساڑھے چار ٹن وزنی اس جانور کی اوسط عمر چالیس سال تک ہوتی ہے۔مقامی باشندے پچھلے پانچ ہزار سال سے اس دیوہیکل جانور کو بار برداری کے کام میں لا رہے ہیں۔مالے کے وسطی اور مغربی جزائر میں پائے جانے والے زہریلے سانپ انڈین پائے تھیان (Indian Python) کا وزن 45 کلوگرام اور لمبائی 20فٹ تک ریکارڈ کی گئی ہے۔

بورنیو، سولاویسی، سماٹرا اور ہالماہیرا کے جزائر پر سؤر کی ایک نسل مالین ٹے پر (Malayan Tapir) پائی جاتی ہے۔320 کلوگرام وزنی اس جانور کا پچھلا دھڑ سرمئی جبکہ اگلا دھڑ سیاہ ہوتا ہے۔سماٹرا کے جزیرے پر سفید ایشیائی گینڈے کی نایاب نسل بھی پائی جاتی ہے۔اس گینڈے کے قیمتی سینگ اور موٹی کھال اس کی سب سے بڑی دشمن ہے۔مقامی شکاریوں نے اس جانور کا اتنی بے دردی سے شکار کیا ہے کہ آج جزیرے پر ان کی آبادی ایک ہزار تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔

مالے کے جنوبی حصے میں سماٹرا کے مشرق اور تیمور کے مغرب میں ایک ایسی دنیا آباد ہے جہاں ڈائنوسار کے زمانے کے کچھ راز موجود ہیں۔یہ کوموڈو کے انڈونیشیائی جزائر ہیں جہاں دنیا کی سب سے بڑی اور خطرناک چھپکلی کوموڈو ڈریگن (Komodo Dragon) پائی جاتی ہے۔بھورے رنگ کی اس گوشت خور ڈراؤنی چھپکلی کا وزن 140 کلوگرام اور لمبائی 10فٹ تک ہوسکتی ہے۔یہ جانور ہوا میں محسوس کرکے اپنے شکار کی پوزیشن جانچ لیتا ہے۔ہمیشہ بھوکا اور اگلے شکار کی تاک میں رہتا ہے۔عام طور پر لومڑیاں، سؤر، بندر اس کا شکار ہوتے ہیں لیکن یہ موقع ملنے پر اپنے سے پانچ گنا بڑی جنگلی بھینس اور انسان تک کو ہڑپ کرسکتا ہے۔اپنے سے بڑے جانور پر حملہ کرنے کا اس کا طریقہ بڑا ہی گھناؤنا ہے۔یہ اچھل کر بھینس کو کاٹ لیتا ہے۔اس کے لعاب میں موجود مہلک زہر بھینس کے جسم میں سڑتا ہوا زخم بنا دیتا ہے۔دھیرے دھیرے بڑھتی موت معاملے کو دو ہفتے تک طویل کرسکتی ہے لیکن بالآخر بھینس ہار مان لیتی ہے تب ڈریگن اس پر ٹوٹ پڑتا ہے۔یہ نایاب چھپکلی دنیا میں صرف کوموڈو اور اس سے ملحقہ پانچ جزائر میں ہی پائی جاتی ہے۔ایک اندازے کے مطابق ان جزائر میں اس کی تعداد پانچ ہزار کے قریب ہے۔انڈونیشیائی حکومت نے اس کی نسل بچانے کے لیے ان جزائر کو کوموڈو نیشنل پارک کا درجہ دے دیا ہے۔

مالے کے مغربی حصے میں واقع نیوگنی اور ملوکا کے جزائر کو رنگ برنگے پرندوں کی سرزمین کہا جاتا ہے۔یہاں خوبصورت پرندوں کی 145ایسی اقسام پائی جاتی ہیں جو دنیا میں اور کہیں نہیں ملتیں۔اپنے خوش نما رنگوں اور خوبصورتی کی وجہ سے ان پرندوں کو جنت کے پرندے (Bird Of Paradise) کہا جاتا ہے۔کسوری (Cassowary) یہاں پایا جانے والا سب سے بڑا پرندہ ہے۔مور جیسے پنجے، سیاہ گول جسم، نیلی گردن اور سر پر بھورے رنگ کی کلغی سجائے اس پرندے کا قد 4 سے 6فٹ تک اور وزن 50 کلوگرام تک ہوسکتا ہے۔وزنی ہونے کی وجہ سے یہ پرندہ اڑ نہیں سکتا لیکن حیرت انگیز طور پر یہ 48 کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے بھاگ سکتا ہے۔کسوری جوڑے میں انڈے سینے کی ذمے داری نر کی ہوتی ہے۔مادہ انڈے کو نر کے حوالے کرکے خود نئے ساتھی کی تلاش میں غائب ہوجاتی ہے۔برطانوی ماہرِ حیاتیات الفریڈ رسل والیس (Alfred Russel Wallace) کے مطابق خوش نما پرندوں کے علاوہ ملوکا کے جزائر کئی نایاب جانوروں کا مسکن ہیں۔یہاں پایا جانے والا 31 انچ اونچا، ساڑھے تین فٹ لمبا اور سو کلوگرام وزنی بابی روسا (Babirusa) نسل کا سؤر دنیا میں اور کہیں نہیں ملتا۔نیوگنی اور ہالماہیرا کے جزائر میں 26 انچ تک لمبے استوائی چوہے فالینگر (Phalanger) کی نسل بھی پائی جاتی ہے۔نیوگنی میں ڈیڑھ میٹر تک پروں کے پھیلاؤ والے دنیا کے سب سے بڑے چمگادڑ بھی پائے جاتے ہیں۔یہ خوراک کی تلاش میں 60 کلومیٹر کے دائرے میں پرواز کرسکتے ہیں۔

جدید تحقیق کے مطابق لگ بھگ 50لاکھ سال پہلے یوریشین پلیٹ، فلپائن پلیٹ اور انڈو آسٹریلین پلیٹ کے باہمی ٹکراؤ کے نتیجے میں مالے کے ہزاروں جزائر کے جھنڈ نے جنم لیا۔یہاں آج بھی درجنوں زندہ آتش فشاں پہاڑ واقع ہیں جو ہر گزرتے دن کے ساتھ یہاں کے جغرافیہ کو تبدیل کررہے ہیں۔ماہرین آثارِ قدیمہ کے مطابق ان جزائر پر پہلے انسان کی آمد لگ بھگ 40ہزار سال پہلے ہوئی جب جنوب مشرقی ایشیائی باشندوں نے خلیج بنگال اور بحیرہ جنوبی چین کو پار کرکے بورنیو اور سماٹرا کے جزائر پر قدم رکھا۔ 2004ء میں آسٹریلیا سے تعلق رکھنے والے ماہرین نے انڈونیشیا کے جزیرے فلورنس میں کھدائی کے دوران یہاں سے 18ہزار سال پرانے ایسے انسانی ڈھانچے برآمد کیے تھے

مالے کی حدود میں واقع ممالک سے متعلق بنیادی اعداد و شمار

ملک	دارالحکومت	رقبہ	آبادی	قومی زبان	کرنسی	مذہب	خواندگی	آزادی کا دن
انڈونیشیا	جکارتہ	1904443 مربع کلومیٹر	21 کروڑ	بہاسا	روپیہ	اسلام	87فیصد	27دسمبر 1949ء (ہالینڈ)
ملائیشیا	کوالالمپور	329758 مربع کلومیٹر	2 کروڑ	بہاسا	رنگٹ	اسلام	88فیصد	31اگست 1957ء (برطانیہ)
فلپائن	منیلا		8کروڑ 3لاکھ	فلی پی نو	پیسو	عیسائیت	95فیصد	4جولائی 1946ء (امریکا)
پاپوانیوگنی	پورٹ موریس بائے	462840 مربع کلومیٹر	50لاکھ	پڈگن	کینا	عیسائیت	76فیصد	16ستمبر 1975ء
مشرقی تیمور	ڈلی	14874 مربع کلومیٹر	12لاکھ	بہاسا	امریکی ڈالر	عیسائیت	60فیصد	20مئی 2002ء (انڈونیشیا)
برونائی	بندرسری بیگوان	5765 مربع کلومیٹر	5لاکھ	مالے	ڈالر	اسلام	92فیصد	یکم جنوری 1984ء (برطانیہ)
سنگاپور	سنگاپور	648	50لاکھ	چینی	ڈالر	بدھ مت	92فیصد	9اگست 1965ء

جن کے قد 3.3فٹ تھے۔یہ انسان ہوموایرکٹس (Homo Erectus) نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔آج مالے کے طول و عرض میں سات سو کے قریب مختلف نسلوں کے لوگ آباد ہیں اور یہاں بارہ سو کے قریب مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔نیوگنی اور انڈونیشیا کے مشرقی جزائر میں بسنے والی دانی (Dani) نسل کے لوگ یہاں پر پچھلے 35ہزار سال سے آباد ہیں۔قارئین کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ صرف نیوگنی کے جزیرے ہی میں ایک ہزار زبانیں بولی جاتی ہیں اور ان میں سے آدھی زبانیں صرف ایک ہزار لوگ ہی بولتے ہیں۔مطلب یہ کہ آپ کو نیوگنی میں صرف دو افراد ایسی زبان بولتے ہوئے مل سکتے ہیں جو دنیا میں نہ تو کوئی بول سکتا ہے اور نہ سمجھ سکتا ہے۔اور یہ بھی کوئی حیرانی کی بات نہیں کہ آج نیوگنی میں ہزاروں سال پرانی کوئی زبان بولنے والا صرف ایک آدمی ہی زندہ ہو۔

عہدِ وسطیٰ (Middle Ages) کے دوران مالے کے ہزاروں جزائر میں متعدد چھوٹی چھوٹی آزاد و خودمختار سلطنتیں قائم تھیں۔یہاں کا طرزِ معاشرت قبائلی اور سب سے بڑا مذہب ہندو مت تھا۔تاہم آبادی کا ایک بڑا حصہ سیکڑوں دیوی دیوتاؤں کے ساتھ مختلف مظاہرِ فطرت کی پوجا بھی کرتا تھا۔1049ء میں جاوا کے ایک مقامی حکمران کنگ اڑلنگا (Airlangga) کی وفات کے بعد مشرقی جاوا کے علاقے پر مشتمل کڈری (Kediri) کی سلطنت وجود میں آئی۔12ویں صدی کے دوران کڈری کے حکمران کنگ جایا بھایا (Jayabhaya) کے عہد (1135-57) میں یہ ایک طاقتور ریاست کے طور پر قائم تھی۔1222ء میں مشرقی جاوا کے ایک حکمران کرتا جایا (Kertajaya) نے کڈری کو شکست دے کر سلطنت آف سنگوسری (Sangosari) کی بنیاد رکھی۔1292ء میں سنگوسری کے آخری حکمران کنگ کرتاناگارا (Kertanagara) کے قتل کے بعد اس کے سوتیلے بیٹے شہزادے وجایا (Vijaya) نے جاوا، سماٹرا، تیمور اور ملوکا پر مشتمل مالے کی سب سے بڑی اور طاقتور سلطنت ماجاپاہٹ (Kingdom Of Majapahit) کی بنیاد رکھی۔یہی وہ وقت تھا جب ہندوستان کے صوبے گجرات سے آئے عرب تاجروں نے سماٹرا کے جزیرے میں اسلام کی تبلیغ کی۔شمالی سماٹرا کا مقامی حکمران سلطان ملک ال صالح آف پسپائی یہاں کا پہلا مسلمان حکمران تھا۔مارکو پولو نے 1292ء اور مسلمان سیلانی ابن بطوطہ نے 1342ء میں ان جزائر کی سیر کی۔چودھویں صدی کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

دوران مالین جزائر کے ہندوستانی اور عرب تاجروں کے ساتھ گہرے تجارتی روابط قائم ہو گئے تھے۔ سن 1400ء میں ساٹرا کے جزیرے پر واقع پالم بانگ کی مملکت کے ایک شہزادے .... پارامیسوارا (Parameswara) نے بورنیو، سنگاپور جزیرہ نما مغربی ملائشیا اور سولاویسی کے جزیرے پر مشتمل سلطنت آف ملاکا کی بنیاد رکھی۔ سن 1405 میں چین کی منگ حکومت نے چینی سپہ سالار ژینگ ہی (Zheng He) کی قیادت میں 317 بحری جہازوں اور بیس ہزار سے زیادہ ملاحوں کے ایک بیڑے کو بحر ہند کی مہمات پر روانہ کیا۔ ژینگ ہی کے کچھ لوگ فلپائن اور کنگڈم آف ملاکا ہی میں رک گئے۔ انہوں نے آنے والے سالوں میں ملاکا اور چین کے درمیان گرم مصالحوں کی تجارت کے معاہدے کیے۔

پندرھویں صدی کے دوران رومن انڈیا روٹ پر عربوں اور اطالوی تاجروں کی اجارہ داری کے بعد بعد مغربی یورپی اقوام نے محسوس کیا کہ انہیں ہندوستان اور مالے تک رسائی کے نئے سمندری راستے کو دریافت کرنا ہوگا۔ 1492ء میں امریکا کی دریافت کے بعد بین الاقوامی سیاست نے ایک نیا رخ اختیار کرلیا۔ جب 1494ء میں پرتگال اور اسپین کے مابین ہوئے دنیا کی تقسیم کے معاہدے کی رو سے اسپین کے لیے بحر ہند کے راستے ایشیا تک رسائی کا بحری راستہ بند ہو گیا۔ اس معاہدے کے بعد پرتگالیوں نے 1498ء میں ہندوستان اور 1509ء میں کنگڈم آف ملاکا میں قدم رکھا۔ پرتگالیوں نے مالے کے وسائل پر قبضے کے لیے تجارت اور سیاست سمیت ہر حربہ استعمال کیا۔ انہوں نے مقامی حکمرانوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے انہیں قیمتی تحائف پیش کیے اور جہاں موقع ملا ان کی اندرونی چپقلش کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں آپس میں دست و گریباں بھی کیا۔ پرتگالیوں کے پاس مقامیوں کے روایتی ہتھیاروں کی نسبت جدید آتشی ہتھیار تھے۔ مقامی حکمران ان ہتھیاروں سے خوف کھاتے تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ یورپین کے جدید ہتھیاروں کے ساتھ دوستی رکھ کر اپنے دشمنوں کو مرعوب کرسکیں۔ 1511ء میں سلطنت آف ملاکا پر قبضہ مکمل کر لینے کے بعد 1512ء میں پرتگالیوں نے مالے کے جنوب مشرقی حصے میں واقع ملوکا کے جزائر میں قدم رکھا اور وہاں کے بعض مسلمان حکمرانوں کے ساتھ گرم مصالحے کی تجارت کے معاہدے کیے۔ ان معاہدوں کے بعد یورپ کو گرم مصالحوں کی ترسیل پر پرتگال کی اجارہ داری قائم ہوگئی۔ اُدھر بحر ہند کا راستہ بند ہو جانے کے بعد پرتگالی نژاد مہم جُو فرڈی نینڈ میگلن نے اسپین کے لیے مغرب کی طرف سے بحرالکاہل کو پار کر کے پہلے گوام اور پھر مالے کے جزائر میں قدم رکھا۔ میگلن کی مالے میں آمد کے بعد 1542ء میں میکسیکو میں تعینات ہسپانوی بحریہ کے ایک افسر روئے لوپیز ڈی ویلالوبوس (Ruy Loez de Villalobos) نے فلپائن کا دورہ کر کے ان جزائر کو اسپین کے بادشاہ چارلس اول کے بیٹے فلپ دوم کے نام پر Islas Filipinas کا نام دیا۔ 1565ء میں اسپین نے فلپائن کے جزیرے سیبو پر اپنی پہلی نوآبادی قائم کی۔ اس صدی کے آخر تک فلپائن پر اسپین جبکہ انڈونیشیا سمیت مالے کے تمام جنوبی جزائر پر پرتگال کا کنٹرول قائم ہو چکا تھا۔ 17ویں صدی کے دوران ڈچ بحری جہاز بحر ہند کے راستے مالے میں داخل ہوئے اور انہوں نے پرتگالیوں کو اس علاقے سے باہر نکال کر انڈونیشیا، برونائی، سنگاپور اور نیوگنی سمیت تمام اہم جزائر پر قبضہ کرلیا تھا۔ اسی صدی کے آخر میں برطانیہ نے ملائیشیا اور برونائی کو اپنی عملداری میں لے لیا تھا۔ 19ویں صدی کے دوران اسپین کو بھی مالے سے نکلنا پڑا۔ جب 1898ء میں امریکا کے ساتھ ہوئی جنگ کے نتیجے میں فلپائن اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ 20ویں صدی مالے کے جزائر میں سیاسی آزادی کی صدی تھی اس صدی کے دوران یہاں بسنے والی تمام اقوام نے بیرونی طاقتوں سے آزادی حاصل کر لی تھی۔ آزادی کے بعد یہاں واقع ساتوں ممالک نے ہر شعبۂ زندگی میں کچھ اس طرح ترقی کی کہ صدیوں تک گرم مصالحوں کے لالچ میں یورپین اقوام کے آگے سرنگوں رہنے والی مالیائی اقوام آج دنیا کی سیاسیات اور اقتصادیات میں نمایاں حیثیت کی مالک ہیں۔

ان جزائر کے تعارف کے بعد اب پھر ہم میگلن کی سفر کہانی کی طرف چلتے ہیں۔

9 مارچ کے دن گوام کے جزیرے پر مقامیوں کے ساتھ ہوئی مڈبھیڑ کے بعد ہسپانوی بحری جہاز مغربی تجارتی ہواؤں کے دوش پر سفر کرتے ہوئے بحیرہ فلپائن میں داخل ہوئے۔ اگلے ایک ہفتے تک یہ لوگ مغرب کی طرف بڑھتے رہے۔ اس دوران موسم گرم مرطوب رہا لیکن پانی اور خوراک کا وافر ذخیرہ محفوظ ہونے کی وجہ سے ملاحوں کے لیے کوئی پریشانی پیدا نہیں ہوئی۔ بحیرہ فلپائن میں سفر کے دوران ملاح خوش اور پُرجوش تھے۔ میگلن اور اس کے غلام انریق کے سوا وہ سب پہلی بار ایشیائی سرزمین پر قدم رکھنے والے تھے۔ لگ بھگ ایک ہفتے کے سفر کے دوران ہسپانوی بیڑے نے ہزار کلومیٹر چوڑے بحیرہ فلپائن کو پار کر کے فلپائن کے چھوٹے بڑے سیکڑوں جزائر کا نظارہ کیا۔

میگلن کو دس سال پہلے کنگڈم آف ملاکا میں گزارے وہ دن اچھی طرح یاد تھے جب اسے پہلی بار مالے کے شمال میں واقع ان جزائر کے بارے میں معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ وہ جب تک ملاکا میں رہا فلپائن کی دریافت کے خیال سے پیچھا نہیں چھڑا سکا۔ نہ جانے کیوں یہ جزائر اسے اپنی طرف بلاتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ سچ یہ تھا کہ فلپائن کی دریافت کے خیال نے ہی اسے مغرب کی طرف سے ایشیا تک رسائی کے متعلق سوچنے پر مجبور کیا تھا۔ میگلن کو اپنے راستے میں آنے والی مشکلات کا اندازہ تھا۔ تاہم وہ جوں جوں فلپائن کے بارے میں سوچتا رہا مغرب کی طرف سے ایشیا تک رسائی کی خواہش بھی اس کے دل و دماغ میں جڑ پکڑتی رہی۔ آج میگلن کی برسوں پرانی وہ خواہش پوری ہونے والی تھی۔ اس نے آنکھوں میں تشکر کا احساس لیے آسمان کی طرف دیکھا۔ قدرت نے اسے ایک بہت بڑے امتحان میں سرخرو کر دیا تھا۔

دوپہر ہوتے ہوتے مقامی ماہی گیروں کی درجنوں چھوٹی بڑی کشتیوں نے یورپین کے تینوں بحری جہازوں کو گھیر لیا تھا۔ مقامیوں کی راہنمائی میں وہ لوگ سولوآن (Suluan) کے چھوٹے جزیرے کے قریب سے ہوتے ہوئے آگے بڑھے۔ وہ خطِ استواء سے 11 ڈگری شمال اور 126 ڈگری مشرق کے خط پر واقع ہومون ہون (Homonhon) کے جزیرے کے قریب پہنچے۔ یہ 16 مارچ 1521ء کا تاریخی دن تھا جب فلیگ شپ ٹرینی ڈاڈ کی قیادت میں کون سیپ سیون اور وکٹوریا نے جزیرے کے مشرقی ساحل پر ٹھیک اس جگہ لنگر گرائے جہاں آج ہومون ہون کی چھوٹی سی بندرگاہ واقع ہے۔

اسپین کی ملکہ ازابیلا کے مغرب کی طرف سے ایشیاء تک رسائی کے خواب کو تعبیر مل گئی۔ میگلن نے بطور پہلے یورپین کے فلپائن کی سرزمین پر اپنا تاریخی قدم رکھا۔ بنی نوعِ انسان میں وہ پہلا مہم جو کہلایا جس نے پہلے مشرق میں بحر ہند کے راستے ایشیا اور اب مغرب میں بحرالکاہل کے راستے ایشیا پہنچ کر کرۂ ارض کے گرد پہلا کامیاب چکر مکمل کرلیا تھا۔ میگلن کے اس تاریخی سفر نے نہ صرف یورپین کے لیے ایشیا کے مغربی دروازے کو کھول دیا تھا بلکہ اس کے اس تاریخی چکر نے کرۂ ارض کے چپٹا ہونے کو لے کر کلیسائے

فلپائن 11 بڑے اور 7107 چھوٹے جزائر کا مجموعہ ہے۔ یہ جزائر مالے کے شمالی حصے میں 100 کلومیٹر لمبے اور 11 سو کلومیٹر چوڑے علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ فلپائن کے شمال میں آبنائے لوزون واقع ہے جو بحیرہ جنوبی چین کو بحیرہ فلپائن سے ملاتی ہے جنوب میں بحیرہ سولاویسی کے پار انڈونیشیا کے جزائر مشرق میں بحیرہ فلپائن کا کھلا سمندر اور مغرب میں بحیرہ جنوبی چین کے پار جزیرہ نما انڈوچائنہ (ویت نام، لاؤس، کمبوچیا، ملائیشیا، تھائی لینڈ) واقع ہیں۔ فلپائن میں شامل بلحاظ رقبہ لوزون، منڈاناؤ، لیٹے، پانے، پالاوان اور سیبو کے جزائر نمایاں ہیں۔ ملک کے ساحلوں کی لمبائی 36 ہزار 289 کلومیٹر ہے۔ لوزون کے جزیرے پر واقع کاگیان سب سے لمبا دریا (لمبائی 350 کلومیٹر) اور اسی جزیرے پر 891 مربع کلومیٹر پر پھیلی جھیل لاگونا (Laguna) ملک کی سب سے بڑی جھیل ہے۔ منڈاناؤ کے جزیرے پر فلپائن کا سب سے اونچا پہاڑ ماؤنٹ آپو (Apo) واقع ہے جس کی بلندی 9692 فٹ ہے۔ فلپائن میں 90 فیصد عیسائی، 7 فیصد مسلمان اور باقی دیگر مذاہب کے ماننے والے آباد ہیں۔

روم کے قدیمی دعوے کو بھی باطل ثابت کر دیا تھا۔

ہسپانوی بیڑے نے آبنائے میگلن سے لے کر فلپائن کی دریافت تک بحرالکاہل میں کل 3 مہینے اور 16 دن کے سفر میں لگ بھگ 19 ہزار کلومیٹر کا ریکارڈ فاصلہ طے کیا تھا۔ انہیں اسپین سے نکلے 1 سال 7 ماہ اور 6 دن ہو چکے تھے اس دوران مجموعی طور پر انہوں نے لگ بھگ 34 ہزار کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا تھا۔ میگلن کو اپنی منزل پر پہنچنے کی بھاری قیمت چکانا پڑی تھی۔ وہ اپنے 5 میں سے 2 بحری جہازوں اور سو سے زیادہ ملاحوں سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا اور اب فلپائن آمد کے وقت اس کے تین بحری جہازوں پر کل 150 یورپین ملاح سوار تھے۔

میگلن کے ہاتھوں دریافت کے وقت فلپائن کے طول و عرض میں 80 کے قریب زبانیں بولی جاتی تھیں جن میں شمالی اور وسطی جزائر میں بولی جانے والی تاگالوگ (Tagalog)، ایلوکانو (Ilocano)، ہیلی گائے نون (Hiligaynon)، جنوبی اور وسطی جزائر میں سیبوآنوس (Cebuanos)، آلونگوس (Alongos)، بیکولانوس (Bicolanos)، بی کول (Bicol)، پمپان گان (Pampangan)، پنگاسی

WWW.PAKSOCIETY.COM

نان (Pangasinan) اور وارے وارے (Waray-Waray) نمایاں تھیں۔ تمام فلپائنی جزائر چھوٹی بڑی درجنوں آزاد و خود مختار ریاستوں میں تقسیم تھے۔ یہاں کا طرزِ معاشرت قبائلی، سب سے بڑا مذہب ہندومت اور معاش کا بڑا ذریعہ زراعت اور ماہی گیری تھا۔ انڈونیشیا، چین اور انڈوچائنا کی نسبت فلپائنی جزائر جدید تہذیب سے کسی قدر دور تھے اور پورے معاشرے میں توہم پرستی کا عکس ہر شعبۂ زندگی پر چھایا ہوا تھا۔ ہر قبیلے میں شادی بیاہ، موت اور زندگی سے متعلق مختلف عجیب و غریب رسم و رواج موجود تھے۔ فلپائنی معاشرے میں ایک فرد کی درجنوں بیویاں ہونا یا ایک شادی شدہ عورت کے کئی مردوں سے تعلقات ہونا ایک عام سی بات تھی۔ عورت کو بچہ پیدا کرنے کی مشین سمجھا جاتا تھا اور مرد و زن کی اکثریت کے نزدیک ستر پوشی کا مطلب صرف نچلے دھڑ کو چھپانا تھا۔ یورپین کی آمد کے وقت یہاں کے جنوب مغربی جزائر میں انڈونیشیا سے تعلق رکھنے والے مسلمان قبائل بھی آباد تھے جنھیں موروس (Moros) کہا جاتا تھا۔ سیاسی طور پر تمام ہندو ریاستیں گو کہ ایک دوسرے سے عناد رکھتی تھیں تاہم جنوب سے آئے مسلمانوں کو وہ سب اپنا مشترکہ دشمن تصور کرتے تھے۔ میگلن کی قیادت میں ہسپانوی یہاں قدم رکھنے والے پہلے یورپین تھے۔ تاہم پرتگالیوں کی مالے کے جنوبی جزائر میں سرگرمیوں کی کہانیاں فلپائن کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی تھیں اور مقامی حکمران اپنے سفید فام دوستوں کے انتظار میں تھے۔

ہومون ہون کی بندرگاہ میں لنگر انداز ہونے کے بعد میگلن نے فلپائن کا کوئی نام رکھے بغیر اسے اسپین کا علاقہ قرار دیا۔ اس نے ہسپانوی جہاز رانوں اور ملاحوں کے ہمت اور حوصلے کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ مغرب کی طرف سے ایشیا تک رسائی ایک عظیم کارنامہ ہے۔ انہیں اس تاریخی کامیابی کے موقع پر بحرالکاہل میں بچھڑے اپنے ساتھیوں کو بھی یاد رکھنا چاہیے۔ میگلن نے کون سیپ کے کپتان سیرانو، وکٹوریا کے کپتان ڈورٹے باربوسا، سینئر جہاز راں کاروال ہو، مارٹن مینڈز، ایل کانو، اسپینی اوسا اور ماہر فلکیات سان مارٹن پر واضح کیا کہ اب انہیں اپنی آخری منزل ملوکا کے جزائر پہنچ کر اس مہم کے مقاصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا ہے۔ پرتگالیوں کے دعوے کے مطابق گرم مصالحوں کے جزائر ان کی ملکیت والے علاقے میں واقع ہیں۔ یہ دعویٰ ..... ٹھیک ہے یا غلط، تاہم وہ کوشش کریں گے کہ ان کا پرتگالیوں سے سامنا نہ ہونے پائے۔ میگلن نے طے کیا کہ ان جزائر میں تازہ دم ہو جانے کے بعد وہ جنوب میں ملوکا جانے کی منصوبہ بندی کریں گے اور وہاں سے گرم مصالحے کی ایک بڑی کھیپ حاصل ہو جانے کے بعد بغیر وقت ضائع کیے بحرالکاہل ہی کے راستے وطن واپس روانہ ہو جائیں گے۔

بات چیت کے آخر میں میگلن نے اپنے ساتھیوں کو مشورہ دیا کہ وہ ان جزائر میں سیر سپاٹے کے دوران اپنے آتشی ہتھیاروں کی خوب اچھی طرح نمائش کریں اور مقامیوں کو مرعوب کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں۔

میگلن نے دیکھا کہ بندرگاہ میں مقامیوں کی ایک بہت بڑی بھیڑ جمع ہو گئی تھی۔ ان کا رویہ دوستانہ تھا اور وہ سفید فاموں کو دیکھ کر خوش دکھائی دیتے تھے۔ مقامیوں کو دیکھ کر میگلن کے غلام انریق کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ اپنے ہم وطنوں میں گھل مل گیا۔ مقامی لوگ ملایا اور چینی تہذیب کے ملاپ کا نمونہ تھے۔ ان کے قد درمیانے، جسم صحت مند، رنگت سفیدی مائل گندمی اور نقوش موٹے تھے۔ مرد اور عورتوں دونوں نے جانوروں کی کھالوں اور اون سے بنے مختصر لباس پہنے ہوئے تھے۔ مردوں نے سروں پر پگڑی نما بڑی بڑی ٹوپیاں پہن رکھی تھیں جن میں پرندوں کے پر اُڑسے ہوئے تھے۔ مردوں کے چہروں پر رنگ برنگے نقش بنے ہوئے تھے اور انہوں نے اپنے بازوؤں پر مختلف جانوروں کی تصویریں کھدوائیں (Tatoos) ہوئی تھیں۔ عورتیں سونے چاندی کے زیورات سے لدی پھندی تھیں اور لباس کے معاملے میں لاپروا معلوم ہوتی تھیں۔ بھیڑ میں موجود بیشتر عورتوں نے لباس کے نام پر صرف زیریں جسم کے گرد ایک کپڑا لپیٹ رکھا تھا۔ میگلن کا عملہ بندرگاہ میں اپنا کیمپ قائم کرنے کی تیاری کر رہا تھا کہ اچانک وہاں کچھ شور سا بلند ہوا۔ حلیے سے سپاہی دکھائی دے رہے بھالوں اور لاٹھیوں سے لیس درجنوں مقامیوں نے عام لوگوں کو بندرگاہ سے دور ہٹانا شروع کیا۔

میگلن کو بتایا گیا کہ مقامی راجا اس کے استقبال کے لیے وہاں پہنچ رہا ہے۔ راجا کی آمد کا سن کر میگلن نے قریب کھڑے سیرانو اور اسپینی اوسا کو کچھ ہدایات دیں۔ کچھ دیر ایک سجی سجائی بیل گاڑی نما رتھ بندرگاہ میں آ کر رکی۔ رتھ کے آگے رسی در رسی چھ تندرست سیاہ بھینسے جتے ہوئے تھے جبکہ پچھلے حصے میں ایک خیمہ نما بلند رنگین چھولداری نصب تھی۔ رتھ رکنے کے بعد چھولداری سے ایک

WWW.PAKSOCIETY.COM

ٹھگنے قد کا سیاہ رُو آدمی نیچے اتر آیا۔ زرق برق لباس، گلے میں سونے چاندی کے ہار پہنے اور کمر سے منقش تلوار لٹکائے یہ ہومون ہون کا مقامی ہندو راجا تھا۔ راجا نے اپنے قدم زمین پر رکھے ہی تھے کہ فضا پے در پے زوردار دھماکوں سے گونج اٹھی۔ ہسپانوی بحری جہازوں پر لگی توپیں ایک کے بعد ایک گولہ داغ رہی تھیں۔ راجا چلتے چلتے رک گیا، مقامیوں کی بھیڑ خوف زدہ ہوگئی اور رتھ میں جتے بھینسے بے چین ہونے لگے۔ گولہ باری تھمنے کے بعد راجا نے آگے بڑھ کر میگلن سے ہاتھ ملایا اور اسے ہومون ہون کے جزیرے پر خوش آمدید کہا۔ میگلن نے چلی سے لائے کچھ نوادرات اور ریشمی کپڑے کا ایک تھان راجا کی نذر کیا۔ انریق نے میگلن کو اسپین کا نمائندہ خصوصی بتاتے ہوئے اس کا راجا سے تفصیلی تعارف کروایا۔ انریق نے کہا میگلن، اسپین کے ہراول دستے کے طور پر یہاں پہنچا ہے اور اس کے پیچھے پیچھے درجنوں جنگی جہازوں پر مشتمل ہسپانوی بیڑا ان جزائر کی طرف بڑھا چلا آرہا ہے۔ راجا جو پہلے ہی ہسپانوی افسران کے حلیوں اور ہتھیاروں سے متاثر دکھائی دے رہا، انریق کی بات سن کر کچھ اور مرعوب ہوگیا۔ اس نے انتہائی خوشامدانہ لہجے میں خود کو اسپین کا دوست قرار دیا اور میگلن کو اپنے محل چلنے کی دعوت دی۔

راجا کا محل بندرگاہ سے قریب ناریل کے درختوں سے گھرے ایک احاطے میں واقع تھا۔ یہ درجنوں کمروں پر مشتمل ایک کچی پکی بے ڈھنگی عمارت تھی۔ شاہی محل پہنچ کر راجا نے میگلن کو تخت پر اپنے ساتھ بٹھایا۔ اس نے ہسپانوی عملے کی پام سے تیار کردہ وائن سے تواضع کی۔ انریق مترجم کے فرائض سنبھالنے کے لیے ہاتھ باندھے ان کے قریب کھڑا ہوگیا۔ میگلن نے کہا کہ وہ کچھ دن تک یہاں قیام کے بعد جنوب میں واقع ملوکا کے جزائر جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ راجا نے میگلن کو اپنے ہر ممکن تعاون کا یقین دلاتے ہوئے مشورہ دیا کہ وہ ملوکا جانے سے پہلے ہومون ہون کے مشرق میں واقع لیٹے (Leyte) کے بڑے جزیرے کا دورہ ضرور کرے۔ راجا نے کہا کہ وہ لیٹے کے جنوبی حصے میں واقع ریاست لیما ساوا (Limaswa) کی طرف سے یہاں حکومت کررہا ہے۔ کچھ دیر کی بات چیت کے بعد میگلن اور اس کے ساتھی بندرگاہ واپس پہنچ گئے۔

میگلن نے پایا کہ ہومون ہون ایک چھوٹا لیکن گنجان آباد جزیرہ تھا۔ اس نے جزیرے پر صرف ایک رات کا مختصر قیام کیا اور اگلے ہی دن قرب و جوار میں پھیلے دیگر چھوٹے بڑے جزائر کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس نے اگلے دو ہفتوں کے دوران سامار، کیلی کوآن، ڈینا گاٹ، سائرگاؤ اور ہائے بسون (Hibuson) سمیت بحیرہ بوہول کے اطراف میں واقع نمایاں جزیروں کا دورہ کیا۔ میگلن جہاں جہاں بھی گیا مقامی حکمرانوں نے اسے خوش آمدید کہا۔ اس نے ہر مقامی حکمران کو حسبِ مرتبہ کچھ تحائف پیش کیے اور مستقبل قریب میں فلپائن آنے والی ہسپانوی فوج کی کہانیوں کو کچھ اس طرح بڑھا چڑھا کر پیش کیا کہ بعض مقامی حکمرانوں نے اس سے اپنی سلامتی کے فرمان تک لکھوا لیے۔ میگلن ایسے ہر فرمان پر اسپین کے خصوصی نمائندے کے طور پر دستخط ثبت کرتا اور مقامی راجا کو یقین دلاتا کہ وہ اب اسپین کے دوست ہیں اور اب انہیں کسی سے مرعوب ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مقامی حکمران، میگلن کے ساتھیوں کو شاہی مہمان کا درجہ دیتے اور ان کی خوش نودی کے لیے کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے۔ ایک طویل اور تناؤ بھرے سفر کے بعد اب ہسپانوی ملاحوں کو فرصت ہی فرصت تھی۔ انہیں گوام میں اپنی نا آسودہ رہ گئی خواہشات کی تکمیل کا یہاں بھرپور موقع ملا۔ مقامی عورتیں خوبصورتی میں اپنی مثال آپ تھیں۔ سیاہ روشن آنکھیں، کھلتا ہوا گورا رنگ، بھرا بھرا سینہ، متناسب جسم اور گھنے سیاہ لمبے بال جو اُن کے گھٹنوں تک آرہے تھے۔ مہینوں عورتوں سے دور رہے ملاحوں کے لیے مقامی عورتوں کو دیکھ کر خود پر قابو پانا مشکل تھا۔ یورپین کو یہ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ ان کی پیش قدمی کے جواب میں مقامی عورتوں کا رویہ حوصلہ افزا تھا۔ مقامی لڑکیاں اس حد تک ان سے گھل مل گئیں کہ بعض ملاحوں نے میگلن سے کچھ عورتوں کو اپنے ساتھ جہازوں پر مستقل رکھنے کی درخواست بھی کی۔ تاہم میگلن نے ان کا یہ مطالبہ سختی کے ساتھ مسترد کردیا۔

اس دوران چھوٹے بڑے جزیروں کے مختصر دورے کرتا ہوا ہسپانوی بیڑا بحیرہ بوہول کے جنوب میں واقع منڈاناؤ پہنچا۔ فلپائن کے جنوبی حصے میں واقع یہ لوزون کے بعد مملکت میں شامل دوسرا بڑا جزیرہ ہے۔ جس کا رقبہ 94630 مربع کلومیٹر اور موجودہ آبادی ڈھائی کروڑ (2009) کے قریب ہے۔ میگلن کی آمد کے وقت منڈاناؤ پر انسانی آبادی کا اندازہ دس سے بیس لاکھ کے درمیان تھا اور تب جزیرے کے طول و عرض میں منڈایا، باگوبو، مان ساکا اور بولی، بالان اور مانو بو اقوام آباد تھیں۔ منڈاناؤ کے شمالی

مشرقی حصے کی سیاحت کے دوران میگلن کے ساتھ آئے پادریوں نے مقامی ہندو راجاؤں کو عیسائیت کی دعوت دی۔ میگلن حیران رہ گیا جب دو مقامی راجاؤں نے مع اپنے درباریوں اور خاندان سمیت عیسائی بننا منظور کرلیا۔ منڈاناؤ میں قیام کے دوران ڈورٹے بار بوسا نے مقامی مزدوروں اور کاریگروں سے اپنے بحری جہاز وکٹوریا کی کچھ مرمت بھی کروائی۔

مارچ کے آخر میں انہوں نے منڈاناؤ سے لنگر اٹھائے اور بحیرہ بوہول کے کھلے سمندر کی طرف بڑھے۔ ابھی وہ ساحل سے قریب پچاس میٹر ہی کے فاصلے پر پہنچے تھے کہ ٹرینی ڈاڈ پر ایک نئی صورتِ حال پیدا ہوگئی۔ میگلن کو اس کے ایک قریبی ساتھی نے بتایا کہ جہاز پر تین مقامی عورتیں بھی موجود ہیں۔ یہ خبر سنتے ہی میگلن آگ بگولا ہوگیا۔ اس نے ٹرینی ڈاڈ کی مکمل تلاشی لی اور ایک تہ خانے سے عورتوں کو بازیاب کرالیا۔ اس نے یہ اندازہ لگانے کے بعد کہ یہ عورتیں تیر کر بہ آسانی خشکی تک پہنچ سکتی تھیں، انہیں کھلے سمندر میں اتار دیا۔ میگلن کی چھان بین کے نتیجے میں دو ملاحوں نے اعتراف کیا کہ وہ گزشتہ شام ہی ان عورتوں کو پھسلا کر جہاز پر لے آئے تھے۔ میگلن نے انہیں خوب جھاڑ پلائی اور اسپینی اوسا کو حکم دیا کہ دونوں ملاحوں کو گن کر پچیس پچیس جوتے لگائے۔

یکم اپریل 1521ء کے دن میگلن اور اس کے ساتھی منڈاناؤ کے 50 کلومیٹر شمال میں واقع لیٹے کے جزیرے پر پہنچے۔ جس کے جنوبی حصے میں لیما ساوا کے نام سے ایک آزاد و خود مختار سلطنت قائم تھی اور یہاں ایک ہندو حکمران راجا کولامبو کی حکومت تھی۔ ہسپانوی بحری جہازوں نے جزیرے کے جنوبی حصے میں واقع بندرگاہ میں لنگر گرائے۔ میگلن اور اس کے ساتھی جہازوں سے نیچے اترے تو راجا کولامبو کے چھوٹے بھائی اور مقامی فوج کے سپہ سالار نے ان کا پُرتپاک استقبال کیا۔ جواب میں ٹرینی ڈاڈ پر نصب توپوں نے یکے بعد دیگرے تین گولے داغے۔ یہاں بھی میگلن اور اس کے ساتھیوں کو ایک جلوس کی صورت میں شاہی محل لے جایا گیا۔ راجا کولامبو کا محل چونے پتھر سے بنی ایک دو منزلہ خوبصورت عمارت تھی۔ قیمتی ریشمی لباس اور سر پر سونے کا بڑا سا تاج سجائے راجا کولامبو نے محل کے دروازے پر ہسپانوی جہازرانوں کا پُرجوش خیر مقدم کیا۔ راجا نے میگلن کو شاہی محل کی سیر کروائی اور اس سے اپنی درجنوں بیویوں اور کنیزوں کا تعارف کروایا۔ میگلن یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ راجا کے حرم میں موجود لڑکیوں کی تعداد سو سے بھی زیادہ تھی۔ وہاں مقامی لڑکیوں کے ساتھ ساتھ چین ملایا حتیٰ کہ سائی بیریا سے لائی گئی سفید فام دوشیزائیں بھی موجود تھیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک۔ ان حسین لڑکیوں نے قیمتی لیکن باریک لباس پہنے ہوئے تھے جو ان کے جسم کے نشیب و فراز کو چھپانے سے قاصر تھے۔ بعض لڑکیوں کے دودھیائی جسموں پر سانپوں اور اژدھوں کی رنگین تصویریں بھی کھدی ہوئی تھیں۔ لڑکیاں راجا کو دیکھ کر خوش دکھائی دیتی تھیں، انہوں نے اسے اپنے حصار میں لیا اور اس سے چہلیں کرنے لگیں۔ راجا نے اپنے قریب کھڑی سب سے حسین کنیز کے گلے میں بازو... حمائل کیے۔ چٹ سے اس کا بوسہ لیا اور میگلن کو حیران دیکھ کر کچھ غوغاں کی۔

انریق نے میگلن سے کہا کہ راجا جاننا چاہتا ہے کہ اس کی بیویوں کی تعداد کتنی ہے؟

”صرف دو۔“ میگلن نے مسکرا کر اپنے ہاتھ کی دو انگلیاں بلند کیں۔ ”ایک مجھے چھوڑ گئی اور دوسری میرا انتظار کررہی ہے۔“

راجا نے ایک قہقہہ لگایا اور انکشاف کیا کہ اس کے حرم میں موجود تمام لڑکیاں کنواری ہیں۔ وہ جس دوشیزہ کے ساتھ ایک رات گزار لے اسے اگلے دن اپنے کسی مصاحب کو بخش دیتا ہے۔ حرم سرا کی سیر کے بعد میگلن اور اس کے ساتھیوں کو کھانے کے وسیع ہال میں لے جایا گیا۔ سب لوگ بیٹھ چکے تو راجا کولامبو کے چھوٹے بھائی اور فوج کے سپہ سالار نے آگے بڑھ کر راجا کے ہاتھ دھلائے اور پھر خاموش اور باادب اس کے پیچھے کھڑا ہوگیا۔ کھانے میں انواع و اقسام کے بھنے ہوئے پرندے، سؤر کے گوشت کے ابلے ہوئے پارچے، تلی ہوئی مچھلی، پھل اور ایک سے زیادہ اقسام کی مقامی شراب موجود تھی۔ کھانا کھانے سے پہلے میگلن نے راجا کی خدمت میں کچھ نذر پیش کی۔ اس نے حسبِ سابق فلپائن آنے والی ہسپانوی فوج کی کہانی کو کچھ اس پیرائے میں بیان کیا کہ راجا کولامبو اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے آگے بڑھ کر میگلن کو گلے سے لگایا اور اسے اپنا بھائی بنانے کا اعلان کیا۔ موقع مناسب دیکھ کر میگلن نے راجا کو عیسائی بننے کی دعوت دی جو اس نے فوراً ہی قبول کرلی۔ اس نے میگلن سے کہا کہ اب وہ اس کا رشتے دار ہے اور اس ناتے وہ اور اس کے ساتھی جب تک چاہیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

شاہی محل میں قیام کرسکتے ہیں۔

لیماساوا میں گزرے یہ دن شاندار تھے۔ یہاں موسم حسین تھا۔ مشرق میں بحرالکاہل کی طرف سے چلنے والی ٹھنڈی ہوائیں ماحول کو خوشگوار بنائے رکھتی تھیں۔ بارشوں کی کثرت کی وجہ سے پورا جزیرہ گھنے برساتی جنگلوں سے اٹا ہوا تھا اور ہر طرف سبزے کی چادر سی بچھی دکھائی دیتی تھی۔ اچھی خوراک اور شراب کے ساتھ ساتھ یہاں بھی انہیں مقامی عورتوں کے ساتھ رات گزارنے کی پوری آزادی حاصل تھی۔ وہ جی بھر کر اپنے ارمان نکال رہے تھے۔ لیماساوا کی ریاست، علاقے کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور گنجان آباد ریاست تھی۔ شہر کی سڑکوں اور بازاروں میں لوگوں کا ازدحام دکھائی دیتا تھا۔ مقامی بازار میں ہر قسم کے سامان کی دکانیں موجود تھیں۔ وہاں خریداروں کے ہجوم میں چینی، عرب اور ہندوستانی تاجر بھی دکانداروں سے مول تول کرتے دکھائی دیے۔ کچھ عرب تاجروں نے یورپین کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلائے۔ اس دوران میگلن کے ساتھیوں نے اپنے آتشی ہتھیاروں کی خوب نمائش کی اور مقامیوں کو مرعوب کرنے کے لیے کچھ راؤنڈ بھی فائر کیے۔ انہوں نے بازار سے کچھ قیمتی پتھر اور نوادرات خریدے۔ ملاحوں نے یہاں سبز رنگ کے خوشبودار چوڑے پتے فروخت ہوتے دیکھے۔ یہ ان جزائر میں پیدا ہونے والے پان کے پتے تھے جنہیں مقامی لوگ بڑی رغبت سے کھاتے تھے۔ میگلن کے سوا باقی ملاحوں نے یہاں پہلی بار پھلوں کے بادشاہ آم کا ذائقہ بھی چکھا۔

میگلن اگلے ایک ہفتے تک راجا کولامبو کا مہمان بنا رہا۔ اس نے راجا سے آگے کے سفر کے لیے خوراک مہیا کرنے کی درخواست کی۔ راجا نے میگلن کی درخواست منظور کرتے ہوئے اسے لیماساوا کے مغرب میں واقع جزیرے سیبو جانے کا مشورہ دیا۔ راجا نے بتایا کہ سیبو کا حکمران خود کو بادشاہ کہلواتا ہے۔ وہ اس علاقے کا سب سے بااثر حکمران ہے۔ اس کے گرم مصالحوں کے عرب اور چینی تاجروں سے بھی قریبی تعلقات ہیں۔ راجا نے میگلن سے کہا کہ اگر وہ سیبو کے حکمران کی خوشنودی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا تو قرب و جوار کی تمام ریاستیں ہسپانوی حلقہ اثر میں داخل ہوجائیں گی۔ راجا نے کچھ اس انداز سے سیبو کا نقشہ کھینچا کہ میگلن وہاں جانے کے لیے بے چین دکھائی دینے لگا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو لیماساوا سے روانگی کے لیے تیار رہنے کی ہدایت کی۔ میگلن کو حیرت ہوئی جب اس کے سب سے قریبی ساتھی کون سیپ سیون کے کپتان سیرانو نے سیبو جانے کی مخالفت کی۔ یہ پہلا موقع تھا جب ہسپانوی جہازراں سیرانو نے اپنے پرتگالی نژاد قائد کے ساتھ کوئی اختلاف رائے کیا تھا۔

”ہم سب تازہ دم ہوچکے ہیں اور ہمارے پاس خوراک کا وافر ذخیرہ بھی موجود ہے، تو پھر ہم کیوں نہ اپنی آخری منزل ملوکا کی طرف بڑھیں۔“ سیرانو نے کہا۔

”جہاں تک میں سمجھا ہوں، سیبو اس مجمع الجزائر کے درمیان میں واقع سب سے اہم ریاست ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے یہ ان جزائر کا دل ہے۔ اگر ہم نے مقامیوں پر اپنی دھاک بٹھانی ہے تو پھر ہمیں ان کے دل کو جیتنا ہوگا۔“ میگلن نے دلائل سے سیرانو کو سمجھانے کی کوشش کی۔

”لیکن یہ ہمارے پروگرام میں شامل نہیں تھا۔“ سیرانو نے بحث کی۔ ”ہم نے یہاں سے خوراک اکٹھی کرنی تھی اور پھر ملوکا روانہ ہوجانا تھا۔“

”ہم بغیر سوچے سمجھے ملوکا نہیں جاسکتے۔“ میگلن نے کہا ”میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ پرتگالی ہم سے پہلے ملوکا کے جزائر تک پہنچ چکے ہیں۔ اب اگر ہم بغیر کسی منصوبہ بندی کے جنوب کی طرف بڑھے تو سیدھے پرتگالی بیڑے سے ٹکرا جائیں گے اور یہ ہمارے حق میں بہتر نہیں ہوگا۔“

میگلن کی بات سن کر سیرانو خاموش ہوگیا۔ وہ چاہتا تھا کہ میگلن، راجا کولامبو کے پاس رہ کر ہی ملوکا جانے کی منصوبہ بندی کرے۔ لیماساوا میں چینی اور عرب تاجروں کے نمائندے موجود تھے جن سے نہ صرف ملوکا کے بارے میں معلومات حاصل ہوسکتی تھیں بلکہ یہاں انہیں ایسے تاجر راہنما بھی مل سکتے تھے جو اُن کی ملوکا میں واقع غیر جانبدار جزائر کی طرف راہنمائی کرسکتے تھے۔ سیرانو اور میگلن کے درمیان چل رہی کشمکش کے تناظر میں باقی کے تمام جہازرانوں کی رائے میگلن کے حق میں تھی۔ وہ پچھلے بیس ماہ کی مہم کے دوران اپنے کپتان کی صلاحیتوں کے قائل ہوچکے تھے۔ اس کے بروقت فیصلوں اور عزم و ہمت ہی کی بدولت وہ یہاں تک پہنچنے میں کامیاب رہے تھے۔ سچ یہ تھا کہ ان کے درمیان ہسپانوی اور پرتگالی کا فرق اب مٹ چکا تھا۔ اب میگلن ہی ان کا قائد اور نجات دہندہ تھا۔ خود سیرانو کے دل میں بھی میگلن کی اتنی ہی قدر تھی لیکن نہ جانے کیوں...... وہ سیبو جانے سے کترا رہا تھا۔

علی سفیان آفاقی کی یادداشتیں

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

ایسے نادر روزگار خال خال ہی نظر آتے ہیں جو نصف صدی سے علم و ادب، صحافت و فلم کے میدان میں سرگرم عمل ہوں اور اپنے روزِ اول کی طرح تازہ دم بھی۔ اُن کے ذہن رسا کی پرواز میں کوئی کمی واقع ہو، نہ اُن کا قلم کبھی تھکن کا شکار نظر آئے۔ آفاقی صاحب ہمارے ایسے ہی جواں فکر و بلند حوصلہ بزرگ ہیں۔ وہ جس شعبے سے بھی وابستہ رہے، اپنی نمایاں حیثیت کے نشان اُس کی پیشانی پر ثبت کردیے۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستگی کے دوران میں انہیں اپنے عہد کی ہر قابل ذکر شخصیت سے ملنے اور اس کے بارے میں آگاہی کا موقع بھی ملا۔ دید شنید اور میل ملاقات کا یہ سلسلہ خاصا طولانی اور بہت زیادہ قابل رشک ہے۔ آیئے ہم بھی اُن کے وسیلے سے اپنے زمانے کی نامور شخصیات سے ملاقات کریں اور اُس عہد کا نظارہ کریں جو آج خواب معلوم ہوتا ہے۔

ادب و صحافت سے فلمی دنیا تک دراز ایک داستاں دردِ داستاں سرگزشت

قسط: 212

پچھلے دنوں دسمبر 2012ء میں برصغیر کے عظیم ترین اداکار دلیپ کمار کی 90 ویں سالگرہ ممبئی میں منائی گئی جس میں ان کے رشتے داروں، قریبی دوستوں اور فلمی صنعت کی ممتاز ہستیوں نے شریک ہوکر دلیپ کمار (یوسف خان) سے اپنی محبت اور عقیدت کا اظہار کیا، یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ دلیپ کمار کا اصلی نام یوسف خان ہے۔ وہ پشاور کے ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے والد غلام سرور خان کی اولاد میں چار بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں۔ وہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

خشک میوے کا کاروبار کرتے تھے۔اس سلسلے میں وہ ہندوستان کے مختلف شہروں میں جاتے آتے رہتے تھے۔ ان کے بیٹوں میں یوسف سرور خان (دلیپ کمار) احسن سرور خان، ناصر سرور خان (جنہوں نے فلمی دنیا میں ناصرخان کے نام سے اداکاری میں بہت نام پیدا کیا) اور اسلم سرور خان شامل ہیں۔ان کی بیٹیوں میں تاج سرور خان، ممتاز سرور خان، فوزیہ اختر اور سعیدہ شامل ہیں۔ان کے بیٹوں میں سے صرف یوسف خان (دلیپ کمار) اور ناصر خان نے اداکار کی حیثیت سے فلموں میں کام کیا۔ باقی دو بیٹے فلمی صنعت اور اداکاری سے دور ہی رہے۔دلیپ کمار نے فلم ساز کی حیثیت سے اپنی پہلی اور آخری فلم ”گنگا جمنا“ بنائی تو اس پر فلم ساز کی حیثیت سے ناصر خان کا نام دیا تھا۔

یوسف خان ابھی بیس برس کے بھی نہیں ہوئے تھے کہ والد کے کاروبار کے سلسلے میں ہندوستان کے مختلف شہروں خصوصاً دہلی اور نینی تال جانے لگے تھے۔ یوسف خان شروع ہی سے کم سخن اور کم آمیز تھے۔انہوں نے بمبئی پہنچنے کے بعد ایک ملٹری کینٹین میں بھی کام کیا تھا۔ اس زمانے میں وہ کرکٹ اور فٹ بال کے شوقین تھے۔انگریز ان کی صحبت کو بہت پسند کرتے تھے۔ان سے بے تکلفی بھی تھی۔ یوسف خان کو اداکاری کا مطلق شوق نہ تھا مگر تقدیر میں اداکار اور وہ بھی برصغیر کا عظیم ترین اداکار بننا لکھا تھا ورنہ وہ کرکٹ یا فٹ بال کے کھلاڑی ہوتے اور فلمی دنیا ایک عظیم اداکار سے محروم ہی رہ جاتی۔

یوسف خان شرمیلے بھی تھے۔الگ تھلگ رہنا پسند کرتے تھے۔ انہوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کی لیکن مطالعے کی کثرت کی وجہ سے وہ بہت زیادہ قابلیت رکھتے ہیں اور مختلف شعبوں کے بارے میں عالمانہ گفتگو کرتے ہیں جو مرعوب کن ہوتی ہے۔

یوسف خان پشاور کے قصہ خوانی بازار کے علاقے میں ایک قدیمی محلے خداداد کے ایک تین منزلہ گھر میں پیدا ہوئے تھے۔ان کے والد تازہ پھلوں اور خشک میوے کے آڑھتی تھے۔1935ء میں دوسری عالمگیر جنگ کے زمانے میں ان کے والد اپنے خاندان کے ساتھ پشاور سے ممبئی منتقل ہوگئے تھے۔دلیپ کمار کو فلموں کا شوق محض کبھی کبھی چھپ کر فلمیں دیکھنے کی حد تک تھا کیونکہ ان کے والد پسند نہیں کرتے تھے۔

یوسف خان نے کچھ عرصے تک ایک فوجی کینٹین میں کام کیا تھا مگر بعد میں وہ اپنے والد کے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹانے لگے۔قسمت نے انہیں ایک موقع اس وقت دیا جب وہ والد کے کاروبار کے سلسلے میں نینی تال گئے جہاں اس وقت کی معروف اداکارہ اور ممبئی ٹاکیز کی مالکہ دیویکا رانی کی ان پر نظر پڑ گئی۔دیویکا رانی نے ایک جوہر شناس کی نظر پائی تھی۔ اس سے پہلے بنگال سے آئے ہوئے ایک تعلیم یافتہ ہنرمند اشوک کمار گنگولی کو بھی انہوں نے لیبارٹری کے کام ترک کر کے اداکار بننے کا مشورہ دیا تھا۔بعد میں یہی اشوک کمار ایک سپر اسٹار بن گئے تھے۔ ممبئی ٹاکیز کی بنائی ہوئی ایک فلم ”قسمت“ نے تو کامیابی کے تمام ریکارڈ توڑ دیے تھے۔ کلکتہ میں ”قسمت“ مسلسل تین سال تک چلتی رہی۔یہ ریکارڈ آج تک کوئی اور فلم نہیں توڑ سکی۔

دیویکا رانی نے یوسف خان کو بمبئی میں ملاقات کے لیے کہا تھا مگر یوسف خان کافی عرصے تک دامن چھڑاتے رہے اور بمبئی ٹاکیز کا رخ نہیں کیا۔ایک روز وہ دیویکا رانی سے ملنے کے لیے بمبئی ٹاکیز گئے۔دیویکا رانی نے ان کے سراپا کا جائزہ لیا اور کسی اسکرین ٹیسٹ کے بغیر انہیں منتخب کرلیا۔ان کا فلمی نام دلیپ کمار بھی دیویکا رانی ہی کا چنا ہوا ہے۔کون جانتا تھا کہ یہ شرمیلا نوعمر لڑکا ایک دن برصغیر کا عظیم ترین اداکار بنے گا اور اداکاری اور شہرت میں ایک نیا معیار قائم کرے گا۔بمبئی ٹاکیز کی فلم ”جوار بھاٹا“ میں انہیں ہیرو کے طور پر کاسٹ کرلیا گیا۔فلم کے ہدایت کار امیہ چکرورتی تھے۔ دلیپ کمار انہیں اپنا استاد اور رہنما سمجھتے ہیں۔انہوں نے امیہ چکرورتی کی ہمیشہ بہت عزت کی۔ امیہ چکرورتی نے فلم ”داغ“ بنائی تو دلیپ کمار نے صرف ایک روپیہ معاوضہ لے کر فلم ”داغ“ میں کام کیا تھا۔”داغ“ شراب نوشی کے خلاف ایک بہت موثر، خوبصورت اور کامیاب فلم تھی جس میں نمی ہیروئین تھیں۔یہ ایک یادگار فلم ہے جو انڈیا میں طالب علموں کو بھی دکھائی جاتی ہے۔دلیپ کمار اپنا دوسرا استاد نتین بوس کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔جب فلم ”گنگا جمنا“ بنائی تو نتین بوس کو ہدایت کار کے طور پر منتخب کیا۔دلیپ کمار نے اس فلم میں ہدایت کاری پر بھی ہاتھ صاف کیا، اس میں نتین بوس کی سرپرستی بھی شامل تھی۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ دلیپ کمار نے نتین بوس کو ایک طرف بٹھا دیا تھا اور فلم کی تمام ہدایت کاری انہوں نے ہی کی ہے۔لیکن یہ درست نہیں ہے۔وہ اپنے استاد کی بہت عزت اور تکریم کرتے تھے۔ انہوں نے جو بھی کام بطور ہدایت کار کیا وہ نتین بوس کے مشورے سے اور ان کی نگرانی

دلیپ کمار اور شاہ رخ خان

میں ہی کیا۔

شوکت حسین رضوی کی فلم ”جگنو“ وہ فلم تھی جس نے دلیپ کمار کو شہرت کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔اس زمانے میں وہ بمبئی ٹاکیز کے تنخواہ دار (اس زمانے کے رواج کے مطابق) ملازم تھے۔شیراز علی سیٹھ کی منظوری سے انہوں نے ”جگنو“ میں کام کیا تھا۔ یہ وہ فلم تھی جس نے انہیں صحیح معنوں میں اسٹار بنا دیا تھا۔

یہ تفصیل محض تمہید کے لیے بیان کی گئی ہے۔تذکرہ دراصل دلیپ کمار کے آبائی گھر کا ہے۔تین مرلہ کا یہ گھر آج بھی شکستہ حالت میں موجود ہے۔خیبر پختونخواہ کی حکومت نے اسے خرید کر یادگار کے طور پر محفوظ رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ دلیپ کمار اور ان کے بہن بھائیوں نے ایک مختارنامے کے ذریعے یہ مکان فروخت کر کے حاصل ہونے والی رقم فلاحی کاموں کے لیے دینے کی اجازت دے رکھی ہے۔دلیپ کمار جب پاکستان آئے تھے تو خاص طور پر پشاور بھی گئے تھے اور اپنے پرانے دوستوں اور بزرگوں سے مل کر انہیں بہت خوشی ہوئی تھی۔حکومت پاکستان نے صدر ضیاء الحق کے دور میں دلیپ کمار کو نشانِ امتیاز کا اعزاز بھی دیا تھا جو بھارت میں دلیپ کمار کے لیے ایک مصیبت بن گیا۔ متعصب ہندو جماعتوں کا مطالبہ تھا کہ ان کی ہمدردیاں پاکستان کے ساتھ ہیں۔انہیں یہ اعزاز واپس کردینا چاہیے لیکن دلیپ کمار نے ایسا نہیں کیا جس کی وجہ سے انہیں شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔وہ مسلمانوں کی فسادات کے زمانے میں مدد کرتے رہتے ہیں اور بے گھر مسلمانوں کو اپنے گھر میں مہمان رکھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ہندو متعصب جماعتیں ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے پڑی رہتی ہیں۔ان پر انکم ٹیکس کے مقدمات بنائے گئے جن میں وہ بے قصور ثابت ہوگئے۔ان کی فلم ”گنگا جمنا“ پر بے معنی اعتراضات کر کے کاٹ چھانٹ کرنے کی ہدایت کی گئی مگر وہ رضامند نہ ہوئے۔ ایک سال تک یہ جھگڑا چلتا رہا۔آخرکار وزیراعظم پنڈت نہرو کی مداخلت پر فلم کو صرف معمولی کاٹ چھانٹ کے بعد نمائش کی اجازت دے دی گئی۔یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس زمانے میں چونکہ راج کپور کی فلم ”جس دیس میں گنگا بہتی ہے“ کی نمائش بھی ہونے والی تھی اس لیے گنگا جمنا، کی نمائش روکنے کے لیے یہ سازش کی گئی تھی۔

دیکھیے پشاور میں یوسف خان کے گھر سے بات شروع ہوئی تھی اور کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔

یوسف خان (دلیپ کمار) کے علاوہ قصہ خوانی کے علاقے میں ہندوستان کے دو اور مشہور و معروف اداکاروں کے گھر بھی ہیں۔یہ راج کپور اور شاہ رخ خان ہیں۔یہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

عجیب اتفاق ہے کہ دو سو میٹر کے محدود رقبے میں ان تینوں کے گھر واقع ہیں۔ دلیپ کمار اور راج کپور قریب قریب ہم عمر ہیں اور پشاور میں بھی آپس میں ملتے جلتے رہتے تھے لیکن شاہ رخ خان اپنے والد کے ہمراہ قیام پاکستان سے پہلے ہی دہلی میں مقیم تھے۔ بعد میں وہ بمبئی چلے گئے اور تقدیر نے انہیں پہلے ولین اور اس کے بعد ہیرو کے طور پر آسمانِ فلم پر جگمگانے کا موقع دیا۔ آج وہ نہ صرف برصغیر کے عظیم اور مشہور ترین اداکار ہیں بلکہ دنیا بھر میں جانے جاتے ہیں۔ لندن کے موم عجائب گھر میں دنیا کی معروف و ممتاز ہستیوں کے ساتھ ساتھ شاہ رخ خان کا مجسمہ بھی نصب ہے۔

پشاور کے بارے میں یہ سن کر حیران ہوں گے کہ سرحد کی سنگلاخ سرزمین سے ایسے مایہ ناز فنکار کیسے دستیاب ہوئے۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ پشاور زمانہ قدیم سے ایک تہذیبی اور ثقافتی مرکز رہا ہے۔ لاہور اور کراچی سے پہلے ریڈیو اسٹیشن پشاور میں قائم ہوا تھا۔ پشاور اپنے قصہ خوانی بازار کی وجہ سے بھی مشہور ہے۔ اس بازار کا یہ نام اس لیے پڑا ہے کہ ایک زمانے میں یہاں تفریح کے طور پر لوگ اکٹھے ہو کر قصہ سنانے والوں سے داستانیں سنا کرتے تھے۔ اس زمانے میں یہی ایک بڑی تفریح تھی۔ لوگ جوق در جوق اس بازار میں سرِشام اپنے کاموں سے فارغ ہو کر آتے تھے۔ پھر قصہ گو حضرات بھی آجاتے تھے۔ قہوے اور خشک میوے کے دور چلتے تھے اور لوگ مزے لے لے کر قصے اور دلچسپ داستانیں سنا کرتے تھے۔ یوں سمجھیے کہ یہ تھیٹر اور آج کے سینما کا نعم البدل تھا جو عام لوگوں کو مفت میں تفریح فراہم کرتا تھا۔ یہ ایک میل ملاقات کا بہانہ بھی بن جاتا تھا جہاں لوگ ایک دوسرے سے مل کر اپنی خوشیاں اور اپنے غم بانٹ لیا کرتے تھے۔ پشاور ایک ایسا شہر ہے جہاں آزادی کی تحریکیں بھی شروع ہوتی رہیں اور انگریزی حکومت سے نجات حاصل کرنے کے لیے باغیانہ جذبات کا اظہار ہوتا رہا۔ آیئے آپ کو پشاور کے فن کاروں کے بارے میں کچھ بتانا چاہوں گا جنہوں نے اس سرزمین کا نام سارے برصغیر میں مشہور کیا اور ایسے حیرت انگیز کارنامے سرانجام دیے جن پر دوسرے شہروں کے لوگ رشک کرتے ہیں اور پشاور والے ان پر فخر سے اپنا سر بلند کر لیتے ہیں۔ ان میں اداکار، قلم کار، شاعر اور دوسرے فنونِ لطیفہ کے شعبوں سے تعلق رکھنے والے شامل ہیں۔

پشاور میں ڈھکی کا علاقہ تنگ گلیوں پر مشتمل ہے۔ یہ گلیاں نشیب و فراز سے گزر کر چکر کھاتی ہوئی شہر کے معروف زمانہ قصہ خوانی بازار تک پھیلی ہوئی ہیں، اب یہاں قصہ خوانی نہیں ہوتی۔ طالبان کی وجہ سے دہشت گردی، قتل و غارت اور تباہی و بربادی کا راج ہے لیکن کسی زمانے میں یہ بازار پشاور بلکہ صوبہ سرحد کا دل کہلاتا تھا جسے اب خیبر پختونخواہ کا نام دے دیا گیا ہے۔

آج ڈھکی کے قدیم علاقے کو برصغیر میں فن کاروں کے حوالے سے جانا جاتا ہے یہاں دو سو مربع میٹر کے مختصر علاقے میں برصغیر کے تین عظیم فنکار پیدا ہوئے اور یہاں انہوں نے ابتدائی زندگی بسر کی۔ ان میں دلیپ کمار (یوسف خان) راج کپور اور شاہ رخ خان شامل ہیں۔

ڈھکی تک جانے کے لیے تنگ و تاریک گلیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ دوسری جانب ایک کھلا میدان ہے۔ ایک پہاڑی سڑک سے گزر کر ایک چھوٹی سی پہاڑی تک جائیں تو راج کپور کے والد پرتھوی راج کپور کا گھر نظر آتا ہے۔ راج کپور کے دادا تحصیلدار تھے اس لیے یہ خوشحال لوگ تھے۔ پرتھوی راج اس خاندان کے پہلے فرد ہیں جنہوں نے اپنے بزرگوں کی خواہشات کے برعکس بمبئی جا کر اداکاری کے میدان میں جوہر دکھائے۔ وہ اداکار، فلم ساز اور تھیٹر کے مالک تھے۔ ان کے تھیٹر نے انڈیا کی فلمی صنعت کو گوہرِ نایاب عطا کیے۔ پرتھوی راج نے بمبئی کی فلمی دنیا میں ایک ایسے فلمی خاندان کی بنیاد ڈالی جس نے فلمی دنیا میں شہرت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ تہلکہ بھی مچا دیا۔ پرتھوی راج بڑے فخر سے اپنے آپ کو ہندو پٹھان، کہا کرتے تھے۔ وہ ایک غیر متعصب انسان تھے۔ اپنے پرتھوی تھیٹر میں انہوں نے بہت سے مسلمانوں کو بھی ملازم رکھا تھا۔

حمید اختر مرحوم نے یہ واقعہ خاص طور پر لکھا ہے کہ جب پونا میں ''ڈبلیو زیڈ احمد'' کا شالیمار اسٹوڈیو بدحالی کا شکار ہوا تو وہ تمام نامور مصنف اور شاعر بیکار ہو گئے جو اس سے وابستہ تھے۔ بہت اچھے مشاہرے لیا کرتے تھے۔ ان میں شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی بھی شامل تھے۔ فلمی ماحول اگرچہ جوش صاحب کے مزاج کے مطابق نہ تھا لیکن انہیں فوری طور پر روزگار کا کوئی دوسرا ذریعہ بھی دستیاب نہ تھا۔

حمید اختر نے پرتھوی راج سے جوش ملیح آبادی کا تذکرہ کیا۔ وہ شاعرِ انقلاب کے نام اور حیثیت سے بخوبی واقف تھے۔ پرتھوی راج سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے اپنے تھیٹر میں جوش صاحب کو بارہ سو یا پندرہ سو (ٹھیک سے

یاد نہیں) روپے ماہوار میں ایک شاعر کی حیثیت سے رکھ لیا۔ اس زمانے میں یہ بہت بڑی رقم تھی لیکن پرتھوی راج جوش صاحب کے مرتبے اور حیثیت سے بخوبی واقف تھے اس لیے انہوں نے جوش صاحب کا بہت گرمجوشی سے استقبال کیا۔ اس طرح وہ برسرِ روزگار ہو گئے۔ حمید اختر لکھتے ہیں کہ کافی عرصے بعد جوش صاحب سے ملاقات ہوئی تو حمید اختر نے پوچھا کہ پرتھوی تھیٹر میں وہ خوش اور مطمئن تو ہیں نا؟

جوش صاحب نے کہا ''ارے میاں یہ پرتھوی راج تو عجب آدمی ہے۔ میں نے اتنے مہینوں میں اس کے کسی ڈرامے کے لیے ایک شعر بھی نہیں لکھ کر دیا ہے۔ بعض اوقات تو کئی کئی دن میں پرتھوی تھیٹر کا رخ بھی نہیں کرتا مگر مجھے تنخواہ باقاعدگی سے بروقت مل جاتی ہے۔''

یہ واقعہ پرتھوی راج کی فن کار شناسی اور نامور لوگوں کے احترام کا حامل ہے۔

پرتھوی راج نے جب اداکار کی حیثیت سے کام کی تلاش میں اسٹوڈیوز کے چکر لگانے شروع کیے تو انہیں اسٹوڈیو کے اندر داخل ہونے کا موقع ہی نہیں دیا گیا کیونکہ اسٹوڈیوز میں داخلے پر سخت پابندی تھی اور باہر کے گیٹ پر متعین چوکیدار فلموں میں کام کرنے کے امیدواروں کو اندر قدم بھی نہیں رکھنے دیتے تھے۔

پرتھوی راج دوسرے سیکڑوں نوجوانوں کی طرح بے نیل و مرام اسٹوڈیوز کے چکر لگاتے رہے۔ وہ ایک اسٹوڈیو کے گیٹ پر پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ دروازے پر ایک مضبوط اور قد آور چوکیدار موجود ہے۔ انہیں اچانک نہ جانے کیا سوجھی کہ وہ پٹھان چوکیدار کے پاس جا کر اس سے پشتو میں باتیں کرنے لگے۔ پٹھان چوکیدار ایک پٹھان طویل القامت اور خوبرو نوجوان سے مل کر بہت خوش ہوا۔ پرتھوی راج نے اس کو بتایا کہ وہ پشاور سے اداکاری کرنے کے لیے بمبئی آئے ہیں مگر آج تک کسی نے انہیں اسٹوڈیو کے اندر قدم تک نہیں رکھنے دیا۔

پٹھان چوکیدار دوسرے پٹھان سے مل کر بہت خوش تھا۔ اس نے گیٹ کھول کر پرتھوی راج کو اسٹوڈیو کے اندر پہنچا دیا اور کہا کہ میں بس یہی کر سکتا ہوں۔ آگے جیسی تمہاری قسمت۔

پرتھوی راج کو دیکھ کر اسٹوڈیو کے مالک بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے پرتھوی راج کو منتخب کر لیا اور پھر اسی اسٹوڈیو نے فلم ''سکندر'' بنائی تو پرتھوی راج نے اس فلم میں

دلیپ کمار کا پشاور والا گھر

سکندر کا کردار ایسی خوبی اور مہارت سے ادا کیا کہ سارا ملک دیوانہ ہو گیا۔ پرتھوی راج کے سب سے بڑے بیٹے راج کپور نے میٹرک پاس کر لیا تو باپ نے پوچھا کہ اب تم کس کالج میں داخلہ لو گے؟

راج کپور نے کہا ''پتا جی، جس کسی کو وکیل بننا ہوتا ہے وہ لاء کالج میں داخلہ لیتا ہے۔ ڈاکٹر بننے کا خواہشمند میڈیکل کالج میں داخلہ لیتا ہے۔ میں اداکار اور ہدایت کار بننا چاہتا ہوں۔ مجھے کسی اسٹوڈیو میں داخلہ دلا دیجیے۔''

بیٹے کی یہ بات پرتھوی راج کو پسند آئی۔ انہوں نے سوچا کہ جب بیٹے کو پڑھنے کا شوق ہی نہیں ہے تو پھر وقت اور زندگی ضائع کرنے کا کیا فائدہ؟ انہوں نے اس وقت کے بہترین ہنر مند اور معروف ہدایت کار کیدار شرما سے بات کی اور اس طرح راج کپور ہدایت کار کیدار شرما کے اسسٹنٹ بن گئے۔ کیدار شرما ہی ہدایت کاری میں ان کے استاد تھے اور کیدار شرما ہی نے اداکار کی حیثیت سے راج کپور کو فلم ''راج کمل'' میں ہیرو کے طور پر کام کرنے کا موقع دیا تھا۔ راج کپور کی قدرتی صلاحیتوں نے ان کو بہت جلد ترقی کی دوڑ میں کامیابی دلائیں اور وہ ایک مایہ ناز فلم ساز، ہدایت کار اور اداکار کا مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

یوسف خان (دلیپ کمار) راج کپور کے بعد اداکار کی حیثیت سے فلمی دنیا سے وابستہ ہوئے تھے لیکن بہت جلد سب کو پیچھے چھوڑ کر ہندوستان کے عظیم ترین اداکار کا مرتبہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ ان دونوں کی ملاقات اور کسی حد تک دوستی پشاور کے محلہ خداداد کے زمانے سے ہی تھی۔ یہ تعلق اور وابستگی بمبئی میں بھی قائم رہی حالانکہ گھروں میں آنے جانے اور پرانے مراسم کے باوجود راج کپور کو ہمیشہ دلیپ کمار سے رقابت رہی جس کا احوال مختلف اوقات میں بیان کیا جاچکا ہے۔

پرتھوی راج کے بعد راج کپور، پھر شمی کپور، ششی کپور اور اگلی نسل میں رشی کپور نے فلمی دنیا میں بہت نام پیدا کیا اور اس طرح اس خاندان کو بمبئی کی فلمی دنیا میں ممتاز حیثیت حاصل ہوگئی۔ راج کپور کی زندگی میں یہ دستور رہا کہ کپور خاندان کی کسی لڑکی نے اداکاری کا رخ نہیں کیا۔ اس کے برعکس اداکارائیں جو اس خاندان کی بہوئیں بنیں انہیں بھی اداکاری ترک کرنا پڑی۔ لیکن راج کپور کی آنکھ بند ہوتے ہی اس خاندان کی لڑکیاں فلموں میں اداکاراؤں کے طور پر جلوہ گر ہوگئیں۔ رشی کپور کے چھوٹے بھائی رندھیر کپور (ڈبو) نے اپنی بیٹی کرشمہ کپور کو اداکاری کرنے کی اجازت دی تو کپور خاندان کی ایک پرانی روایت کا خاتمہ ہوگیا۔ کرشمہ کے بعد ان کی چھوٹی بہن کرینہ کپور دھوم مچانے کے لیے فلمی دنیا میں آگئیں۔ کرینہ کپور نے نہ صرف اداکارہ کی حیثیت سے نام پیدا کیا بلکہ عریانی اور جسم کا مظاہرہ کرنے میں بھی سب پر بازی لے گئیں۔ ان کے پے در پے کئی اسکینڈل سامنے آئے۔ شاہد کپور کے ساتھ تو ان کے مراسم بہت گہرے اور نمایاں ہوگئے تھے۔ شادی تک نوبت پہنچ گئی تھی۔ لیکن، یہ جوڑی ٹوٹ گئی۔ چند اور اسکینڈلز کے بعد نواب زادہ سیف علی خان کے ساتھ کرینہ کی دوستی کے چرچے شروع ہوگئے اور کرینہ کپور نے تمام دوسرے رومانی رشتے ختم کردیے۔ سیف علی خان شادی شدہ ہیں۔ ان کی شادی اداکارہ امرتا سنگھ سے ہوئی تھی جو عمر میں اس سے بڑی تھیں۔ دو بچوں کی پیدائش کے بعد یہ رشتہ ختم ہوگیا اور سیف علی خان پھر آزاد ہوگئے۔ کرینہ کپور کے ساتھ ان کے رومان کے چرچے شروع ہوئے تو خیال تھا کہ یہ بھی وقتی ابال ہوگا۔ لیکن یہ مراسم پائیدار نکلے۔ مذہب درمیان میں حائل ہوا اور نہ ہی یہ حقیقت کہ سیف شادی شدہ اور عمر میں کرینہ سے بڑے ہیں جہاں تک مذہب کا تعلق ہے بالی وڈ میں اب یہ برائے نام رہ گیا ہے۔ ہندو اور مسلمان کی شادیاں اب معمول بنتی جارہی ہیں۔ خود سیف علی خان کے والد نوابزادہ منصور علی خان (ٹائیگر پٹودی) نے اپنے زمانے کی مشہور اور مقبول ہیروئین شرمیلا ٹیگور سے شادی کی تھی۔ ان کی اولادوں میں سیف علی خان اور سوہا علی خان شامل ہیں۔ سوہا علی بھی اداکاری کرنے لگی ہیں اور ایک ہندو سے ان کی محبت کے چرچے ہیں۔ شرمیلا ٹیگور بہ ذات خود بہت اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہندوستان تو نوبل پرائز حاصل کرنے والے شاعر ٹیگور کے خاندان سے ان کا تعلق ہے۔ پچھلے دنوں 1 دسمبر 2012ء میں کافی مراحل سے گزرنے کے بعد سیف علی خان اور کرینہ کپور کی شادی ہوگئی۔ یہ شادی شرمیلا ٹیگور اور ٹائیگر پٹودی کی شادی کی طرح پائیدار اور کامیاب ہوگی یا محض وقتی جذباتی ابال ثابت ہوگی اس کا فیصلہ آنے والا وقت کرے گا۔

پرتھوی راج خاندان کی بیٹی کرینہ کپور کے علاوہ کرینہ کے کزن رنبیر کپور بھی آج کل بالی وڈ کے کامیاب اداکاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ پرتھوی راج کے خاندان کا فلمی دنیا میں آمد کا سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا اور یہ فلمی خاندان بالی وڈ میں جگمگاتا رہے گا یا وقت کی گرد میں گم ہوجائے گا؟ اس بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

پشاور میں ڈھکی کے علاقے میں راج کپور خاندان کی تین منزلہ قدیم حویلی اور اس کی منقش بالکونیاں، کھڑکیاں اور دروازے آج بھی پشاور کے لوگوں کو ان کی یاد دلاتے رہتے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد راج کپور یا ان کے خاندان کا کوئی فرد پشاور نہیں آیا لیکن پشاور کے لوگ آج بھی کھلنڈرے راج کپور کو یاد کرتے ہیں۔ ڈھکی کے رہنے والے نوے سالہ محمد یعقوب آج بھی راج کپور کی یادوں کو دل میں لیے بیٹھے ہیں۔ محمد یعقوب نے پرانی یادیں تازہ کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ 1920ء میں میرا لنگوٹیا تھا۔ وہ عمر میں مجھ سے ایک سال چھوٹا تھا۔ ہم دونوں گلی ڈنڈا کھیلا کرتے تھے۔ ہم ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے۔ کپور خاندان 1930ء میں بمبئی چلا گیا تھا۔ قیام پاکستان سے پہلے ان کے کچھ افراد کبھی کبھی پشاور آجاتے تھے مگر پاکستان بننے کے بعد یہ سلسلہ بھی ختم ہوگیا۔

آیئے، آگے چلتے ہیں۔ راج کپور کی حویلی سے گلی میں آگے جائیں تو تین منٹ کا راستہ طے کرنے کے بعد ایک پرانا شکستہ مکان نظر آتا ہے یہ برصغیر کے عظیم ترین اداکار دلیپ کمار کا گھر ہے جس کا رقبہ تین مرلے ہے۔ ساری دنیا یہ تسلیم کرتی ہے کہ دلیپ کمار سے بڑا اداکار آج تک پیدا نہیں ہوا۔ اس تنگ گلی میں پیدا ہونے والے یوسف خان نے بمبئی جانے کے بعد بہت جلد ایک نمایاں مقام حاصل کرلیا۔ دلیپ کمار کو آٹھ بار فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا جو کہ ایک ریکارڈ ہے۔ انڈیا میں فلم فیئر ایوارڈ کو آسکر ایوارڈ جیسی اہمیت حاصل ہے۔ دلیپ کمار نے پچاس سال تک اداکاری کے میدان میں اپنا ڈنکا بجایا۔ خصوصاً 1950ء سے لے کر 1960ء تک کی دہائی میں بالی وڈ میں دلیپ کمار کا ہمسر کوئی نہ تھا۔ ہندوستانی فلمی صنعت کے تین بڑوں میں دلیپ کمار، راج کپور اور دیو آنند شامل تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اداکاری میں ان کا دلیپ کمار سے کوئی مقابلہ اور موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔ دیو آنند نے تو اپنی خودنوشت سوانح میں واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ دلیپ کمار ہندوستان کا عظیم ترین اداکار ہے۔ دلیپ کمار اپنی نپی تلی اداکاری کی وجہ سے سب سے الگ اور نمایاں رہا۔ دلیپ کمار کو پدم شری کا سب سے بڑا صدارتی ایوارڈ بھی دیا گیا۔ اپنی فلاحی خدمات کے باعث اس کو بمبئی کے شیرف کے عہدہ پر بھی فائز کیا گیا جس سے وہ زیادہ عرصے تک وابستہ نہیں رہ سکا۔

دلیپ کمار کا خاندانی گھر ٹوٹ پھوٹ اور شکستگی سے دوچار ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے وہ کسی وقت بھی زمیں بوس ہوسکتا ہے۔ دیواروں میں شگاف پڑ گئے ہیں۔ گھر کے دروازوں، کھڑکیوں اور خوبصورت بالکونی کو دیمک لگ چکی ہے۔ گھر کے اندر جاؤ تو پشاور کے روایتی لکڑی کے کام سے آراستہ دیواریں خستہ حال ہوچکی ہیں۔ پلاسٹر جگہ جگہ سے اکھڑ کر گر رہا ہے۔ چھت کا پلاسٹر بھی جھڑتا رہتا ہے۔

دلیپ کمار کا یہ خستہ گھر آج کل ایک گودام کے طور پر استعمال ہورہا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ یہ عظیم ترین اداکار دلیپ کمار کا آبائی گھر ہے۔ اس گودام میں کام کرنے والے ایک مزدور نے بتایا ”میں تو اتنا جانتا ہوں کہ یہ وہ چھوٹا سا گھر ہے جس میں جنم لینے والا ہندوستان کا سب سے بڑا اداکار بنا۔ میرے لیے یہ ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسرے لوگ بھی اس گھر کو عقیدت اور محبت سے دیکھتے ہیں اور گئے دنوں کو یاد کرتے ہیں۔“

مقام شکر ہے کہ خیبر پختون خواہ کی حکومت نے اس گھر کے مالکانہ حقوق حاصل کرلیے ہیں اور تزئین و مرمت

پشاور کے تین خان ایک ہندو دو مسلمان

کے بعد اس کو ایک یادگار میوزیم میں تبدیل کرنے کا منصوبہ زیر تکمیل ہے۔ پشاور کے اس عظیم بیٹے کا یہ حق تو ہے کہ اس کے چھوٹے سے گھر کو تاریخی یادگار بنادیا جائے۔ کیونکہ یہ گھر پشاور والوں کے لیے عظمت کا نشان ہے۔

دلیپ کمار پاکستان آئے تو اپنا گھر دیکھنے بھی گئے اور سائرہ بانو کو پرانے زمانے کے واقعات سناتے رہے۔ وہ بے تکلفی سے لوگوں میں گھل مل گئے۔ ان کے کچھ پرانے ملاقاتیوں سے ملاقات بھی خوشگوار رہی۔ دلیپ کمار گلی کے تھڑے پر بیٹھ کر لوگوں سے گپ شپ کرتے اور قہوے کی پیالیاں خالی کرتے رہے۔ انہوں نے اور ان کے خاندان والوں نے تو دستبردار ہوکر یہ گھر فروخت کرکے ساری آمدنی فلاحی ادارے کو دینے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اب صوبائی حکومت ان کا یہ وعدہ کیسے نبھاتی ہے یہ ایک اہم سوال ہے۔ دلیپ کمار کو پشاور سے بہت محبت ہے۔ پشاور سے بمبئی جانے والے ہر شخص کی وہ بہت آؤ بھگت کرتے ہیں اور حق مہمانداری ادا کرتے ہیں۔ دلیپ کمار نو برس کے ہوچکے ہیں۔ وہ کئی بیماریوں میں مبتلا ہیں۔ انہیں بات کرنے میں مشکل پیش آتی ہے۔ خیال ہے کہ وہ الزائمر کی بیماری سے جنگ کررہے ہیں۔ اس کے باوجود ٹوٹے پھوٹے فقروں میں پشاور کی یادیں تازہ کرتے رہتے ہیں۔ وہ شخص جس کے مکالمے سن کر لوگ حیران رہ جاتے تھے اب بولنے میں دقت محسوس کرتا ہے۔

انقلابات ہیں زمانے کے۔

دلیپ کمار (یوسف خان) کے قدیمی گھر سے تین منٹ پیدل چل کر ایک معروف سڑک ہے۔ اس سڑک پر

WWW.PAKSOCIETY.COM

آج کے بالی وڈ کے سب سے بڑے اداکار کنگ خان، شاہ رخ خان کا آبائی گھر ہے ، شاہ رخ خان اس وقت ہندوستان میں سب سے زیادہ معاوضہ وصول کرنے والا اداکار ہے۔ آج کل انڈین فلمیں دنیا کے ہر ملک میں نمائش کے لیے پیش کی جاتی ہیں جس کی وجہ سے شاہ رخ خان کا نام چاردانگ عالم میں جانا جاتا ہے اور شاہ رخ خان کی شکل سے بچہ بچہ واقف ہے۔

شاہ رخ خان کے والد کا نام تاج محمد خان ہے۔ وہ پشاور کے اسی گھر میں پیدا ہوئے تھے۔ شاہ رخ خان کی پیدائش پشاور کی نہیں ہے چونکہ جب وہ پیدا ہوئے تو ان کے والد دہلی میں رہتے تھے لیکن شاہ رخ خان نوعمری اور نوجوانی میں پشاور آتے رہتے تھے اور کئی کئی دن یہاں گزارتے تھے۔ شاہ رخ خان دہلی میں پیدا ہوئے تھے لیکن پشاور اور یہاں کے رشتے داروں سے ان کا رابطہ کبھی ختم نہیں ہوا۔ وہ عموماً چھٹیاں گزارنے کے لیے پشاور آیا کرتے تھے اس وجہ سے یہاں ان کے رشتے داروں کے علاوہ ان کے دوست بھی ہیں جو آج بھی شاہ رخ خان کے لڑکپن اور نوجوانی کے قصے مزے لے لے کر سناتے ہیں اور شاہ رخ خان کا تذکرہ بہت محبت سے کرتے ہیں۔ شاہ رخ خان شہرت اور دولت مندی کی بلند ترین سطح پر پہنچنے کے باوجود بہت سادہ اور خوش مزاج ہیں۔ ان کے بارے میں جاننے والے کہتے ہیں کہ ان میں غرور یا بناوٹ نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ اپنے پرانے دوستوں اور رشتے داروں کے لیے آج بھی وہی شاہ رخ خان ہیں۔ شاہ رخ خان کی کزن نور جہاں آج بھی پشاور میں رہتی ہیں۔ وہ بمبئی سے دوبار پشاور آئے لیکن ان کی آمد کا ڈھنڈورا نہیں پیٹا گیا۔ پاکستانیوں کو تو پتا بھی نہیں چلا کہ شاہ رخ خان 1978ء اور 1979ء میں اپنے آبائی شہر کو دیکھنے اور رشتے داروں سے ملنے کے لیے پشاور آئے تھے۔ ان کی کزن نور جہاں نے بتایا کہ وہ پشاور آکر بہت خوش ہوئے اور پرانی یادیں تازہ کرتے رہے۔ پرانے دوستوں کے لیے وہ آج بھی وہی پرانے شاہ رخ ہیں۔ وہ ان کے ساتھ بے تکلفی سے گپ شپ کرتے اور قہوے کے کپ پیتے رہے۔

نور جہاں نے بتایا کہ جب شاہ رخ قیام پاکستان کے بعد پہلی بار پشاور آئے تو اپنے رشتے داروں خصوصاً اپنے والد کے خاندان والوں سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی بچے کو اس کا کھویا ہوا کھلونا مل گیا ہو۔

نور جہاں نے کہا ”آپ اس وقت جس کمرے میں بیٹھے ہیں شاہ رخ اسی کمرے میں سویا کرتے تھے۔ جب وہ ہم سے ملتے ہیں تو اداکار شاہ رخ خان کو باہر ہی چھوڑ آتے ہیں۔ وہ ہم سب کے ساتھ گھل مل جاتے ہیں۔ خوب باتیں کرتے ہیں، ہنستے ہنساتے رہتے ہیں۔ ہم کو بمبئی کے قصے سناتے ہیں اور ہم سے پشاور کے قصے سنتے ہیں۔

نور جہاں پشاور میں شاہ رخ خان کے آبائی گھر میں ہی رہتی ہیں۔ نور جہاں خود بھی اپنے بچوں کے ساتھ شاہ رخ کی دعوت پر دوبار بمبئی جا چکی ہیں۔ انہوں نے اپنے بڑے بارہ سالہ بیٹے کا نام شاہ رخ خان رکھا ہے جو بڑے اعتماد کے ساتھ اپنے آپ کو شاہ رخ خان نمبر 2 کہتا ہے۔ شاہ رخ خان نمبر 2 بڑے فخر کے ساتھ اپنے مشہور اور معروف انکل کا تذکرہ کرتا رہتا ہے۔ اس نے کہا کہ انکل نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ اگر میں بڑا ہو کر کرکٹ کا اچھا کھلاڑی بنا تو وہ مجھے اپنی ٹیم میں شامل کرلیں گے۔ یہ بات تو سب جانتے ہیں کہ شاہ رخ خان نے انڈین پریمیئر لیگ میں اپنی ایک کرکٹ ٹیم خرید رکھی ہے جس کا نام کولکتہ نائٹ رائڈرز ہے۔ شاہ رخ خان کے والد کا خاندان پشاور میں رہتا ہے۔ انڈیا میں صرف ان کے ننھیالی عزیز رہتے ہیں۔ جب پاکستانی فاسٹ بولر شعیب اختر بمبئی گئے تو شاہ رخ خان کے ساتھ کافی گھل مل گئے۔ وہ دونوں کئی تقاریب میں ایک ساتھ شریک ہوئے۔ ایک تقریب میں تو شعیب اختر نے شاہ رخ خان کے ساتھ ڈانس بھی کیا تھا۔ اس کے بعد یہ خبریں گرم ہوئی تھیں کہ شعیب اختر بالی وڈ کی فلموں میں اداکاری کریں گے مگر یہ محض قیاس آرائیاں تھیں۔ انڈیا کی متعصب ہندو جماعتیں موقع پاتے ہی ہاتھ دھو کر شاہ رخ خان کے پیچھے پڑ جاتی ہیں حالانکہ شاہ رخ نے بچپن کی دوست اور ساتھی گوری کے ساتھ شادی کی ہے اور بہت خوشگوار ازدواجی زندگی بسر کررہے ہیں۔ شاہ رخ اپنا زیادہ تر فارغ وقت گھر پر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ہی گزارتے ہیں۔ بمبئی کے ایک بہترین اور قیمتی علاقے میں انہوں نے اپنا شاندار ذاتی گھر بنایا ہے۔ یہ کئی منزلہ ہے اور اس میں بارہ بیڈ روم ہیں۔ اس کے علاوہ سینما گھر، سوئمنگ پول، کھیلنے کے لیے میدان اور جمنازیم بھی ہیں جہاں ساری فیملی ورزش کرتی ہے۔ شاہ رخ خان نے اپنے گھر والوں کو فلمی دنیا سے دور ہی رکھا ہے۔ ان کی بیوی اور بچے فلمی تقریبات میں شرکت نہیں کرتے۔ وہ اپنے گھر اور بزنس کو علیحدہ رکھنے

پشاور میں واقع راج کپور کا گھر

کے قائل ہیں۔

شاہ رخ کے خلاف متعصب ہندو جماعتیں خصوصاً شیوسینا موقع پاکر مہم چلاتی رہتی ہیں۔ جن دنوں شاہ رخ خان کی فلم ”مائی نیم از خان“ پورے ملک میں ریلیز ہوئی تو شاہ رخ خان کے ایک بیان کی آڑ لے کر شیوسینا کے کارکنوں نے بمبئی میں ایک دھواں دھار مہم چلائی تھی۔ شاہ رخ خان کا قصور یہ تھا کہ انہوں نے ایک بیان میں کہا تھا کہ پاکستان کے باصلاحیت کرکٹ کھلاڑیوں کو بھی انڈین پریمیئر لیگ میں شامل کرنا چاہیے۔ ان کے اس بیان کے خلاف شیوسینا والوں نے بمبئی کے سینما گھروں میں توڑ پھوڑ کی اور مطالبہ کیا کہ شاہ رخ اپنا بیان واپس لیں ورنہ ان کی فلم سینما گھروں میں نہیں چلانے دیں گے۔ شاہ رخ خان بھی ایک پٹھان کی طرح اڑ گئے اور اپنا بیان واپس لینے یا معافی مانگنے سے انکار کردیا۔ یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ مہاراشٹر کے صوبے خصوصاً بمبئی میں متعصب ہندو جماعتوں کا بہت زور ہے اور وہ طاقت کے ذریعے کسی کو بھی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ لیکن شاہ رخ خان نے ان کے سامنے جھکنے سے انکار کردیا۔ بالآخر بال ٹھاکرے کے حکم پر ان کی فلم کے خلاف مہم بند کردی گئی اور ان کی فلم ”مائی نیم از خان“ نے کامیابی کے نئے ریکارڈ قائم کیے۔

اس جگہ یہ تذکرہ کرنا بھی نامناسب نہ ہوگا کہ گزشتہ چند سالوں سے بالی وڈ پر تین ”خان“ حکمرانی کررہے ہیں۔ یہ سلمان خان، شاہ رخ خان اور عامر خان ہیں۔ ہندو فلم سازوں اور ہدایت کاروں نے ان کے مقابلے میں کئی اداکاروں کو ان کا ہم پلہ بنانے کی کوشش کی مگر ان تینوں ”خانوں“ کی مقبولیت اور حکمرانی ختم نہ ہوسکی بلکہ اس میں کچھ اور اضافہ ہوگیا۔ ریتھک روشن، رنبیر کپور، اجے دیوگن اور اکشے کمار کو ان کے مقابلے میں پلٹی دے کر ”بڑا“ بنانے کی کوشش کی گئی مگر دوسرے فن کار کچھ عرصہ چمک دکھا کر غائب ہوگئے مگر تینوں خانوں کی مقبولیت کم نہ ہوئی آج کل اکشے کمار کی چند فلمیں پے در پے ہٹ ہوگئی ہیں تو انہیں ”خانوں“ کے مقابلے میں کھڑا کیا جارہا ہے۔ بدقسمتی سے ان تینوں کے مراسم بھی آپس میں بہت اچھے نہیں رہتے۔ میڈیا والے بھی ان کے اختلافات کی خبریں دے کر فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان تینوں میں سے عامر خان عموماً الگ تھلگ رہ کر اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں اور میڈیا والوں کے اکسانے پر مخالف گفتگو سے پرہیز کرتے ہیں لیکن سلمان خان اور شاہ رخ خان کے ایک دوسرے کے خلاف بیانات کو میڈیا میں بہت ہوا دی جاتی ہے۔ پچھلے دنوں سلمان خان اور شاہ رخ خان کے تعلقات تو ٹھیک ہوگئے ہیں اور دونوں

WWW.PAKSOCIETY.COM

ایک دوسرے سے ملنے جلنے لگے ہیں مگر عامر خان اور شاہ رخ خان کے مابین اختلافات ابھی تک باقی ہیں اور ان میں دوستی نہیں ہو سکی ہے۔

پشاور کے ان تین معروف ترین اداکاروں کے علاوہ کئی اور بھی ممتاز فلمی ہستیوں کی پیدائش اس شہر کی ہے۔ مدھوبالا جسے ہالی وڈ کی اداکارہ مارلین منرو سے تشبیہ دی جاتی ہے اور جس کی تصویریں ٹائم میگزین کے سرورق پر بھی شائع ہوتی رہی ہیں۔ انہوں نے بھی پشاور ہی میں جنم لیا تھا۔ دلیپ کمار اور مدھوبالا کے رومان کے پروان چڑھنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ دونوں ہی پشاور میں پیدا ہوئے تھے۔ بدقسمتی سے ان دونوں کا ملن نہ ہو سکا اور حالات نے ان دونوں کے درمیان ایک گہری خلیج حائل کر دی۔ بہرحال وہ ایک علیحدہ داستان ہے جو پہلے تفصیل سے بیان کی جا چکی ہے۔

پشاور کے مردم خیز شہر میں جنم لینے والے فلمی فن کاروں میں نمایاں نام پرتھوی راج کپور، راج کپور، دلیپ کمار، مدھوبالا، پریم ناتھ، ونود کھنہ کے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے بہت سے نامور اداکار پشاور میں ہی پیدا ہوئے۔ ان کا تذکرہ بھی آپ کو سنایا جائے گا۔ لیکن سوال یہ ہوتا ہے کہ پشاور کی سرزمین میں ایسی کیا خصوصیت ہے جس کی وجہ سے یہاں نامور ہستیوں نے جنم لیا۔ صوبے کی تاریخ کے ماہر ابراہیم ضیاء نے اس کا سبب یہ بتایا ہے کہ خاموش فلموں کے زمانے میں تھیٹر اور سینما پر بنگالیوں اور پارسیوں کا قبضہ تھا مگر جب بولتی فلموں کا رواج ہوا تو اداکاروں کی کشش اور خوبصورتی کو لازمی قرار دیا گیا اور اداکاروں کو بھی نمایاں حیثیت حاصل ہو گئی' پشاور سے تعلق رکھنے والے مرد خوبرو، قدآور اور گورے چٹے ہوتے تھے۔ اس لیے انہیں ترجیح دی جاتی تھی، ایک اور اہم بات یہ تھی کہ پشاور کے لوگ اردو اور ہندی بھی بہت شستہ اور روانی سے بولتے تھے۔ ان کا تلفظ اور لب و لہجہ بھی اچھا تھا۔ ان باتوں کی وجہ سے پشاور کے اداکاروں کو ترجیح دی جاتی تھی۔

دیکھا جائے تو کافی حد تک یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے۔ پشاور کے مشہور اداکاروں پر نظر ڈالیے تو پرتھوی راج' راج کپور اور ان کا خاندان' دلیپ کمار، ناصر خان، شاہ رخ خان سبھی دلکش شخصیت کے مالک نظر آتے ہیں۔ یہ صوبہ باصلاحیت لوگوں کو پیدا کرنے کے سلسلے میں بھی قابل ذکر ہے۔ پرتھوی راج اور دلیپ کمار سے پہلے سرحد کے ایک اداکار گل حمید نے بہت مقبولیت اور شہرت حاصل کی تھی۔ گل حمید مردانہ وجاہت اور حسن کا نمونہ تھے۔ انہوں نے خاموش فلموں کے دور میں اداکاری کا آغاز کیا تھا۔ بولتی فلموں کا دور آیا تو گل حمید نے ان فلموں میں بھی اداکاری کے جوہر دکھائے۔ اپنے زمانے میں وہ مقبول ترین اور وجیہہ ترین اداکار تھے۔ انہیں آج بھی یاد کیا جاتا ہے۔ صوبہ سرحد کے اداکاروں کے علاوہ دوسرے شعبوں میں بھی اس سرزمین کے فرزندوں نے نمایاں کارکردگی دکھانے کی وجہ سے امتیاز اور شہرت حاصل کی۔ ضیاء سرحدی جیسے مصنف اور ہدایت کار کا تعلق اسی سنگلاخ سرزمین سے تھا۔ رفیق غزنوی جیسے نامور موسیقار بھی اس خطے سے تعلق رکھتے تھے جنہیں "ہم لوگ" کے علاوہ بمبئی کی متعدد مشہور فلموں کے مصنف اور مکالمہ نویس کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ پاکستانی اداکار خیام سرحدی ان ہی کے صاحب زادے ہیں۔

پشاور کی ثقافتی روایات بہت قدیم ہیں۔ یہ شہر موسیقی، تھیٹر، شاعری اور علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ کسی زمانے میں پشاور میں کئی تھیٹر گروپ تھے۔ ان میں شوقیہ تھیٹر بھی تھا اور پروفیشنل تھیٹر بھی تھا۔ پشاور وہ شہر ہے جس کا شمار ہندوستان کے ان چند شہروں میں ہے جہاں ریڈیو اسٹیشن تھا۔ یہاں 1936ء میں ریڈیو اسٹیشن قائم ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں لاہور اور کراچی جیسے شہر ریڈیو اسٹیشن سے محروم تھے۔

شاعر اور دانشور، آذر سرحدی کا نام اب بہت کم لوگوں کو یاد ہے مگر یہ اپنے وقت کے بہت اچھے شاعر تھے۔ انہوں نے بی اے تک تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ انہیں پشتو اور فارسی کے علاوہ انگریزی اور اردو پر بھی عبور حاصل تھا۔ شاعری میں وہ معروف شاعر سیماب اکبر آبادی کے شاگرد تھے۔ ایک زمانے میں وہ بھی فلمی دنیا کا مزہ چکھنے کی غرض سے بمبئی گئے تھے۔ شوکت حسین رضوی کی کامیاب اور مقبول فلم "جگنو" کے نغمات آذر سرحدی نے ہی لکھے تھے۔ یہ وہ فلم ہے جس کا ایک دوگانا محمد رفیع نے نور جہاں کے ساتھ گایا تھا، جس کے بول یہ تھے۔

یہاں بدلہ وفا کا بے وفائی کے سوا کیا ہے

محبت کر کے بھی دیکھا محبت میں بھی دھوکا ہے

اسی گیت سے محمد رفیع کو پہچان ملی تھی اور وہ گلوکاری کے عروج تک پہنچے تھے۔ فیروز نظامی نے "جگنو" کے لیے آذر سرحدی کے گانوں کی موسیقی ترتیب دی تھی۔ اس فلم کے تمام گانے ہٹ ہوئے تھے۔ ایسے مقبول نغمات لکھنے کے باوجود آذر سرحدی نے محسوس کیا کہ وہ فلمی ماحول میں اپنے آپ کو نہیں ڈھال سکتے۔ وہ بمبئی سے واپس اپنے وطن چلے آئے اور یہاں درس و تدریس کے شعبے سے منسلک ہو گئے۔ وہ مشاعروں میں بہت کم شریک ہوتے تھے۔ انہوں نے زندگی بھر شادی نہیں کی۔ 72 سال کی عمر میں ہارٹ اٹیک کی وجہ سے وفات پائی، ان کا یوم وفات 10 اپریل 1972ء ہے۔ انہیں کوہاٹ میں ہی سپردِ خاک کر دیا گیا جہاں انہوں نے وفات پائی تھی۔

پشاور کے ایک اور نامور اداکار خلیل خان تھے۔ وہ ایک خوبرو انسان تھے۔ اردو اور پشتو دونوں زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ تھیٹر کے زمانے میں انہوں نے اداکاری شروع کی تھی۔ ان کی آواز گونجدار اور بارعب تھی۔ وہ مائیکروفون کے محتاج نہ تھے۔ انہوں نے آغا حشر کے زمانے میں ڈراما "سفید خون" میں ایک اسی سالہ بوڑھے بادشاہ خاقان کا کردار اس خوبی سے ادا کیا تھا کہ آغا حشر نے بھی گلے لگا کر ان کی تعریف کی اور اپنے ڈراموں میں باقاعدگی سے کام کرنے کی دعوت دی تھی۔

بمبئی میں انہوں نے متعدد فلموں میں کام کیا جن میں حاتم طائی قابلِ ذکر ہے جس میں انہوں نے ڈبل کردار ادا کیا تھا۔ بمبئی کی جادوئی فلموں میں بھی انہوں نے کام کر کے شہرت حاصل کی۔ اسٹیج اور فلم کے علاوہ پشاور واپس آ کر انہوں نے پشاور ریڈیو کے ڈراموں میں کام کر کے بہت شہرت حاصل کی۔ ان میں محمد بن قاسم، غازی صلاح الدین، موسیٰ بن نصیر کے علاوہ پشتو ڈرامے بھی شامل ہیں۔ پشاور ریڈیو کے ایک مقبول پروگرام 'قہوہ خانہ' میں وہ چار سال تک صداکاری کرتے رہے۔ پشاور ریڈیو نے ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر ان کی سلور جوبلی بھی منائی تھی۔ یہ اعزاز ریڈیو کے بہت کم فن کاروں کو حاصل ہوا ہے۔ 1930ء میں انہوں نے پاکستان کی ایک دستاویزی پشتو فلم میں بھی کام کیا تھا جس کے اردو مکالمے، اسکرین اور کہانی قدرت اللہ شہاب نے تحریر کیے تھے۔ ان کا پشتو ترجمہ امیر حمزہ شنواری نے کیا تھا۔ سجاد سردار نیازی (ناہید نیازی کے والد) اس فلم کے موسیقار تھے۔ رفیق غزنوی نے بھی اس فلم میں اداکار کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ وہ اپنی آواز کی گھن گرج کی وجہ سے مشہور تھے۔ بنیادی طور پر تھیٹر کے اداکار تھے۔ فروری 1980ء میں ان کا انتقال ہوا۔

پشاور کے ایک اور فن کار کریم جان تھے۔ ان کے والد محکمۂ پولیس میں ملازم تھے۔ کریم جان پشاور میں 1910ء میں محلہ آسیہ گیٹ میں پیدا ہوئے تھے۔ انہیں بچپن ہی سے اداکاری کا شوق تھا۔ اس زمانے میں ہندوستان کے دوسرے شہروں سے تھیٹر کمپنیاں پشاور آ کر ڈرامے پیش کرتی تھیں۔ وہ اپنے والد کے ساتھ ڈرامے دیکھنے جاتے تھے۔ اسکول میں طالب علمی کے زمانے میں انہوں نے اسکول کے ڈراموں میں کام بھی کیا تھا۔

کریم جان کو اداکاری کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ اسی شوق کے باعث وہ تعلیم ادھوری چھوڑ کر ایک پارسی تھیٹر کمپنی میں ملازم ہو گئے اور بمبئی پہنچ گئے۔ بمبئی میں انہوں نے ایک فلم ساز ادارے میں ملازمت کر لی۔ اس وقت بولتی فلموں کا دور شروع ہو چکا تھا۔ ان کی پہلی فلم 'لعل یمن' تھی' وہ پہلی فلم ہی سے مقبول ہو گئے۔ انہیں واڈیا مووی ٹون کی متعدد فلموں میں کام کرنے کا موقع ملا جن میں باغِ مصر، کالا گلاب، حسن بانو اور سردار منصور نے بہت شہرت حاصل کی۔ انہوں نے فلم 'قدرت کا فیصلہ' میں ہیرو کی حیثیت سے کام کیا۔ دوسری عالمگیر جنگ شروع ہو گئی تو کریم جان نے اداکاری چھوڑ کر نیوی میں ملازمت کر لی۔ وہ مختلف محاذوں پر موجود رہے اور اس بہانے دنیا کے بہت ملکوں کی سیر کی۔ برما کے محاذ پر جاپانیوں کے حملے اور کامیابیوں کے بعد برطانوی فوج پسپا ہوئی۔ کریم جان نے بھی بھاگ کر جان بچائی لیکن اپنے یونٹ سے وابستہ رہے۔ جنگِ عظیم کے ختم ہونے کے بعد وہ بمبئی میں ہی تعینات رہے، قیامِ پاکستان کے وقت وہ اپنے وطن پشاور واپس آ گئے جہاں ان کی شادی ہوئی۔ پشاور میں انہوں نے محکمہ پی ڈبلیو ڈی میں ملازمت اختیار کی اور ایس ڈی او کے عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے۔ کریم جان عموماً سفید لباس پہنا کرتے تھے۔ سردیوں میں سوٹ پہنتے تھے مگر ٹائی استعمال نہیں کی۔ انگریزی اور اردو پر انہیں عبور حاصل تھا۔ پشتو اور ہندکو ان کی مادری زبانیں تھیں۔ 1957ء میں دل کا دورہ پڑنے کی وجہ سے وہ جاں بحق ہو گئے۔

پشاور کے ایک اور فن کار شاعر غزنوی تھے۔ وہ 1910ء میں پشاور کے محلہ سرکہ فروت میں پیدا ہوئے۔ زمانہ طالب علمی سے ہی وہ شعر کہنے لگے تھے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ فلمی جریدہ 'مصور' کے ایڈیٹر ہو گئے جو لاہور سے شائع ہوتا تھا۔ اس طرح ان کا سفر شروع ہوا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

لاہور میں ان کی ملاقات 1934ء میں اے آر کاردار سے ہوئی۔ کاردار ان دنوں کلکتہ کے ایک ادارے سے وابستہ تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی میں وہ مصنف کے طور پر کام کرنے لگے۔ ان کی پہلی فلم باغی سپاہی تھی جس کے مکالمے اور کہانی شاعر غزنوی نے لکھے تھے۔ یہ فلم 1930ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس فلم کو بنانے میں کافی سرمایہ لگایا گیا تھا۔ اس فلم کے اداکاروں میں مظہر خان، بملا کماری شامل تھے۔ باغی سپاہی کو بہت کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ اس کے بعد فلم ملاپ اور مندر کی کہانی اور مکالمے لکھے۔ کاردار کلکتہ سے بمبئی گئے تو شاعر غزنوی کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ بمبئی میں انہوں نے اے آر کاردار کی فلم ''پوجا'' کے گیت لکھے۔ اس فلم کے موسیقار رائیل بسواس تھے۔ کاردار کی زیرِ ہدایت بننے والی فلم سوامی، کے گیت بھی شاعر غزنوی نے لکھے تھے۔ رفیق غزنوی اس فلم کے موسیقار تھے۔ انہوں نے کاردار کی اور بھی فلموں کے گیت لکھے تھے۔ کاردار سے اختلافات کی بِنا پر وہ ان سے الگ ہوگئے۔

کاردار سے علیحدہ ہونے کے بعد ممبئی سے لاہور آگئے۔ لاہور میں انہوں نے عطاء اللہ شاہ ہاشمی کی فلم ''بھائی'' کی کہانی، مکالمے اور گیت لکھے۔ اس فلم کے ہدایت کار کے ڈی مہرا تھے۔ ماسٹر غلام حیدر نے فلم ''بھائی'' کی موسیقی ترتیب دی تھی۔ اس فلم کے گیت بہت مقبول ہوئے تھے۔ یہ ایک کامیاب فلم تھی۔ فلم ساز عطا اللہ شاہ کی فلم ''تہذیب'' کا آغاز ہوا تو تقسیمِ ہند کا بھی اعلان ہوگیا۔ ہدایت کار کرشن کمار بمبئی چلے گئے جہاں یہ فلم ''کنیز'' کے نام سے بنائی گئی۔ بمبئی میں کاسٹ بھی تبدیل کردی گئی۔ منور سلطانہ، شیام، کلدیپ کور، شبانہ اس فلم کے ممتاز اداکار تھے۔ تقسیم کے بعد یہ فلم ''کنیز'' کے نام سے لاہور میں بھی ریلیز ہوئی تھی۔

''کنیز'' کے بعد شاعر غزنوی نے فلم ''ایک روز'' لکھی۔ اس کے موسیقار شیام سندر تھے۔ ہدایت کاری کے فرائض داؤد چاند نے ادا کیے تھے۔ الناصر اور نسرین اس کے مرکزی کردار تھے۔ (نسرین سلمٰی آغا کی والدہ ہیں) آشا بھونسلے اور آغا سلیم رضا بھی اس فلم کے اداکاروں میں شامل تھے۔ تقسیم کے بعد یہ فلم بھی بمبئی میں مکمل ہوئی تھی۔ 1947ء میں شاعر غزنوی نے فلم خانہ بدوش لکھی تھی۔

بمبئی کے دورانِ قیام میں شاعر غزنوی کا ایک قابلِ ذکر کارنامہ ہدایت کار محبوب کی شہرۂ آفاق انقلابی فلم ''ایک ہی راستہ'' کی کہانی اور مکالمے لکھنا تھا۔ ''ایک ہی راستہ'' ایک انوکھے موضوع پر لکھی گئی تھی۔ انگریزی حکومت کے دور میں اس موضوع پر ایسی انقلابی فلم بنانا بڑے حوصلے کی بات تھی۔ اس فلم میں شیخ مختار نے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ شیخ مختار فوج میں ملازم ہے اور ملک سے باہر فرائض ادا کرتا ہے۔ ایک بار وہ اپنے گاؤں واپس آتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص نے اس کی بہن کی آبروریزی کی ہے۔ شیخ مختار انتقام کے جذبے سے اندھا ہوجاتا ہے اور اس شخص کو ہلاک کردیتا ہے۔ پولیس گرفتار کرلیتی ہے۔ مقدمہ عدالت میں پیش ہوتا ہے۔ عدالت کا منظر ایک یادگار منظر ہے، شیخ مختار جج کے سامنے پیش ہوکر کہتا ہے کہ یہ کس قسم کا نظام اور انصاف ہے۔ میں نے میدانِ جنگ میں بے شمار دشمنوں کو ہلاک کیا جن سے میری کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی اور نہ ہی انہوں نے میرا کچھ بگاڑا تھا۔ ان کو مارنے پر مجھے تمغے دیے گئے۔ اب جبکہ میں نے اپنی بہن کی آبرو لوٹنے والے کو ہلاک کیا ہے تو مجھے سزائے موت کا حقدار ٹھہرایا جارہا ہے۔

انگریز حکومت کے دور میں یہ فلم ایک باغیانہ فلم تھی لیکن سنسر نے اس کو پاس کردیا اور اس فلم نے زبردست کامیابی حاصل کی۔ ہدایت کار محبوب کو اس فلم بنانے پر بہت داد ملی۔ محبوب نے اس دور میں بہت سے انوکھے موضوعات پر فلمیں بنائی تھیں جن میں ایک فلم روٹی بھی تھی۔ اس فلم میں محبوب نے دولت اکٹھی کرنے والے لوگوں پر طنز کیا تھا اور یہ واضح کیا تھا کہ دولت کی ہوس لامعنی اور بے مقصد ہے۔ یہی دولت کا لالچی کردار جب ایک ٹرک میں سونا لاد کر جارہا ہے تو راستے میں ایک ریگستان میں پھنس جاتا ہے جہاں کھانا پینا بھی میسر نہیں ہے۔ وہ ایک روٹی اور دو گھونٹ پانی کے لیے ترس رہا ہے۔ اس ویرانے میں ایک نیم پاگل کردار نمودار ہوکر اس کی حالتِ زار پر ہنستا ہے اور کہتا ہے کہ لو، اب یہ سونا کھاؤ اور پیو۔ تمہیں ساری زندگی اسی کو اکٹھا کرنے کا جنون رہا ہے نا؟ اب اسی سے بھوک مٹاؤ۔

قیامِ پاکستان کے بعد شاعر غزنوی نے لاہور کی فلمی صنعت کے لیے کہانیاں اور گیت لکھے۔ پہلے وہ فلم ساز عطا اللہ شاہ ہاشمی سے وابستہ رہے اور ان کے لیے فلموں کی کہانیاں اور مکالمے لکھے۔ اس سے پہلے جب لاہور میں فلمی صنعت برائے نام رہ گئی تھی تو شاعر غزنوی بددل ہوکر پشاور

کرینہ سیف علی خان کی رسمِ ولیمہ کے موقع پر لی گئی تصویر اور نیچے ان کے ولیمہ کارڈ کا عکس

Begum Mansur Ali Khan of Pataudi

requests the pleasure of the company

Nawab & Begum
Kazim Ali Khan of Rampur

Dawat-e-Walima

to celebrate the wedding of her son

Saif Ali Khan

son of the Late Nawab Mansur Ali Khan of Pataudi

to

Kareena Kapoor

daughter of Shri Randhir Kapoor & Smt. Babita Kapoor

on Thursday the 18th of October 2012, at 8 p.m.

چلے گئے اور ریڈیو میں پروڈیوسر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ 1950ء میں عطا اللہ شاہ ہاشمی نے دوبارہ فلم سازی کا آغاز کیا تو شاعر غزنوی کو اپنی فلم ''اکیلی'' کی کہانی اور مکالمے لکھنے کے لیے پشاور سے بلالیا۔ شاعر غزنوی نے فلم ''اکیلی'' کی کہانی، مکالمے اور گیت لکھے۔ اس فلم کے ہدایت کار کے ڈی مہرا اور موسیقار ماسٹر غلام حیدر تھے۔ اداکاروں میں سنتوش، راگنی، ہندوستان سے آئے ہوئے مزاحیہ اداکار چارلی نمایاں تھے۔ یہ فلم زیادہ کامیابی حاصل نہ کرسکی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے فلم ''ہم وطن'' لکھی۔ اس دوران میں ان کی ملاقات اداکار، فلم ساز اور ہدایت کار نذیر سے ہوئی جو انہیں بمبئی سے جانتے تھے۔ نذیر صاحب کے لیے انہوں نے فلم ''بھیگی پلکیں'' کے مکالمے اور گیت لکھے۔ ممبئی سے واپس آئے ہوئے شریف نیر اس کے ہدایت کار تھے۔ موسیقی غلام حیدر نے بنائی تھی۔ یہ فلم باکس آفس پر کامیاب نہ ہوئی تو نذیر صاحب نے پنجابی فلمیں بنانے کا ارادہ کیا۔ شاعر غزنوی ان کے اصرار کے باوجود ان سے رخصت ہوگئے۔ نذیر صاحب کی پنجابی فلم ''شہری بابو'' نے بہت کامیابی حاصل کی جس کے مکالمے بابا عالم سیاہ پوش نے لکھے تھے۔ رشید عطرے اس کے موسیقار تھے۔

ایور ریڈی پکچرز نے فلم ''سسی'' بنائی تو مکالمے اور گیت لکھنے کے لیے شاعر غزنوی کی خدمات حاصل کیں۔ اس فلم کے ہدایت کار داؤد چاند تھے۔ اداکاروں میں صبیحہ خانم، سدھیر، آشا بھونسلے اور نذر شامل تھے۔ نذر کے لیے لکھے ہوئے مکالمے ہر ایک کی زبان پر چڑھ گئے۔ فلم

WWW.PAKSOCIETY.COM

''سسی'' نے بے انتہا کامیابی حاصل کی اور آمدنی کا نیا ریکارڈ قائم کیا۔ اس فلم نے مشرقی پاکستان میں بھی زبردست کامیابی حاصل کی۔ نذر نے شیر گل کے نام سے جو مزاحیہ کردار ادا کیا تھا وہ سب پر چھا گیا تھا اور اس فلم کے مزاحیہ مکالمے لوگوں کو زبانی یاد ہو گئے تھے۔ فلم ساز اور ہدایت کار اشفاق ملک کی کامیاب ترین فلم ''باغی'' کا منظر نامہ اور مکالمے بھی شاعر غزنوی نے لکھے تھے۔ اس کے موسیقار رحمان ورما تھے۔ مسرت نذیر اور سدھیر مرکزی اداکار تھے۔ یہ فلم بہت کامیاب ہوئی تھی اور اس کی نمائش چینی زبان میں ڈب کر کے چین میں بھی کی گئی تھی۔

شاعر غزنوی کافی عرصے تک فلم ساز عطا اللہ شاہ ہاشمی کے فلم ساز ادارے کارواں پکچرز سے وابستہ رہے اور ان کی کئی فلموں کے منظر نامے اور مکالمے لکھے۔ فلموں سے دل اکتا گیا تو وہ کراچی چلے گئے جہاں انہوں نے صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ شاعر غزنوی کی تحریر کا قابلِ ذکر پہلو یہ تھا کہ وہ تھیٹریکل انداز کی بجائے سادہ اور عام فہم زبان میں چھوٹے چھوٹے مکالمے لکھتے تھے جو کہ اس زمانے کا رواج نہ تھا۔ 22 اکتوبر 1971ء کو لاہور میں ان کا انتقال ہوا جہاں قبرستان میانی صاحب ان کا آخری ٹھکانا ہے۔

شاعر غزنوی سے ہماری بھی ملاقاتیں رہی ہیں۔ ہم اس زمانے میں صحافی تھے اور فلمی حلقوں اور اسٹوڈیوز میں ہماری آمد و رفت رہتی تھی۔ شاعر غزنوی اس وقت بوڑھے ہو چکے تھے لیکن اندازہ ہوتا تھا کہ جوانی میں وہ ایک خوبرو شخص ہوں گے۔ گورا رنگ، ستواں ناک اور چمکدار آنکھیں ان کی ذہانت کی عکاس تھیں۔ سامنے کے دو تین درمیانی دانت ٹوٹ چکے تھے جس کی وجہ سے بعض اوقات ان کی بات سمجھنے میں مشکل پیش آتی تھی۔

ان کے بارے میں ایک لطیفہ یاد آ رہا ہے۔ عطا اللہ شاہ ہاشمی شاہ نور اسٹوڈیو میں فلم ''غالب'' بنا رہے تھے جس میں سدھیر نے غالب کا کردار ادا کیا تھا۔ سیٹ پر گئے تو ایک منظر فلمایا جا رہا تھا جس میں سدھیر ایک شعر بھی پڑھتے ہیں۔ اس منظر کی ریہرسل شروع ہوئی تو سدھیر صاحب نے مکالمے ادا کرتے ہوئے یہ شعر پڑھا۔

دل ہی تو ہے نا سنگ و خشت
درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار
کوئی ہمیں رلائے کیوں

ریہرسل میں ہم نے دیکھا کہ سدھیر صاحب شعر کا پہلا مصرع اس طرح پڑھ رہے تھے۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ و ہشت

ہم نے آغا سلیم رضا کے کان میں کہا کہ سدھیر صاحب ''سنگ وخشت'' کی جگہ ''سنگ وہشت'' کہہ رہے ہیں۔ ہمارا کہنا تو مناسب نہ ہوگا۔ آپ تصحیح کرا دیں۔ آغا صاحب نے کان لگا کر سنا تو شعر اسی طرح پڑھا جا رہا تھا مگر کسی کی اس طرف توجہ نہ تھی۔ آغا سلیم رضا نے ہدایت کار کرشن کمار کو جا کر بتایا اور انہوں نے شعر درست کرا دیا۔

آغا سلیم رضا ہنستے ہوئے واپس آئے تو ہم نے کہا ''آغا جی، غالب کے شعر میں یہ غلطی کیوں ہو رہی تھی؟''

انہوں نے کہا۔ ''آفاقی، دراصل مکالمے شاعر غزنوی یاد کراتے ہیں۔ ان کے ٹوٹے ہوئے دانتوں کی وجہ سے خشت کی جگہ ہشت کی آواز نکلی ہوگی جو سدھیر صاحب نے اسی طرح یاد کر لیا۔ کسی اور کا تو ریہرسل کی طرف دھیان ہی نہیں تھا۔ ہدایت کار کرشن کمار ہی یہ مکالمہ سن رہے تھے جنہیں اردو اور غالب سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے اس لیے سدھیر صاحب شعر کا حلیہ بگاڑ رہے تھے۔''

شاعر غزنوی صاحب سے ہماری اکثر اسٹوڈیو میں ملاقات ہو جاتی تھی۔ اس وقت تک ہم ان کے مکمل پس منظر سے واقف نہیں تھے۔ ویسے بھی وہ ہمارے بزرگ تھے اس لیے کبھی زیادہ ملاقاتوں اور بے تکلفی کی نوبت نہیں آئی۔ مگر وہ ایک خوددار اور حساس مصنف کی حیثیت سے نمایاں تھے۔ ان کی طبیعت میں انکسار بہت زیادہ تھا۔ کسی پر اپنی علمیت اور کارکردگی کا رعب نہیں ڈالتے تھے۔ بعد میں جب ان کی طویل جدوجہد کے بارے میں معلوم ہوا تو بہت افسوس ہوا کہ اگر پہلے معلوم ہو جاتا تو ان کے تجربات سے کافی فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔

برصغیر کے ایک اور نامور اداکار اشرف خان بھی پشاور میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے آباؤ اجداد افغانستان سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ تلاشِ معاش کے سلسلے میں ان کے والد اندور چلے گئے تھے۔ اشرف خان سات برس کی عمر میں یتیم ہو گئے تھے۔ وہ تعلیم چھوڑ کر اپنی والدہ اور چھوٹی بہن کی پرورش کرنے کے لیے محنت مزدوری کرنے لگے۔ روزگار سے پورا نہ ہو سکا تو انہوں نے مویشی چرانے شروع کر دیے۔ ایک دن وہ شام کو مویشیوں کو واپس لے کر گانے

ہوئے واپس آ رہے تھے۔ شہر کے باہر ایک گجراتی سیٹھ ٹھہرے ہوئے تھے جو ایک تھیٹر کمپنی کے مالک تھے۔ اس نے اشرف خان کی سریلی آواز سنی تو انہیں بلایا۔ یہ نوعمر لڑکا انہیں بہت باصلاحیت اور خوبصورت نظر آیا۔ سیٹھ نے ایک خوبرو لڑکے کو دیکھا تو پوچھا ''کیا تم کسی ڈرامے میں لڑکی کا کردار کرو گے؟'' اس زمانے میں تھیٹر میں لڑکے لڑکیوں کے کردار کیا کرتے تھے۔ اشرف خان نے جواب دیا۔ ''میں ایک مرد ہوں، لڑکی کا کردار کیسے کر سکتا ہوں ہاں اگر لڑکے کا کردار ہو تو مجھے منظور ہے۔''

سیٹھ ان کی صاف گوئی اور جرأت سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے اشرف خان کو اپنی تھیٹریکل کمپنی میں بیس روپے ماہانہ پر ملازم رکھ لیا۔ شروع میں انہیں چھوٹے موٹے کردار کرنے پڑے مگر انہوں نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا لیا، وہ روز بروز بہتر کام کرتے ہوئے مقبول ہونے لگے۔ جب جوان ہوئے تو انہیں مرکزی کردار ملنے لگے۔ ان کی تنخواہ بڑھا کر دو سو روپے ماہوار کر دی گئی جو کہ اس زمانے کے لحاظ سے بہت اچھی بلکہ بہت بڑی تنخواہ تھی۔ اس زمانے میں ہر چیز سستی تھی۔ آٹا ایک روپے کا 32 سیر اور گھی ایک روپیا میں چوبیس چھٹانک ملتا تھا۔ ایک وقت کا کھانا دو پیسے میں تیار ہو جاتا تھا۔ اس لحاظ سے دو سو روپے ماہوار ایک بہت بڑی تنخواہ تھی۔

سیٹھ جو گجراتی تھا وہ چاہتا تھا کہ اشرف خان گجراتی ڈراموں میں بھی کام کریں۔ اشرف خان کی مادری زبان پشتو تھی لیکن انہوں نے گجراتی زبان بھی سیکھ لی تھی اور گجراتی ڈراموں میں بھی کام کرنے لگے تھے۔ مختلف تھیٹریکل کمپنیوں میں وہ کام کرتے رہے اور نام کماتے رہے۔

فلموں کا دور آیا تو انہوں نے چودہ پندرہ خاموش فلموں میں کام کیا۔ ان کی اداکاری کو بہت پسند کیا جاتا تھا۔ ان کی شخصیت بارعب اور آواز گونجدار تھی۔

خاموش فلموں میں کام کرنے کے باوجود وہ تھیٹر میں کام کرنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ انہوں نے جس بولتی فلم میں پہلی بار کام کیا اس کا نام شکنتلا تھا۔ انہوں نے کئی بولتی فلموں میں اس زمانے کی مشہور ہیروئنوں کے ساتھ کام کیا اور شہرت حاصل کی۔ ایک فلم میں ان کی ہیروئن سردار اختر تھیں۔ وہ فلموں میں گانے بھی گاتے تھے۔ ان کے گائے ہوئے کئی گانے بہت مقبول ہوئے تھے۔ ایک فلم ''ویر کنال'' میں ان کی ہیروئن مہتاب تھیں۔ 1933ء میں ان کی فلم ''حسن کا غلام'' ریلیز ہوئی، شریف بائی ان کے ساتھ ہیروئن تھیں۔ اس فلم میں اشرف خان کے گائے ہوئے گانے بہت مقبول ہوئے، خصوصاً یہ گیت....

نگاہیں پھیر لیں ظالم نے کر کے ہم سے چار آنکھیں
مگر تم نے مری آنکھوں پر کر ڈالیں نثار آنکھیں
کروں کس سے شکایت میں دلِ نادان یہ مشکل ہے
یہاں ایسا ہوا میں دیکھتا ہوں دور منزل ہے

اشرف خان کی مقبولیت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس زمانے میں ایسے اداکاروں کی بہت قدر کی جاتی تھی جو بہت اچھے گلوکار بھی تھے۔

اشرف خان نے محبوب کی فلم ''روٹی'' میں یادگار کردار کیا تھا۔ اس فلم کے مرکزی کردار چندر موہن، سردار اختر اور شیخ مختار تھے۔ ''روٹی'' اپنے زمانے کی باغیانہ اور بامقصد فلم تھی۔ اشرف خان کا گایا ہوا یہ گانا بہت مقبول ہوا تھا۔

غریبوں پر دیا کر کے بڑا احسان کرتے ہو
انہیں بزدل بنا دینے کا تم سامان کرتے ہو
ان ہی کو لوٹتے ہو اور ان ہی کو دان دیتے ہو
بڑے ہی دھرم والے ہو بڑا احسان کرتے ہو

اشرف خان کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ نمازی اور پرہیز گار تھے۔ وہ چوبیس گھنٹے باوضو رہتے تھے۔

اشرف خان نے فلموں میں کام کر کے بہت شہرت، دولت اور مقبولیت حاصل کی تھی مگر ان کی پہلی ترجیح تھیٹر تھا۔ گجرات کے شہر راجکوٹ میں وہ ایک ڈرامے میں حصہ لینے کے لیے گئے تھے۔ شام کو گھر واپس آئے تو بے ہوش ہو گئے۔ انہیں فوراً اسپتال لے جایا گیا مگر وہ جاں بر نہ ہو سکے۔ نومبر کی گیارہ تاریخ کو وہ انتقال کر گئے۔ ان کی میت احمد آباد لائی گئی جہاں ان کی تدفین ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ جس گھر سے ان کا جنازہ اٹھایا گیا دو ماہ تک وہ تازہ پھولوں کی خوشبو سے مہکتا رہا۔ ان کے مزار پر ہر سال عرس ہوتا ہے جس میں ہزاروں عقیدت مند حصہ لیتے ہیں۔ اس طرح ایک اداکار نے روحانی رہنما کا درجہ بھی حاصل کر لیا۔

اشرف خان نے فلموں میں ہیرو اور کیریکٹر ایکٹر کی حیثیت سے کام کیا تھا اور ہر کردار میں انہیں بے حد سراہا گیا تھا۔ ایسے اداکار بہت کم ہوتے ہیں جو دنیا کے ساتھ دین بھی کماتے ہیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

پشاور کی سرزمین میں جنم لینے والے ایک مایہ ناز مصنف اور ہدایت کار ضیاء سرحدی.... برصغیر میں اپنے کارناموں کی وجہ سے مشہور ہیں۔ ان کے بارے میں ہندوستان کی فلمی دنیا میں ان کی کارکردگی ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔ ضیاء سرحدی پشاور کے محلہ سیٹھیاں میں 1914ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن بہت عیش وعشرت سے گزرا۔ ان کا اصل نام فضل قادر سیٹھی تھا۔ زمانہ طالب علمی میں وہ خاکسار تحریک میں شامل ہو گئے تھے۔ فلموں سے انہیں شروع سے ہی دلچسپی تھی اور چھپ چھپ کر فلمیں دیکھا کرتے تھے۔ اسی زمانے میں ان کو ایک لڑکی سے محبت ہوگئی۔ گھر والوں کو علم ہوا تو انہیں ان کی ہمشیرہ کے پاس بمبئی بھجوادیا گیا۔ عاشقی کے دنوں میں انہوں نے شاعری بھی کی مگر نام نثر نگاری میں پیدا کیا۔

ایک روز موقع پاکر وہ فلم اسٹوڈیو کے اندر پہنچ گئے۔ وہاں ان کی ملاقات محبوب خان سے ہوئی جو اس زمانے میں ساگر موی ٹون کی فلموں میں ایکسٹرا کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ یہ دوستی بہت گہری ہوگئی۔ محبوب خان ہی وہ شخص تھے جنہوں نے ضیاء سرحدی کو کہانیاں لکھنے کی طرف مائل کیا۔ اس طرح ضیاء سرحدی نے فلموں کی کہانیاں، مکالمے اور منظر نامہ لکھنا شروع کردیے اور محبوب خان کے ساتھ ان کے دوستانہ مراسم قائم ہوگئے۔ انہوں نے محبوب خان کے لیے بھی ایک کہانی لکھی تھی۔ محبوب خان کو اس وقت تک کسی فلم کی ہدایت کاری کا موقع نہیں ملا تھا مگر ضیاء سرحدی کو یقین تھا کہ ایک دن وہ بڑے ہدایت کار بن جائیں گے۔

اسی زمانے میں انہیں کلکتہ جانے کا موقع ملا۔ وہاں انہیں ایک فلم ایینہ میں ایک چھوٹا سا کردار کرنے کا موقع ملا۔ اس فلم کے ہدایت کار بھی ایک پٹھان اختر نواز تھے۔ ان کے بارے میں بہت کچھ بیان کیا جاچکا ہے۔ اس فلم میں کام کرتے ہوئے وہ فلم کی ہیروئن سردار اختر پر عاشق ہوگئے مگر یہ عشق یک طرفہ تھا۔ کلکتہ میں وہ ایک فلم دیکھنے گئے جس کا نام ''الہلال'' تھا۔ یہ دیکھ کر وہ حیران رہ گئے کہ یہ وہی اسکرپٹ تھا جو وہ محبوب کو دے کر آئے تھے۔ محبوب خان ''الہلال'' کے ہدایت کار تھے مگر کہانی نویس کی حیثیت سے بھی ان ہی کا نام جلوہ گر تھا۔ ضیاء سرحدی کو غصہ بھی آیا اور مایوسی بھی ہوئی۔ انہوں نے محبوب خان کو ایک قانونی نوٹس بھجوادیا۔ جواب میں انہیں محبوب کا تار موصول ہوا جس میں محبوب نے انہیں فوراً بمبئی واپس آنے کا لکھا تھا۔ بمبئی پر محبوب سے ملاقات ہوئی تو بہت گلے شکوے ہوئے۔ محبوب نے بتایا کہ جب فلم ساز نے ضیاء سرحدی کا لکھا ہوا اسکرپٹ پڑھا تو انہیں اتنا پسند آیا کہ انہوں نے اس کہانی کے لالچ میں محبوب کو ہدایت کاری کا موقع دے دیا۔ محبوب کے پاس ضیاء سرحدی کا پتا نہیں تھا اور وہ یہ موقع بھی ہاتھ سے نہیں کھونا چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے یہ کہانی ''الہلال'' کے نام سے فلمائی۔ ''الہلال'' نے سارے ملک میں تہلکہ مچادیا۔ محبوب نے ضیاء سرحدی کو ساگر موی ٹون کے اسکرپٹ ڈپارٹمنٹ میں ملازم کرادیا۔

1930ء میں ضیاء سرحدی نے اس ادارے کے لیے فلم ''من موہن'' لکھی محبوب خان اس کے ہدایت کار تھے۔ ضیاء سرحدی نے ''من موہن'' کے گیت بھی لکھے تھے۔ یہ فلم بھی بے حد کامیاب ہوئی۔ کہانی اور مکالموں کے علاوہ ضیاء سرحدی کے لکھے ہوئے گیت بھی بہت مقبول ہوئے۔ ایک گانا خاص طور پر بے حد مقبول ہوا۔ اس کے بول تھے۔

تم ہی نے مجھ کو پریم سکھایا
سوئے ہوئے ہردے کو جگایا

اس فلم کی کامیابی نے ضیاء سرحدی کو سکہ بند مصنف گیت نگار اور محبوب کو ایک بڑے اور کامیاب ہدایت کار کی حیثیت سے مستحکم کردیا۔ ضیاء سرحدی نے جاگیردار، جیون ساتھی، کل کی بات، ہم تم اور وہ، وطن اور جیون ساتھی کے اسکرپٹ اور گیت لکھے اس طرح ان کی شہرت میں اضافہ ہوتا گیا۔

1938ء میں انہوں نے ساگر موی ٹون کے لیے فلم ''پوسٹ ماسٹر'' لکھی اس کے ہدایت کار بھی وہی تھے۔ ببو، کمار، یعقوب اور بدھو ایڈوانی وغیرہ نے اس فلم کی کاسٹ میں اہم کردار ادا کیے تھے۔ یہ بہت کامیاب فلم تھی۔ ضیاء سرحدی کی لکھی ہوئی کہانیوں میں حقیقی زندگی... اور عام لوگوں کے روزمرہ کے مسائل ضرور شامل ہوتے تھے جس کی وجہ سے فلم بین انہیں پسند کرتے تھے۔ اسی سال انہوں نے ساگر کی فلموں سیوا سماج، بھولے بھالے کی ہدایت کاری کے فرائض ادا کیے۔ یہ بہت کامیاب فلمیں تھیں۔ 1942ء میں ضیاء سرحدی نے محبوب خان کے لیے فلم ''بہن'' لکھی جس نے کامیابی کا ایک نیا ریکارڈ قائم کیا۔ انیل بسواس اس فلم کے موسیقار تھے۔ اسی سال انہوں نے فلم ''سپیرا'' لکھی۔ اس کے ہدایت کار بھی وہی تھے۔ اس فلم کے گیت تنویر نقوی نے لکھے تھے۔ وہ ایک فلم ''وادی پار'' بنانے کے لیے لاہور بھی آئے تھے مگر فلم ساز سے اختلافات کے باعث یہ فلم مکمل نہ کرسکے اور واپس بمبئی چلے گئے۔ 1943ء میں انہوں نے فلم ''نادان'' لکھی اور اس کی ہدایت دیں۔ نور جہاں اور مسعود اس فلم کے مرکزی کردار تھے۔ اس فلم میں نور جہاں کے گائے ہوئے نغمات بہت مقبول ہوئے۔ انہوں نے فلم ''بجنی''، بڑی ماں، اور محبوب کی فلم اعلان، کے گیت لکھے۔ یہ سب فلمیں بہت مقبول اور کامیاب تھیں۔ فلم بڑی ماں کے گیت بھی ضیاء سرحدی نے لکھے تھے جو بہت پسند کیے گئے۔ ہر آنے والی فلم کے ساتھ ان کی شہرت، مہارت اور مانگ میں اضافہ ہوتا رہا۔

1951ء رنجیت موی ٹون کی فلم ''ہم لوگ'' کا آغاز ہوا۔ یہ فلم ضیاء سرحدی کی پیشہ ورانہ زندگی میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے جس کے حوالے سے ضیاء سرحدی ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ اس فلم کے اہم اداکاروں میں بلراج ساہنی، نوتن، شیاما، انور حسین، رشید خان، بی ایم درانی اور رتن کمار (چائلڈ ایکٹر کی حیثیت سے) شامل تھے۔ اس فلم کی موسیقی روشن نے بنائی تھی جس کو بے حد پسند کیا گیا۔ اس فلم کی کہانی، مکالمے اور نغمات خود ضیاء سرحدی نے لکھے تھے۔ یہ ایک نچلے، محروم اور کچلے ہوئے طبقے کی کہانی ہے جس میں ہر اداکار نے اپنے کردار کا حق ادا کردیا ہے۔ اس فلم کے مکالمے لوگوں کو زبانی یاد ہوگئے تھے۔ مثلاً یہ نعرہ، جس دیے میں تیل نہ ہو اس کو جلنے کا کیا ادھیکار؟''

''ہم لوگ'' نچلے طبقے کی محرومیوں اور مایوسیوں کی کہانی تھی جسے نہایت ہنر مندی سے فلم کے سانچے میں ڈھالا گیا تھا۔ بلراج ساہنی نے اس فلم میں سب سے اہم اور مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ فلم میں مشکلات اور مایوسیوں میں گھرے ہوئے لوگوں کے لیے یہ پیغام بھی تھا کہ ایک دن ان کے حالات ضرور بدلیں گے اور اچھے دن بھی آئیں گے۔ اس گیت کو فلم کی تھیم کی حیثیت حاصل تھی۔

گائے چلا جا، گائے چلا جا
اک دن تیرا بھی زمانہ آئے گا

فلم کا ایک ایک مکالمہ سوچ سمجھ کر لکھا گیا تھا جو فلم بینوں کے دلوں میں پیوست ہو جاتا تھا۔ مثال کے طور پر یہ مکالمے۔

''دیے کا تیل ختم ہوگیا تو پھر کیا ہوگا؟''

سیف علی خان کرینہ کپور......نواب پٹودی شرمیلا ٹیگور ایک یادگار تصویر

WWW.PAKSOCIETY.COM

"پھر صبح ہو جائے گی"

"ہم لوگ" ایک ایسی فلم تھی جسے دیکھنے والے کبھی بھلا نہیں سکیں گے۔ اس فلم نے ضیاء سرحدی کو ایک ترقی پسند کہانی نویس اور ہدایت کار کے روپ میں پیش کیا اور یہ ان کا حوالہ بن کر رہ گئی۔ ہر اداکار نے نپا تلا کردار بڑی خوبصورتی سے ادا کیا تھا۔ ہدایت کار نے فلم میں ایک حقیقی ماحول پیدا کر دیا تھا جس کی وجہ سے دیکھنے والوں کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ فلم نہیں، سچ مچ کے چلتے پھرتے زندہ انسان دیکھ رہے ہیں۔ اس فلم کی سلور جوبلی کے موقع پر بمبئی میں ایک بہت بڑا جلسہ منعقد کیا گیا تھا۔ کسی فلم کی کامیابی کا جشن منانے کا بالکل نیا اور انوکھا طریقہ تھا۔ بمبئی کے تمام نامور ترقی پسندوں نے اس فلم کو سراہا تھا۔ "ہم لوگ" ضیا سرحدی کی زندگی میں ایک انقلاب اور نمایاں تبدیلی لے کر آئی۔ حقیقت پسند کہانیاں وہ پہلے بھی لکھتے اور بناتے رہے تھے مگر ان میں رومان کی چاشنی ہوتی تھی جبکہ "ہم لوگ" ہندوستانیوں کی اکثریت کی کہانی اور ایک فریاد تھی۔ اس کے بعد ضیاء سرحدی نے رومانی فلمیں بنانے پر توجہ نہیں دی۔ وہ بے رحم حقیقت پسندی کے اظہار کے عادی ہو گئے۔

"ہم لوگ" کے بعد بمبئی میں ضیاء سرحدی نے فلم "فٹ پاتھ" بنائی۔ جیسا کہ فلم کے نام ہی سے ظاہر ہے، یہ فٹ پاتھ پر زندگی گزارنے والوں کی کہانی تھی۔ اس فلم میں دلیپ کمار اور مینا کماری نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ "فٹ پاتھ" موضوع اور پیشکش کے اعتبار سے ایک اعلیٰ درجے کی فلم تھی جسے بامقصد آرٹ فلم بھی کہا جا سکتا ہے۔ باکس آفس پر "فٹ پاتھ" کامیاب نہ ہو سکی لیکن ہندوستان کی یادگار فلموں میں اس کا شمار ہوتا ہے اور انڈیا کے فلم آرکائیو میں یہ فلم رکھی گئی ہے۔ خیام اس کے موسیقار تھے۔

"فٹ پاتھ" کی ناکامی کے باوجود نہ ضیاء سرحدی کا حوصلہ پست ہوا اور نہ ہی وہ افسوس اور مایوسی کا شکار ہوئے۔ ان کے پرانے ساتھی اور دوست محبوب خان نے انہیں اپنی ایک فلم کی ہدایت دینے اور لکھنے کی پیشکش کی۔ فلم کا نام "آواز" تھا۔ یہ بھی ایک حقیقت پسندانہ موضوع تھا لیکن فلم کی تکمیل میں بہت زیادہ تاخیر ہو گئی۔ اس کے علاوہ محبوب خان اور ضیاء سرحدی میں اختلافات بھی پیدا ہو گئے۔ ضیاء سرحدی یہ فلم نامکمل چھوڑ کر پاکستان آ گئے۔ محبوب خان نے اس فلم کو اپنی مرضی کے مطابق کاٹ چھانٹ کے بعد مکمل کیا لیکن یہ فلم فلاپ ہو گئی۔ ضیاء صاحب اس ناکامی کا ذمہ دار محبوب خان کو ٹھہراتے تھے اور محبوب، ضیاء سرحدی کو الزام دیتے تھے۔

ہندوستان میں ضیاء سرحدی ایک اور انقلابی فلم "خاتون" کی کاغذی تیاریاں بھی مکمل کرتے رہے۔ خاتون، ایک کشمیری خاتون کی کہانی ہے جس نے ریاست کے حکمراں کے خلاف آواز بلند کی تھی۔ یہ بہت انوکھا انقلابی موضوع تھا لیکن یہ منصوبہ ادھورا ہی رہ گیا۔ پاکستان آنے کے بعد ضیاء سرحدی نے ایک فلم راہگیر بنائی جسے کامیابی نہ حاصل ہو سکی۔ صبیحہ خانم اور اسلم پرویز اس کے مرکزی کردار تھے۔ یہ کافی مہنگی فلم تھی جس کی تکمیل میں کافی دیر لگی۔ اس کی ناکامی کے باوجود انہوں نے دوسری فلم "آخرِ شب" کا آغاز کر دیا لیکن یہ فلم نامکمل ہی رہی۔

پاکستان میں ضیاء سرحدی نے چند فلموں کی کہانیاں لکھیں جن میں "لاکھوں میں ایک" نے بہت کامیابی حاصل کی۔ کافی عرصے بعد انہوں نے کریسنٹ فلمز کے لیے فلم "انسان" کی ہدایت کاری کی۔ اس فلم کے اداکاروں میں علاؤ الدین، سنتوش کمار، اور صابرہ سلطانہ نمایاں تھے۔ رشید عطرے اس فلم کے موسیقار تھے۔ یہ فلم زیادہ کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ یوں لگتا تھا جیسے "ہم لوگ" کے بعد کامیابیوں نے ضیاء سرحدی کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ 1971ء میں انہوں نے ایک فلم "رم جھم" کا آغاز کیا تھا لیکن فلم ساز سے اختلافات کے باعث وہ یہ فلم چھوڑ کر برطانیہ چلے گئے۔ 1974ء میں اور ایک فلم "شہر سائے" کی ہدایت کاری کے لیے پاکستان آئے تھے۔ ان کی زندگی کی آخری فلم تھی جو کامیاب نہ ہو سکی۔ وہ برطانیہ واپس چلے گئے اور پھر لوٹ کر واپس نہیں آئے۔ ان کی وفات بھی لندن میں ہی ہوئی۔ 27 جنوری 1997ء کو بیاسی برس کی عمر میں وہ ایک پردیسی ملک میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ برطانیہ میں وہ اپنی بیٹی کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ وہاں ان کی دوستوں سے ملاقاتوں اور گپ شپ کرنے کے سوا کوئی اور مصروفیات نہیں تھیں۔

پاکستان میں ان کے دو بیٹے خیام سرحدی اور بلال سرحدی ہیں۔ خیام سرحدی ٹی وی کے مقبول اداکار ہیں۔ انہوں نے فلمی اداکارہ صاعقہ سے شادی کی تھی۔ فروری 2011ء میں ان کے بیٹے خیام سرحدی حرکتِ قلب بند ہو جانے کی وجہ سے انتقال کر گئے۔ بلال سرحدی

پاکستان میں ان کی یادگار رہ گئے ہیں (2013ء)

ضیاء سرحدی نظریاتی طور پر سوشلسٹ تھے۔ ان کی لکھی ہوئی فلموں میں بھی ان کی سوشلزم کا رنگ نظر آتا ہے۔ فلم "ہم لوگ" اور "فٹ پاتھ"، ایک لحاظ سے نظریاتی فلمیں تھیں۔

ضیاء صاحب پاکستان آئے تو وہ ایک مشہور شخصیت تھے۔ پاکستان فلمی اور ادبی حلقوں میں گرمجوشی سے ان کا خیر مقدم کیا گیا۔

وہ ایک مجلسی انسان تھے۔ دوستوں اور عقیدت مندوں کے ہجوم میں وہ بہت خوش رہتے تھے۔ وہ ایک حاضر جواب، ذہین اور شگفتہ مزاج انسان تھے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ کسی دانشور مصنف یا مغربی فلاسفر کا تذکرہ چھڑ جاتا تھا تو وہ معلومات کا دریا بہا دیتے تھے۔ ان کا اندازِ گفتگو اور کہانی سنانے کا انداز بہت دلکش اور پُرکشش تھا۔ کئی بار وہ کہانی سناتے تو کسی ایک اہم کردار کے حوالے سے واقعات بیان کرتے تھے۔ لیکن جب کہانی لکھنے بیٹھتے تو ان کا ذہن کسی اور طرف چل پڑتا تھا۔ ہم نے انہیں کبھی مکمل اسکرپٹ لکھتے ہوئے نہیں دیکھا۔ منظر نامہ بھی وہ کاغذ پر نہیں لکھتے تھے۔ یہ ان کے ذہن میں محفوظ رہتا تھا جس میں وہ خود ہی تبدیلیاں کرتے رہتے۔ فلم سازوں اور اداکاروں کے لیے یہ جاننا مشکل تھا کہ آئندہ وہ کیا کرنے والے ہیں۔ وہ کاغذوں پر فلمائے جانے والے مناظر کے مکالمے ساتھ کے ساتھ لکھتے رہتے تھے۔ انڈیا میں ان کا کیا طریقہ تھا یہ معلوم نہیں ہو سکا لیکن پاکستان میں ہم نے ان کا یہی طریقۂ کار دیکھا۔

یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ فلمی دنیا میں ہر ایک سے دوستی اور ملاقات ہونے کی وجہ سے ہم نے اپنے دوستوں کے ذریعے ان تک رسائی حاصل کر لی اور پھر ان کے گرد صحافیوں اور فلم والوں کا جو مجمع رہتا تھا ہم بھی ان میں شامل ہو گئے۔ ضیاء صاحب بہت دلچسپ باتیں کرتے تھے۔ وہ ایک زندہ دل انسان تھے۔ باتوں باتوں میں فقرہ بازی بھی کرتے رہتے تھے۔ جب ہم ان سے نزدیک ہو گئے تو انہوں نے ہمیں بھی فقرے بازی کا نشانہ بنایا۔ ہم نے اپنے محترم دوست آئی اے رحمان سے کہا کہ ضیاء صاحب ہم پر بہت فقرے کستے ہیں مگر ہم جواب میں احتراماً خاموش رہتے ہیں۔

رحمان صاحب نے کہا "فقرہ بازی میں لحاظ ملاحظہ

محمد آصف طارق

پاکستان کے پہلے طیارہ ساز، والد بزرگوار کا نام چوہدری محمد منیر، 1958ء میں پیدا ہوئے، 1974ء میں انہوں نے جامعہ ملیہ کراچی سے میٹرک کیا۔ ایف اے کے بعد بی ایس سی میں داخلہ لیا لیکن اس دوران میں انہیں پی آئی اے میں ملازمت مل گئی۔ انہوں نے دورانِ ملازمت پاکستان کا پہلا طیارہ بنایا۔ انہیں یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ تیسری دنیا کے ممالک میں پہلے طیارہ ساز ہیں۔ سول ایوی ایشن اتھارٹی نے ان کے بنائے ہوئے جہاز کو رجسٹریشن نمبر APBCU الاٹ کیا جبکہ جہاز کا نام المنیر ہے۔ اس ہوائی جہاز سے انہوں نے 28 اگست 1986ء کو ملیر کے رن وے سے باقاعدہ پرواز کی۔ پی آئی اے نے ان کی فنی صلاحیتوں کو مزید اجاگر کرنے کے لیے انہیں امریکا بھجوایا جہاں انہوں نے ایرو سپیس (Aerospace) میں ڈپلوما کیا۔ ان کے جہاز کو ائرپورٹ کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ایک دفعہ 15 پونڈ ایندھن بھر کر تین سو میل تک سو میل فی گھنٹے کی رفتار سے پرواز کر سکتا ہے۔ اسے ٹیک آف اور لینڈ کرنے کے لیے صرف تین سو فٹ جگہ کی ضرورت ہے۔ اس کی لمبائی 18.5 فٹ اونچائی 7.5 فٹ اور بازوؤں کی لمبائی 37 فٹ ہے۔ یہ جہاز تین سلنڈر اور 54 سی سی کا ہے۔ مجموعی وزن 650 پونڈ ہے۔ اس پر تین لاکھ روپے لاگت آئی تھی۔

مرسلہ: طارق نوید، بکھر

WWW.PAKSOCIETY.COM

کیا۔ اگر وہ آپ کو بے تکلفی میں نشانہ بناتے ہیں تو آپ بھی جواب دیا کیجیے۔"

ایک بار ان کی محفل میں بیٹھے ان کی فقرہ بازی سن رہے تھے۔ بار بار جوابی فقرے زبان تک آ کر رہ جاتے تھے۔ ہم نے ضیاء صاحب سے کہا "آپ ہمارا بہت مذاق بناتے ہیں اور جملے کستے رہتے ہیں۔ ہم جواب میں احتراماً چپ رہتے ہیں۔"

وہ ہنس کر بولے۔ "ارے میاں بے تکلفی میں سب جائز ہے۔ آپ بھی فقرہ بازی کیجیے۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

یہ اجازت نامہ حاصل کرنے کے بعد ہم نے بھی زبان کھولی۔ ضیاء صاحب اس نوک جھوک سے بہت لطف اندوز ہوئے۔ ہم نے محسوس کیا کہ ہمارے لیے ان کے دل میں شفقت کے جذبات ہیں۔ برا ماننے کی بجائے وہ ہماری بے تکلفی پر بہت خوشی کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ ہم نے بعد میں ہر موضوع کے بارے میں ان سے سوالات کرنے شروع کردیے۔ وہ اپنی طرف سے وضاحت دے کر یا ہماری بات کو ہنسی میں اڑا کر مزہ لیتے تھے۔

ایک بار ہم نے کہا "ضیاء صاحب، آپ نے بہت اچھی رومانی کہانیاں اور مکالمے لکھے ہیں مگر ہم نے محسوس کیا ہے کہ "ہم لوگ" بنانے کے بعد آپ نظریات کے دائرے میں بند ہو کر رہ گئے ہیں۔ آپ 'ہم لوگ' کے خول سے باہر کیوں نہیں نکلتے؟"

وہ ہنسنے لگے "آپ نے خول سے باہر آنے کی بات خوب کی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے انڈا توڑ کر چوزے کو باہر نکالنے کی فرمائش کر رہے ہیں۔"

انہوں نے ہمیں نکتہ چینی کی اجازت بھی دے رکھی تھی جس کا ہم شاید کبھی کبھی ناجائز فائدہ بھی اٹھا لیا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر ان کی فلموں کے بارے میں گفتگو شروع ہوئی تو ہم نے کہا "ضیاء صاحب فٹ پاتھ کے بعد آپ نے محبوب صاحب کے لیے فلم آواز بنائی مگر اختلافات کی وجہ سے ادھوری چھوڑ کر الگ ہو گئے۔ بعد میں یہ فلم محبوب صاحب نے بذاتِ خود مکمل کی تھی مگر یہ فیل ہو گئی۔ ایسا کیوں ہوا؟"

کہنے لگے "ارے بھئی محبوب سے پرانا یارانہ ہے مگر میں اپنے کام میں مداخلت نہیں برداشت کر سکتا۔ بعد میں انہوں نے فلم میں کاٹ چھانٹ کر کے اس کا حلیہ ہی بگاڑ دیا۔ فلم آدھا تیتر آدھا بٹیر ہو کر رہ گئی اور فلاپ ہو گئی۔ اس کو فلاپ کرانے کی ذمے داری محبوب ہی کی ہے۔"

ہم نے کہا "ضیاء صاحب، محبوب صاحب ایک ہنرمند ہدایت کار ہیں۔ یہ تو آپ بھی تسلیم کرتے ہیں۔ یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ وہ خود اس کے فلم ساز تھے۔ پھر خود اپنی فلم کو فلاپ کرنے کی ذمے داری ان پر کیسے ڈالی جا سکتی ہے۔"

بولے "دراصل فلم کی کہانی اور منظرنامہ تو میرے ذہن میں تھا۔ جب محبوب نے فلم کی ہدایت کاری کی تو وہ نہیں جانتے تھے کہ میں کیا بنانا چاہتا تھا۔ اس لیے فلم کا حلیہ بگڑنا ہی تھا۔"

ہم نے اچانک سوال کیا۔ "ضیاء صاحب ہم نے دیکھا ہے کہ آپ منظرنامہ اور مکمل اسکرپٹ نہیں لکھتے۔ ساتھ کے ساتھ سین اور مکالمے لکھتے رہتے ہیں، ہم نے پڑھا ہے کہ اٹلی کا مشہور حقیقت پسند ہدایت کار روزے لینی کا بھی یہی دستور تھا۔ کیا آپ کے خیال میں یہ طریقہ کار درست ہے۔"

"ارے بھئی۔ روزے لینی بہت بڑا مصنف اور ہدایت کار تھا۔ اس نے دنیا میں فلموں کی شکل و صورت ہی بدل دی تھی۔ یہاں تک کہ انگریز ڈیر کمین جیسی حسین فن کارہ کا شوہر بھی بن گیا۔ تو کیا وہ غلط تھا۔ اگر غلط تھا تو اتنی شہرت اور کامیابیاں اس نے کیسے حاصل کر لیں؟"

ہم کچھ کہتے کہتے رک گئے۔

ضیاء صاحب مسکرا کر بولے "چپ کیوں ہو گئے۔ بولیے کیا کہنا چاہتے ہیں۔"

ہم نے کہا "تو کیا روزے لینی کے نقشِ قدم پر چل کر آپ بھی کسی انگریز ڈیر کمین کے منتظر ہیں۔"

ضیاء صاحب نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ دوسرے لوگ بھی ہنسنے لگے۔

ضیاء صاحب بولے "ارے بھئی تم تو بہت خطرناک آدمی ہو۔ دلوں کے بھید بھی جانتے ہو۔"

ضیاء صاحب کی ایک ادا یہ بھی تھی کہ وہ سوچتے یا گفتگو کرتے ہوئے ماچس کی تیلیاں توڑتے رہتے تھے، یہاں تک کہ ٹوٹی ہوئی تیلیوں کا ڈھیر لگ جاتا تھا۔ ایک دن ہم نے کہا "ضیاء صاحب اب پتا چل گیا کہ آپ کے فلم ساز یہ شکوہ کیوں کرتے ہیں کہ آپ جو فلم بناتے ہیں اس پر لاگت بہت زیادہ آتی ہے۔"

"اچھا، تو ہمیں بھی بتائیے۔"

ہم نے کہا "آپ ماچسوں کا بہت خرچہ کراتے ہیں۔" ضیاء صاحب کے نزدیک ہو کر ہم نے یہ دیکھا کہ وہ فلم ساز کا زیادہ سے زیادہ خرچہ کراتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک منظر فلمانے کے لیے کرین منگائی اور اسٹوڈیو کے فلور کی دیواریں تڑوا دیں مگر شوٹنگ کی نوبت کئی دن کے بعد آئی۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام خرچے فلم ساز کو برداشت کرنا پڑے۔

فلم "راہگیر" کے لیے انہیں ایک منظر میں پنجرے سمیت ایک طوطے کی ضرورت تھی۔ پروڈکشن کنٹرولر ان کے حکم کے مطابق یہ سمجھ کر پنجرہ اور طوطا کرائے پر لے آیا کہ ایک دو دن بعد واپس کر دے گا۔ اس کا کرایہ غالباً پانچ یا دس روپے روزانہ تھا جبکہ پندرہ بیس روپے میں پنجرے سمیت طوطا خریدا جا سکتا تھا۔ ضیاء صاحب نے طوطے کا منظر دو تین ہفتے کے بعد فلما کر طوطا واپس کرنے کی ہدایت کردی۔ پروڈکشن کنٹرولر نے ہمیں شکایتاً بتایا کہ طوطے اور پنجرے کا کرایہ 280 روپے ادا کرنا پڑا ہے حالانکہ پندرہ روپے میں یہ خریدا جا سکتا تھا۔

ایک دن ضیاء صاحب بہت اچھے موڈ میں تھے اور چہک رہے تھے۔ ہم نے کہا "ضیاء صاحب، لوگوں کا خیال ہے کہ آپ فلم ساز کا پیسہ بلاوجہ زیادہ سے زیادہ خرچ کراتے ہیں۔"

ضیاء صاحب مسکرائے۔ "لوگ ٹھیک کہتے ہیں۔"

ہم نے پوچھا۔ "مگر آپ بلاوجہ فلم ساز کا نقصان کیوں کراتے ہیں۔"

ضیاء صاحب بولے۔ "اس لیے کہ ان لوگوں نے بھی تو غریبوں کا خون چوس کر ہی یہ پیسا جمع کیا ہے۔ تو پھر ان کی جیب خالی کرانے میں کیا حرج ہے۔"

یہ تھا ضیاء صاحب کا نظریہ۔ وہ دراصل اس طرح پیسے والوں سے غریبوں کا انتقام لیتے تھے۔

ضیاء صاحب جب تک لاہور میں رہے ان کی محفل آرائی کا سلسلہ جاری رہا۔ ہم بھی موقع پا کر ان سے ملنے پہنچ جایا کرتے تھے۔ جب وہ برطانیہ جانے لگے تو ان کے قریبی حلقے کے لوگ اداس ہو گئے۔ ہم نے کہا "ضیاء صاحب اب برطانیہ جا کر انگریزوں سے اربابِ وطن کی بے بسی کا انتقام ضرور لیجیے گا۔"

وہ ہنسنے لگے۔ چند سال بعد وہ واپس آئے تو آئی رحمٰن صاحب کے دفتر میں محفل جمائی۔ ہمیں بھی رحمان صاحب نے فون کر کے مطلع کیا اور ہم فوراً وہاں پہنچ گئے۔ ضیاء صاحب دیکھنے میں ویسے کے ویسے ہی تھے البتہ ان کے گھنے

آسیان
(Association of South East Asian Nations)

جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک کی اس تنظیم کا قیام 8 اگست 1967ء کو بنکاک (تھائی لینڈ) میں عمل میں آیا، اس کے چارٹر پر پانچ رکن ممالک انڈونیشیا، ملائیشیا، سنگاپور، تھائی لینڈ اور فلپائن نے دستخط کیے۔ برونائی دارالسلام جنوری 1984ء میں، ویت نام 28 جنوری 1995ء، لاؤس اور میانمر (برما) 23 جولائی 1997ء کو اس کے رکن بنے اور اب ان کی تعداد نو ہو گئی ہے۔ اس کے قیام کا مقصد رکن ممالک کی معاشی ترقی کو تیز کرنا اور علاقے میں امن و امان قائم کرنا ہے، اس اعتبار سے ادارے کا مستقبل انتہائی تابناک نظر آتا ہے۔ آسیان ممالک کی بلند ترین اتھارٹی رکن ممالک کے سربراہوں کی کانفرنس ہے۔ پہلی سربراہ کانفرنس فروری 1976ء میں انڈونیشیا کے شہر بالی میں منعقد ہوئی تھی۔ باری باری رکن ممالک کے وزرائے خارجہ کسی رکن ملک میں ہر سال اکٹھے ہوتے ہیں۔ معاشی امور کے وزراء بھی رکن ممالک کے مابین معاشی معاملات پر غور کرنے کے لیے سال میں اپنا ایک اجلاس بلاتے ہیں۔ علاوہ ازیں وزراء کی کانفرنسیں حسبِ ضرورت بلائی جا سکتی ہیں۔ ضرورت کے وقت اسٹینڈنگ کمیٹی کا اجلاس بھی ہوتا ہے۔ یہ میزبان ملک کے وزیر خارجہ اور دیگر رکن ممالک کے سفیروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کی گیارہ مستقل کمیٹیاں ہیں۔ اقتصادی تعاون کی کمیٹی رکن ممالک کے امورِ اقتصادیات کے وزراء کی ہدایت کے مطابق اپنے فرائض انجام دیتی ہے۔ کمیٹی کو خوراک، زراعت، جنگلات، مالیات، بنکاری، صنعت، معدنیات، بجلی، مواصلات، ٹرانسپورٹ، تجارت اور سیاحت کے شعبوں میں باہمی تعاون کو فروغ دینے کا فریضہ سونپا گیا ہے۔ دوسرے وزارتی اجلاس کا اہتمام یہ تین کمیٹیاں کرتی ہیں جن میں ثقافت اور اطلاعات، سائنس اور ٹیکنالوجی اور سماجی ترقیات شامل ہیں۔

مرسلہ: زہیب اختر، کوئٹہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

اور گھونگریالے بالوں کا بیشتر حصہ سفید ہوچکا تھا۔ ہم تینوں کافی دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اس ملاقات میں ضیاء صاحب کی گفتگو کا موضوع انگریزوں کی اخلاقی پستی تھا۔

بولے "ارے آفاقی کیا پوچھتے ہو۔ ہم لوگ انگریزوں سے خواہ مخواہ مرعوب ہیں۔ وہاں جاکر دیکھا تو چوریاں اور جرائم عام ہیں۔ سڑکوں پر کھڑی کاروں سے چور ریکارڈ پلیئر اور ریڈیو نکال کر چلتے بنتے ہیں۔ آئے دن گھروں میں نقب لگا کر چوریاں ہوتی ہیں۔ چور سڑکوں پر پارک کاروں کے پہیے تک اتار کرلے جاتے ہیں اور تو اور منرل واٹر کے نام سے نلکوں کا پانی بوتلوں میں بھر کر فروخت کرنے کے جرم میں کئی کمپنیوں کو بند کیا جاچکا ہے۔ یہ ہے وہ انگریز جس نے دو سو سال تک ہم پر حکومت کی ہے اور ہم جس کو بہت ایماندار، با اصول اور بلند اخلاق سمجھتے ہیں۔"

یہ ضیاء صاحب سے ہماری آخری ملاقات تھی کیونکہ اگلے دن انہیں کراچی روانہ ہوجانا تھا۔ اس کے بعد ان کی وفات کی خبر آئی۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

(پشاور سے شوکت رحمان خٹک صاحب نے پشاور میں پیدا ہونے والے ایک مشہور اداکار پریم ناتھ کے حوالے سے دلچسپ معلومات ارسال کی ہیں، ملاحظہ کیجئے۔)

یہ کہانی پشاور کے کریم پورہ بازار کے رہنے والے پریم ناتھ کی ہے جس نے ہندوستان فلم انڈسٹری میں بہت نام پیدا کیا۔ پریم ناتھ اور راج کپور آپس میں رشتے دار تھے۔ دلیپ کمار کے والد سرور خان جو ڈرائی فروٹ کا کاروبار کرتے تھے ان کے پرتھوی راج کے والد مسٹر ناتھ جو پشاور کے کابلی تھانے میں بطور ڈی ایس پی تعینات رہ چکے تھے، ان کے آپس میں دوستانہ مراسم تھے۔ جب سرور خان بمبئی روانہ ہوئے تو پھر وہیں رہائش اختیار کی۔ اس طرح سرور خان اور پرتھوی راج فیملی کے مابین تعلقات مزید بڑھے۔ پریم ناتھ کی کہانی کچھ اس طرح سے ہے۔ پریم ناتھ ملہوترا 21 نومبر 1926ء کو پشاور شہر کے کریم پورہ بازار کی ایک گلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد رائے بہادر کرتار ناتھ ملہوترا پشاور میں ڈی آئی جی پولیس تعینات تھے۔ پریم ناتھ کی پیدائش کے دن پشاور کے علاقے چوک ناصر خان میں ہولناک آگ لگی تھی جس نے بہت بڑے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اس آگ میں سیکڑوں گھر جل کر راکھ ہوگئے تھے۔ اس دور میں پشاور کے گھروں میں لکڑی بہت زیادہ استعمال کی جاتی تھی۔ اتفاق کی بات ہے کہ اسی دن دریائے نربدا کی قیامت خیز طغیانی نے بھی بڑے وسیع علاقے میں تباہی مچائی تھی۔ پریم ناتھ اپنے والدین کی پہلی اولاد تھے۔ ان کے بعد ان کے چھوٹے بھائی راجندر ناتھ اور نریندر ناتھ دوسرے اور تیسرے نمبر پر تھے۔ پریم ابھی ماں کی گود میں ہی تھے کہ ان کے والد کا تبادلہ جزائر انڈیمان (کالا پانی) ہوگیا، وہاں پر چار برس تعیناتی کے بعد ان کا واپس ہندوستان تبادلہ ہوا۔ پریم نے ابتدائی تعلیم ناگپور کے سینٹ جان اسکول سے حاصل کی۔ بعدازاں مارس کالج لکھنو سے گریجویشن کی۔ اس دوران میں ان کے والد کے تبادلے ہوتے رہے جس کی وجہ سے ان کی تعلیم بھی متاثر ہوتی رہی تاہم انہوں نے اٹھارہ سال کی عمر میں بی اے کی ڈگری حاصل کرلی تھی۔ ان کے والدین کی خواہش تھی کہ وہ آئی سی ایس کریں لہٰذا انہیں الٰہ آباد کے لاء کالج میں داخل کرادیا گیا لیکن قانون کی تعلیم میں ان کا دل نہ لگا۔ انہیں بچپن سے اداکاری کا شوق تھا۔ وہ اپنے پھوپی زاد بھائی پرتھوی راج کے بڑے شیدائی تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے ایک خط میں پرتھوی راج سے اپنے اداکار بننے کی خواہش کا اظہار بھی کیا تھا لیکن پرتھوی راج نے پریم کو تعلیم جاری رکھنے کا مشورہ دیا تھا اور گریجویشن کے بعد فلموں میں قسمت آزمائی کی نصیحت کی تھی۔

پریم کے والد نے انہیں وکالت کی تعلیم چھوڑنے کی اجازت تو دے دی لیکن وہ فلمی زندگی کے سخت خلاف تھے مجبوراً پریم فوج میں بھرتی ہوگئے اور نو ماہ تک اندور کی فوجی چھاؤنی میں سخت تربیت حاصل کرتے رہے لیکن جلد ہی گھبرا گئے اور وہاں سے بھاگ کر ممبئی چلے گئے۔ اس وقت ان کی جیب میں صرف 100 روپے تھے۔ ممبئی میں پریم نے پرتھوی راج کے گھر میں رہائش اختیار کی۔ یہ نومبر 1944ء کا زمانہ تھا۔ پریم نے پرتھوی تھیٹر کے ڈراموں میں حصہ لینا شروع کیا 1945ء کا پورا سال تھیٹر کی نذر ہوگیا جہاں ان کی دوستی اپنے ہم عمر راج کپور سے ہوئی جو ان کے ساتھ ڈراموں میں حصہ لیتے تھے۔ ان دونوں نے پرتھوی تھیٹر کے کئی ڈراموں شکنتلا، پٹھان، آہوتی اور دیوار وغیرہ میں اکٹھے کام کیا۔ اس تھیٹر میں پریم کی تنخواہ 750 روپے ماہوار تھی۔ انہی دنوں راج کپور کی ملاقات پریم کی بہن کرشنا سے ہوئی اور وہ پہلی نظر میں ہی کرشنا کی محبت میں گرفتار

ہوئے۔ بعدازاں ان کی کرشنا سے شادی ہوگئی تھی۔ 20 برس کی عمر میں پریم کو ممبئی کے فلمی ادارے عالم آرٹ پروڈکشنز کی ایک فلم "دولت کے لیے" میں .... اداکاری کا موقع ملا۔ اس فلم کے ہدایت کار رشید اور موسیقار اے کے [illegible] تھے۔ اداکاروں میں ممتاز، پریم ناتھ، دلاور، فیروز، [illegible]، مقبول اور سیانی نمایاں تھے۔ یہ فلم اگست 1947ء میں ممبئی میں ریلیز ہوئی۔ اس فلم کی نمائش کے موقع پر ممبئی میں ہندو مسلم فسادات پھوٹ پڑے جس سے بے حد مالی اور جانی نقصان ہوا۔ 1948ء میں پریم کو ان کے بہنوئی راج کپور نے اپنی پہلی فلم "آگ" میں ایک مصور کا کردار دیا۔ اس فلم کے ہدایتکار راج کپور اور موسیقار رام گنگولی تھے۔ اداکاروں میں نرگس، راج کپور، کامنی کوشل، پریم ناتھ، نگار سلطانہ اور ششی راج نمایاں تھے۔ یہ فلم اپنی دلکش موسیقی کے باوجود کوئی خاص کامیابی حاصل نہ کرسکی تھی۔

بطور ہیرو ان کی پہلی فلم اے بی سی پروڈکشنز کی رنگین فلم "اجیت، عرف رنگین زمانہ" تھی جس میں اس کی ہیروئن مونیکا ڈیسائی تھی۔ اس فلم کے ہدایت کار ایم بھوناتی اور موسیقار گوبند رام تھے۔ پریم کی شہرت اور ناموری کا آغاز راج کپور کی شہرہ آفاق فلم "برسات" سے ہوا جس میں انہوں نے نرگس اور راج کپور کے ساتھ بطور سیکنڈ ہیرو کام کیا۔ فلم میں ان کی ہیروئن ایک نئی اداکارہ "نمی" تھی جو مشہور گلوکارہ وحیدن بائی کی بیٹی اور اداکارہ جیوتی کی بھانجی تھی۔ اس فلم کے ہدایتکار راج کپور اور موسیقار شنکر جے کشن تھے۔ یہ ان موسیقاروں کی بھی پہلی فلم تھی۔ یہ فلم 1949ء میں ریلیز ہوئی۔ اور باکس آفس پر سپرہٹ ثابت ہوئی۔

اسی سال پریم کے والد پولیس ڈیپارٹمنٹ سے ریٹائر ہوگئے۔ اپنے والد کی ریٹائرمنٹ کے بعد پریم ناتھ نے جبل پورہ میں ایمپائر تھیٹر خرید لیا اور اپنے والد سے درخواست کی کہ وہ اس سینما کی دیکھ بھال کی ذمے داری قبول کرلیں۔

1951ء میں پریم ناتھ نے کیشپ پروڈکشنز کی فلم "آرام" میں مدھوبالا اور دیو آنند کے ساتھ "عاشق نامراد" اور فیمس پکچرز کی فلم "دوستارے" میں ثریا اور دیو آنند کے ساتھ ایک "منچلے محبوب" اور ڈاکومینٹری آف انڈیا کی ایک فلم "ہندوستان ہمارا" میں ایک ویلن بندھو، کا کردار ادا کیا لیکن ان کو اصل شہرت 1952ء میں ریلیز ہونے والی محبوب پروڈکشنز کی رنگین فلم "آن" سے ملی جس میں انہوں نے ایک "گھمنڈی شہزادے" کا کردار ادا کرکے ناقدین کو چونکا دیا۔ اس فلم کے ہدایت کار محبوب خان اور موسیقار نوشاد تھے۔ مرکزی کردار نادرہ، دلیپ کمار اور نمی نے ادا کیے تھے۔ یہ فلم پریم ناتھ کے فلمی کیریئر کا سنگ میل ثابت ہوئی۔ اس فلم میں ان کا یہ ڈائیلاگ عوام میں بے حد مقبول ہوا تھا۔

"جب چیونٹی کی موت آتی ہے تو اس کے پر نکل آتے ہیں۔"

"آن" کی بے مثال کامیابی کے بعد پریم ناتھ نے متعدد فلموں "بادل گھر جوائی، اور ساقی میں مدھوبالا، بزدل، مہمان اور درد دل میں نمی، نوجوان میں نلنی جیونت، "شوخیاں، میں ثریا، انجان میں وجنتی مالا، پربت میں نوتن، آب حیات میں ششی کلا، سگائی میں ریحانہ، جاگیر میں مینا کماری، فوری ڈیز، ڈاکٹر شیطان، چوبیس گھنٹے اور گیمبلر میں شکیلا، بن آف سندباد میں نشی، بس کنڈیکٹر، سارا جہاں ہمارا، میرا بھائی میرا دشمن اور اپنا گھر میں شیاما اور پٹھان میں ممتاز کے ساتھ مرکزی کردار ادا کیے۔ پریم ناتھ کا پہلا فلمی دور تھا۔ انہوں نے اپنے دور کی تمام خوبصورت اور نامور اداکاراؤں کے ساتھ بطور ہیرو کام کیا۔ 1953ء میں پریم ناتھ کی زندگی میں اداکارہ بھینا رائے نے قدم رکھا۔ ان کی پہلی ملاقات ورما فلمز کی فلم "عورت" کے سیٹ پر ہوئی۔ پہلی ملاقات ہی میں پریم ناتھ دل ہار بیٹھا۔ فلم "عورت" کی فلم بندی کے ساتھ ان کی محبت بھی پروان چڑھتی رہی یہاں تک کہ فلم کی تکمیل کے بعد دونوں شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ فلم "عورت" کے ہدایتکار بی ورما اور موسیقار شنکر جے کشن تھے۔ بعدازاں پریم ناتھ نے بینا رائے کے ساتھ پی این فلمز کی فلم "شگوفہ، نوکلا نوکیتی کی فلم "ہمارا وطن" اور این سی فلمز کی چنگیز خان وغیرہ میں بطور ہیرو کام کیا۔

1954ء میں پریم ناتھ نے اپنا فلمساز ادارہ پی این فلمز قائم کیا اور ایک فلم "پرزنر آف گولکنڈہ" بنائی۔ اس کے فلمساز ہدایتکار اور ہیرو پریم ناتھ خود تھے۔ موسیقی جگن ناتھ نے ترتیب دی، اداکاروں میں بھینا رائے، پریم ناتھ، شوبھنا سمرتھ، ہیرالال، آغا نادر، گگو نمایاں تھے۔ اس فلم کو ضرورت سے زیادہ انقلابی قرار دے کر سنسر بورڈ نے فلم کی دھجیاں بکھیر دیں اور فلم کا حلیہ بگڑ گیا۔ بڑی مشکلوں سے فلم ریلیز ہوئی اور پہلے ہفتے میں ہی بری طرح ناکام ہوگئی۔

اس فلم کی ناکامی سے پریم ناتھ کا دل ٹوٹ گیا۔ انہوں نے خود ساختہ جلاوطنی اختیار کرلی اور دنیا کے مختلف ملکوں میں گھوم پھر کر اپنا غم غلط کرتے رہے۔ وطن واپسی پر

WWW.PAKSOCIETY.COM

پریم ناتھ نے اپنی فلمی زندگی کے دوسرے دور کا آغاز کیا۔ انہوں نے ایک فلم ”بمبئی فلیٹ 417“ شروع کی جو ڈبوں میں بند ہو کر رہ گئی مجبوراً انہیں پانچ پنجابی فلموں اور ایک تامل فلم میں کام کرنا پڑا۔ اس دوران پریم ناتھ نے ایک فلم ”سمندر“ بنائی۔ موسیقار مدن موہن تھے۔ اداکاروں میں بھینا رائے، پریم ناتھ اور راجندر ناتھ نمایاں تھے۔ پریم ناتھ نے اس فلم میں سمندری ڈاکو کا کردار ادا کیا تھا۔ اس فلم کی فلمبندی کے لیے تمام فنکاروں کو بیس روز تک کھلے سمندر میں رہنا پڑا۔ سمندر کا یہ علاقہ شارک مچھلیوں کا مسکن تھا۔ تمام خطرات کے باوجود پریم ناتھ نے سمندر میں چھلانگ لگا کر ایک سین فلمبند کرایا۔ ایک مرتبہ ان کی کشتی کی ایک بڑے جہاز سے ٹکر بھی ہوگئی مگر قسمت نے یاوری کی اور وہ محفوظ رہے۔ یہ فلم 1957ء میں ریلیز ہوئی مگر خاص کامیابی حاصل نہ کر سکی۔

پندرہ برس تک فلموں سے کنارہ کشی کے بعد پریم ناتھ کے فلمی دور کے تیسرے دور کا آغاز 1970ء میں گولڈن جوبلی فلم ”جونی میرا نام“ سے شروع ہوا تھا۔ اس فلم کے ہدایتکار وجے آنند اور موسیقار کلیان جی آنند تھے۔ اس فلم کا معاوضہ انہیں پینتیس ہزار روپے ملا تھا۔ پریم ناتھ نے جن فلموں میں کریکٹر رول کیے ان فلموں میں شہید بھگت سنگھ، سکندر اعظم، امر پال، پیار محبت، تیسری منزل، بہاروں کے سپنے، مہوا، دو بچے دس ہاتھ، گورا اور کالا، راجا جانی، جانی میرا نام، شور، سیاست اور فلسفہ شامل ہیں۔

1967 میں پریم ناتھ نے ایک امریکن ٹی وی سیریز ”مایا“ میں کام کیا۔ 1969ء میں ایک امریکی فلم ”کیئر“ میں فٹ بال کے کھلاڑی کا کردار بھی ادا کیا۔ 1971ء میں پریم ناتھ نے ایک انگریزی فلم ”کاماسترا“ میں فریال کے ساتھ کام کیا۔ جنسی موضوع پر بننے والی اس فلم کی زیادہ تر شوٹنگ ہندوستان میں ہوئی تھی۔ 1985ء میں پریم ناتھ کی آخری فلم ”ہم دونوں“ ریلیز ہوئی جس کے بعد وہ فلموں سے ریٹائر ہو گئے تھے۔ بطور فلمساز پریم ناتھ نے ایک تاریخی فلم ”واجد علی شاہ“ پر کام شروع کیا تھا۔ اس فلم کے موسیقار ہروانے ناتھ تھے۔ لتا منگیشکر نے ان سے اتنا تعاون کیا کہ فلم کے تین گانے صرف ایک روپیہ معاوضہ لے کر ریکارڈ کرائے تھے لیکن بدقسمتی سے یہ فلم مکمل نہ ہو سکی۔

1982ء میں پریم ناتھ پر دل کا پہلا دورہ پڑا جس کے بعد انہوں نے شراب، سگریٹ اور گوشت وغیرہ سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ پریم ناتھ نے اپنے پندرہ سالہ خود ساختہ جلاوطنی کے دور میں ہمالیہ کے وسیع برفانی علاقے چھان مارے تھے۔ انہوں نے سادھوؤں اور رشیوں سے ملاقاتوں کی خاطر انتہائی دشوار گزار راستوں کو خچر کی پیٹھ پر بیٹھ کر عبور کیا تھا۔ کوہ کیلاش پر ایک ڈاکومینٹری فلم بھی بنائی تھی۔ انہوں نے 450 میل کا طویل سفر چھ ہمراہیوں کے ساتھ تبت اور اس کے آس پاس کے علاقوں کا کیا تھا۔

1957ء میں جب چین نے ہندوستان پر حملہ کیا تو پریم ناتھ کو جاسوس قرار دے کر قید کر لیا گیا۔ چین کے وزیراعظم چواین لائی نے صرف ایک سال قبل ہندوستان کا دورہ کیا تھا۔ وہ پریم کو پہچانتے تھے ان کی سفارش پر پریم ناتھ کو قید سے رہائی ملی تھی۔

پریم ناتھ نے ایک برس تک عملی سیاست میں بھی حصہ لیا تھا وہ سوتنترا پارٹی کے رکن رہے مگر بعدازاں تنگ آ کر سیاست کو خیرباد کہہ دیا۔ پریم ناتھ نے ہندی اور انگریزی میں دو کتابیں بھی تصنیف کی تھیں۔ ان کتابوں کے موضوعات میں قدرت، محبت، جنگ، سیاست اور فلسفہ شامل تھے۔ ان کے دو شعری مجموعے، محبت کے آنسو، اور دل کے آنسو، شائع ہوئے تھے۔ یہ نظمیں انہوں نے سری لنکا میں قیام کے دوران لکھی تھیں۔ پریم ناتھ کو اداکاری کے ساتھ ساتھ موسیقی سے دلچسپی بھی جنون کی حد تک تھی۔ موسیقار رنگین ناتھ ان کے استاد تھے۔ ان سے پریم ناتھ نے 92 راگ سیکھے تھے۔ پریم ناتھ کا انتقال 3 نومبر 1992ء کو دل کا دورہ پڑنے سے ہوا اس وقت ان کی عمر 66 برس تھی۔ بھینا رائے سے پریم ناتھ کے دو بیٹے پریم کرشن اور کیلاش ناتھ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ ان کا ارادہ اپنے باپ کی طرح اداکار بننے کا تھا لیکن پریم ناتھ کے مشورے سے انہوں نے فلمسازی کو منتخب کیا، بعدازاں وہ ٹی وی سے وابستہ رہے۔ پریم کرشن نے ٹی وی سیریل ”کتھا“ ”ساگر“ اور ”موننی“ نے ”دھمال“ جیسے سپرہٹ ٹی وی پروگرام پیش کیے۔ پریم ناتھ کے چھوٹے بھائی راجندر ناتھ اور نریندر ناتھ انڈین فلموں کے نامور کامیڈین تھے۔ 1993ء میں بننے والی لارنس ڈی سوزا کی فلم ”دل تیرا عاشق“ اور 1997ء میں بننے والی راکیش ناتھ کی فلم ”محبت“ کو آنجہانی پریم ناتھ کی یادوں سے منسوب کیا گیا تھا۔

جاری ہے

شکیل صدیقی

ان چار دوستوں نے کب سوچا تھا کہ ان کی تان شعلہ نوا بن کر پوری دنیا کے دلوں میں گرمئ عشق جگانے کا سبب بن جائے گی۔ وہ جہاں جاتے تھے انہیں سننے کے لیے شہر کا شہر امنڈ آتا تھا۔ ان کی آواز کا جادو سر چڑھ کر بولتا تھا۔ وہ پوپ سونگ کے بانی کہلائے۔

دنیا بھر میں سب سے زیادہ سنے جانے والے بینڈ کا تذکرہ

جس طرح کتاب دل کی تفسیریں بہت لکھی جاتی ہیں پھر بھی نفسِ مضمون ادا نہیں ہو پاتا، اسی طرح سے ان چار گویوں کے بارے میں کچھ بھی کہا جائے نفسِ مضمون تشنہ لگتا ہے۔ ان کے بارے میں بلا مبالغہ ہزاروں کتابیں شائع ہو چکی ہیں، مگر ہر سال ان کے بارے میں ایک نئی کتاب چھپتی ہے پھر مزید انکشافات ہوتے ہیں۔ ان کے کچھ اور ریکارڈ مارکیٹ میں آجاتے ہیں، جو اب تک سامعین تک نہیں پہنچ سکے۔ بین الاقوامی رسالہ ٹائم اب تک

WWW.PAKSOCIETY.COM

ان کی سال گرہ مناتا ہے اور اپنے قارئین کو ایسی معلومات فراہم کرتا ہے جو اس سے پہلے ان تک نہیں پہنچیں۔ وہ یقیناً اب تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں، بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ انہوں نے اپنی تاریخ خود لکھی ہے۔ ہر سال اگست میں ہزاروں شائقین لیورپول میں جمع ہوتے ہیں اور انہیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ہفتہ موسیقی مناتے ہیں۔ گائیکی کا ایک قدرداں کہتا ہے کہ بیٹلز کو ناپسند کرنے کا مطلب ہے کہ ہم سورج کو ناپسند کرنے لگیں۔

ناقدین کہتے ہیں کہ بیٹلز (فیبل فور) نے موسیقی کا اسٹائل اور رنگ ڈھنگ تبدیل کر کے رکھ دیا۔ انہوں نے ماضی سے اپنا رشتہ توڑ کر حال میں رہنا پسند کیا۔ نیا اور ہیجان خیز ماحول، جس میں ہر چیز کی رفتار بلا خیز تھی۔ ان سے پہلے موسیقی اور گائیکی کی روایات کیا تھیں اور ان کے تہذیبی اقدار کا اثاثہ کیا تھا وہ انہوں نے جاننے کی کوشش نہیں کی اور اسے پس پشت ڈال کر ایک نئی راہ نکالی، جس کا سحر نئی نسل کے رگ و پے میں اس طرح بسا کہ تقریباً نصف صدی ہونے کو آئی ہے اور اترنے کا نام نہیں لے رہا۔ نہ معلوم کتنے آئے اور چلے گئے، سناترا، ایلوس اور جیکسن، لیکن بیٹلز لوگوں کی نگاہوں میں اب تک بسے ہوئے ہیں۔ ان کا لباس، حرکات و سکنات اور آہنگ منفرد تھا، اسی لیے وہ دوسری دنیا کی مخلوق لگتے تھے۔ ان کی گائیکی میں حلاوت، نرمی اور دھیما پن نہیں تھا، ایک تیز تر بہاؤ تھا، جس میں ایک نسل بہہ گئی۔ ایک ناقد نے ان کے فن کی کچھ اس طرح سے تعریف کی کہ وہ راک اور پاپ میوزک کے باپ ہیں، ان سے مفر ممکن نہیں۔ ایک مبصر کا کہنا ہے کہ وہ عظیم مصور پکاسو کی طرح ہیں، جو منفرد اور اوریجنل تھا۔ اس نے فنِ مصوری میں ایک نئی جہت کا آغاز کیا اس لیے لوگ رہتی دنیا تک اسے فراموش نہ کر سکیں گے۔

ناقدین کے تبصروں سے قطع نظر بیٹلز بینڈ کے گائیک جان لینون نے بہرحال اعتراف کیا کہ ان کے بینڈ کا اندازِ گائیکی عظیم گلوکار ایلوس پریسلے کا مرہونِ منت ہے۔ وہ ابتدا میں ایلوس سے بہت متاثر تھے۔ اگر اس دنیا میں ایلوس پریسلے نہ ہوتا تو بیٹلز بھی نہ ہوتے۔ ایلوس ان کے وجود کی اساس ہے۔ وہ ایسا دیا ہے جو کبھی بجھ نہیں سکتا۔ اس کی ضیا پاشیوں سے یہ عالم صدا جگمگاتا رہے گا۔

دیے سے دیا جلا اور بیٹلز اپنے پیش رو سے آگے نہیں نکلے تو اس کے مقام تک ضرور پہنچ گئے۔ اس بلندی تک پہنچتے ہوئے اچھے اچھوں کا سانس پھول جاتا ہے۔ انہوں نے 1960ء میں گائیکی کی دنیا میں قدم رکھا اور تین برس ہی میں لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا۔ ایک بار وہ نیویارک سے واپس آئے تو لیورپول (برطانیہ) کے ایئرپورٹ پر اترنے سے ان کے چاہنے والوں کو پتا چل گیا۔ وہ چار گھنٹے پیشتر ہی ایئر پورٹ پر آ کر جمع ہو گئے۔ ان میں نوجوان لڑکیاں اور لڑکے شامل تھے۔ پھر جب بیٹلز کے طیارے نے لیورپول کے ایئر پورٹ پر لینڈ کیا، اس کا دروازہ کھلا اور زینے لگا دیے گئے۔ ان چار گویوں نے دروازے کے قریب پہنچ کر اپنے ہاتھ ہلائے تو جیسے پیاسی آنکھوں کو قرار آ گیا۔ انہیں دیکھتے ہی سب نے دیوانوں کی طرح ان کا نام لے لے کر نعرے لگانا شروع کر دیے۔ وہ ان پڑھ اور جاہل نہیں تھے، بدتہذیب اور گنوار نہیں تھے، تعلیم یافتہ اور اعلیٰ اقدار کے حامل تھے مگر ان کی صورت دیکھتے ہی وہ ہیجان میں مبتلا ہو گئے اور انہوں نے دیوانگی میں چیخنا شروع کر دیا "بیٹلز۔ بیٹلز۔ بیٹلز۔"

ان کے پرستاروں کی حفاظت کے لیے پولیس کے جوان گھوڑوں پر دوڑتے پھر رہے تھے۔ دو لڑکیاں ان گھوڑوں کی ٹاپوں تلے آ کر روندی گئیں اور انہوں نے موقع پر ہی دم توڑ دیا۔ ان کے جسدِ خاکی کو اٹھانے کی بھی کسی کو فکر نہیں تھی۔ ایک لڑکی بیٹلز کو مخاطب کرنے کے لیے اتنی زور زور سے چیخی کہ اس کے حلق سے خون آنے لگا۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ محبت سرخ گلاب ہے، لیکن اس سرخی میں لہو کی آمیزش کیسے ہو گئی؟ یہ محبت تھی کہ دیوانگی؟

ان چار گویوں کا جادو ان کے چاہنے والوں کے سر پہ کس حد تک چڑھ گیا تھا، یہ بتانے کے لیے ہمیں ذرا پیچھے جانا پڑے گا۔ ان گلوکاروں کا بینڈ (گروپ) 1960ء میں باقاعدہ تشکیل پایا تھا۔ اس گروپ میں جارج ہیریسن، جان لینون، پال میکارٹنی اور رنگو اسٹار شامل تھے۔ وہ چاروں گائیکی کی دنیا میں ایک انقلاب لے آئے۔ تیز تر اور ہیجان خیز انقلاب، جس میں کسی حد تک وحشت بھی شامل تھی۔

ابتدا میں انہیں سننے والا کوئی نہیں تھا، چنانچہ انہوں نے لیورپول اور ہمبرگ (جرمنی) کے کلبوں میں اپنے پروگرام پیش کرنا شروع کر دیے۔ وہاں انہوں نے کچھ نئے تجربات کیے یعنی وحشیانہ پن کے بجائے شائستگی اور نرم روی کا لہجہ اپنایا۔ ان کے گیتوں کی روانی اور رفتار میں اضافہ ہو گیا اور ان کے گانوں کی موسیقی جدید ہونے کے ساتھ رومان پرور ہوتی چلی گئی تو ان کے مداحوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔ نوجوان تو ان کے گرد جمع ہو ہی رہے تھے، عمر رسیدہ افراد نے بھی ان کلبوں میں جانا شروع کر دیا جہاں وہ اپنے پروگرام پیش کرتے تھے۔ ان کا منیجر برین ایپسٹین بہت دانش مند، ہوشیار اور کاروباری تھا، انہیں مجمع کے سامنے کب اور کیسے پیش کرنا چاہیے، یہ اسے خوب معلوم تھا۔ اس کی انگلیاں شائقین کی نبضوں پر رہتی تھیں۔ ابتدا میں ان گویوں کو 'بیٹلمینیا' اور پھر 'فیبل فور' کہا جانے لگا۔ یہ ان کے چاہنے والوں کا والہانہ انداز تھا، جس کے آگے کوئی بند نہیں باندھ سکا۔

ان چار گویوں میں ایک جان لینون تھا۔ جو 9 اکتوبر 1940ء کو لیورپول میں پیدا ہوا، اس کے والدین میں ناچاقی ہو گئی تھی، اس لیے اس نے اپنی خالہ کے ہاں پرورش پائی۔ جب وہ سترہ برس کا تھا تو اس کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ اس سانحے کے بعد لینون کا دل نہ تو گھر میں لگا اور نہ اسکول میں۔ اس لیے کہ گھر میں اس کی خالہ میمی کا رویہ بے حد جارحانہ تھا، جب کہ اسکول میں وہ پڑھائی میں نکھٹو تھا اس لیے اپنے اساتذہ اور ساتھیوں کے اسکیچز اپنی کاپیوں میں بنایا کرتا یا ان پر مضامین لکھتا رہتا۔ اس کی عادات و اطوار کو مدِنظر رکھتے ہوئے اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے خالہ میمی کو خط لکھا کہ اسے اسکول آف آرٹس بھیجا جائے، اس لیے کہ اسے مصوری سے شغف ہے۔ آرٹس اسکول میں اس کی صلاحیتیں اجاگر ہو سکتی ہیں۔ اگر اسے آرٹ اسکول میں داخل نہ کرایا گیا تو یہ ساری عمر کچھ نہ کر سکے گا۔

خالہ نے ہیڈ ماسٹر کی ہدایت پر عمل کیا اور اسے آرٹس اسکول میں داخل کرا دیا۔ 1956ء میں اسکول آف آرٹس میں اس کے ایک دوست نے سالانہ جشن کے موقع پر ایک ڈرامے میں اسے ایلوس پریسلے کا کردار کرنے کو کہا، جو اس نے خوبی سے ادا کیا۔ وہاں سے اس کی سوچ کا دھارا تبدیل ہو گیا اور وہ گلوکاری کی طرف مائل ہو گیا۔ میمی لاکھ سخت مزاج سہی لیکن اس کی ضد کے آگے اس نے ہتھیار ڈال دیے اور اسے ایک گٹار خرید کر دیا۔ جس پر وہ مشہور گیتوں کی دھنوں کی نقل بجانے لگا۔ اس کی ماں نے اپنی زندگی میں اسے ماؤتھ آرگن بجانا سکھا دیا تھا، جان لینون نے اس کی بھی پریکٹس کرنا شروع کر دی۔ اس کے بعد اس نے اپنا ایک گروپ بنا لیا (جو بیٹلز نہیں تھا)، جس میں گلی کوچوں کے وہ لڑکے شامل تھے جنہیں گائیکی کا شوق تھا۔ لینون کو اسی دوران ایک لڑکی سے عشق ہو گیا۔ اس نے فوراً ہی تو نہیں البتہ چار برس بعد (1962ء) میں اپنی گرل فرینڈ سانتھیا پاویل سے شادی کر لی جس سے ایک لڑکا جولین اپریل 63ء میں ہوا۔

1957ء لینون کی ملاقات پال میکارٹنی سے ہوئی۔

اس کی طرح سے پال میکارٹنی بھی لیورپول میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی ماں اسپتال میں مڈوائف تھی۔ انہوں نے کئی بار اپنی رہائش گاہ تبدیل کی اور کسی ایک جگہ ٹک کر نہیں بیٹھے۔ حسنِ اتفاق سے پال میکارٹنی، جان لینون کی خالہ کے مکان سے صرف ایک میل کے فاصلے پر رہا کرتا تھا مگر یہ اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ کبھی اس سے آن ملے گا اور وہ ایک مشترکہ بینڈ قائم کریں گے۔ میکارٹنی کا باپ دن میں سوتی کپڑے فروخت کرتا اور رات کو ایک کلب میں گٹار بجایا کرتا تھا۔ اس نے میکارٹنی اور اس کے بھائی کو پیانو بجانا سکھا دیا۔ اس کی ماں چھاتی کے سرطان میں انتقال کر گئی۔ اس وقت میکارٹنی کی عمر صرف چودہ برس تھی۔ اس کے ایک دوست نے اسے موسیقی کے گروپ 'قوئیری مین' میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ وہاں اس نے مذاق مذاق میں پیانو بجایا تو لوگوں نے اسے پسند کیا۔ چنانچہ جان لینون نے اسے مستقل طور پر بینڈ میں شامل ہونے کو کہا جسے اس نے قبول کر لیا، اس لیے کہ اس کا دل پڑھائی میں نہیں لگتا تھا۔

فروری 58ء میں پال نے اپنے دوست جارج ہیریسن کو دعوت دی کہ وہ اس گروپ کی نگرانی کرے۔ جارج ہیریسن 1943ء میں پیدا ہوا تھا، اس لحاظ سے وہ اپنے گروپ میں سے سب سے کم عمر تھا۔ اس کا باپ بس ڈرائیور تھا اور ماں ملازمت نہیں کرتی تھی اور گھریلو کام کاج میں اپنا وقت گزارتی تھی۔ جارج نے اسکول میں تعلیم حاصل کی لیکن وہ ابتدا ہی سے ہپی ازم کو پسند کرتا تھا، اس لیے بڑے بال رکھتا اور جینز پہنتا تھا۔ گانا بجانا اس کی سرشت میں شامل تھا، اس لیے اس نے بھائی کے ساتھ مل کر ایک میوزیکل گروپ بنا لیا۔ لیکن انہیں اپنا پروگرام پیش کرنے کے لیے گھر سے باہر رہنا پڑتا تھا اور روزگار کی تلاش میں مارا مارا بھی پھرنا پڑتا تھا۔ جارج ہیریسن اور پال میکارٹنی ایک ہی بس میں اسکول جایا کرتے تھے، لہٰذا ان کے درمیان شناسائی تھی۔ انہیں ایک دوسرے کے مشاغل کا جلد ہی پتا چل گیا۔ گٹار دونوں کا شوق تھا۔ چنانچہ وہ ایک دوسرے کے گھر جا کر پریکٹس کرنے لگے۔ پھر انہوں نے جارج ہیریسن کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ وہ کم عمر تھا، اس لیے اسٹیج پر کافی

WWW.PAKSOCIETY.COM

پیچھے کھڑا ہوتا تھا اور جب کوئی گٹار بجانے والا غیر حاضر ہوتا تھا تو اس کی جگہ پُر کر دیتا تھا۔ ان سب نے گائیکی کو اپنا محور بنا لیا تھا، مگر ہیریسن گیت نگاری کی طرف مائل تھا۔ (کچھ عرصے بعد دنیا نے بھی اس کی گیت نگاری کا لوہا مان لیا) جب وہ بیٹلز کی حیثیت سے مشہور ہوئے تو 'اے ہارڈ ڈیز نائٹ' کی فلم بندی کے دوران اسے 'پیٹی بوائڈ' نامی لڑکی سے محبت ہوگئی چنانچہ انہوں نے 21 جنوری 1966ء میں شادی کرلی۔

اس اثنا میں ان کے بہت سے دوست گروپ کو چھوڑ کر چلے گئے۔ گروپ میں صرف یہی تینوں رہ گئے۔ ان لوگوں نے ایک یونی ورسٹی میں داخلہ لے لیا اور باقاعدہ گائیکی اور موسیقی کی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی۔ تاہم اگر کوئی ڈرم بجانے والا مل جاتا تھا تو وہ مہینے میں دو یا تین بار کلبوں میں اپنی آواز کا جادو بھی جگا لیتے تھے۔

لینون کا ایک دوست اسٹکلیفی تھا، جس نے حال ہی میں اپنی ایک پینٹنگ فروخت کر کے گٹار خریدا تھا، جنوری 1960ء میں وہ اس گروپ میں شامل ہوگیا۔ اس نے مشورہ دیا کہ موجودہ نام کو تبدیل کر کے بیٹلز رکھا جائے تاکہ یہ تاثر ملے کہ وہ مشہور گلوکار 'بڈی ہولی' کو خراج عقیدت پیش کر رہے ہیں، جس کے گروپ 'کریکٹ' نے ایک زمانے میں دھوم مچا دی تھی۔ سب نے اس سے اتفاق کیا اور اپنے گروپ کا نام 'بیٹلز' رکھ لیا، مگر کچھ ہی دنوں بعد اسے تبدیل کر کے 'سلور بیٹلز' کر دیا۔ انہی دنوں پاپ سنگر 'جونی جنٹل' اسکاٹ لینڈ کے دورے پر جا رہا تھا، اس نے سلور بیٹلز کو اپنے گانوں میں موسیقی دینے کے لیے چلنے کی دعوت دی جسے انہوں نے بخوشی قبول کرلیا۔ اگست کے مہینے میں انہوں نے اپنا نام تبدیل کر کے ایک بار پھر 'بیٹلز' رکھ لیا، اس لیے کہ سلور بیٹلز انہیں کچھ عجیب سا معلوم ہو رہا تھا۔

کچھ عرصے بعد کوشمیڈر نامی ایک شخص نے ہمبرگ (جرمنی) کے ایک کلب میں گانے کا معاہدہ کرا دیا، جس میں ہوٹل میں رہائش بھی شامل تھی۔ وہ نہ صرف اس کلب بلکہ دوسرے کلبوں میں بھی اپنی آواز کا جادو جگانے لگے۔ اسی اثنا میں کلاز ورمین جو ایک پاپ سنگر تھا، اسے ان کی گائیکی اور ہیر اسٹائل پسند آگیا تو اس نے اپنے اخباری نمائندہ دوستوں کو جمع کرلیا اور ان سے کہا کہ وہ بیٹلز کی تصاویر کھینچ کر اپنے اخبارات میں شائع کریں۔ صحافی دوستوں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا جس سے بیٹلز کو ہمبرگ کے لوگ پہچاننے لگے۔ وہ جب تک ہمبرگ میں رہے فوٹوگرافروں کی ایک ٹیم ان کے پیچھے پیچھے چلتی رہی اور انہیں پبلسٹی دیتی رہی۔

کچھ عرصے بعد یہ پریشانی اٹھ کھڑی ہوئی کہ کوشمیڈر سے کسی بات کے تنازعہ کے سبب وہ ہمبرگ سے نکال دیے گئے۔ شہری انتظامیہ نے کہا کہ ان کی عمریں کم ہیں اس لیے وہ ہمبرگ میں نہیں گا سکتے۔ لینون دسمبر میں لیورپول واپس آگیا، جب کہ اس کا دوست اسٹکلیفی بدستور ہمبرگ میں تھا۔ دو برس بعد بیٹلز گروپ میں شامل لڑکوں کی عمروں میں اضافہ ہوگیا (گویا اب وہ بالغ ہوگئے) تو انہیں ہمبرگ میں گانے کی اجازت مل گئی۔ وہ رات رات بھر کے پروگرام پیش کرنے لگے۔ اسٹکلیفی ذہین اور سمجھ دار تھا، ہر وقت نت نئی باتیں سوچتا رہتا تھا، اس نے ایک بڑے ہیر ڈریسر کے پاس جا کر اپنے بال نئے انداز سے کٹوا لیے۔ یہ انداز بیٹلز گروپ میں شامل دوسرے لڑکوں کو بھی پسند آیا تو انہوں نے اسے اپنا لیا۔ اسٹیج پر پروگرام کرنے والے یہ چاروں گلوکار ایک جیسے لگتے تھے۔ اس لیے کہ وہ اب کپڑے بھی ایک جیسے پہننے لگے تھے۔

اسٹکلیفی کو گلوکاری کے علاوہ آرٹ سے بھی دلچسپی تھی، اس لیے اس نے گروپ کو چھوڑ دیا اور آرٹ یونی ورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ ایک بار پھر بیٹلز گروپ میں تین گلوکار رہ گئے۔ انہوں نے 62ء میں ٹونی شیروڈن کے ساتھ مل کر گانے کا معاہدہ کرلیا۔ اسی اثنا میں انہوں نے ایک گانا ریکارڈ کرایا جو جلد ہی مارکیٹ میں آگیا۔ فروخت کے اعتبار سے وہ 32 ویں نمبر پر رہا۔

ہمبرگ میں معاہدہ ختم ہوا تو وہ ایک بار پھر اپنے شہر لیورپول آگئے۔ وہاں انہوں نے مختلف کلبوں میں گانا بجانا جاری رکھا، لیکن اس بات پر انہیں کوفت ہوتی تھی کہ کوئی انہیں ساری رات گانے کا موقع نہیں دے رہا تھا کہ وہ اپنی آواز کا جادو جگا سکیں اور خود کو منوا سکیں۔ اس موقع پر برین ایپسٹین ان کے بہت کام آیا۔ وہ موسیقی کے مختلف گروپس کا منیجر تھا۔ اسے ان لڑکوں کی آواز نے متاثر کیا تو اس نے ان کے لیے پروگرام ترتیب دینا شروع کر دیے۔ وہ معاملہ فہم تھا اور بخوبی جانتا تھا کہ کب کیا کرنا چاہیے۔ اسی کے کہنے پر وہ ایک بار پھر ہمبرگ گئے۔ وہاں انہیں یہ اندوہ ناک خبر ملی کہ ان کے دوست اسٹکلیفی کا ایک روز پیشتر دماغ کی رگ پھٹنے سے انتقال ہوگیا ہے۔ وہ ایک بہترین دوست تھا، اس لیے وہ گم صم رہ گئے۔ انہیں توقع تھی کہ جب وہ اپنی تربیت مکمل کرلے گا تو ان کے گروپ میں شامل ہو جائے گا۔

بیٹلز اپنے معاہدے کی تکمیل کر کے لندن واپس آئے تو مشہور ریکارڈنگ کمپنی ای ایم آئی نے ان کو ایک گانے کی ریکارڈنگ کی پیشکش کی، جو انہوں نے منظور کر لی۔ اس طرح 6 جون 1962ء کو ان کا پہلا گانا ریکارڈ ہوا، لیکن وہ اس سے مطمئن نہیں تھے۔ انہوں نے اپنے منیجر سے شکایت کی کہ ڈرم بجانے والے نے ناقص کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے آئندہ وہ کسی نئے ڈرمر کو موقع دیں گے۔ اگست کے وسط میں انہوں نے رنگو اسٹار کو گروپ میں شامل کرلیا جو ڈرم بجانے کا سلیقہ رکھتا تھا۔ ایک نیا گانا 'لوّی ڈوّ' ریکارڈ کیا گیا جو فروخت کے اعتبار سے اس ہفتے 17 ویں نمبر پر رہا۔ اس کے بعد ٹی وی کے لیے انہیں ایک پروگرام 'پیپلز اینڈ پلیس' دیا گیا۔ انہوں نے ہمبرگ میں آخری پروگرام پیش کیا۔ اب لوگ انہیں اچھی طرح سے پہچاننے لگے تھے۔ انہوں نے طے کیا کہ اب وہ جینز نہیں پہنیں گے اور شرفا کی طرح سے سوٹ پہن کر ٹائی لگائیں گے۔ اسٹیج پر کھڑے ہونے کا اسٹائل بھی تبدیل کریں گے۔ وہ تینوں پیش منظر میں رہیں گے، جب کہ رنگو اسٹار پس منظر میں رہے گا۔

رنگو اسٹار لیورپول کے ایک چھوٹے سے مکان میں 1940ء کو پیدا ہوا۔ اس کا باپ گودی پر کام کرتا تھا بعد میں وہ ایک بیکری میں ڈبل روٹیاں بنانے لگا۔ جہاں اس کی ملاقات ایلس سے ہوئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کیا اور شادی کرلی۔ اس کے نتیجے میں رنگو اسٹار ہوا۔ رنگو جب تیرہ برس کا ہوا تو اس کی بڑی آنت (قولون) میں تکلیف ہوئی جس کی بنا پر وہ پڑھائی کی طرف توجہ نہیں دے سکا۔ اس کے نام رنگو کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ وہ کانوں میں رنگ (بالے) پہنتا تھا اور کاؤ بوائز کا روپ دھارے رہتا تھا۔ اسے بھی گائیکی سے شوق تھا، اس لیے وہ مختلف گروپوں کے ساتھ گایا کرتا اور ڈرم بجایا کرتا تھا۔ وہ ہمبرگ میں 1960ء میں بیٹلز کے بینڈ میں شامل ہوگیا۔ 64ء تک وہ بینڈ میں شامل رہا اس کے بعد اپنی بیماری کی بنا پر علیحدہ ہوگیا۔ (اس کی جگہ جمی نکول کو ڈرمر کی حیثیت سے رکھ لیا گیا۔) رنگو نے اپنی گرل فرینڈ ماورین سے شادی کرلی جس سے اس کے تین بچے زیک، جیسن اور لی ہوئے۔ رنگو سے ایک بار کسی نے پوچھا کہ وہ اپنی زندگی میں کیا کرنا چاہتا تھا تو اس نے بتایا کہ وہ انجینئر بننا چاہتا تھا۔

ہر بڑا گلوکار اپنے گانوں کا البم ضرور بناتا ہے جس میں ایک کے بجائے اس کے کئی گانے ہوتے ہیں چنانچہ انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ بھی اپنا ایک البم ترتیب دیں گے جس کا نام 'پلیز پلیز می' ہوگا۔ یہ البم دس گانوں پر مشتمل تھا۔ اس کی زبردست پذیرائی ہوئی اور یہ فروخت کے اعتبار سے پہلے نمبر پر رہا۔ ایک نقاد نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ کئی عشرے گزرنے کے بعد بھی جب اس ریکارڈ کو سنو تو یہ تازہ معلوم ہوتا ہے، اس لیے کہ اسے نئی نسل کے نمائندہ نوجوانوں نے ترتیب دیا ہے، جو گائیکی سے گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ وہ دن دور نہیں جب وہ لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کریں گے۔

ایک ایک کر کے 1970ء یعنی دس برس میں ان کے نو البم آئے اور اس میں سے آٹھ پہلے نمبر پر رہے۔ ان کا چوتھا البم 'شی لوز یو' نے تیزی سے فروخت ہونے کا ایک نیا ریکارڈ قائم کیا۔ 1978ء تک اس سے زیادہ کوئی البم فروخت نہیں ہوسکا۔ اب ہر طرف بیٹلز ہی بیٹلز تھے۔ ان کے نام کا ڈنکا ساری دنیا میں بج رہا تھا۔ اس بینڈ نے پہلے سال کے ابتدائی تین مہینوں میں چار بار پورے برطانیہ کا دورہ اور اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ یہ ٹور بے حد کامیاب رہا اور پریس نے انہیں بھرپور کوریج دینا شروع کر دی۔ ان کی تصاویر ہر اخبار اور رسالے میں شائع ہونے لگیں اور قدِ آدم پوسٹر چھپنے لگے۔ ان کے شائقین انہیں دیکھتے ہی بیٹلز بیٹلز چیخنے لگتے تھے اور جذبات سے بے قابو ہونے لگتے تھے۔ ناقدین نے اسے 'بیٹلمینیا' کا نام دیا۔

اکتوبر 1962ء میں جب بینڈ پانچ روزہ دورے پر سوئیڈن گیا تو ان کا ہاتھوں ہاتھ استقبال ہوا اور مقامی ٹی وی نے ان کا تفصیلی پروگرام پیش کیا۔ وہاں سے ان کی واپسی دسمبر کی آخری تاریخوں میں ہوئی۔ انہیں ہیتھرو ائرپورٹ پر اترنا تھا اور اتفاق سے اس روز بارش ہو رہی تھی، مگر چاہنے والوں کا جم غفیر تھا، سب چیخ رہے تھے۔ پچاس کے قریب اخباری نمائندے اور مشہور زمانہ براڈکاسٹنگ کارپوریشن بی بی سی کے چار نمائندے وہاں موجود تھے۔ بیٹلز کے لیے یہ ایک بڑا اعزاز تھا، اس لیے کہ برطانوی وزیراعظم کے لیے بھی کبھی اتنے افراد جمع نہیں ہوئے تھے۔

بیٹلز نے آرام نہیں کیا اور برطانیہ کا چوتھا دورہ شروع کر دیا۔ یہ نو ماہ میں ان کا چوتھا دورہ تھا۔ یہ دورہ چھ ہفتوں کے لیے رکھا گیا تھا۔ نومبر کے وسط میں ہونے والے ایک پروگرام کے بارے میں پولیس کو پیشگی اطلاع دے دی گئی

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھی، اس نے بے قابو ہو جانے والے مجمع کو قابو کرنے کے لیے فائر بریگیڈ کی مدد لی اور ایسا انتظام کر لیا کہ مجمع پر پائپوں کے ذریعے سے پانی پھینکا جا سکے۔ انہوں نے انتظامیہ کو درخواست دی کہ اس کے سوا ان کے پاس مجمع پر قابو پانے کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

ان کے ریکارڈ ’’ود دی بیٹلز‘‘ کی ریکارڈنگ کی تیاری ہونے لگی تو دکان داروں نے اس کی پیشگی بکنگ کرانا شروع کر دی۔ اس کی فروخت کے دوران دنیا بھر میں فروخت ہونے والے رسالے ’ٹائم‘ کے موسیقی کے انچارج ولیم مین نے پال میکارٹنی اور لینون کو 1963ء کا بہترین انگریزی گائیک اور موسیقار تسلیم کیا۔ ’ود دی بیٹلز‘ نامی ریکارڈ دس لاکھ (ایک ملین) کی تعداد میں فروخت ہوا۔ اس سے پیشتر کوئی ریکارڈ اتنا فروخت نہیں ہوا تھا۔

ان کی شہرت سر آنکھوں پر، لیکن امریکی اب بھی انہیں کوئی حیثیت دینے سے گریزاں تھے۔ ان کے مبصر کہتے تھے کہ برطانیہ کے لوگوں کو گائیکی کی تمیز نہیں ہے۔ ان کا ایک گلوکار ’کلف رچرڈ‘ کچھ گانا بجانا جانتا ہے، بس اس کے علاوہ انہیں کچھ نہیں آتا۔ دسمبر 1963ء میں ان کا ایک ریکارڈ ’پلیز پلیز می‘ امریکی ریڈیو سے پیش کیا گیا۔ اس کا نئی نسل کے لڑکوں نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ اس کے بعد ایک اور ریکارڈ پیش کیا گیا، لیکن اس کا بھی وہی حشر ہوا۔ امریکیوں کو ان کی گائیکی نے متاثر نہیں کیا۔ دوسرے ریکارڈ کا نام تھا ’شی لوز یو‘۔ امریکی نوجوان نسل جب بیٹلز کے خاص انداز سے کٹے ہوئے بال دیکھتی تھی تو ٹھٹھا مار کر ہنستی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ گانا تو دور کی بات انہیں تو لباس پہننے اور بال بنانے کا بھی سلیقہ نہیں ہے۔ وہ صورت ہی سے گنوار لگتے ہیں۔

اس اثنا میں فضائی کمپنیوں کی ائر ہوسٹس اور دوسرے شائقین بیٹلز کے ریکارڈ اپنے سامان میں رکھ کر امریکا کے شہروں میں لے جانے اور تحفتاً اپنے دوستوں کو پیش کرنے لگے۔ ان شہروں میں نیویارک، لاس اینجلس اور شکاگو شامل ہیں۔ دوستوں نے دوستوں کو جب یہ ریکارڈ پیش کیے تو سارے امریکا میں بیٹلز کا تعارف ہوا۔ بیٹلز رفتہ رفتہ ان کے دلوں میں (لاشعوری طور پر سہی) گھر کرنے لگے۔

ہر چند کہ جان ایف کینیڈی کے قتل سے برطانیہ کا کوئی تعلق نہیں تھا، لیکن اس کے قتل کے بعد ان کی گائیکی امریکا میں مشہور ہونے لگی۔ ایک ماہرِ نفسیات کا تجزیہ ہے کہ کینیڈی کے قتل کے بعد امریکی قوم ذہنی پستی (DEPRESSION) میں مبتلا ہو گئی تھی۔ چنانچہ اس موقع پر بیٹلز کی موسیقی اور گائیکی نے انہیں سنبھالا دیا۔ وہ لاشعوری طور پر ان کی طرف مائل ہو گئے۔ یہ حقیقت ہے کہ جب 1964ء میں ان کے پروگرام امریکی ٹی وی سے پیش کیے گئے تو ان کی شہرت کا گراف بلند ہونے لگا۔

ان کا ایک ریکارڈ ’’آئی وانٹ ٹو ہولڈ یور ہینڈ‘‘ جس کی فروخت کا امریکا میں بھی انتظام ہوا تھا، دس لاکھ (ایک ملین) کی تعداد میں فروخت ہوا۔ اس موقع سے ان کے منیجر برین اپسٹین نے فائدہ اٹھایا اور ایک مشہور کمپنی سے امریکی دورے کا معاہدہ کرا دیا۔ یہ طے پایا کہ وہ 7 فروری 1964ء سے امریکا کے شہروں کا دورہ کریں گے۔

بیٹلز کے مداحوں کو اس پروگرام کا پتا چل گیا تو وہ ہیتھرو ائر پورٹ پر جمع ہو گئے اور حسبِ معمول بیٹلز بیٹلز کے نعرے لگانے لگے۔ انہیں الوداع کہنے والوں کی تعداد ایک اندازے کے مطابق چار ہزار تھی، جو کسی صدر یا وزیراعظم کے لیے جمع ہونے والوں کی بھی نہیں ہوتی۔ انہوں نے روتے چیختے انہیں الوداع کہا۔

دوسری طرف امریکا میں بھی یہی حال تھا، جب انہوں نے جان۔ ایف کینیڈی انٹرنیشنل ائر پورٹ پر قدم رکھا تھا تو وہاں بھی جوش و جنون سے بے قابو مجمعے کا سامنا تھا۔ تقریباً تین ہزار مداحین نے منہ سے جھاگ بہاتے اور نعرے لگاتے ہوئے ان کا استقبال کیا۔ تقریباً 200 فوٹو گرافرز اور اخباری نمائندے جمع تھے جو ان کی تصاویر کھینچنا چاہتے یا انٹرویو لینا چاہتے تھے۔ ان کی حفاظت کے لیے سو پولیس افسران وہاں متعین تھے۔ امریکن ہر اعتبار سے تعلیم یافتہ اور مہذب گردانے جاتے ہیں، لیکن اس روز انہوں نے بیٹلز سے والہانہ محبت میں سب کچھ نظر انداز کر دیا اور ساری تہذیب اور طور طریق بالائے طاق رکھ دیے۔ بہر حال وہ کلف رچرڈ کے بعد پہلے برطانوی گویے تھے جنہیں امریکیوں نے پسند کیا تھا۔ اس سے پیشتر وہ کسی گلوکار یا موسیقار کو اپنے آگے کچھ نہیں گردانتے تھے۔

امریکا میں ان کا پروگرام ’ایڈ سلیوان شو‘ کے تحت ہوا جسے براہِ راست نشر کیا گیا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق سات کروڑ تین لاکھ افراد نے یہ شو اپنے گھروں کے ٹی وی پر دیکھا۔ یہ تعداد (اس وقت) ساری امریکی آبادی کا 37 واں حصہ تھی۔ اسٹوڈیو میں بیٹھنے کے لیے پچاس ہزار افراد نے درخواست دی، لیکن اسٹوڈیو صرف 728 افراد کو وہاں

بیٹھنے کا اجازت نامہ دے پائی، کیونکہ اس سے زیادہ کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ ایک صحافی کا کہنا ہے کہ بیٹلز نے پانچ گانے گائے، مگر میں مشکل ہی سے انہیں سن پایا، اس لیے کہ ان کے مداحوں نے قسم کھا رکھی تھی کہ وہ خاموشی اختیار نہیں کریں گے۔ وہاں اتنا ازدحام تھا جو میں نے ایلوس پریسلے اور فرینک سناترا کے کنسرٹ کے دوران نہیں دیکھا۔ اعداد و شمار جمع کرنے والی ایک تنظیم کا کہنا تھا کہ اس سے پیشتر کسی پروگرام کو اتنی پذیرائی نہیں ملی کہ جسے آنکھوں کے ساتھ دل سے بھی دیکھا گیا ہو۔

واشنگٹن ڈی سی تک وہ بذریعہ ٹرین پہنچے، تاکہ ان کے مداحین ہر اسٹیشن پر ان کا نظارہ کر سکیں اور ان کے جلووں سے آنکھیں سینک سکیں۔ وہاں انہوں نے ایک کنسرٹ میں پروگرام پیش کیا، کھلی جگہ پر 7000 شائقین کے لیے گنجائش تھی۔ (اس جگہ پر اب پارکنگ لاٹ بنا دیا گیا ہے) شو کے سارے ٹکٹ پیشگی فروخت ہو چکے تھے اور ان میں مایوس ہو کر لوٹنے والوں کی تعداد تقریباً ایک ہزار تھی۔ (گویا مجموعی طور پر آٹھ ہزار شائقین آ گئے تھے۔ وہ حالانکہ ایک سرد اور واہیات رات تھی، سب ٹھٹھرے جا رہے تھے۔ جب گھر سے نکلنے کی ہمت شاذ ہی کوئی کر پاتا تھا، لیکن لوگ تھے کہ امڈے چلے آ رہے تھے۔ ان کے شو سے پیشتر دو گلوکاروں کے شو اور بھی تھے۔ جب بیٹلز اسٹیج پر آئے تو کیمروں کے فلیش بلب چمکنے لگے اور مجمع بے قابو ہونے لگا۔ ہر طرف سے ایک ہی نعرہ سننے میں آ رہا تھا۔ بیٹلز۔ بیٹلز۔ بیٹلز۔ یہ شو بھی براہِ راست نشر کیا گیا تھا۔

شو سے پیشتر انہوں نے ایک پریس کانفرنس بھی کی۔ شو کے بعد برطانوی سفارت خانے نے ان کے اعزاز میں عشائیہ دیا۔ برطانیہ کے وزیر اعظم اتفاق سے ان دنوں سرکاری طور پر واشنگٹن ڈی سی میں تھے، لیکن انہوں نے اس مصلحت کے تحت سفارت خانے میں ہونے والی پارٹی میں شرکت نہیں کی کہ ان کا منیجر ناراض ہو جائے گا کہ کسی سرکاری عہدے دار نے اس پارٹی میں شرکت کیوں کی؟ پارٹی کے دوران ایک دلچسپ بات یہ ہوئی کہ ایک عورت نے ڈرم بجانے والے خوب رُو بیٹلز رنگو اسٹار کے بالوں کی ایک لٹ بغیر اجازت کاٹ کر اپنے پرس میں رکھ لی اور اس کے رخسار کا ایک بوسہ بھی لے لیا۔ اخباری نمائندوں نے اس واقعہ کی تصاویر شائع کیں اور تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ بیٹلز چیز ہی ایسی ہیں کہ انہیں دیکھ کر خواتین اپنا دل ہار

پتھری
گردہ مثانہ یا پتہ میں ہو انشاء اللہ تعالیٰ ریت بن کر نکل جائے۔ کورس 20 دن صرف 1500 روپے
موٹاپا
بڑھا ہوا پیٹ ڈھلکا ہوا پیٹ قد سے زائد وزن
جسم کی فالتو چربی پسینہ بن کر خارج ہو جائے گی
کورس ایک ماہ صرف 2000 روپے
گیس ٹربل
سینے کی جلن تیزابیت، دائمی قبض، پیٹ سخت ہونا
معدے کے زخم اور انتڑیوں کے زخم کا کامیاب علاج
کورس ایک ماہ صرف 1200 روپے
طب یونانی کے مایہ ناز
دواخانہ حکیم عالم شیر کھرل
بلھے شاہ روڈ نزد اڈا للیانی قصور شہر
0345-6397367
0300-4280816

WWW.PAKSOCIETY.COM

بیٹھتی ہیں۔

اگلے دن جب امریکی صدر لنڈا بی جانسن کی ملاقات سرکاری سطح پر برطانوی وزیراعظم سے ہوئی تو انہوں نے کہا۔ ”جناب! آپ کے لڑکوں نے اچھا پروگرام پیش کیا، مگر کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ اپنے بال بھی کٹوالیا کریں۔“

بیٹلو نے وہ رات ایک ہوٹل میں گزاری اس کے بعد نیویارک روانہ ہوگئے۔ وہاں سے طیارے کے ذریعے میامی پہنچے۔ ’ایڈ سیلوان شو‘ ہر ہفتے ٹی وی پر پیش کیا جاتا تھا، اس کے تحت انہوں نے میامی (فلوریڈا) کے ہوٹل ڈیوائل سے براہِ راست اپنا پروگرام پیش کیا۔ مجموعی طور پر سات کروڑ افراد نے اس شو کو ٹی وی پر دیکھا۔ پھر 22 فروری کو وہ واپس برطانیہ آگئے۔ ان کے یہ شو بعد میں امریکا اور کینیڈا کے تقریباً ایک سو تھیٹروں میں دکھائے گئے۔ اتنا اُدھم مچانے کے باوجود امریکا کے پرانے گائیک ان کی موسیقی اور گائیکی کو اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان کے نزدیک وہ اعلیٰ گلوکار نہیں تھے۔ اپنی اس رائے کا اظہار فرینک سناترا جیسے بڑے گلوکار نے اپنے ایک انٹرویو میں ایک بار کیا تھا۔

یونائیٹڈ آرٹسٹ جو برطانیہ کا سب سے بڑا فلمی ادارہ ہے، اس نے ان چار گویّوں کو ایک فلم میں کام کرنے کی پیشکش کی جس کا نام ’اے ہارڈ ڈیز نائٹ‘ تجویز ہوا۔ یہ طے ہوگیا تھا کہ اسے مشہور و معروف ہدایت کار رچرڈ لیسٹر بنائے گا۔ فلم کاروباری لحاظ سے بڑا بزنس نہیں کرسکی، لیکن اس نے شائقین کے سینوں کو ضرور گرما دیا۔ اس کے بعد انہوں نے ایک دستاویزی فلم کی تیاری میں حصہ لیا جس کی جولائی اور اگست میں لندن اور نیویارک میں نمائش ہوئی۔ برطانیہ میں ان کے ریکارڈ فروخت ہونے لگے اور جب ان کی تعداد لاکھوں تک پہنچنے لگی تو دوسری ریکارڈنگ کمپنیوں نے بھی امریکا میں اپنی مارکیٹ بنالی۔ ناقدین اس عہد کو ’امریکا پر برطانوی موسیقی کا حملہ تصور‘ کرتے ہیں۔ برطانیہ اور امریکا کے بعد ڈچ ٹی وی نے انہیں مدعو کیا اور چھ ہفتے تک ان کے پروگرام پیش کیے۔

بیٹلو نے لوگوں کے دل و دماغ پر حکومت کرنے کے ساتھ ثقافت اور تمدن پر نقب زنی کردی۔ لوگ انہی کی طرح سے بال بنانے اور ان کی طرح سے کپڑے پہننے میں فخر محسوس کرنے لگے۔ گھروں میں خاندان کے بڑے بوڑھوں کی تصاویر کی جگہ ان کے پوسٹر لگائے جانے لگے۔ وہ نوجوانوں کے دلوں میں اس قدر گھر کر چکے تھے کہ انہیں بیٹلو کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ محبت اور فریفتگی کا انداز بیان سے بالاتر تھا۔

جب سب ہی ان کی شہرت سے متاثر ہورہے تھے اور اپنی ریاستوں میں انہیں مدعو کررہے تھے تو یورپ کی ریاستیں کیوں پیچھے رہتیں۔ ڈنمارک، نیدر لینڈ، ہانگ کانگ، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں انہوں نے 27 ہفتوں میں 37 پروگرام پیش کیے اور ہر جگہ اپنی گائیکی کا لوہا منوا لیا۔ اسی دوران رنگو اسٹار کو اپنی بیماری کے سلسلے میں اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ اس کی جگہ ’جمی نکول‘ نے پانچ روز تک شو میں ڈرم بجایا۔ یورپ سے واپسی پر وہ ایک بار پھر امریکا گئے جہاں 23 ریاستوں میں انہوں نے 30 کنسرٹ پروگرام پیش کیے جن کا دورانیہ صرف آدھے گھنٹے کا ہوتا تھا، لیکن انہیں سننے کے لیے ہر کنسرٹ میں بیس ہزار شائقین آتے تھے۔ اسی دوران وھائٹ ہاؤس سے ان کے لیے دعوت نامہ آیا جس میں درخواست کی گئی تھی کہ وہ جان ایف کینیڈی کی قبر پر صدر لنڈا بی جانسن کے ساتھ ایک تصویر کھنچوالیں، مگر بیٹلو کے منیجر اپسٹین نے انکار کر دیا۔ اس نے جواب دیا کہ بیٹلو عوامی گائیک ہیں، اس لیے کوئی سرکاری دعوت قبول نہیں کرسکتے، نہ کسی سرکاری عہدے دار سے مصافحہ کرسکتے ہیں۔

امریکا کے اس دورے میں انہوں نے 33 روز میں 23 ریاستوں کا دورہ کیا۔ لاس اینجلس اور ایسی کئی ریاستوں میں شہر کی انتظامیہ نے ان کے طیارے کو اپنے ائر پورٹ پر اترنے کی اجازت نہیں دی۔ اس لیے کہ ان کے مداح (نئی نسل کے نوجوان) ہاہو کرتے اور دیوانوں کی طرح چیختے ہوئے ائرپورٹ پہنچ جاتے اور سب کچھ تہس نہس کر ڈالتے۔ بیٹلو کو دیکھتے ہی ان کا ہیجان اپنے عروج کو پہنچ جاتا اور اس ہیجان میں دیوانگی شامل ہوجاتی۔

بیٹلو کے اس امریکی دورے میں کنساس سٹی میں اپنی آواز کا جادو جگانا ان کے پروگرام میں شامل نہیں تھا۔ شہر کے لوگوں نے شیرٹن ہوٹل کے ایک پروگرام منیجر فنلے سے گزارش کی کہ وہ بیٹلو کو وہاں بلانے کا انتظام کرے۔ فنلے 19، اگست 1964ء کو سان فرانسسکو گیا جہاں سے بیٹلو کو اپنے پروگرام کی ابتدا کرنی تھی۔ اس نے بیٹلو کے منیجر اپسٹین سے ملاقات کی اور اسے پچاس ہزار ڈالر کی پیش کش کی کہ بیٹلو کنساس سٹی میں پروگرام کرنا منظور کرلیں۔ مگر اپسٹین نے انکار کردیا اور جواب دیا کہ کنساس سٹی کے لیے وقت نہیں ہے۔ ان کے معمولات میں ایسی کوئی گنجائش نہیں ہے اور نہ شہری انتظامیہ سے کوئی پیشگی اجازت لی گئی ہے۔ فنلے بہرحال ہمت نہیں ہارا اور اس نے ایک لاکھ ڈالر کی پیشکش کی۔ اپسٹین کا جواب اب بھی وہی تھا۔ اس کا کہنا تھا بینڈ کے پاس 17 ستمبر کی تاریخ ہے جب وہ فری ہوں گے مگر اس روز وہ آرام کرنے کے بعد نیو آرلینز جائیں گے۔ میں ان کے آرام میں خلل نہیں ڈالنا چاہتا۔ وہ گائیکی کی مشین نہیں ہیں، انسان ہیں انہیں بھی آرام کا حق پہنچتا ہے۔

ایک ہفتے بعد فنلے نے اپسٹین سے لاس اینجلس میں دوسری ملاقات کی اور ایک لاکھ ڈالر کا چیک پھاڑ کر ڈیڑھ لاکھ ڈالر کا نیا چیک لکھا اور اپسٹین کی طرف بڑھا دیا۔ (جو آج کل کے دس لاکھ ڈالر یعنی ایک ملین کے برابر ہے) ابھی تک کسی کنسرٹ کے لیے اتنی بھاری رقم نہیں دی گئی تھی۔ پروگرام کا وقت اتنا کم تھا کہ چار ہزار آٹھ سو ڈالر فی منٹ کا ریٹ بنتا تھا۔ اس کے مجبور کرنے پر اپسٹین نے بینڈ سے مشورہ کیا تو جان لینون نے جواب دیا کہ وہ منیجر ہے، لہٰذا وہ جو کچھ کہے گا بینڈ اسی پر عمل کرے گا۔ چنانچہ اپسٹین نے فنلے کی پیشکش منظور کرلی۔

جب بیٹلو کنساس سٹی پہنچے تو ان کا بھرپور استقبال کیا گیا اور کنسرٹ کے لیے جو ٹکٹ فروخت کیے گئے ان کی پشت پر فنلے کی تصویر تھی، جس میں اس کے بال بیٹلو اسٹائل کے تھے۔ (یہ وہی قوم تھی جو چند برس پہلے بیٹلو کے ہیئر اسٹائل کا مضحکہ اڑاتی تھی) اس شو سے ہونے والی آمدنی کا نصف حصہ ایک اسپتال کو عطیے کے طور پر دیا گیا۔ ایک اخبار نے ان کی کنساس آمد پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ بیٹلو کے بابرکت قدم یہاں تک پہنچے تو لگے ہاتھوں ایک اسپتال کی مدد ہوگئی۔

1965 میں جب بیٹلو ایک ڈنر میں مدعو تھے، ان کے دندان ساز نے لینون اور جان ہیریسن کی کافی میں ایل ایس ڈی (نشہ آور محلول) ملا دیا۔ لینون نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ کافی میں کیا کچھ ملا دیا گیا ہے، مجھ پر عجیب سا تجربہ کیا گیا، لیکن اس کے اثرات میرے دل و دماغ پر انتہائی سرور انگیز تھے۔ میں تو اس کے سُرور سے ایک یا دو ماہ تک محظوظ ہوتا رہا۔ ہر وقت دماغ پر ایک خواب آور کیفیت طاری رہتی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ ہمہ وقت آنکھیں بند کرکے سوتا رہوں یا

آصف خان، یمین الدولہ
1569-1641ء

شہنشاہ جہانگیر کی بیوی نور جہاں کے بھائی اور شاہ جہاں کے خسر عبدا اور مرزا غیاث بیگ اعتماد الدولہ کے فرزند۔ اصل نام الحسن تھا۔ مغل شہنشاہ اکبر اعظم کے عہد میں وہ صوبہ بہار کے صوبے دار تھے۔ جہانگیر کے عہد میں مہرالنساء (بعد میں نور جہاں) سے جہانگیر کی شادی ہوئی۔ اپریل 1612ء میں ان کی بیٹی ارجمند بانو (جو بعد میں ممتاز محل کے نام سے مشہور ہوئیں) سے شاہجہاں کی شادی ہوئی تو دربار میں ان کا وقار بھی بڑھ گیا۔ 1614ء میں انہیں آصف خاں کا خطاب ملا۔ جہانگیر کی وفات کے بعد جب اس کی میت کو لاہور لایا گیا تو نور جہاں نے اپنے بھائی آصف خاں اور شاہجہاں کے دیگر ساتھیوں کو تدفین کے وقت گرفتار کرنے کا منصوبہ بنایا۔ جہانگیر کو دفن کرنے کے بعد نور جہاں نے اپنے داماد شہریار کو لاہور میں شاہ شاہاں کے لقب سے تخت نشین کردیا۔ آصف خاں نے جہانگیر کی وفات کے بعد شاہجہان کو دکن سے بلایا اور مرکز پر قبضہ کرنے کی تلقین کی۔ تخت نشین ہونے کے بعد شاہجہان نے آصف خان کو یمین الدولہ کا خطاب دیا اور انہیں وزیراعظم کے منصب پر فائز کیا۔ بہتّر سال کی عمر میں انتقال کیا۔ مقبرہ شاہدرہ میں ہے۔ آصف خان کا مقبرہ، مقبرۂ جہانگیر کے قریب واقع ہے۔ آصف خان کے مقبرے کو شاہجہاں نے تعمیر کرایا تھا۔ اس کے داخلی دروازے کے ساتھ ہی دائیں طرف سرخ پتھروں سے تعمیر کی گئی ایک خوبصورت چھوٹی سی مسجد بھی ہے۔ وسیع باغ کے درمیان واقع مقبرہ آٹھوں کونوں پر مشتمل ہے اور اس کے اوپر ایک گنبد ہے۔ قبر پر اللہ کے 99 نام کندہ ہیں۔ باغ کو درختوں، فواروں اور راہداریوں سے آراستہ کیا گیا ہے اور اس کے اردگرد ایک دیوار ہے جس پر کہیں کہیں خوبصورت نقش و نگار کے آثار آج بھی آصف خان کے مقبرے کی گم گشتہ شان و شوکت کا پتا دیتے ہیں۔ مقبرے میں جو ٹائلیں لگی ہوئی ہیں وہ ملتان، سندھ اور ایران کی ٹائلوں سے ملتی جلتی ہیں۔

مرسلہ: نادر خان، کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھتا رہوں۔

اُس سرور انگیز نشے کی انہیں طلب ہوئی تو انہوں نے مختلف لوگوں سے اس کا تذکرہ کیا۔ ایل ایس ڈی انہیں مہیا کر دی گئی۔ پھر لینون اور ہیریسن رفتہ رفتہ اس نشے کے عادی ہو گئے۔ ایک موقع پر رنگو اسٹار نے بھی اس نشے سے شوق کیا۔ میکارٹنی نے بھی اسے منہ لگایا، مگر اسے مزہ نہیں آیا۔ البتہ اس نے یہی تجربہ جب 1966ء میں کیا تو اس کا عادی ہوتا چلا گیا۔ اس نے اپنے اس شوق کے بارے میں ایک میگزین کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا۔ ”ایل ایس ڈی نے تو میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ ایل ایس ڈی نے مجھے معاشرے کا ایک نیک، دیانت دار اور مخلص کارکن بنا دیا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اب ہر وقت سچ بولتا رہوں اور سچ کے سوا کچھ نہ کہوں۔“

جب ان کی شہرت اور مقبولیت برطانیہ کے علاوہ امریکا اور دوسرے ممالک تک پہنچ گئی تو ملکہ الزبتھ دوم نے جون 1965ء میں بیٹلز کو ممبرز آف دی آرڈر آف دی برٹش ایمپائر (ایم بی ای) کے لیے نامزد کر دیا۔ اس کے بعد وزیر اعظم ہیرلڈ ولسن نے انہیں اس ایوارڈ سے نوازا۔ برطانیہ کا یہ ایوارڈ اس سے پیشتر ملٹری کے ریٹائرڈ افسران اور سیاسی رہنماؤں کو ملتا تھا۔ چنانچہ کچھ راسخ العقیدہ، مگر اعزاز یافتہ افراد نے اس پر احتجاج کیا اور اپنا ایوارڈ حکومت کو واپس کر دیا۔ ان کے نزدیک گلوکاروں کو اس اعزاز سے نوازنا مناسب نہیں تھا۔

بیٹلز کی دوسری فلم ’ہیلپ‘ تھی۔ اس فلم پر ناقدین اور ناظرین کا ملا جلا ردِعمل تھا۔ فلم باکس آفس پر زیادہ کام یاب نہیں رہی۔ میکارٹنی نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا کہ ہیلپ بہت عظیم فلم تھی، مگر ہمارے لیے نہیں تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہم اس میں مہمان اداکار ہوں۔ اس فلم کا ہدایت کار پہلی فلم کی طرح لیسٹر تھا، نغمہ نگاری اور نغمہ سرائی زیادہ تر لینون نے کی تھی۔

ان کی مقبولیت اور شہرت میں روز بہ روز اضافہ ہو رہا تھا۔ جب انہوں نے امریکا کا تیسرا دورہ کیا تو ان کا فقید المثال استقبال کیا گیا۔ 15 اگست 1965ء کو نیویارک کے شیا اسٹیڈیم میں ان کا کنسرٹ 55600 افراد نے دیکھا۔

اس کے بعد انہوں نے ایسے نو مزید کنسرٹ مختلف ریاستوں میں کیے۔ (کنسرٹ میں روایتی قسم کا اسٹیج نہیں ہوتا، بلکہ ضرورت کے مطابق اسٹیج تیار کیا جاتا ہے) ٹور کے خاتمے پر معروف پاپ سنگر ایلوس پریسلے نے اپنے مکان بیورلے ہلز پر انہیں مدعو کیا۔ یہ بھی بیٹلز کے لیے بڑا اعزاز تھا۔ ایک عظیم گلوکار نے ان گلوکاروں کو خراجِ تحسین پیش کیا تھا۔ گویا عظمت نے عظمت کو سلام کیا۔ ان کے امریکا سے آنے سے قبل کارٹون فلم ’دی بیٹلز‘ ٹی وی پر پیش کی گئی۔ جسے نونہالوں کے علاوہ بالغ لوگوں نے بھی پسند کیا۔ اکتوبر 1965ء میں انہوں نے موسیقی میں ایک نیا تجربہ کیا اور گٹار کے بجائے ستار کو اپنے گانوں میں استعمال کیا۔ اس تجربے کو لوگوں نے بھی پسند کیا۔

1966ء میں کیپٹل ریکارڈ کمپنی نے امریکا میں فروخت ہونے والے بیٹلز کے البم کا جب کور شائع کیا تو ایک ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس لیے کہ اس کے کور پر بیٹلز کو قصابوں کے روپ میں دکھایا گیا تھا۔ وہ ہاتھوں میں بغدے لیے ہوئے تھے اور پس منظر میں گوشت لٹک رہا تھا۔ خریداروں نے یہ دلیل دی کہ کمپنی نے یہ تمثیلی اشارہ دیا ہے کہ بیٹلز اب امریکی موسیقی کو قتل کر دیں گے اور اس کا نام و نشان تک مٹا دیں گے۔ کمپنی نے ریکارڈ کے کور پر دوسری تصویر چھاپ کر بچکائی تب جا کر ہنگامہ ختم ہوا۔ ایسا ایک البم جس پر دوسری تصویر لگنے سے رہ گئی تھی (بیٹلز قصابوں کے روپ میں تھے)، دسمبر 2005ء کے ایک نیلام میں ساڑھے دس ہزار ڈالر میں فروخت ہوا۔

ایک ماہ بعد بیٹلز نے فلپائن کا ٹور کیا، جہاں فرسٹ لیڈی امیلڈا مارکوس نے انہیں صدارتی محل میں ناشتا کرنے کی دعوت دی۔ اس موقع پر ان کے منیجر اپسٹین نے انہیں منع کیا کہ سرکاری سطح پر ایسی دعوت قبول کرنا ہماری پالیسی کے خلاف ہے۔ بیٹلز نے انکار کر دیا تو ملک بھر میں احتجاج کیا گیا کہ ان لوگوں نے خاتونِ اول کی بے عزتی کی ہے۔ بیٹلز بڑی دشواری سے جان چھڑا کر وہاں سے بھاگے۔ انہیں ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ان کی جان کے لالے پڑ گئے ہوں۔ اسی دوران میں بیٹلز کا گروپ پہلی بار انڈیا گیا، جو مشرق میں کلاسیکی موسیقی کا گڑھ ہے۔ وہاں انہیں والہانہ خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ کئی موسیقاروں اور گلوکاروں نے انہیں دعوت دی کہ وہ انڈیا کا ٹور لگائیں۔ موسیقار روی شنکر نے کلاسیکی موسیقی کے کچھ درس ان لوگوں کو سکھائے۔

جب وہ وطن واپس آئے تو رنگ بدلا ہوا تھا، ہوا کا رخ تبدیل ہو چکا تھا۔ ایک راسخ العقیدہ امریکی گروپ نے

ان کے خلاف گلی کوچوں میں بینر لگائے ہوئے تھے اور فضا کو گرما گرم کیا ہوا تھا۔ بیٹلز جہاں بھی جاتے انہیں ایسا معلوم ہوتا جیسے ان پر چنگاریاں برس رہی ہوں۔ اس کی وجۂ تسمیہ یہ تھی کہ لینون نے ایک میگزین کے رپورٹر ماورین کو مارچ میں انٹرویو دیا تھا کہ عیسائیت ختم ہو جائے گی۔۔۔ ایک دم سے نہیں بلکہ بتدریج معدوم ہو جائے گی، ممکن ہے کہ بالکل ہی نابود ہو جائے یا سکڑ کر اتنی چھوٹی ہو جائے کہ نظر ہی نہ آئے۔ مجھے اس معاملے پر کامل یقین ہے اور اب میں یہ ثابت بھی کر سکتا ہوں کہ ہم یسوع مسیح سے زیادہ مقبول و معروف ہو چکے ہیں۔ میں اس بارے میں نہیں بتا سکتا کہ کون پہلے ختم ہوگا؟ عیسائیت یا راک اینڈ رول۔ یسوع مسیح کے افکار و خیالات اپنی جگہ پر درست تھے، مگر وہ اتنے گنجلک اور دبیز تھے کہ عام آدمی کے سر پر سے گزر جاتے تھے۔

اس انٹرویو کا برطانیہ میں کوئی نوٹس نہیں لیا گیا، مگر جب ان کے امریکا کے ٹور کے موقع پر نوجوان نسل کے میگزین ’ڈیٹ بک‘ نے پانچ ماہ بعد اس انٹرویو کو دوبارہ شائع کیا تو اس سے امریکی عیسائیوں پر گہرا اثر ہوا۔ ویٹی کن سٹی (عیسائیت کے مرکز) نے اس کا نوٹس لیا اور بیٹلز کے ریکارڈوں کی فروخت پر اسپین، ڈچ اور جنوبی افریقا میں پابندی لگا دی۔ یہ بھی حکم دیا گیا کہ اب ان کے ریکارڈ ریڈیو سے بھی نشر نہیں کیے جائیں۔ عیسائیت کے عقیدت مندوں نے ان کے ریکارڈ سڑکوں پر ڈال کر جلا دیے اور ان کے پوسٹر پھاڑ ڈالے۔ ان کا بس چلتا تو وہ ریکارڈ کے شعلوں میں بیٹلز کو بھی ڈال کر جھلسا دیتے۔

اپسٹین نے میگزین ’ڈیٹ بک‘ سے خصوصی طور پر معافی مانگی۔ اس کے بعد لینون نے اس کے رپورٹر کے سامنے بیٹھ کر وضاحت کی اور بات کو گول مول کرتے ہوئے وضاحت کی کہ میں نے تو یہ کہا تھا کہ لوگ اب ہمیں اتنا پسند کرنے لگے ہیں کہ یسوع مسیح کے برابر درجہ دے بیٹھتے ہیں۔

اس پر رپورٹر نے اس کے الفاظ اسے یاد کرائے تو لینون نے برہمی سے کہا کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں معافی مانگوں؟ اگر اس سے تمہارا دل خوش ہو جائے گا تو میں معافی مانگتا ہوں۔

امریکا کا ٹور شروع ہوا، لیکن بیٹلز نے محسوس کر لیا کہ لائیو کنسرٹ کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو رہا ہے، اس لیے کہ ان کے مداحین کے ساتھ اب احتجاج کرنے والے بھی شامل ہو چکے تھے۔ ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں اور پروگرام

آزادیٔ مذہب

آزادیٔ مذہب کسی بھی انسان کا وہ حق ہے جو اس سے چھینا نہیں جا سکتا۔ دنیا بھر کے دساتیر میں ہر شخص کو انفرادی طور پر کسی بھی مذہب کو اختیار کرنے اور اسے چھوڑ کر دوسرا مذہب اپنانے پر کسی قسم کی کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی۔ اسلام بھی اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی شخص کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے۔ آئین پاکستان کی دفعہ 12 میں حقِ مذہب کے تحت کہا گیا ہے کہ ”قانونِ امن عامہ اور اخلاقی حدود کے اندر ہر شخص کو کسی بھی مذہب پر کاربند ہونے اور اس کی ترویج کا حق حاصل ہوگا۔“ اسی طرح ہر مذہبی فرقے کو اپنی عبادت گاہیں بنانے اور اس کی حفاظت کا حق حاصل ہوگا۔ آرٹیکل 13 میں کہا گیا ہے کہ کسی فرد سے ایسے مذہب کے لیے ٹیکس نہیں لیا جائے گا جو اسے ناپسند ہو اور نہ ہی ایسا ٹیکس نافذ کیا جائے گا، جس کی آمدنی سے ایسے مذہب کی تبلیغ مقصود ہو جو اس کا اپنا مذہب نہ ہو۔ آرٹیکل چودہ میں کہا گیا ہے کہ کسی فرد کو بھی تعلیمی اداروں میں ایسے مذاہب کی تعلیم کے حصول کے لیے یا عبادت کے لیے مجبور نہیں کیا جائے گا جو اس کا اپنا مذہب نہ ہو۔ مذہبی اداروں پر ٹیکس کے نفاذ کے ضمن میں کسی طبقے سے امتیازی سلوک روا نہیں رکھا جائے گا۔ ہر مذہبی گروہ کا اپنے طلبا کے لیے مذہبی تعلیم کا انتظام اس کا بنیادی حق ہے۔ اسی طرح شہریوں پر تعلیمی اداروں میں نسل، مذہب، سکونت اور ذات پات کی بنا پر داخلے کی کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی، بشرطیکہ وہ ادارہ حکومت کے سرمائے سے چل رہا ہو۔ لیکن یہ آرٹیکل سرکاری احکام کے ان اقدامات پر اثر انداز نہیں ہوگا جو پسماندہ علاقوں کے لیے اٹھائے جائیں۔ اسی طرح آئین کے دیباچے میں کہا گیا ہے کہ اقلیتوں کے لیے اس امر کی مناسب گنجائش پیدا کی جائے گی کہ وہ آزادانہ طور پر اپنے مذہب کی پیروی کر سکیں، مذہبی فرائض پر عمل درآمد کر سکیں اور اپنی ثقافت کی نشو و نما کر سکیں۔

اقتباس: مرسلہ: شکیلہ پروین، سرگودھا

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں گڑبڑ ہو رہی تھی۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب وہ امریکا دوبارہ نہیں آئیں گے۔

وطن پہنچ کر انہوں نے 'آل یو نیڈ از لو' ٹی وی کے پروگرام 'اوور ورلڈ' کے تحت پیش کیا جسے ساڑھے تین کروڑ افراد نے دیکھا۔ 25 اگست کو انہیں ایک صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ ان کا برسوں پرانا منیجر اپسٹین اس دنیائے فانی سے کوچ کر گیا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اس نے منشیات کی بڑی مقدار لے لی تھی، جس کی بنا پر اس کی موت واقع ہوگئی تھی، جب کہ بعض نے یہ کہا کہ اس نے خودکشی کی ہے۔ وہ سب خوف زدہ تھے۔ انہیں اندیشہ تھا کہ اب ان کا مستقبل تباہ ہو جائے گا۔

لینون نے اس کی موت پر اپنے ساتھیوں سے وسوسوں کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں سوائے گٹار بجانے کے ... اور کیا آتا ہے؟ ہمارے معاملات جس خوش اسلوبی سے اپسٹین نے سنبھالے ہوئے تھے، مجھے یقین نہیں آتا کہ کوئی اور اس طرح سے سنبھال سکے گا۔ پروگرام کہاں اور کس طرح سے پیش کرنا ہے، کس سے کتنا معاوضہ طلب کرنا ہے اور اسٹیج پر کس انداز سے پیش کش کرنا ہے، یہ سب اسی کو آتا تھا۔ ہم تو نرے بدھو ہیں۔

جنوری 1968ء میں انہوں نے 'یلو سب میرین' میں کام کیا جو ایک کارٹون فلم تھی جس میں ان کے ایسے گانے استعمال کیے گئے تھے، جو ابھی مارکیٹ میں نہیں آئے تھے۔ چونکہ فلم مزاحیہ تھی، اس لیے لوگوں نے بہت پسند کی۔ پھر جب سات ماہ بعد اس کے گیتوں کا لانگ پلے آیا تو وہ لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہوا۔ وہ ہر لمحہ اپسٹین کو یاد کرتے رہتے تھے۔ اس کی رہنمائی ان کے لیے مشعلِ راہ تھی۔ اس کی جھلک انہیں انڈیا کے مہارشی مہیش یوگی میں دکھائی دی تو انہوں نے اس کی شاگردی اختیار کرلی۔ مہارشی نے انہیں تلقین کی کہ وہ اس کے پاس تین ماہ بیٹھ کر درس لیں تو ان کی موسیقی میں نکھار اور بالیدگی پیدا ہو جائے گی۔ وہ اس کے لیے تیار ہو گئے۔ مہارشی مہیش یوگی انہیں مشرقی موسیقی پر لیکچر دیتا اور انہیں موسیقی کے سُر سکھانے کی کوشش کرتا رہا۔ رنگو اسٹار کو دس دن بعد ہی اکتاہٹ ہوگئی اور وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر انڈیا سے بھاگ آیا، جب کہ میکارٹنی ایک ماہ کے بعد بور ہوگیا اور اس نے بھی وہاں سے رختِ سفر باندھ لیا۔

لینون اور ہیریسن وہاں جمے رہے۔ ان کے ایک

آغا خان

اسماعیلی فرقے کے اماموں کا لقب۔ اس فرقے کے ایک امام حسن علی شاہ کے والد ایران کے صوبہ کرمان کے گورنر تھے۔ ان کے انتقال کے بعد شاہِ ایران فتح علی شاہ قاچار نے حسن علی شاہ کو اس منصب پر فائز کیا اور اپنی بیٹی ان کے عقد میں دے دی۔ نیز آغا خان کے لقب سے نوازا۔ ان کی اولاد میں جو شخص مسندِ امامت پر متمکن ہوا وہ آغا خان کہلایا۔ ان کے پیروکار آغا خانی کہلاتے ہیں۔

مرسلہ: مہتاب خان، کراچی

دوست نے اندیشہ ظاہر کیا کہ وہ ان کی تخلیقی صلاحیتیں اجاگر نہیں کر رہا ہے، بلکہ کچھ سکھانے کے بہانے ان کی جیبیں کاٹ رہا ہے۔ وہ ہپناٹزم کے ذریعے سے ان کے دماغوں پر قبضہ کرلے گا۔ وہ حد درجے کا عیاش ہے اور اس کے بہت سی باندیوں سے ناجائز تعلقات ہیں۔ لینون کو پہلے ہی مہارشی کے کردار پر شبہ تھا، وہ دو ماہ بعد واپس لندن آگیا۔ ان ہی دنوں مہارشی کا ایک جنسی اسکینڈل بھی منظرِ عام پر آگیا جس سے تصدیق ہوگئی۔ کچھ ہی دنوں بعد ہیریسن نے بھی کان پکڑ لیے اور اپنے وطن واپس آگیا۔

اکتوبر 1968ء ان کے لیے بھاری اور نامہربان تھا۔ ان میں ناچاقی شروع ہوگئی۔ ہر ایک بات پر وہ ایک دوسرے سے بدکنے لگے۔ رنگو اسٹار کسی بات پر ناراض ہوگیا تو اس کی جگہ میکارٹنی نے ڈرم بجانا شروع کردیا۔ لینون اور میکارٹنی کے دلوں میں کدورت پیدا ہوگئی۔ کہاں تو ایک دوسرے کو دیکھ کر جیتے تھے اور کہاں اب بے زار ہو رہے تھے۔ غالباً کسی نے درست کہا ہے کہ زیادہ مٹھاس سے کیڑے پڑ جاتے ہیں۔ اسی اثنا میں پال میکارٹنی نے لنڈا ایسٹ مین سے شادی کرلی۔ جو ایسٹ مین اینڈ کوڈک نامی کمپنی کے مالک کی بیٹی تھی۔

پھر لینون کو 'یوکو اونو' نامی لڑکی سے محبت ہوگئی، جو تیسرے درجے کی جاپانی اداکارہ تھی۔ اس نے یوکو انو سے شادی کرلی۔ یہ شادی جبرالٹر میں ہوئی تھی۔ جب وہ گانے کے لیے یکجا ہوئے تو لینون اس بات پر مُصر تھا کہ اپنی بیوی کو اسٹوڈیو لائے گا، جب کہ ان چاروں کے درمیان یہ طے پا گیا تھا کہ اسٹوڈیو میں کوئی اور نہیں آئے گا، ورنہ اس سے کام میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہے۔ بات بڑھ گئی تو لینون

WWW.PAKSOCIETY.COM

نے ستمبر میں باقی بیٹلز کو بتا دیا کہ اب وہ گروپ سے علیحدہ ہو رہا ہے۔ دانش مندوں نے اسے سمجھایا کہ وہ اس کا باقاعدہ اعلان نہ کرے، بلکہ کچھ دن ٹھہر جائے تاکہ ان کا البم مارکیٹ میں آجائے اور اس کی فروخت پر کوئی اثر نہ پڑے۔ البم 'ایبے روڈ' مارکیٹ میں آیا اور تین ماہ میں اس کے چالیس لاکھ (چار ملین) ریکارڈ فروخت ہوئے اور اس نے فروخت کے تمام ریکارڈ ایک بار پھر توڑ ڈالے۔

3 جنوری 1970ء میں جب ایک گانا ریکارڈ کرنے کا پروگرام بنایا گیا تو ہیریسن اس وقت ڈنمارک میں تھا، اس نے بینڈ کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ پھر 10 اپریل کو میکارٹنی نے بھی بینڈ سے علیحدہ ہونے کا باقاعدہ اعلان کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اب علیحدہ ہو کر گلوکاری کرے گا۔ اس کے اعلان کے بعد کئی ریکارڈنگ کمپنیوں نے اسے آفر دی اور اس نے ایک البم تیار کرانے کی ہامی بھرلی۔ یوں بیٹلز کا بینڈ ٹوٹ گیا اور سب علیحدہ ہو کر اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے لیے تگ و دو کرنے لگے۔ یہ صحیح ہے کہ بینڈ میں سب ہی اپنے فن کا جوہر دکھاتے تھے، مگر بینڈ کی اصل طاقت جان لینون اور پال میکارٹنی تھے۔ جارج ہیریسن گٹار اچھا بجاتا تھا اور رنگو اسٹار دل کش اور خوب صورت تھا، اس لیے لڑکیاں اس بینڈ کی طرف کھنچی چلی آتی تھیں۔ تاہم جان لینون اور پال میکارٹنی کی آواز باقی دو سے اچھی تھی اور انہوں نے گائے جانے والے بیشتر گیت خود لکھے، جو حسن و عشق اور جذباتیت کی مہک میں بسے ہوئے تھے۔ جان لینون میں انتظامی صلاحیتیں تھیں اور وہ اس بات سے واقف تھا کہ بینڈ کو کیسے کنٹرول کرنا چاہیے۔ بلاشبہ وہ دونوں بیٹلز کی محوری طاقت کہے جاسکتے ہیں۔

پال میکارٹنی نے کہا کہ اس سے پہلے کہ بیٹلز ہوٹ ہو جائیں، ہمیں علیحدہ ہو جانا چاہیے۔ آواز ملا کر گانا علیحدہ بات ہے اور ایک جیسی زندگی گزارنا علیحدہ بات۔ ہم زندگی کی آخری سانسوں تک ایک جیسے نہیں لگ سکتے اور ایک ساتھ اسٹیج پر نہیں آسکتے۔ مثال کے طور پر جان نے 'یوکو' نامی لڑکی سے شادی کی اور میں نے لنڈا سے۔ کیا ہم سب ایک لڑکی سے شادی کرسکتے تھے؟

ان کوششوں سے 1970ء کے وسط تک ان سب کے علیحدہ البم مارکیٹ میں آگئے۔ اگست 71ء میں نیویارک میں بنگلہ دیش کے لیے ہیریسن نے رنگو اسٹار کے اشتراک سے ایک پروگرام ترتیب دیا۔ کنسرٹ لوگوں سے کھچا کھچ بھر

گیا۔ ناقدین نے کہا کہ ان کی مقبولیت کا گراف ابھی تک نہیں گرا ہے۔ ایک ریکارڈنگ کمپنی 'ایپل' نے 1960ء سے لے کر 70ء تک کے گیتوں کا انتخاب کر کے مارکیٹ میں دیا تو وہ بے پناہ فروخت ہوا اور اسے امریکا اور برطانیہ میں پلاٹینم سرٹیفکیٹ دیا گیا۔ (گلوکاروں کی مساعیٔ جمیلہ کا اعتراف کرتے ہوئے، بڑی کمپنیاں پلاٹینم کا بنا ہوا ایک چھوٹا سا ریکارڈ گلوکاروں کو دیتی ہیں)

1980ء میں لینون کار کے حادثے میں ہلاک ہوگیا۔ اس کی یاد میں ہیریسن نے ایک گیت ریکارڈ کرایا۔ اس کے بعد اس سلسلے میں باقاعدہ ایک تقریب منائی گئی، جس میں انہوں نے لینون کی بیوہ یوکو انو اور اس کے دو بچوں جولین اور شون کو بلایا۔ ہلاکت کی وجہ کیا تھی، اس کا پتا نہ چل سکا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ بیٹلز کو ہلاکت کی وجہ کا علم تھا، لیکن انہوں نے اسے قانون سے چھپایا اور معاملے کی ہوا نہیں لگنے دی۔ معاملہ بہرحال پُراسرار تھا، اس لیے کہ اس کی ہلاکت کی خبر پہلے ہی عام ہو چکی تھی۔

ڈریک یونی ورسٹی کے اخبار 'دی ٹائمز ڈیلفک' میں ایک مضمون شائع ہوا جس کا عنوان تھا 'کیا پال میکارٹنی مر چکا ہے؟' لکھنے والے کا نام ٹام ہار پر تھا۔ اس نے مختلف کلیوز سے یہ ثابت کیا تھا کہ میکارٹنی مر چکا ہے۔ مثال کے طور پر اس نے بیٹلز کے ایک البم 'دی سارجنٹ' کو پیش کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ البم کے کور پر چھپی ہوئی تصویر دیکھ کر ہی پتا چل جاتا ہے کہ بیٹلز خیریت سے نہیں ہیں، خاص طور پر میکارٹنی موت کے دہانے پر کھڑا ہے۔ البم کے کور پر ایک پُراسرار ہاتھ کو میکارٹنی کے سر پر دکھایا گیا ہے، جو یونانیوں اور امریکا کے سرخ ہندیوں میں موت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

گروپ کے قدموں میں ایک قبر ہے اور اس پر ایک بائیں ہاتھ سے گٹار بجانے والا پڑا ہوا ہے (میکارٹنی بائیں ہاتھ سے گٹار بجایا کرتا تھا) اس البم کی پشت والے کور پر جارج ہیریسن کو ایک ضرب المثال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ جس کا مطلب ہے 'زندگی میں صرف ایک دن'۔ اس کے علاوہ بیٹلز کے ایک اور البم 'میجکل مسٹری ٹور' کے ایک گانے میں بھی اس ہلاکت کا ذکر ہے۔ اسی البم کو جب آئینے میں دیکھا جائے تو اس پر ایک نامعلوم ٹیلی فون نمبر لکھا نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ 12 اکتوبر کو ریڈیو اسٹیشن مشی گن کے اسٹیشن انچارج کو ایک طالب علم نے فون کیا کہ میکارٹنی مر چکا ہے، لہٰذا اس کی یاد میں اس کا مشہور گانا

ریولوشن۔ 9 بجائیے۔

تب اسٹیشن انچارج نے ایسا ہی کیا اور بعد میں ناظرین کو اس گانے کو نشر کرنے کی وجہ سے آگاہ کیا۔ طالب علموں نے بھی یونی ورسٹی کے پرائیویٹ ریڈیو اسٹیشن سے یہ خبر نشر کر دی۔ جس سے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سراسیمگی کی لہر دوڑ گئی۔ یہ سب باتیں جنگل کی آگ کی طرح سے پھیل رہی تھیں اور اس آگ کو بجھانے والا کوئی نہیں تھا۔ بیٹلز کے پریس آفس میں ٹیلی فونز کا تانتا بندھ گیا تو آفس نے 21 اکتوبر 1969ء کو اس کی تردید کی اور کہا کہ یہ محض افواہیں ہیں۔ اس میں کوئی صداقت نہیں ہے۔

مشہور رسالہ 'ٹائم' اور اس کے بعد 'لائف' نے میکارٹنی کو تلاش کرنے کے لیے ایک ٹیم لندن سے اسکاٹ لینڈ روانہ کی۔ اس کا پتا چل گیا کہ وہ ایک ویران اور سنسان علاقے میں رہتا ہے۔ وہ علاقہ بے حد سرد تھا۔ بہرحال ٹیم وہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئی۔ میکارٹنی کے باہر ایک کتا کھڑا تھا، جو انہیں دیکھ کر بھونکنے لگا۔ پھر میکارٹنی اپنے مکان سے باہر آیا تو فوٹوگرافر نے اس کی تصاویر کھینچیں۔ وہ ٹیم کو دیکھ کر برہم ہوا کہ اس کی ذاتی زندگی میں وہ لوگ کیوں دخیل ہو رہے ہیں؟ اس نے ان لوگوں پر ایک بالٹی پانی پھینکا۔ لائف کا عملہ وہاں سے واپس چلا آیا۔ میکارٹنی مکان کے اندر چلا گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد اسے احساس ہوا کہ اس نے پریس کے ساتھ زیادتی کی، اس لیے وہ اپنی فورڈ میں بیٹھا اور ان کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے معذرت کی۔ وہ انٹرویو دینے پر بھی رضامند ہوگیا۔ اس کا انٹرویو مع تصاویر لائف کے 7 نومبر 1969ء کے شمارے میں شائع کیا گیا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ زندہ ہے اور ان کے سوالات کے جوابات دے رہا ہے۔ وہ چونکہ دنیائے ساز و آہنگ سے دور ہوگیا تھا، اس لیے اس کے بارے میں لوگوں کو کچھ پتا نہیں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اب اس کے پاس کچھ کہنے کو بچا نہیں ہے، لہٰذا وہ کنارہ کشی اختیار کیے ہوئے ہے۔ وہ اپنے خاندان کے ساتھ یہاں خوش ہے۔

پریس کو ایک بار پھر اپنی دکان چمکانے کا موقع مل گیا۔ اس کے بارے میں خبریں اور مضامین پھر سے شائع ہونے لگے۔ بیٹلز کے ریکارڈوں کی فروخت میں بھی ایک بار پھر تیزی آگئی۔ ان کا البم اور فلم تھوڑے دنوں بعد ریلیز ہوئی تو لوگ اس پر ٹوٹ پڑے۔

تاہم اب بیٹلز کے چاروں گویوں نے انفرادی طور پر اپنا کیریئر بنانا شروع کر دیا۔

1995ء سے 96ء کے دوران وہ پھر یکجا ہوگئے اور انہوں نے پانچ حصوں کی ایک ٹی وی سیریز ریکارڈ کرائی۔ یہ سیریز بے حد کامیاب رہی اور دنیا بھر میں اسے چالیس کروڑ افراد نے دیکھا۔ پھر 13 نومبر 2000ء میں ان کے گیتوں کا ایک انتخاب مارکیٹ میں آیا، جس میں امریکا اور برطانیہ میں گائے جانے والے گانے شامل تھے، جس کی نہایت تیزی سے فروخت ہوئی۔ پہلے ہفتے میں اس کے ساڑھے تین لاکھ ریکارڈ فروخت ہوئے۔ ایک ماہ بعد ان کی تعداد ایک کروڑ تیس لاکھ ہوچکی تھی۔ بیٹلز کا جادو اب بھی لوگوں کے سروں پر چڑھا ہوا تھا حالانکہ انہیں اپنے فن کا جادو جگاتے ہوئے چالیس برس ہوچکے تھے۔ یہ ریکارڈ دنیا کے 28 ممالک میں فروخت ہوا۔

نومبر 2001ء میں جارج ہیریسن سرطان میں مبتلا ہوکر آنجہانی ہوگیا۔ اس کی یاد میں ایک برس بعد رائل البرٹ ہال میں ایک پروگرام ہوا جس میں پال میکارٹنی اور رنگو اسٹار نے شرکت کی۔ اس پروگرام میں ہیریسن کی بیوہ اولیویا بھی آئی تھی۔ اسے خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ان چاروں کے گائے ہوئے اور اس کے تنہا گائے ہوئے گانے لوگوں کو سنائے گئے۔

2009ء میں وہ تینوں ایک امدادی شو کے لیے پھر نیویارک کے ریڈیو سٹی میوزک ہال میں اکٹھا ہوئے۔ اس لیے ان کے چاہنے والوں کی تعداد کم نہ ہوئی تھی۔ ان کے سروں میں راک اینڈ رول میوزک کا سودا اب بھی سمایا ہوا تھا۔

امریکا میں انہیں 6 ڈائمنڈ البم۔ 39 پلاٹینم البم۔ 45 گولڈ البم۔ ایک گریمی۔ ایک آسکر ایوارڈ دیا گیا۔ تاریخ میں بیٹلز بیسٹ سیلنگ بینڈ رہے ہیں۔ ای ایم آئی کا کہنا ہے ان کے ریکارڈ دنیا بھر میں فروخت کر کے انہوں نے ایک ارب ڈالر کمائے ہیں۔ ٹائم میگزین نے انہیں ان سو بڑے افراد میں شامل کیا ہے جنہوں نے اپنے عہد کو ہمیشہ متاثر کیا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق امریکا میں ان کے 17 کروڑ ریکارڈ فروخت ہوچکے ہیں۔ فروخت کے اعتبار سے وہ برطانیہ میں سب سے آگے ہیں۔ ان کے ریکارڈ اب تک فروخت ہو رہے ہیں۔

پیار کی آگ

ذوالفقار ارشد گیلانی

صحرائے دل میں خاک اڑاتی خواہشیں اسے پالینے کی جستجو، یہی متاعِ حیات ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی تھی جیسے اس کا نصیب بادل ہو۔ وہ اسیرِ عشق ہوکر بھی خوش تھا کیونکہ اسے فضاؤں میں ہرسو کسی کی زلف کی خوشبو ایسے محسوس ہوتی جیسے صندل کا دھواں، وہ پیار کی آگ میں پور پور جل گیا تھا۔

صوبۂ خیبر پختونخواہ سے ایک مشہور کتھا

تاریخی شواہد کے ساتھ ایک دلچسپ لوک داستان

محبتیں جس طرح رنگ، نسل، مذہب اور ذات پات کی محتاج نہیں ہوتیں، اسی طرح معاشرتی اقدار، جغرافیائی حالات اور ماحول بھی ان پر اثرانداز نہیں ہوتا کیونکہ یہ وہ فصل ہے جو ہر موسم میں نہ صرف بوئی جاسکتی ہے بلکہ ہر زمین پر یہ اپنی پوری جولانی اور شادابی کے ساتھ پنپتی بھی ہے۔ خیبر پختونخواہ اور اس کے باسیوں یعنی پختونوں کا تذکرہ ہو تو سب سے پہلے گولی اور بندوق کا تصور ابھرتا ہے کیونکہ یہاں ہر پٹھان بے حد فخر سے کہتا ہے کہ ٹوپک زماں قانون...... یعنی بندوق میرا قانون، لیکن گولیوں اور بندوقوں کی اس سرزمین اور بارود آلود فضاؤں میں بھی

WWW.PAKSOCIETY.COM

چاہت ومحبت کی ایسی داستانیں رچی بسی ہیں جنہیں صرف پٹھان ہی اپنا ورثہ قرار نہیں دیتے بلکہ یہ بہ حیثیت مجموعی بھی شعروادب کا سرمایہ ہیں۔

مردان اور صوابی، خیبر پختونخواہ کے پہلو بہ پہلو آباد اضلاع ہیں۔ مردان شہر کسی زمانے میں عظیم گندھارا تہذیب کا اہم شہر تھا۔ اس علاقے کی بیشتر زمین زرعی ہے جبکہ یہاں آبپاشی کے لیے دنیا کے بہترین نظاموں میں سے ایک نظام موجود ہے جسے انگریزوں نے 1857ء سے 1947ء کے درمیان برصغیر پر اپنے دورِ حکمرانی میں بچھایا تھا۔ مردان کے مختلف حصوں میں اب بھی گندھارا تہذیب کی درجنوں نشانیاں موجود ہیں جن کی وجہ سے یہ علاقہ سیاحوں کی توجہ کا خاص مرکز ہے۔ یہاں کی بہترین ثقافت اور مہمان داری کی شاندار روایات اسے دوسرے علاقوں سے ممتاز کرتی ہیں۔

ضلع مردان کا علاقہ درحقیقت وادی پشاور کا حصہ ہے جس کا سب سے پہلا تذکرہ گندھارا بادشاہت کے دور میں ہوا۔ الیگزینڈر دی گریٹ کی افواج 326 قبل مسیح میں ہندوستان فتح کرنے کے لیے افغانستان سے دو مختلف راستوں کے ذریعے وادی سندھ پہنچیں۔ فوج کے ایک حصے نے درہ خیبر عبور کیا جبکہ دوسرے حصے نے خود الیگزینڈر دی گریٹ کی سربراہی میں کنہڑ، باجوڑ، سوات اور بونیر کا راستہ اختیار کیا۔ الیگزینڈر کی روانگی کے بعد وادی پشاور، چندر گپت کے زیرِ نگیں آ گئی جو 321 قبل مسیح سے 297 قبل مسیح تک یہاں کا مالک ومختار تھا۔ چندر گپت کا پوتا اشوکا دی گریٹ (اشوک اعظم) چونکہ بدھ مت کا پیروکار تھا اس لیے وادیِ پشاور میں بھی اس کے اثرات نمودار ہوئے۔ وادی نے اس وقت برہمن ازم کی تجدید دیکھی جب شاہ مہندا کے عہد میں یونانیوں نے اس پر قبضہ کرلیا۔ ان کی تقلید سی تھین قبائل اور ہندوؤں نے کی جو ساتویں صدی عیسوی تک یہاں قابض رہے۔

مردان کا سب سے بااثر اور بڑا قبیلہ یوسف زئی ہے جبکہ اس کے نواحی علاقوں میں سید بھی آباد ہیں۔ یہاں کے دلیر پختونوں کی جنگی خدمات نہایت قابلِ تحسین ہیں اور اس وقت یہ پاکستان آرمی کی سب سے بڑی اور قدیم ترین پنجاب رجمنٹ کا رجمنٹل سینٹر ہے۔ مردان کو مشہور زمانہ گائیڈز رجمنٹ کا ''گھر'' ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے جسے لومس ڈن نے قائم کیا تھا۔ سلطنتِ برطانیہ کی ملکہ ہر میجسٹی الزبتھ اور پرنس فلپ نے 1960ء کی دہائی کے اوائل میں اولڈ گائیڈز میس مردان کا دورہ بھی کیا تھا جبکہ برطانیہ کے سابق وزیراعظم سرونسٹن چرچل نے ایک نوجوان فوجی افسر کی حیثیت سے بہ راستہ باجوڑ، پشاور جاتے ہوئے یہاں کچھ دیر کے لیے قیام کیا تھا۔

مردان کے پہلو میں دریائے سندھ اور دریائے کابل کی قدرتی پہرے داری میں ضلع صوابی آباد ہے جس کے مکینوں کو ضلع کے نام کی مناسبت سے صوابی وال کہا جاتا ہے۔ مردان کی طرح یہ بھی یوسف زئیوں کا علاقہ ہے لیکن گنجانی کے اعتبار سے صوبے میں اس کا چوتھا نمبر ہے۔ تاریخ اور ثقافت کے حوالے سے بھی صوابی کسی دوسرے علاقے سے پیچھے نہیں۔ مرحوم مورخ روشن خان بابا نے جن کا تعلق اسی علاقے سے تھا، یوسف زئیوں کی تاریخ مرتب کی جو بہ ذاتِ خود ایک نادر دستاویز ہے جبکہ جنگ کارگل کے ہیرو اور پاکستان کا اعلیٰ ترین فوجی اعزاز نشانِ حیدر حاصل کرنے والے کیپٹن کرنل شیر خان کا تعلق بھی اسی ضلع سے ہے۔

صوابی، دنیا کے سب سے بڑے مٹی کی بھرائی کے ڈیم، تربیلا ڈیم کا آبائی ضلع ہے جبکہ ٹوپی میں غلام اسحاق خان انسٹی ٹیوٹ آف انجینئرنگ، سائنسز اینڈ ٹیکنالوجی کا شمار پاکستان کے بہترین اور شاندار تعلیمی اداروں میں ہوتا ہے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے کہ ضلع صوابی کے گاؤں ٹھنڈکوئی میں جتنے حفاظ ہیں، اتنے پاکستان کے کسی اور گاؤں میں نہیں۔

ضلع صوابی میں 438 آثارِ قدیمہ ہیں جن کا تعلق تاریخ کے مختلف ادوار سے ہے۔ مردان کی طرح یہ بھی گندھارا تہذیب کا حصہ تھا۔ اس ضلع کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ الیگزینڈر دی گریٹ نے اسی کے ایک گاؤں ہنڈ سے دریائے سندھ عبور کیا۔ ہنڈ کو آثارِ قدیمہ کا خزانہ کہا جاتا ہے کیونکہ یہ تین سو سال تک ہندوشاہی اور ترک شاہی کا دارالسلطنت رہا۔

ضلع صوابی کی ایک نہایت دلچسپ جگہ رانی گھاٹ ہے جو دور افتادہ پہاڑوں میں واقع ہے۔ اس کا تعلق بھی گندھارا تہذیب سے ہے۔ یہ پہاڑ کی چوٹی پر بنے تاریخی محل کی وجہ سے مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت کی رانی اس محل میں رہتی تھی اور صوابی کی طرف سے آنے والی تازہ ہوا خریدا کرتی تھی۔ اس مقصد کے لیے وہ دیہاتیوں کو

انعام دیا کرتی تھی کہ وہ فصلیں یا کچرا جلا کر فضا آلودہ اور ہوا کو گندہ نہ کریں۔

ضلع صوابی کا ایک تاریخی مقام لاہور کہلاتا ہے اور آثارِ قدیمہ سے ثابت ہے کہ پنجاب کا شہر لاہور اس کے بعد آباد ہوا۔ ہنڈ کسی دور میں باقاعدہ ایک ریاست تھی جبکہ یہ لاہور اس کا دارالسلطنت تھا۔ اس وقت یہ چھوٹا سا گاؤں ہے جہاں اس چھ رویہ موٹر وے کا انٹرچینج واقع ہے جو اسلام آباد سے پشاور جاتی ہے۔

صوابی درجنوں ندیوں اور دو بڑے دریاؤں کی سرزمین بھی ہے۔ دریائے سندھ اور دریائے کابل۔ یہ دونوں دریا کنڈ کے مقام پر آپس میں ملتے ہیں۔ دریائے سندھ کا نیلا اور دریائے کابل کا مٹیالا پانی ایک دوسرے میں مدغم ہوئے بغیر میلوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں جو واقعی قابلِ دید منظر ہے۔ مائن نامی گاؤں میں ایک نہایت منفرد قسم کی ندی ہے جو گاؤں کے عین وسط سے گزرتی ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا پانی سردیوں میں شدید گرم اور گرمیوں میں بے حد ٹھنڈا ہوتا ہے۔ اس ندی کا نام چانَنا ہے (اسے چینا بھی کہا جاتا ہے جس کے معنی چشمے کے ہیں) مائن، کوٹھا اور ٹوپی کے تین دیہات کو اجتماعی طور پر اتمان کہا جاتا ہے کیونکہ تینوں میں ہی قدرتی چشمے ہیں۔ مائن کے چشمے کو چینا، کوٹھا کے چشمے کو چینو اور ٹوپی کے چشمے کو بائن کہا جاتا ہے۔

ان تمام اعزازات کے ساتھ ساتھ مردان اور صوابی کو یہ امتیازی حیثیت بھی حاصل ہے کہ پشتو ادب کی معروف رومانوی داستان یوسف خان، شیر بانو کے کرداروں نے یہیں جنم لیا۔ مردان سے صوابی جانے والی سڑک صرف قدرتی نظاروں اور اردگرد پھیلے سرسبز وشاداب لالہ زاروں کی وجہ سے ہی مشہور نہیں بلکہ اسی پر پہاڑوں میں گھرا اترلاندی نام کا گاؤں واقع ہے جہاں یوسف خان نامی شکاری رہا کرتا تھا جبکہ شیر بانو اس کے روزمرہ راستے میں پڑنے والے ایک گاؤں کی خوب صورت اور نازک اندام حسینہ تھی۔

یوسف خان شکار کے لیے روزانہ اپنے گاؤں سے کڑامار پہاڑ کے دامن میں واقع جنگل میں جایا کرتا تھا۔ یوسف زئیوں کی ہموار زمین سے ایک ہزار چھ سو پچاس فٹ بلند کڑامار کی ڈھلوانیں اور اطراف ان دنوں دیودار، چیڑ اور صنوبر کے جنگلات سے اٹی پڑی تھیں جن میں جابہ جا گرم و سرد چشموں کے علاوہ ہرن، ریچھ، لومڑیاں، بارہ سنگھے اور دیگر جنگلی جانور بہ کثرت موجود تھے چنانچہ شاید ہی کوئی دن ایسا ہوتا کہ یوسف خان بلند چوٹیوں سے خالی ہاتھ زرخیز زمینوں کو لوٹتا۔

یوسف خان کے گاؤں اور کڑامار کے درمیان میدے میں گندھی، دلکش شیر بانو کا گاؤں تھا چنانچہ یہ شاید وقت کا میلان ہی تھا کہ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، کیوپڈ نے تیر چلایا اور وہ..... اپنے دل گھائل کر بیٹھے۔ پختونوں میں چچیرے بھائیوں میں لڑائیاں عام سی بات ہے۔ کبھی یہ محض اختلافات ہوتے ہیں لیکن بعض اوقات بندوقیں بھی نکل آتی ہیں۔ یہ جھگڑے اس وقت زیادہ مہلک اور خطرناک ہوجاتے ہیں جب ان میں سے کسی ایک کے والد کا انتقال ہوجائے۔ یوسف خان کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اس کے والد کا چونکہ عرصہ دراز پہلے انتقال ہوچکا تھا اس لیے اس کے چچازاد اس پر بھاری پڑ رہے تھے۔ وہ یوسف خان کو صرف اس کے باپ کی جائداد سے ہی بے دخل نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ ان کی خواہش تھی کہ اس کی محبوبہ بھی چھین لی جائے۔

اس فتنہ فساد کی وجہ سے نوجوان یوسف خان کو اپنی بوڑھی ماں اور چھوٹی بہن کو چھوڑ کر دہلی میں ملازمت پر مجبور ہونا پڑا جو اس کے گھر سے کئی دنوں کی مسافت پر تھا۔ وہاں یوسف خان کو مغل شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر (1556ء-1605ء) کی فوج میں ایک معمولی ملازمت مل گئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ یوسف خان نے ترقی کی اور اسے ایک دستے کا سالار بنا دیا گیا لیکن ایک طرف تو حالات بہتری کی جانب گامزن تھے مگر دوسری جانب دور واقع اس کے گاؤں سے نہایت بری خبریں مل رہی تھیں۔ اسے اطلاع ملی کہ اس کے چچازادوں نے اس کی ماں، بہن اور شیر بانو کی اپنی شدید ترین مخالفت اور مزاحمت کے باوجود شیر بانو کی شادی کسی اور شخص سے طے کردی ہے۔

دربار سے رخصت لے کر یوسف خان، مغل شہ سواروں کے ایک دستے کے ہمراہ کڑامار کے دامن میں واقع اپنے گاؤں روانہ ہوا اور خوش قسمتی سے عین اس دن اپنی منزل پر پہنچا جب شیر بانو کی زبردستی شادی کی جارہی تھی۔

یوسف خان کسی وحشی درندے کی طرح شادی کی تقریب پر حملہ آور ہوا۔ اس نے تمام انتظامات درہم برہم

WWW.PAKSOCIETY.COM

کر دیے جبکہ اپنے چچازادوں کے بعض عزیزوں کو بھی قتل کر ڈالا۔ یوسف خان کے پاس چونکہ شاہی طاقت موجود تھی اس لیے اس کے بچ جانے والے چچازادوں نے اس سے صلح کر لی یا یہ ظاہر کیا کہ اب ان کی دشمنی ختم ہوگئی ہے۔

اس قضیے سے فارغ ہو کر یوسف خان نے اپنی محبوبہ سے شادی کر لی اور دونوں ہنسی خوشی زندگی گزارنے لگے۔ ابھی ان کی ازدواجی زندگی کو کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ یوسف خان اپنے سابقہ معمول کے مطابق شکار کے لیے گیا لیکن خالی ہاتھ واپس آیا۔ شیر بانو جو کھانا پکانے کے لیے اس کا انتظار کر رہی تھی، یہ صورتِ حال دیکھ کر بے حد مایوس ہوئی۔ اس نے کچھ اس انداز میں اپنے جذبات کا اظہار کیا کہ یوسف خان انہی قدموں شکار کے لیے واپس کڑامار کی جانب چل دیا لیکن اس مرتبہ دو کزن بھی اس کے ہمراہ تھے، جو اب ظاہری طور پر اس کی دوستی کا دم بھر رہے تھے۔

ان تینوں نے ایک ہرن شکار کیا جو بھاگتا ہوا ایک کھائی میں جا گرا۔ یوسف خان ہرن دیکھنے کے لیے کھائی پر جھکا تو اس کے چچیرے بھائیوں نے ہمیشہ کے لیے اس سے جان چھڑانے کا فیصلہ کیا اور اسے کھائی میں دھکا دے دیا۔ یوسف خان کی موت کی خبر سن کر شیر بانو نے بھی پہاڑ کی چوٹی سے کود کر جان دے دی۔

یوسف خان، شیر بانو کی داستانِ محبت پشتون ادب کا گراں قدر سرمایہ اور پشتونوں کے لیے ایک خزانہ ہے اور وہ اسے وہی مقام دیتے ہیں جو پنجاب میں ہیر رانجھا، سندھ میں سسی پنوں، عرب میں لیلیٰ مجنوں اور یورپ میں رومیو جیولٹ کو دیا جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ یوسف خان، شیر بانو کو بہت زیادہ شاعروں نے نظم نہیں کیا اور اس داستان کو عام کرنے کا سہرا پشتو کے نامور شاعر علی حیدر جوشی کے سر ہے، جوشی نے ہی وہ کمال دکھایا ہے جو دیگر شاعر نہ کر پائے۔

دوسری بہت سی رومانوی داستانوں کی طرح یوسف خان شیر بانو کی کہانی میں بھی کئی واقعاتی اختلافات ہیں لیکن اس کے باوجود کہانی سو فی صد مبنی بر حقیقت ہے جبکہ محبت کے اس انمول ہیرے کے وقوع پذیر ہونے کے زمانے میں بھی کوئی ابہام نہیں پایا جاتا۔ یوسف خان شیر بانو کو نظم و نثر کا روپ دینے والوں کے ساتھ ساتھ مورخین بھی اس امر پر متفق ہیں کہ یوسف خان نے شہنشاہ جلال الدین اکبر کے عہد میں مغلوں کی ملازمت اختیار کی تھی چنانچہ یہ بات بغیر کسی شک وشبے کے کہی جاسکتی ہے کہ یوسف خان اور شیر بانو 1556ء سے 1605ء کے درمیان حیات تھے کیونکہ اکبر کا دورِ حکمرانی بھی اسی عرصے پر محیط تھا۔

پشتون شاعر اسماعیلہ علی حیدر جوشی نے جس انداز میں اس قصے کو رقم کیا ہے، اس کے مطابق یوسف خان ایک نہایت خوش شکل اور دلیر نوجوان تھا۔ مردان، صوابی شاہراہ پر واقع گاؤں ترلاندی کے باسیوں کا دعویٰ ہے کہ یوسف خان ان کے گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اس کے والد محمد شاہ کا انتقال ہو چکا تھا اور وہ اپنی بوڑھی ماں اور چھوٹی بہن بولندرا کا واحد کفیل تھا۔ یوسف خان کا کوئی مستقل ذریعۂ معاش نہ تھا اس لیے وہ شکار کے ذریعے اپنا اور اپنے چھوٹے سے کنبے کا پیٹ پالتا۔ اس مقصد کے لیے وہ روزانہ گھر سے نکلتا اور تمام دن گزار کر تازہ گوشت کے ساتھ واپس آتا۔

علاقے کے لوگوں کے مطابق یوسف خان کڑامار کے پہاڑوں میں شکار کھیلتا تھا۔ اب تو کڑامار کے پہاڑ تقریباً بے آب و گیاہ اور ویران ہو چکے ہیں لیکن اس زمانے میں پہاڑوں کی ڈھلوانیں دیودار اور چیڑ کے بلند و بالا درختوں سے گھری ہوئی تھیں۔ ان گھنے پہاڑی جنگلوں میں شکار کی کوئی کمی نہ تھی اور خوں خوار درندوں کے علاوہ ہرن، بارہ سنگھے، جنگلی خرگوش اور لومڑیاں وغیرہ بہ کثرت پائی جاتی تھیں۔ یوسف خان تمام دن ان جانوروں کے پیچھے بھاگتا رہتا لیکن کم و بیش ہر شام کامیاب ہی لوٹتا۔ ایسا دن شاید ہی کبھی آتا کہ یوسف خان خالی ہاتھ گھر پہنچتا۔

یوسف خان کی اس مہم جوئی میں اس کے والد کے شکاری کتے اس کا بھرپور ساتھ دیتے تھے۔ کتے بے حد سمجھ دار اور شکار میں بے حد ماہر تھے۔ یہ شکاری کتے چونکہ یوسف خان کے والد کے تھے اس لیے وہ ان کا بے حد خیال رکھتا اور ان سے پیار کرتا۔ اس نے کتوں کو اپنے انداز میں سجا رکھا تھا۔ اس نے کتوں کے گلوں میں رنگ برنگے پٹے ڈال رکھے تھے جن کے ساتھ چاندی کی چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ ان گھنٹیوں کی سُریلی آوازے لوگوں کو اس خوبصورت اور وجیہہ شخص کے آنے اور جانے کا بہ خوبی پتا چلتا رہتا تھا۔

ترلاندی سے کڑامار جاتے ہوئے راستے میں ایک چھوٹا سا گاؤں آتا تھا جسے یوسف خان روزانہ سر جھکائے ہوئے پار کرتا تھا لیکن ایک روز اس کی نظر اچانک اٹھی اور پھر وہیں کی ہو کر رہ گئی۔ اسے ایک نہایت حسین، دلکش اور باادب نظر لڑکی دکھائی دی تھی جس کا نام اسے بعد میں شیر بانو بتایا گیا۔ حیران کن بات یہ تھی کہ شیر بانو بھی اسی کو دیکھ رہی تھی۔ یوسف خان کو یہ تو علم نہیں تھا کہ وہ لڑکی پہلے بھی اسے دیکھتی رہی تھی یا یہی وہ دن تھا کہ دونوں کی نگاہیں بیک وقت ایک دوسرے سے ٹکرائی تھیں لیکن آنے والے دنوں میں یہ ضرور ثابت ہوگیا کہ شیر بانو باقاعدہ اسی کا انتظار کرتی ہے۔

شیر بانو نے یوسف خان کے اس گاؤں سے گزر کر کڑامار جانے اور پھر واپسی کی نشانی اس کے شکاری کتوں کی گھنٹیوں کی آواز کو بنا رکھا تھا۔ صبح شام اسے جیسے ہی گھنٹیاں بجتی سنائی دیتیں، وہ یوسف خان کے راستے پر آ کھڑی ہوتی۔ پہلے تو یوسف خان شرمایا شرمایا سا اُس کے قریب سے گزر جایا کرتا تھا لیکن جب اس نے شیر بانو کی دلچسپی اور وارفتگی دیکھی تو اس نے بھی شیر بانو کے سراپا کو اپنی آنکھوں میں سمونا شروع کر دیا چنانچہ اب صورتِ حال یہ تھی کہ دونوں نے کبھی ایک دوسرے کو مخاطب نہ کیا تھا لیکن آنکھوں ہی آنکھوں میں محبت اور پسندیدگی کا خاموش پیغام روزانہ ہی اِدھر سے اُدھر پہنچ جایا کرتا تھا۔

جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے تھے، شیر بانو کی بے قراریاں اور بے چینیاں بھی بڑھ رہی تھیں۔ شروع شروع میں تو خاموش نگاہوں کے تبادلوں سے اس کی تسکین ہو جایا کرتی تھی لیکن اب اس کے جذبات باقاعدہ اظہار کے طلب گار بنتے جا رہے تھے۔ یوسف خان کی حرکات و سکنات سے اسے یہ اندازہ تو ہوگیا تھا کہ وہ بھی اس سے محبت کرتا تھا لیکن زبان سے کچھ نہ کہتا تھا جبکہ شیر بانو میں خود بھی اسے مخاطب کرنے کا حوصلہ نہ تھا۔ یوں بھی وہ زمانہ موجودہ دور سے بے حد مختلف تھا اور پھر پشتون روایات بھی کچھ اتنی سخت تھیں کہ یوں سرِ راہ کسی لڑکے، لڑکی کا ہم کلام ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ محبت، شیر بانو کو مضبوط کرنے کے بجائے دیمک کی طرح چاٹنے لگی۔ وہ تمام دن آہیں بھرتی رہتی۔ اس کی آنکھیں ویران رہنے لگیں۔ کھانا پینا چھوٹ گیا۔ اس نے اپنے گھر والوں اور سہیلیوں سے بات چیت بھی تقریباً ختم کر دی البتہ اس کے کان ہر وقت کتوں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں پر لگے رہتے۔ صبح اور شام کے وقت اسے جیسے ہی دور سے یوسف خان کے کتوں کی گھنٹیوں کی آواز سنائی دیتی، وہ اپنے محبوب کے دیدار کے لیے بے تابی سے گلی میں جا کھڑی ہوتی۔ تمام دن میں بس ان چند لمحوں کے لیے شیر بانو کی آنکھوں کی رونق اور چہرے کی بشاشت لوٹ آتی جب وہ اور اس کا محبوب ایک دوسرے کا دیدار کرتے۔

گزرتے دنوں کے ساتھ شیر بانو کی اداسی پژمردگی میں بدلنے لگی تو اس کے گھر والوں کو تشویش ہونا شروع ہوگئی۔ یہ تو سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ شیر بانو کسی کی محبت میں گھلے جا رہی ہے چنانچہ سب سے پہلا خیال انہیں یہی آیا کہ کسی دشمن نے ان کی خوبرو بیٹی پر کوئی جادو یا تعویذ کر دیا ہے۔ اس لیے انہوں نے اس کے توڑ کی کوششیں شروع کر دیں مگر کوئی تعویذ گنڈا ہوتا تو شیر بانو کی حالت میں بہتری بھی آتی۔ جب تعویذوں سے بات نہ بنی تو شیر بانو کے گھر والوں نے اسے ایک بزرگ کے مزار پر بھیجنے کا فیصلہ کیا تاکہ بزرگ کے روحانی فیض کے طفیل ان کی بچی ٹھیک ہو جائے چنانچہ شیر بانو کی ایک سہیلی اسے لے کر بزرگ کے مزار کے لیے روانہ ہوئی، جس کا راستہ یوسف خان کے گاؤں سے ہو کر گزرتا تھا۔

دونوں لڑکیاں پانی پینے کے لیے دانستہ یا نادانستہ طور پر یوسف خان کے گھر رکیں۔ یوسف خان کی بہن بولندرا نے ان دونوں کو نہایت احترام کے ساتھ زنان خانے میں بٹھایا اور پانی کے علاوہ بھی خاطر مدارت کی پیش کش کی لیکن دونوں نے نہایت نپے تلے الفاظ اور مہذب انداز میں اس سے معذرت کر لی تاہم شیر بانو کی سہیلی، بولندرا سے یہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی کہ یہ کس کا گھر ہے۔ بولندرا نے نہایت فخریہ انداز میں بتایا کہ یہ یوسف خان شکاری کا گھر ہے۔

شیر بانو کی سہیلی اس کی رازدار بھی تھی اور جانتی تھی کہ شیر بانو پر کسی نے کچھ نہیں کیا بلکہ وہ یوسف خان کے تیرِ نظر کا شکار ہوگئی ہے۔ بولندرا کے جواب سے تو شیر بانو کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں لیکن اس کی سہیلی کی زبان چلنے لگی۔

"اپنے بھائی کو بتانا......" شیر بانو کی سہیلی نے کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر بولندرا کو مخاطب کیا "کہ اگلے گاؤں میں ایک لڑکی رہتی ہے جو اس کے ساتھ ایسے رشتے میں بندھ چکی ہے جسے محبت کہتے ہیں۔ محبت کا یہ شعلہ اس قدر تیز اور طاقت ور ہے کہ اس نے لڑکی کو جلا کر رکھ دیا ہے اور اس کے گھر والے سمجھنے لگے ہیں کہ اسے پریاں چمٹ گئی ہیں۔"

اس نے ہنستے ہوئے شیر بانو کی طرف اشارہ بھی کر دیا جس سے بولندرا کو علم ہوگیا کہ اس کے بھائی کی محبت میں جلنے

WWW.PAKSOCIETY.COM

والی کوئی اور نہیں بلکہ اس کے سامنے بیٹھی ہے۔" "ضرور بتانا اپنے بھائی کو۔" سہیلی نے بولندرا کو تاکید کی اور شیر بانو کو لے کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگئی۔

اس رات جب یوسف خان گھر آیا تو بولندرا نے نہایت تفصیل کے ساتھ اسے اُن دو لڑکیوں کے آنے کی بابت بتایا۔ یوسف خان نے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا لیکن جب بولندرا نے شیر بانو کی سہیلی کا پیغام یوسف خان کو دیا تو توقع کے برعکس اسے غصہ آ گیا۔ بولندرا کا خیال تھا کہ وہ نہایت دلچسپی سے ان باتوں کو سنے گا لیکن یوسف نے نہ صرف بہن کو مارا بلکہ سختی سے یہ ہدایت بھی کی کہ خبردار.... آیندہ اس قسم کی کوئی فضول بات زبان پر نہ لانا۔

بولندرا، روئی اور چیخی بھی لیکن اس سے زیادہ حیران ہوئی کہ آخر بھائی نے اس طرح کے ردِعمل کا اظہار کیوں کیا ہے لیکن فی الوقت اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا اور نہ ہی وہ کچھ کر سکتی تھی۔ اسی شش و پنج میں نیا دن طلوع ہوگیا اور شیر بانو اپنی سہیلی کے ساتھ مزار سے واپسی پر پھر یوسف خان کے گھر رکی۔ شیر بانو سے زیادہ اس کی سہیلی کو تجسس تھا کہ کل وہ یوسف خان کے نام جو پیغام دے گئی تھی، اس کا ردِعمل کیا ہوا ہے لیکن یہ سب کچھ پوچھنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ بولندرا انہیں دیکھتے ہی چیخ اٹھی۔ اس نے اپنے بھائی کے ہاتھوں پٹنے کا تمام غصہ ان دونوں پر اتار دیا۔ بجائے پانی پلانے یا خاطر مدارات کے، وہ اُن پر بری طرح برسی اور بے عزت کر کے گھر سے نکال دیا۔

شیر بانو کو اس سلوک سے بے حد تکلیف ہوئی۔ بولندرا نے صرف اس کی محبت کا مذاق ہی نہیں اڑایا تھا بلکہ اس کی توہین بھی کی تھی۔ وہ دل ہی دل میں کھولتی وہاں سے روانہ ہوئی لیکن ساتھ ہی ساتھ اس نے یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ آج یوسف خان جب شکار سے واپس آئے گا تو وہ اسے راستے میں روک لے گی اور اس سے پوچھے گی کہ یہ سب کیا ہے؟ وہ اس سے دوٹوک بات کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

لیکن یوسف خان اس صورتِ حال سے بے خبر کڑا مار کے جنگلات میں شکار کھیلنے میں مصروف تھا مگر آج خلافِ معمول بات یہ ہوئی تھی کہ اس کے کزن بھی اس کے ساتھ تھے۔ بنیادی طور پر یوسف خان تنہا شکار کھیلنے کا عادی تھا اور وہ کسی کو بھی ساتھ نہیں لے جانا چاہتا تھا لیکن اس کے چچیرے بھائیوں نے دشمنی ختم کر کے دوستی کی شروعات کا ڈراما رچا کر اسے رضامند کر لیا تھا کہ انہیں بھی شکار پر ساتھ لے چلے۔ یوسف خان نے اس فیصلے سے پہلے اپنے ذہن کے مطابق سوچا بھی تھا۔ جب اس کے والد زندہ تھے تو یوسف خان اور اس کے چچیرے بھائیوں میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر بڑے بڑے جھگڑے معمول کی بات تھی لیکن جب سے والد کا انتقال ہوا تھا اس کے چچیرے بھائیوں نے دشمنی کو خیرباد کہہ دیا تھا اور اب وہ حیلے بہانوں سے یوسف خان سے دوستی اور قربت کی کوششوں میں مصروف تھے۔ شکار پر ساتھ جانے کی ضد بھی ان کے اسی منصوبے کا حصہ تھا۔ وہ یوسف خان کو بتانا چاہتے تھے کہ اب انہوں نے برے دن پیچھے چھوڑ دیے ہیں، دشمنی بھلا دی ہے اور وہ اچھے دوستوں کی طرح اس کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔

چنانچہ یوسف خان نے بھی ماضی کی تمام تلخیوں اور دشمنیوں کو فراموش کر کے ان کا ہاتھ تھام لیا اور خیر سگالی کے طور پر انہیں اپنے ساتھ شکار پر لے آیا۔

لیکن شکار اس طرح نہ ہو سکا جیسے یوسف خان کو توقع تھی۔ وہ اپنے چچیرے بھائیوں کی موجودگی سے خود کو قدرے بے آرام محسوس کر رہا تھا مگر اس کی کوشش تھی کہ ایسی کوئی بات اس کے رویے یا تاثرات سے ظاہر نہ ہونے پائے۔ وہ حتی المقدور دل جمعی کے ساتھ شکار میں مصروف تھا۔ اس کے شکاری کتے بھی اس کے ساتھ پوری جان لڑا رہے تھے۔ اس روز یوسف خان خوب بھاگا اور کتوں نے بھی اچھل اچھل کر جانوروں کو دبوچنے کی کوشش کی لیکن اس بھاگ دوڑ کا کوئی فائدہ نہ ہوا اور دن ضائع ہوگیا۔ شام کے سائے اترنے والے تھے لیکن شکاری خالی ہاتھ تھے۔ یوسف خان اس صورتِ حال پر خاصا پریشان تھا کیونکہ عام طور پر اس کے ساتھ کبھی ایسا نہیں ہوا تھا اور وہ شکار کیے بغیر کبھی گھر نہ جاتا تھا۔

جب یوسف خان اور اس کے ساتھی واپسی کی تیاری کر رہے تھے تو اچانک انہیں ایک جنگلی بھیڑ دکھائی دے گئی۔ یوسف خان نے اپنے کتے اس کے پیچھے ڈال دیے اور خود بھی دوڑ لگا دی۔ یوسف خان، بھیڑ کو زخمی کرنے میں تو کامیاب ہوگیا لیکن شاید وہ خاصی سخت جان تھی کیونکہ زخم کھانے کے باوجود وہ گرنے کے باوجود بھاگتی رہی۔ یوسف خان، اس کے کزن اور کتے بھی بھیڑ کے پیچھے تھے جو جان بچانے کے لیے اپنی قوت صرف کر رہی تھی..... بالآخر وہ اپنی سمت کھو بیٹھی اور ایک گہری کھائی میں جا گری۔

اب یوسف خان اور اس کے چچیرے بھائی کھائی کے کنارے کھڑے سوچ رہے تھے کہ اتنے صحت مند شکار کو کھائی سے کیونکر اور کیسے نکالا جائے؟ یہ چونکہ آج ان کا واحد شکار تھا اس لیے وہ اسے جنگلی درندوں کے لیے چھوڑ کر جانے کے بجائے ہر قیمت پر ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ چچیرے بھائیوں نے جھک کر گہری کھائی میں جھانکا کہ شاید کسی ترکیب سے بھیڑ کو باہر نکالا جا سکے لیکن انہیں اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ کوئی شخص خود کھائی میں اترے اور بھیڑ کو باہر نکالے۔ سب نے پہلے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر یوسف خان سے مخاطب ہوئے۔ انہوں نے چکنی چپڑی باتوں سے یوسف خان کو قائل کر لیا کہ وہ ان کی نسبت زیادہ مضبوط، طاقت ور اور پھرتیلا ہے، اس لیے اسی کو کھائی میں اترنا چاہیے۔ انہوں نے اسے یہ بھی کہا کہ وہ چونکہ ماہر شکاری اور اس علاقے سے اچھی طرح واقف ہے جبکہ خود وہ لوگ آج پہلی مرتبہ شکار کے لیے آئے ہیں اس لیے یہ کام اس سے بہتر اور کوئی نہیں کر سکتا۔

یوسف خان اپنے چچیرے بھائیوں کی چال نہ سمجھ سکا چنانچہ اس نے معمولی سی مزاحمت کے بعد کھائی میں اترنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ اس کی کمر کے گرد رسّا باندھ دیا گیا اور اس کے چچیرے بھائیوں نے اسے آہستہ آہستہ کھائی میں اتارنا شروع کر دیا۔ نیچے سے یوسف خان انہیں اپنی پوزیشن بتاتا اور اوپر سے اس کے بھائی رسّا مزید ڈھیلا کر دیتے۔ جب یوسف خان نے اپنے بھائیوں کو بتایا کہ اب صرف ایک تہائی فاصلہ باقی رہ گیا ہے اور وہ کچھ ہی دیر میں زخمی بھیڑ تک پہنچ جائے گا جو اب صاف دکھائی دے رہی تھی تو اس کے چچیرے بھائیوں نے یک لخت رسّا چھوڑ دیا۔ یوسف خان ایک دلدوز چیخ کے ساتھ کھائی میں جا گرا جبکہ اس کے چچازاد یہ دل میں لیے وہاں سے فرار ہو گئے کہ آج انہوں نے اپنے سب سے بڑے دشمن کو ختم کر دیا ہے۔

دوسری جانب شیر بانو دوٹوک بات کرنے کے لیے اپنے گاؤں میں یوسف خان کی منتظر تھی۔ اسے دور سے جب کتوں کی گھنٹیوں کی آواز سنائی دی تو وہ بھاگ کر گلی میں آئی لیکن یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ کتے اکیلے تھے۔ وہ سب سابق اپنے گھر کی جانب بھاگ رہے تھے لیکن ان کا مالک ان کے ساتھ نہیں تھا۔ کتے اس کے قریب سے گزر گئے اور وہ شش و پنج کے عالم میں وہیں کھڑی رہ گئی۔

اس نے سوچا کہ اگر کتوں کی زبان ہوتی تو وہ یقیناً انہیں روک کر ان سے ان کے مالک کی بابت دریافت کرتی لیکن ایسا نہ تھا۔ وہ مزید کچھ دیر کھڑی انتظار کرتی رہی کہ شاید یوسف خان کہیں پیچھے رہ گیا ہو اور بعد میں آ جائے لیکن اس نے آنا تھا نہ آیا۔

ترلاندی پہنچ کر کتوں نے گویا آسمان سر پر اٹھا لیا۔ وہ بری طرح بھونک رہے تھے اور بار بار کڑا مار کی طرف منہ اٹھاتے تھے۔ شور سن کر یوسف خان کی ماں ننگے پاؤں اور ننگے سر گھر سے باہر نکل آئی۔ کتوں کا واویلا سن اور ان کی بے تابی دیکھ کر اسے صورتِ حال سمجھنے میں ذرا دیر نہ لگی۔ اس کی چھٹی حس نے اسے بتا دیا تھا کہ اس کے بیٹے کے ساتھ کچھ ہو گزرا ہے۔ کتوں نے اپنی مالکن کو دیکھ کر زیادہ زور شور سے بھونکنا شروع کر دیا۔ ان کا رخ کڑا مار کی طرف ہی تھا جس سے ماں کو یہ سمجھنے میں ایک لمحہ بھی نہ لگا کہ یوسف خان جنگل میں ہی کسی مشکل یا مصیبت کا شکار ہو گیا ہے۔ کتوں نے کڑا مار کی طرف بھاگنا شروع کر دیا جبکہ یوسف خان کی ماں اور بہن بولندرا ان کے پیچھے پیچھے تھیں۔

لوگ رک رک کر دیکھ رہے تھے کہ یہ دو عورتیں کیوں پاگلوں کی طرح کتوں کے پیچھے بھاگی چلی جا رہی ہیں؟ بعض نے یوسف خان کی ماں اور بہن سے دریافت بھی کیا اور انہوں نے اپنی آہ و بکا میں کوئی جواب بھی دیا لیکن سوائے یوسف خان کے لوگوں کی سمجھ میں کچھ نہ آ سکا۔ انہیں صحیح صورتِ حال کا علم بہرحال نہ ہو سکا تھا۔

کڑا مار کا راستہ چونکہ ایک ہی تھا اس لیے کتوں کی گھنٹیوں کی آواز جب شیر بانو کے کانوں میں پڑی تو وہ پھر بے قرار ہو کر باہر نکل آئی۔ اس مرتبہ کتے بھونک بھی رہے تھے جبکہ پہلے سے بھی زیادہ عجیب منظر اس کے سامنے تھا۔ یوسف خان کی ماں اور بہن ننگے سر اور ننگے پاؤں، کتوں کے پیچھے بھاگ رہی تھیں۔ شیر بانو کا دل دھک سے رہ گیا۔ اب اس امر میں کوئی شبہ نہ رہ گیا تھا کہ یوسف خان کسی مشکل سے دوچار تھا۔ صورتِ حال ایسی نہیں تھی کہ شیر بانو، یوسف خان کی ماں اور بہن کو روک کر کچھ پوچھ سکتی۔ ان دونوں کو اپنا ہوش نہیں تھا تو شیر بانو کو کیا بتاتیں۔ چنانچہ اس نے بھی کچھ سوچے سمجھے بغیر ان کے پیچھے دوڑ لگا دی۔

شیر بانو کا گاؤں چونکہ کڑا مار کے عین متصل تھا چنانچہ وہاں کے کچھ لوگ بھی ان کے ساتھ ہو لیے کیونکہ وہ بھی سمجھ

WWW.PAKSOCIETY.COM

گئے تھے کہ کوئی مصیبت میں ہے جبکہ یوسف خان کے اپنے گاؤں کے کچھ نوجوان اور بوڑھے بھی ان سے آملے تھے۔ اس طرح یوسف خان کی مدد کو جانے والوں کی تعداد میں اچھا خاصا اضافہ ہوگیا تھا۔

بھونکتے ہوئے کتے ایک گہری کھائی کے کنارے جاکر رک گئے جس سے اندازہ ہوا کہ ان کا مالک یہیں گرا ہے۔ یوسف خان کی ماں اور بہن نے بھی مدد کو پہنچنے والے لوگوں کو بتایا کہ یوسف خان کسی حادثے کا شکار ہوگیا ہے۔ تاریکی پھیل چکی تھی لیکن اس کے باوجود کئی لوگ متبادل راستوں سے کھائی میں اتر گئے تاکہ یوسف خان کو تلاش کیا جاسکے۔ خاصی کوششوں کے بعد انہیں کھائی کی مسطح ڈھلوان پر اُگے درخت میں اٹکا انسانی جسم دکھائی دے گیا جس میں بہ ظاہر زندگی کی کوئی رمق نہیں تھی۔ دیہاتیوں نے قریب جاکر دیکھا تو وہ یوسف خان ہی تھا لیکن شدید زخمی حالت میں۔ اس کی کمر کے گرد رسّا بہ دستور لپٹا ہوا تھا اور محسوس ہوتا تھا کہ کسی نے اسے جان سے مارنے کے لیے کھائی میں گرایا لیکن درخت کے راستے میں آجانے کی وجہ سے اس کی زندگی بچ گئی۔

کھائی کے کنارے کھڑے لوگوں نے اوپر سے مزید رسّے نیچے گرائے جن کی مدد سے یوسف خان کو طویل جدوجہد کے بعد بے ہوشی کے عالم میں اوپر کھینچ لیا گیا۔ یوسف خان کی ماں اور بہن چیخیں مار کر اس کے بے ہوش بدن پر گر گئیں جبکہ شیر بانو نے بھی زاروقطار رونا شروع کردیا۔ ساتھ موجود لوگوں نے انہیں دلاسا دیا اور بتایا کہ یوسف خان زندہ ہے اور اسے فوری ترلاندی لے جانے کا انتظام کیا جائے تاکہ اس کے زخموں کی مرہم پٹی ہوسکے۔

لوگ اس مقصد کے لیے درختوں کی موٹی ٹہنیوں اور رسیوں کی مدد سے ایک اسٹریچر تیار کرنے میں مصروف ہوگئے کیونکہ کسی ایک شخص کے لیے یوسف خان جیسے کڑیل جوان کو اٹھا کر ترلاندی لے جانا ممکن نہ تھا۔ یوسف خان کی ماں اور بہن بھی ان کی مدد کرنے لگیں لیکن شیر بانو نے ایسی حرکت کی جس کا گمان بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یوسف خان کو ایک چٹان پر لٹا دیا گیا تھا جبکہ اس کے زخموں سے مسلسل خون رِس رہا تھا۔ شیر بانو اسی چٹان پر بیٹھ گئی اور اپنے محبوب کا سر اپنے زانو پر رکھ کر اس کے چہرے پر لگی گرد جھاڑنے لگی اور اس کے زخم اپنے دوپٹے کے پلو سے صاف کرنے لگی۔ یوسف خان کی ماں، بہن اور موقعے پر موجود تمام لوگوں نے اسے حیرت سے دیکھا مگر اس وقت سب خاموش رہے۔

لیکن یوسف خان کو نیم مردنی کی کیفیت میں ترلاندی بھیجنے کے بعد جب شیر بانو اپنے گھر پہنچی تو یہ خبر اس سے پہلے اس کے باپ کو مل چکی تھی کہ وہ ایک اجنبی شخص کا سر گود میں رکھے بیٹھی تھی۔ باپ شدید غصے میں اور اسے جان سے مارنے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ شیر بانو کی خوش قسمتی یہ تھی کہ یوسف خان کی بہن تو اپنے زخمی بھائی کے ساتھ ترلاندی چلی گئی تھی لیکن اس کی ماں شیر بانو کو چھوڑنے اس کے ساتھ آئی تھی کیونکہ کھائی کنارے یوسف خان کی ماں اور بہن کے علاوہ وہ اکیلی عورت تھی اور یوسف خان کی ماں نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس طرح رات گئے تنہا گھر جائے۔

چنانچہ جب شیر بانو کا باپ اسے واقعی قتل کرنے پر تُل گیا تو یوسف خان کی ماں نے فوراً شیر بانو کا ہاتھ تھام لیا۔

"آپ اسے کچھ نہیں کہہ سکتے بھائی!" یوسف خان کی ماں نے نہایت احترام کے ساتھ شیر بانو کے والد کو مخاطب کیا "اب شیر بانو ہماری ہے۔ یہ یوسف خان کی عزت بن چکی ہے اور میں بہت جلد اپنے گاؤں کے بڑوں کے ساتھ اس کا رشتہ مانگنے آپ کے پاس آؤں گی اور پھر اسے باعزت طور پر بیاہ کرلے جائیں گے...... نہایت دھوم دھام کے ساتھ۔"

شیر بانو نے نہ صرف تشکرانہ نگاہوں سے اپنی ہونے والی ساس کو دیکھا بلکہ اس کا سر بھی فخر سے بلند ہوگیا کیونکہ اس کی محبت جیت گئی تھی۔ شیر بانو کے والد کا غصہ بھی فوری ختم ہوگیا اور اس نے شیر بانو کو یوسف خان کی ماں کی خاطر تواضع کی ہدایت کی، لیکن اس نے یہ کہہ کر معذرت کرلی کہ اس کا اپنے زخمی بیٹے کے پاس پہنچنا زیادہ ضروری ہے۔

یوسف خان کو اس کے اپنے اور شیر بانو کے گاؤں کے لوگوں نے گھر پہنچا دیا تھا۔ اسی وقت طبیب کو بلالیا گیا۔ چوٹیں خاصی گہری تھیں لیکن صد شکر کہ اس کی جان بچ گئی تھی۔ کچھ وقت یوسف خان کی چوٹیں ٹھیک ہونے میں لگا اور چند ہفتے کھوئی ہوئی توانائی بحال ہونے میں لگ گئے۔ اس عرصے میں یوسف خان کی ماں نے شیر بانو کے والد سے کیا وعدہ بھی پورا کردیا۔ وہ اپنے گاؤں کے بزرگوں کے ساتھ شیر بانو کے گھر گئی اور اس کا رشتہ مانگ لیا۔ باپ نے کوئی اعتراض نہیں کیا جبکہ شیر بانو کی تو دلی خواہش یہی تھی۔

اس کے ساتھ ہی شادی کی تیاریاں شروع کردی گئیں چنانچہ جیسے ہی طبیب نے یوسف خان کو مکمل صحت یاب قرار دیا۔ ترلاندی کے باسی اس کی برات لے کر شیر بانو کے گھر پہنچ گئے اور نہایت طمطراق سے اسے بیاہ کر لے آئے۔ شادی کا جشن.... کئی روز تک جاری رہا جس میں دور دراز سے آئے مہمانوں کی کثیر تعداد نے شرکت کی، لیکن توقعات کے برعکس یوسف خان نے شادی کی تقریبات میں کوئی دلچسپی نہ لی اور نہ ہی اپنی خوبصورت دلہن کو چھوا۔ اس پر صرف انتقام کا بھوت سوار تھا۔ اس کے چچا زادوں نے اس کے ساتھ جو کچھ کیا تھا وہ ان سے اس کا بدلہ لینے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے بدلے کے جنون میں ہر چیز سے منہ موڑ لیا تھا لیکن سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ بدلہ کیسے لے؟

وہ گھر آتا تو اسے محسوس ہوتا کہ دیواریں اس سے پوچھ رہی ہیں کہ تم اتنے بزدل کب سے ہوگئے کہ خود سے کی گئی زیادتی کا بدلہ نہیں لے پارہے۔ باہر نکلتا تو پرندوں کی چہچہاہٹ میں بھی اسے اپنے لیے لعن طعن محسوس ہوتی۔ اسے یوں لگتا جیسے چرند پرند بھی اس کی مردانگی پر شبہ کرنے اور اسے بزدلی کا طعنہ دینے لگے ہیں۔ وہ درختوں کے پتوں کو بھی خوف زدہ نگاہوں سے دیکھتا کہ کہیں یہ بھی کوئی سوال نہ کر بیٹھیں۔

بالآخر حالات سے ہار مان کر یوسف خان نے ایک دن چپکے سے گاؤں چھوڑ دیا۔

یوسف خان کو معلوم ہوا تھا کہ اس کے دشمن یعنی چچا زاد بھائی اسے کھائی میں دھکا دینے کے بعد دہلی فرار ہوگئے ہیں چنانچہ اس نے بھی دہلی کا رخ کیا۔ اپنی حسین بیوی، بوڑھی ماں اور چھوٹی بہن کو اس نے بتا دیا تھا کہ اس کی واپسی کی امید نہ رکھی جائے کیونکہ وہ انتقام کی اندھی راستوں کی جانب جارہا ہے۔ اگر وہ انتقام میں کامیاب رہا تو زندہ لوٹ آئے گا ورنہ اسی کوشش میں جان دے دے گا۔

شیر بانو نے بہت آنسو بہائے، ماں نے منتیں کیں اور بہن نے واسطے دیے لیکن یوسف خان پر ایک ہی دُھن سوار تھی کہ کسی نہ کسی طرح اپنے دشمنوں سے بدلہ لے، چنانچہ وہ کسی کی بھی پروا کیے بغیر تینوں کو بے آسرا چھوڑ کر چلا گیا۔

دوسری جانب اس کے دشمن بھی حالات سے مکمل باخبر تھے۔ اِدھر یوسف خان نے گاؤں چھوڑا اور اُدھر وہ

آنکھیں

آنکھیں کبھی کبھی گزرا ہوا زمانہ بھی دکھا دیتی ہیں۔ جو ہو چکا وہ پھر سے ہونے لگتا ہے، جو گزر گیا وہ پھر سے گزرنے لگتا ہے۔ جس سانحے پر ہم رو چکے ہوں، اس پر پھر رونے کو جی چاہتا ہے۔ یہ آنکھوں کا کمال ہے کہ ایک خاص وقت میں ایک خاص منظر دکھا دیتی ہیں اور پھر پُرانے نغمات یاد آجاتے ہیں۔ لیکن کیا کیا جائے...... آنکھوں کی تمام کوششیں خاموش ہوجاتی ہیں۔ عہدِ جنوں ہی نہیں ہوتا، لوگ مطلب اور منفعت کی دنیا میں گم ہوجاتے ہیں۔ کون آتا ہے، درد کے صحرا میں اور عہدِ جنوں بھی تو ایک یادگار ہی تو دے گیا...... ایک مینار، اس نے ہمیں شرمندہ تو نہیں کرنا۔ ہم شرمندہ ہی کیوں ہوں...... چلو ہم آنکھیں بند کرلیتے ہیں...... لیکن......

رہ گئی کان میں صدائے جرس
کارواں کا غبار آنکھوں میں

اقتباس: حرف حرف حقیقت از واصف علی واصف

مرسلہ: ملک ثاقب شاد تنولی، ایبٹ آباد

لوگ اپنے گھروں کو واپس آگئے۔ اب معاملہ کچھ یوں تھا کہ یوسف خان کے دشمن تو چین اور سکون سے اپنے گھروں میں رہ رہے تھے لیکن یوسف خان دربدر تھا۔ وہ جنہیں تلاش کرتا پھر رہا تھا وہ اپنی ہی پناہ گاہوں میں موجود تھے لیکن یوسف خان کو اس کی کوئی خبر نہ تھی۔

اس طرح کئی سال بیت گئے۔ یوسف خان کی کوئی خیر خبر آئی نہ وہ خود گھر لوٹا۔ اس کی طویل غیر حاضری کو بنیاد بنا کر اس کے چچا زادوں نے اس کی موت کا اعلان کردیا اور یوسف خان کی جائداد پر قبضہ کرلیا۔ یوسف خان کی ماں اور بہن بہت چیخی چلائیں اور گاؤں کے بعض بڑوں کو بھی اس معاملے میں مداخلت کے لیے کہا لیکن دشمن چونکہ طاقتور ...اور بارسوخ تھے اس لیے کسی کی کوئی بات نہ مانی گئی اور کل تک جو کچھ ان کا اپنا تھا' دیکھتے ہی دیکھتے پرایا ہوگیا۔

شیر بانو اور اس کے شوہر کے درمیان چونکہ ازدواجی تعلقات قائم نہ ہوئے تھے اس لیے اس کی حالت سب سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

قابلِ رحم اور حیثیت دو کوڑی کی بھی نہ تھی کیونکہ کوئی اسے یوسف خان کی بیوی تسلیم کرنے کو تیار ہی نہ تھا۔ اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے اس کا باپ اسے واپس اپنے گھر لے جانے کے لیے آیا، لیکن شیر بانو نے انکار کردیا۔ اس کے باپ کا کہنا تھا کہ وہ آخر کب تک ایک مردہ شخص کے نام پر بیٹھی رہے گی؟ لیکن شیر بانو کا اصرار تھا کہ یوسف خان زندہ ہے۔ اس نے مکمل اعتماد کے ساتھ اس یقین کا اظہار کیا کہ اگر یوسف خان خدانخواستہ اس دنیا میں نہ ہوتا تو اسے کسی نہ کسی طرح اس کی خبر ضرور ہوجاتی۔ اسے بھروسا تھا کہ یوسف خان لازمی لوٹے گا۔

لیکن اندر سے وہ ٹوٹ گئی تھی۔ جو کچھ ہو رہا تھا وہ اس سے بے حد دل گرفتہ تھی۔ وہ یہ سوچ سوچ کر بے تحاشا روتی تھی کہ اس نے جس شخص سے اپنی زندگی سے بڑھ کر پیار کیا وہ اسے یوں بے یارومددگار چھوڑ گیا تھا۔ وہ ساری ساری رات آہ و بکا کرتی رہتی اور سارا سارا دن اپنے محبوب کے انتظار میں گزار دیتی لیکن اس کا محبوب لوٹ کر نہ آیا۔

شیر بانو کے بزرگوں نے ابتدا میں نہایت پیار، محبت اور شفقت سے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ یوسف خان کے غم میں آہ وزاری نہ کیا کرے کیونکہ وہ مر چکا ہے اور مرنے والوں کے لیے ساری زندگی نہیں رویا جاسکتا۔ اور ساتھ ہی مناسب رشتے کی تلاش شروع کردی کیونکہ وہ بے انتہا خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ ابھی تک کنواری تھی اور کوئی بھی شخص اسے بیوی بنا کر پلکوں پر بٹھانے کے لیے تیار ہوسکتا تھا۔

پہلے پہل تو ان الفاظ میں نرمی اور لہجوں میں شفقت تھی لیکن کچھ عرصے بعد نصیحتوں نے طعنوں کا روپ دھار لیا۔ اب اس کے بزرگ کہنے لگے تھے کہ انہوں نے اس کے جذبات کے ہاتھوں مجبور ہوکر ایک ایسے غیر ذمے دار اور بے توقیر شخص کے ساتھ بیاہ دیا تھا جو اس کی قدر کرنے کے بجائے اسے حالات اور دشمنوں کے رحم وکرم پر چھوڑ کر فرار ہوگیا تھا۔ انہوں نے شیر بانو پر سختی شروع کردی اور متنبہ کردیا کہ اب وہ اپنی مرضی کریں گے اور اسے کسی ایسے شخص کے ساتھ بیاہیں گے جو اسے عزت، تحفظ اور چھت دے سکے۔

ہر ایسے موقعے پر شیر بانو واویلا کرتی، شور مچاتی، روتی دھوتی اور شادی سے انکار کردیتی۔ اس کے بزرگوں نے اسے رضامند کرنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ شیر بانو کے والد نے جب دیکھا کہ اس پر دھمکیوں، پیار و محبت کا کوئی اثر نہیں ہوا تو ایک دن اس نے اپنی پگڑی بیٹی کے قدموں میں رکھ دی۔

”میں ایک باعزت شخص ہوں بیٹی!“ اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر شیر بانو کو مخاطب کیا ”اور میں نے ساری زندگی ایک عزت دار اور خود دار انسان کی طرح گزاری ہے لیکن اب بوڑھا ہوگیا ہوں اور نہیں جانتا کہ کب مر جاؤں۔ اگر میں مرگیا تو تم ہی بتاؤ کہ کون تمہاری حفاظت کرے گا؟ تمام بستی مجھ پر ہنس رہی ہے اور مجھ پر لعن طعن کررہی ہے۔ تم میری بیٹی ہو، اس لیے میری عزت کو یوں نہ اچھالو......اور میری پگڑی کا خیال کرو......“

شیر بانو نے باپ کی پگڑی فوراً زمین سے اٹھائی اور اس پر لگی مٹی جھاڑ کر دوبارہ باپ کے سر پر رکھ دی۔

”ایسے مت کہو بابا!“ شیر بانو نے باپ کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے ”میں نہیں جانتی کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے اور میرا شوہر کہاں ہے؟ اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ کس حال میں ہے لیکن میں بھی تمہاری عزت و آبرو کو داغ دار نہیں کرسکتی اور نہ میں نے آج تک کیا ہے۔ میری شادی تم نے اپنے ہاتھوں کی تھی لیکن وہ مجھے چھوڑ کر اپنا انتقام لینے چلا گیا۔ اس تمام عرصے میں گو مجھے اس کا کوئی پیغام نہیں ملا لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ زندہ ہے۔ یہ درست ہے کہ میں اس کے لیے روتی ہوں کیونکہ مجھے اس سے محبت ہے۔ میری درخواست ہے کہ مزید ایک سال مجھے اپنی محبت کا ماتم کرلینے دو، یہ ایک سال پورا ہوجائے تو تمہیں اجازت ہے کہ جو چاہو کرو۔ میں تمہیں اختیار دیتی ہوں کہ میرے لیے جیسا چاہے رشتہ تلاش کرو۔ میں تمہاری مرضی کے مطابق شادی کے لیے تیار ہوں......بس ایک سال......“

”تم نے مجھے خوش کردیا بیٹی!“ باپ نے شیر بانو کو سینے سے لگالیا۔ اسے بیٹی کے الفاظ سے دلی خوشی ہوئی تھی۔ ”اب میں برادری میں پھر سے سرخرو ہوجاؤں گا جو مجھے اٹھتے بیٹھتے طعنے دیتی ہے۔ میں یہ تکلیف برداشت نہیں کرسکتا کہ تم اپنے بال ایک ایسے غیر ذمے دار اور بے وقعت انسان کے انتظار میں سفید کرلو جس کے زندہ ہونے یا مرنے کی کوئی خبر نہیں۔ کون جانے کہ وہ واقعی مرگیا ہو یا کسی شرمندگی کی وجہ سے سامنے نہ آرہا ہو۔ مجھے یہ مت کہو کہ وہ واپس آرہا ہے اور تم اس کا انتظار کررہی ہو۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ اپنے گاؤں کے کسی خوبصورت جوان مرد کو پسند کرو اور اس کے ساتھ ہنسی خوشی اپنی زندگی جیو......

انتظار؟ اگر تمہیں ایک سال کی مہلت چاہیے تو ٹھیک ہے۔ تم یہ ایک سال گزار لو لیکن اس سے اور اس کی یادوں سے چھٹکارا حاصل کرلو۔“

شیر بانو نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ اپنے باپ سے ایک سال کی مہلت لے لی تھی۔ اس کی دلی خواہش یہی تھی کہ اس عرصے میں یوسف خان لوٹ آئے اور وہ اپنی باقی زندگی اسی کی قربت میں گزارے ورنہ باپ کو ایک سال انتظار کرنے کا کہنے کی اس کے سوا کوئی وجہ نہ تھی۔

جبکہ یوسف خان، پٹھانوں کی سرزمین اور شیر بانو کی سوچوں سے بہت دور ایک اجنبی دیس میں سفر کررہا تھا۔ وہ ایک ایسے گاؤں میں پہنچا تھا جہاں ڈاکوؤں کا خوف بری طرح لوگوں کے ذہنوں پر مسلط تھا۔ یہ ڈاکو قریبی جنگل میں روپوش تھے اور وقتاً فوقتاً حملہ کرکے دیہاتیوں کا نہ صرف سازوسامان لوٹ لیتے بلکہ مزاحمت کرنے والوں کو جان سے بھی مار دیتے تھے۔ جس رات یوسف خان وہاں پہنچا، اس رات بھی گاؤں کے مکینوں کو کچھ ایسی ہی صورتِ حال درپیش تھی۔ پوچھنے پر انہوں نے یوسف خان کو بتایا کہ ان کے کئی جوان ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارے جاچکے ہیں جبکہ باقی لوگ خوف زدہ ہیں کہ کسی وقت ان کی باری بھی آسکتی ہے۔

یوسف خان نے جب یہ دیکھا کہ ان کی حفاظت کا کوئی معقول بندوبست نہیں تو اس نے نہایت بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی خدمات پیش کردیں اور وعدہ کیا کہ ان کے لیے اگر اسے اپنی جان بھی دینی پڑی... تو اس سے دریغ نہیں کرے گا۔ دیہاتیوں کے لیے ظاہر ہے کہ یہ غیبی مدد تھی چنانچہ انہوں نے یوسف خان کی پیش کش بہ خوشی قبول کرلی۔

اتفاق سے اسی رات ڈاکوؤں نے گاؤں پر ہلّا بول دیا۔ یوسف خان نے تمام بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کو محفوظ جگہوں پر چلے جانے کا کہا اور خود تلوار سونت کر ڈاکوؤں کے مقابلے پر آگیا۔ ڈاکو بے شمار اور یوسف خان تنہا تھا لیکن وہ اس بہادری سے لڑا کہ ڈاکو اپنے کئی ساتھیوں کی لاشیں چھوڑ کر فرار پر مجبور ہوگئے۔ اپنے گھروں میں دبکے ہوئے شہری اس پٹھان نوجوان کی بہادری، دلیری اور تلوار بازی دیکھ کر حیران رہ گئے۔ جن ڈاکوؤں پر وہ ایک طویل عرصے سے قابو نہ پاسکے تھے انہیں اکیلے آدمی نے مار بھگایا تھا۔ یوسف خان ایک ہی رات میں پورے گاؤں کی آنکھ کا تارا بن گیا۔ وہ محض رات بھر قیام کے لیے یہاں آیا تھا لیکن گاؤں والوں نے کئی روز کے لیے اسے وہاں سے ہلنے نہ دیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہوا کہ یوسف خان کی بہادری کی خبر، داستان بن کر جنگل کی آگ کی طرح قرب وجوار میں پھیل گئی اور دور ونزدیک سے لوگ گروہ در گروہ اس سے ملنے اور اسے دیکھنے آنے لگے۔

انہی دنوں ہندوستان کا مغل بادشاہ، شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر دورانِ سفر اس گاؤں کے قریب سے گزرا تو اسے یوسف خان کی بہادری کا قصہ سنایا گیا۔ اکبر، اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے یوسف خان کو فوری اپنے حضور پیش کرنے کے احکامات دے دیے۔ شاہی ہرکارے وقت ضائع کیے بغیر مذکورہ گاؤں پہنچے اور یوسف خان کو ساتھ لے کر بادشاہ کے حضور حاضر ہوگئے۔ یوسف خان، بادشاہِ وقت کے سامنے کورنش بجا لایا اور مزید احکامات کے لیے باادب کھڑا ہوگیا لیکن اکبر کے ذہن میں تو کچھ اور ہی تھا۔

مغل بادشاہ سنے سنائے قصے کے بجائے یوسف خان کی بہادری اور مہارت اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے ایک تلوار یوسف خان کی طرف اچھالی جسے اس نے دستے سے تھام لیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ تلوار پھینکے جانے کا مقصد پوچھتا، دربارِ اکبری کا ایک ماہر تلوارزن اس کے مقابلے پر آگیا۔ یوسف خان پٹھان تھا اور تیر وتلوار سے کھیل کر ہی جوان ہوا تھا چنانچہ اس نے نہایت آسانی سے مقابل پر قابو پالیا۔ یوسف خان نے اسے قتل نہیں کیا کیونکہ اس سے اس کی کوئی دشمنی نہیں تھی بلکہ یہ تو اس کی مہارت کا امتحان تھا۔ اس نے تلوار مخالف کے سینے پر رکھی اور سوالیہ نگاہوں سے بادشاہ کو دیکھنے لگا۔

اکبر نے تالیاں بجا کر اس کے ہنر وفن کی داد دی اور درباریوں کے نعرۂ ہائے تحسین کی گونج میں یوسف خان کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ یوسف خان نے بادشاہ کے سامنے پہنچ کر گردن جھکادی۔ اس نے یوسف خان کو ایک قیمتی ہار انعام کے طور پر دیا۔ خلعت سے نوازا اور سپاہیوں کے ایک بڑے دستے کا سالار مقرر کردیا۔ یوں دیکھتے ہی دیکھتے ایک چھوٹے سے گاؤں کا معمولی نوجوان بادشاہ کا

WWW.PAKSOCIETY.COM

بااعتماد سالار بن گیا۔

اب یوسف خان تھا اور شہنشاہ اکبر کے احکامات۔ پہلے تو اسے دور و نزدیک متعدد فوجی مہمات پر بھیجا جہاں سے وہ ہمیشہ کامیاب و کامران لوٹا لیکن پھر اپنی خوبصورتی اور بہادری کی وجہ سے وہ دربار میں اس قدر مقبول ہوا کہ اکبر نے اسے ہمیشہ دربار میں حاضر رہنے کے احکامات جاری کردیے چنانچہ وہ اپنا سارا وقت بادشاہ کی صحبت میں گزارنے لگا۔

یوسف خان کی حیثیت اب درباری امیر کی سی تھی۔ شہنشاہ اکبر کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اپنے درباری امرا کا نہایت قریب سے مشاہدہ کیا کرتا تھا چنانچہ اس نے یوسف خان کو بھی اپنی کسوٹی پر پرکھنا شروع کردیا۔ بادشاہ کے لیے اس کی شخصیت کا یہ رخ خاصا حیرت انگیز تھا کہ وہ مبالغے کی حد تک بہادر تھا لیکن درباری معاملات، محفلوں اور تقریبات میں اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ یوسف خان فطرتاً ایک اداس شخص تھا۔ وہ تنہائی پسند تھا۔ اکثر و بیشتر وہ سوچوں میں ڈوبا رہتا۔ بعض اوقات تاسف سے بھرپور گہری گہری سانسیں لیتا اور یوں خلاؤں میں گھورتا رہتا جیسے کسی کھو جانے والی شے کو تلاش کررہا ہو۔

اکبر نے پہلے تو اپنے دیگر امرا سے کہا کہ وہ اس بات کی کھوج لگائیں کہ معاملہ کیا ہے لیکن بدقسمتی سے یوسف خان کا کوئی دوست نہیں تھا اس لیے تمام امرا نے بادشاہ کے سامنے اپنی ناکامی کا اعتراف کرلیا کہ وہ یوسف خان کی حالت کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ شہنشاہ اکبر نے تھک کر خود یوسف خان کو طلب کرلیا تاکہ اس کی اداسی اور الگ الگ رہنے کی وجہ پوچھ سکے۔

بادشاہ کے سوالوں کے جواب میں یوسف خان نے بتایا کہ ایک زمانے میں وہ اپنے علاقے کا نامور شکاری تھا۔ کیسے شکار پر جایا کرتا تھا اور پھر کس طرح ایک نہایت حسین اور دل رُبا دوشیزہ اس کی محبت میں گرفتار ہوگئی۔ یوسف خان نے بادشاہ کو اپنے چچازادوں سے دشمنی اور ان کی جانب سے اس کی جان لینے کی کوشش سے آگاہ کیا۔ یوسف خان کا کہنا تھا کہ وہ اپنے چچازادوں سے انتقام کی خاطر اپنی بیوی کو بغیر چھوئے گھر سے نکل آیا تھا۔ وہ اکثر خوابوں میں اپنی ماں اور بہن کو اپنے لیے پریشان دیکھتا ہے۔ اسے بین کرتی شیر بانو بھی نظر آتی ہے اور وہ جاگتے میں بھی یہی سوچتا رہتا ہے کہ شیر بانو اب کیسی اور کہاں ہوگی؟ اس کی کسی اور جگہ شادی کردی گئی ہوگی یا وہ اب بھی اس کی منتظر ہوگی؟ لیکن پانچ سال سے وہ اپنے گاؤں نہیں گیا اور وہ نہیں جانتا کہ اس کی ماں، بہن اور شیر بانو کس حال میں ہوں گی۔ وہ اپنے چچازادوں سے انتقام کے لیے گھر سے نکلا تھا لیکن اس طویل عرصے میں وہ بھی اسے نہیں مل سکے۔

یوسف خان نے بادشاہ کو ایک ٹوپی بھی دکھائی جو شیر بانو نے اپنے ہاتھوں سے اس کے لیے بُنی تھی۔ مغل بادشاہ اس کی داستان سے بے حد متاثر ہوا اور اس نے یوسف خان کو ہدایت کی کہ یہ اس کے گاؤں واپسی کا مناسب ترین وقت ہے تاکہ ایک جانب تو وہ ذہنی طور پر سکون اور اطمینان حاصل کرسکے جبکہ دوسری طرف ان عورتوں کی خبر گیری بھی کرسکے جنہیں وہ بے یار و مددگار چھوڑ آیا تھا۔ شہنشاہ اکبر نے یوسف خان کو یہ اجازت بھی دی کہ وہ جس قدر چاہے، سپاہی اپنے ساتھ لے جاسکتا ہے۔

اور پھر ایک دن یوسف خان پٹھانوں کی سرزمین کو لوٹنے کے لیے دہلی سے روانہ ہوگیا۔ یہ سرزمین اس کی اپنی دھرتی بھی تھی۔ شاہی فوج کا ایک بڑا دستہ اس کے ہمراہ تھا جسے بادشاہ کی طرف سے یہ احکامات دیے گئے تھے کہ یوسف خان کی ہر ہدایت کو بادشاہ کا حکم سمجھ کر اس پر عمل کیا جائے۔ یوسف خان اور اس کے سپاہیوں نے دن رات سفر کیا اور ہفتوں کا فاصلہ دنوں میں طے کرکے ترلاندی پہنچ گئے۔ یوسف خان اور اس کے ساتھیوں کی آمد کی کسی کو خبر نہ تھی اور نہ ہی کسی کو توقع تھی کہ اب وہ لوٹ کر آئے گا۔ کہا جاتا ہے کہ یوسف خان نے اپنے سپاہیوں کے ہمراہ ایک رات دوبیاں میں قیام کیا اور اگلی صبح فوج کو وہیں چھوڑ کر تنہا اپنے گاؤں کو روانہ ہوا۔

وہ سارا دن تو اس نے گاؤں اور اس کے گردونواح کے حالات کا جائزہ لینے میں گزارہ اور مغرب کی نماز اپنے گاؤں کی واحد مسجد میں ادا کی لیکن یہ دیکھ کر اسے حیرت ہوئی کہ کسی ایک شخص کی آنکھوں میں بھی اس کے لیے شناسائی کی رمق تک نہ تھی۔ وہ اپنے گھر کے سامنے سے بھی گزرا لیکن دل مسوس کر رہ گیا کیونکہ اب وہاں رونقوں کے ڈیرے نہیں بلکہ ویرانیوں کا راج تھا۔ اس نے ایک راہ چلتے شخص کو روک کر دریافت کیا کہ اس گھر میں بسنے والوں پر کیا بیتی۔

اس آدمی نے مشکوک انداز میں یوسف خان کو دیکھا۔ "کیا تم ان لوگوں کو جانتے ہو؟" وہ یوسف خان کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

یوسف خان اس سے نظریں چرا گیا لیکن اس نے یہ کہہ کر اس آدمی کو مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ سالوں پہلے وہ سفر کے دوران ایک بار یہاں رکا تھا۔ گھر کے مکین اس قدر خوش اخلاق اور مہمان نواز تھے کہ انہوں نے نہ صرف گرم گرم کھانے اور قہوے سے اس کی تواضع کی بلکہ سونے کے لیے جگہ بھی مہیا کی تھی۔

اس شخص نے تاسف سے سر ہلایا "اس گھر کا سربراہ نوجوان سالوں پہلے ہندوستان چلا گیا تھا لیکن کوئی نہیں جانتا کہ اس پر کیا بیتی۔" اس نے دوبارہ یوسف خان کو غور سے دیکھا لیکن اس مرتبہ بھی وہ اسے پہچان نہ پایا تھا۔ "اس کے چچازادوں نے جائداد پر قبضہ کرکے نہ صرف مکینوں کو بے دخل کردیا بلکہ نوجوان کی ماں اور بیٹی کو اپنے گھر کے کام کاج کے لیے رکھ لیا۔ اس شخص کی بیوی بے حد خوبصورت تھی لیکن جب وہ نوجوان غائب ہوا تو اس کی بیوی کے والدین لڑکی کو واپس اپنے گھر لے گئے۔" اس شخص نے چند ثانیوں کے لیے رک کر کچھ سنا۔ دور کہیں سے ڈھول بجنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ "یہ ڈھول بجنے کی آوازیں سن رہے ہو؟" اس آدمی نے ایک ہاتھ اٹھا کر آواز کی سمت اشارہ کیا۔ یوسف خان نے بھی آوازیں سنیں اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ "آج اس لڑکی کی دوبارہ شادی ہورہی ہے۔" یوسف خان کا دل دھک سے رہ گیا لیکن وہ بولا کچھ نہیں۔ "یہ ڈھول اسی کی شادی کی خوشی میں بجائے جارہے ہیں۔"

"اس کی شادی کس سے ہورہی ہے؟"

اب وہ شخص چونکا "تمہیں اس سے کیا؟" وہ قدرے تیز لہجے میں بولا "تم کون ہو اور اس طرح کے سوال کیوں کررہے ہو؟"

یوسف خان کا جی چاہا کہ تلوار بے نیام کرکے ابھی اس شخص کو بتادے کہ وہ کون ہے لیکن اس نے اپنے غصے پر قابو پالیا اور اسے وہیں چھوڑ کر دوسری سمت چل دیا۔

اب اس کا رخ شیر بانو کے گاؤں کی جانب تھا۔ گاؤں میں واقعی بے حد رونق تھی۔ جگہ جگہ چراغ جلائے گئے تھے اور کم و بیش ہر گلی میں لڑکوں کی ٹولیاں رقص کررہی تھیں۔ وہ لوگ پشتو میں خوشی کے گیت بھی گا رہے تھے جنہیں سن کر یوسف خان کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی لیکن وہ بہ مشکل خود پر قابو پائے رہا۔ لوگوں کی بڑی تعداد اس شاندار شادی کو دیکھنے وہاں موجود تھی لیکن یوسف خان کو کسی نے نہیں پہچانا۔

یوسف خان ایک سمت کھڑا ان رونقوں کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک اس کی نگاہ ایک شناسا چہرے پر پڑی۔ وہ کوئی اور نہیں، اس کی چھوٹی بہن بولندرا تھی۔ وہ لپک کر اس تک پہنچا لیکن وہ بھی اپنے بھائی کو نہ پہچان پائی تھی۔ وہ نہایت تیزی میں تھی لیکن یوسف خان نے درخواست کرکے اسے چند لمحوں کے لیے روک لیا۔

یوسف خان نے اس سے پوچھا کہ شیر بانو کی شادی کس سے ہورہی ہے؟ بولندرا نے نہایت دکھی انداز میں اسے بتایا کہ اس کا بھائی کچھ عرصہ قبل انہیں بے آسرا چھوڑ کر چلا گیا تھا جس کے بعد اس کے چچازادوں نے پہلے تو ان کی جائداد پر قبضہ کرلیا اور انہی میں سے ایک زبردستی شیر بانو کے ساتھ شادی کررہا ہے لیکن شیر بانو دلہن بننے اور ڈولی میں بیٹھنے سے مسلسل انکار کررہی ہے۔ آج اس کی شادی ہے لیکن صبح سے اب تک منت، سماجت اور زور زبردستی کے باوجود اس نے منہ دھویا ہے، نہ بالوں میں کنگھی کی ہے۔

یوسف خان نے کچھ اور پوچھنا چاہا تو بولندرا نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کردیا "میں اپنے چچازادوں کے پاس ملازمت کررہی ہوں۔" اس نے یوسف کو بتایا۔ "ان کی نوکرانی ہوں میں اور شادی کے گھر میں مجھے بہت سا کام کرنا ہے۔ مجھے جانے دو، دیر ہوگئی تو میرے چچازاد نہ صرف مجھے ماریں گے بلکہ میری اندھی ماں پر بھی تشدد کریں گے۔"

یوسف خان نے ہاتھ بڑھا کر اس کا بازو پکڑ لیا "تو تم نے بھی مجھے نہیں پہچانا، میری بہن!"

بولندرا پہلے تو حیران ہوئی لیکن پھر روتے ہوئے یوسف خان کے گلے لگ گئی۔ بہت دیر تک وہ یوسف خان سے شکوے کرتی رہی اور یوسف خان اس کے سر پر ہاتھ پھیر پھیر کر اسے تسلیاں دیتا رہا۔ اس نے بولندرا سے وعدہ لیا کہ وہ فی الحال کسی کو اس کی واپسی کے بارے میں نہیں بتائے گی اور بولندرا ہتھیلیوں سے آنکھوں کے آنسو خشک کرتی، سر ہلاتی اور خوشی سے نم آنکھیں لیے ہجوم میں غائب ہوگئی۔

اب یوسف خان نے قریب کھڑے ایک بچے کو بلایا

WWW.PAKSOCIETY.COM

اور سر سے ٹوپی اتار کر اسے تھمائی اور کہا کہ اسے شیر بانو کو دے آؤ۔

شیر بانو گم صم اپنے کمرے میں بیٹھی تھی۔ اس کے والدین اور سہیلیاں باجود کوشش کے اسے اب تک دلہن بننے پر آمادہ نہ کر پائے تھے لیکن بچّے نے جونہی ٹوپی لے جا کر اسے دی وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔ اس نے ٹوپی کو چوما، آنکھوں سے لگایا اور دیر تک اسے سینے سے لپٹائے روتی رہی۔ پھر وہ چھلانگ مار کر اپنی جگہ سے اٹھی اور اپنی سکھیوں سے کہنے لگی کہ اسے جلدی سے تیار کرو اور دلہن کا جوڑا پہناؤ۔ ہر ایک اس کی بدلی ہوئی کیفیت پر خوش گوار حیرت کا شکار تھا۔ کہاں تو وہ صبح سے اس کی منتیں کر رہے تھے اور وہ ٹس سے مس نہیں ہو رہی تھی اور کہاں اب وہ خود دلہن بننے کی فرمائش کر رہی تھی۔ سہیلیوں نے جلدی سے اسے تھاما اور تیار کرانے لگیں۔ انہوں نے اس کے سیاہ لمبے بال دھوئے اور ان میں کنگھی کی جبکہ اس دوران شیر بانو اپنی سکھیوں کے علاوہ گھر والوں کے ساتھ بھی ہنس ہنس کر باتیں کرتی رہی جو اس کی بدلی ہوئی حالت دیکھ کر شہد کی مکھیوں کی طرح اس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ کسی نے شیر بانو کی آنکھوں میں کاجل لگایا اور کوئی اس کی نظر اتارنے کے لیے اس کی بھوؤں کے درمیان ٹیکا لگانے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں شیر بانو چمکتے دمکتے طلائی زیورات اور نیا سرخ جوڑا پہن کر دلہن بن گئی۔

بولندرا اسے دیکھنے کمرے میں آئی تو دونوں نے پہلے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو معنی خیز اشارہ کیا اور پھر پُرجوش انداز میں بغل گیر ہو گئیں۔ بولندرا اپنی بھابی کی بلائیں لے کر بھائی کو یہ بتانے چل دی کہ اس کی دلہن اس کے استقبال کے لیے تیار ہے۔

یوسف خان اتنی دیر میں اپنے سپاہیوں کو پیغام بھجوا چکا تھا اور مغل سپاہی نہایت خاموشی کے ساتھ گاؤں کے چپّے چپّے پر پوزیشن سنبھال چکے تھے۔ یوسف خان اس قدر شدید غصے میں تھا کہ اس نے اپنے سپاہیوں کو قتلِ عام کا حکم دے دیا۔ مغل سپاہیوں نے کارروائی شروع کی تو گاؤں میں کہرام مچ گیا۔ مردوں کے ساتھ ساتھ عورتیں بھی قتل ہو رہی تھیں۔ مغل سپاہیوں کے ہتھے چڑھنے والوں کی بیویاں اور بیٹیاں ننگے پاؤں اور ننگے سر باہر نکل آئیں۔ وہ جھولیاں پھیلا پھیلا کر یوسف خان سے رحم کی بھیک مانگ رہی تھیں لیکن وہ کسی کی بات سننے یا ماننے کو تیار نہیں تھا۔

بالآخر دلہن بنی شیر بانو کو خود نکل کر باہر آنا پڑا۔ اس نے گاؤں والوں کی طرف سے یوسف خان کے سامنے ہاتھ باندھ دیے۔ اس نے یوسف خان سے درخواست کی کہ بے قصور مردوں کی بیویوں کو بیوہ مت بناؤ۔ میں نے تمہاری جدائی میں بیواؤں جیسی زندگی گزاری ہے اور جانتی ہوں کہ بیوگی کا زخم کتنا گہرا اور دکھ کس قدر بھاری ہوتا ہے۔ تمہاری دشمنی صرف اپنے چچازادوں سے ہے، پورے گاؤں سے نہیں۔ دشمنوں سے جیسا چاہو سلوک کرو لیکن بے گناہوں کو بخش دو۔"

یوسف خان نے اپنی دلہن کے کہنے پر بے گناہوں کو معافی دے دی لیکن یہ سب اس وقت ہوا جب گاؤں کے لوگوں نے فوری جرگے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ جرگے نے فیصلہ دیا کہ یوسف خان کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ غلط تھا۔ اسے اپنے چچیرے بھائیوں کے قتل پر کسی قسم کی سزا نہیں دی جائے گی کیونکہ اس کے چچازاد پہلے ہی اسے قتل کرنے کی کوشش کے مرتکب ہو چکے تھے۔ جرگے نے یوسف خان کی چھینی گئی تمام جائداد اسے واپس کرنے کے احکامات بھی دیے۔

شیر بانو اسی رات دلہن بن کر یوسف خان کے گھر آ گئی۔ اس نے مغل سپاہیوں کو چند روز اپنا ذاتی مہمان رکھا اور پھر انہیں واپس دہلی روانہ کر دیا۔ یوسف خان نے شہنشاہ اکبر کی ملازمت خیرباد کہہ دی تاہم سپاہیوں کے ہاتھ ایک خط ضرور روانہ کیا جس میں بادشاہ کی عنایتوں پر اس کا شکریہ ادا کیا گیا تھا۔

یوسف خان اپنی ماں، بہن اور شیر بانو کے ساتھ خوشگوار زندگی گزارنے لگا۔ اس کے معمولات لوٹ آئے تھے۔ وہ اب دوبارہ شکار کے لیے کڑامار جانے لگا۔ پہلے کی طرح اب بھی وہ شام کو جب لوٹتا تو اس کے پاس شکار کیا ہوا کوئی نہ کوئی جانور ضرور ہوتا لیکن ایک روز یہ نامور شکاری خالی ہاتھ گھر آیا۔ شیر بانو چولہا گرم کیے اپنے شوہر کی منتظر تھی کہ وہ گوشت لائے گا تو اسے پکائے گی لیکن جب اس نے خالی ہاتھ یوسف خان کو دیکھا تو نہ صرف چولہا ٹھنڈا کر دیا بلکہ زبان سے بھی مایوسی کا اظہار کیا۔

یوسف خان، شیر بانو کی جانب سے چولہے پر سے ہنڈیا اتارنے اور تبصرے کو طنز سمجھا اور تاریکی کے باوجود غصے میں شکار کے لیے دوبارہ کڑامار کی جانب چل دیا۔ شیر بانو اس کے پیچھے بھاگی تا کہ اسے بتا سکے کہ اس نے

... سمجھا ہے۔ چولہے پر سے ہنڈیا اتارنے یا کچھ کہنے کا مقصد طنز نہیں تھا بلکہ ہنڈیا تو صرف اس لیے اتاری تھی کہ ... بجھ نہ جائے۔

لیکن یوسف خان اپنی محبوبہ کی منتوں کے باوجود نہ رکا اور پھر کبھی واپس نہ آیا۔ وہ اسی کھائی میں مردہ پایا گیا جہاں ایک بار پہلے اس کے چچازادوں نے اسے پھینکا تھا۔ کچھ کا کہنا ہے کہ وہ پھسل کر کھائی میں گر گیا تھا جبکہ بعض کہتے ہیں کہ اس کے چچیرے بھائیوں کے بعض ہمدردوں یا ساتھیوں نے اسے دھکا دیا تھا۔ بہرحال اس کی موت کی وجہ کوئی بھی رہی ہو، شیر بانو، جس نے سالوں اس کی واپسی کا انتظار کیا تھا، اپنے محبوب کے مرنے کے بعد چند دن بھی زندہ نہ رہ سکی اور ہمیشہ کے لیے ابدی نیند سو گئی۔

بعض کہانیوں میں ہے کہ یوسف خان، صوابی کے گاؤں اسماعیلہ (تورے غنڈے) کا رہنے والا تھا۔ ممکن ہے کہ ترلاندی اور تورے غنڈے ایک ہی گاؤں کے دو نام ہوں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یوسف خان نے شہنشاہ اکبر کے ہاں ملازمت ضرور کی تھی لیکن شیر بانو سے اس کی شادی مغلوں کی ملازمت اور چچیرے بھائیوں سے انتقام کے بعد ہوئی تھی۔

ان کہانیوں کے مطابق شادی کے تھوڑے عرصے بعد ہی یوسف خان معمول کے مطابق شکار کھیلنے کڑامار گیا اور خالی ہاتھ واپس آیا۔ شیر بانو نے جب دیکھا کہ وہ کھانے کے لیے کچھ نہیں لایا تو وہ بولے بغیر نہ رہ سکی چنانچہ یوسف خان غصے میں اپنے دو چچیرے بھائیوں کے ساتھ جو انتقام سے بچنے کے بعد خود کو اس کا دوست ظاہر کر رہے تھے شکار کے لیے چلا گیا۔ پہاڑ پر انہوں نے ایک ہرن کو نشانہ بنایا جو کھائی میں جا گرا اور جب یوسف خان ہرن کو نکالنے کے لیے رسّے کی مدد سے کھائی میں اترا تو اس کے چچیرے بھائیوں نے اوپر سے رسّا کاٹ دیا اور یوسف خان کھائی میں گر کر مر گیا۔

شیر بانو کو جب اس سانحے کی خبر ہوئی تو اس نے بھی اس پہاڑ سے کود کر خودکشی کر لی۔

قومی لوک ورثہ اسلام آباد نے مارچ 1978ء میں سرحد کی رومانوی کہانیاں شائع کی تھیں جس میں مردان و صوابی کی اس مشترکہ رومانوی داستان کو "یکہ یوسف شیر بانو" کے نام سے شامل کیا گیا ہے۔ اسے ممتاز شاعر و ادیب خاطر غزنوی مرحوم نے تحریر کیا ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ یہ مشہور رومان علی حیدر شاعر نے پشتو میں منظوم کیا ہے لیکن حسبِ معمول اس میں بھی اکثر بعید از قیاس باتیں شامل ہیں لیکن ملک الشعراء سمندر خان سمندر بدرشوی اور میری (خاطر غزنوی) ذاتی تحقیق سے جو حالات دستیاب ہوئے ہیں، ان کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

علاقہ یوسف زئی میں صوابی کے شمال اور موضع رستم کے جنوب مشرق میں ایک گاؤں ہے جس کا نام ترلاندی ہے۔

اس گاؤں میں ایک یتیم لڑکا اپنی ماں اور ایک بہن کے ساتھ رہتا تھا۔ لڑکے کا نام یوسف تھا اور اس کی بہن بندئی کہلاتی تھی۔ یوسف کے چچازاد بھائیوں نے یوسف کے والد کے مرنے کے بعد اس کی ساری جائداد اور زمینوں پر قبضہ جما لیا اور اس ... تاک میں لگ گئے کہ اس کا رہائشی مکان بھی چھین لیں۔

یوسف حسین و جمیل نوجوان تھا۔ ناز و نعم میں پلا تھا۔ کوئی کام کاج اسے پسند نہ تھا۔ محض شکار کا شوقین تھا۔ اپنے دو محبوب کتوں کو لیے سارا سارا دن شکار کھیلتا رہتا۔ شکار کے لیے اس نے کڑامار کی پہاڑیوں کو مخصوص کر رکھا تھا۔ اس طرف جاتے ہوئے اسے ایک دوسرے گاؤں شیر غونڈہ سے ہو کر جانا پڑتا۔

شیر غونڈہ سے گزرتے ہوئے وہ اکثر ایک لڑکی کو پنگھٹ پر کھڑے دیکھتا جو حسن و جمال کا مجسمہ تھی۔ یوسف، شیر غونڈہ کے اس پنگھٹ کے قریب سے گزرنے لگتا تو اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جایا کرتیں۔ وہ اکثر محسوس کرتا کہ اس کا دل اسے وہاں رک جانے پر مجبور کر رہا ہے۔

وہاں آ کر اسے اکثر پیاس بھی لگ جاتی لیکن اس کے باوجود وہ اپنی پیاس اور اپنے دل کی امنگوں کا گلا گھونٹ دیتا۔ اس کی آنکھیں بار بار پنگھٹ کی طرف اٹھنے کی کوشش کرتیں لیکن یوسف اپنی آنکھوں کو مجبور کر دیتا کہ وہ پنگھٹ کے بجائے سامنے راستے پر لگی رہیں یا پھر جھک جائیں اور یوں وہ دل کی پیاس اور آنکھوں کی آس بجھائے بغیر یہاں سے گزر جاتا۔

اس کے چلے جانے کے کافی دیر بعد اس کی بہن بندئی دوپہر کے کھانے کے وقت اسی راستے سے اس کے لیے کھانا لے جایا کرتی تھی۔ بندئی بھی اسی مقام پر پہنچ کر ایک لڑکی کو پنگھٹ پر اپنا منتظر پایا کرتی۔ کبھی کبھار وہ لڑکی

WWW.PAKSOCIETY.COM

بندئی سے اس شکاری کے متعلق پوچھ بھی لیا کرتی۔
پنگھٹ والی لڑکی شیر غونڈہ کے ایک خان کی بیٹی شیر بانو تھی۔ وہ شکاری کی بے پروائی کی بے حد شاکی تھی۔ وہ کبھی کبھی بندئی سے کہتی ”تیرے شکاری بھائی نے شیر غونڈہ کے پنگھٹ پر ایک پرندے کو شکار تو کرلیا لیکن شکار کو تڑپتا چھوڑ کر چلا گیا۔“
وہ اکثر یہ ٹپا بھی الاپا کرتی۔

اور یشتم پورتہ وے نکرم
سرے وِیشلہ مارغہ ذراو چنہ وینہ

یعنی تو نے شکار تو کرلیا لیکن اٹھایا نہیں حالانکہ شکاری اپنے شکار کو فوراً اٹھالیا کرتا ہے۔
بندئی بھی کبھی کبھی شیر غونڈہ کے پنگھٹ کی لڑکی کی باتیں اپنے بھائی سے چھیڑ دیتی لیکن یوسف اس کی طرف توجہ نہ دیتا اور بات کا رخ ہی بدل دیتا۔
یونہی دن گزرتے گئے۔ شکاری حسبِ معمول شیر غونڈہ سے گزرتا رہا اور پنگھٹ کی زخمی چڑیا تڑپتی رہی۔
ایک دن یوسف کے دشمنوں نے موقع دیکھا اور کڑامار میں ایک خطرناک گھاٹی کے قریب چھپ کر بیٹھ گئے۔ یوسف کے کتوں کے گلے میں بندھے گھنگھروؤں کی جھنکار نے دشمنوں کو چوکنا کردیا۔ کتے اچھلتے، پھلانگتے آگے نکل گئے۔ جوں ہی یوسف گھاٹی کے قریب پہنچا، اس کے چچا زاد بھائی اس کے راستے میں کھڑے ہوگئے۔ یوسف سکتے میں آگیا۔ دشمنوں نے یوسف کو زیادہ موقع نہ دیا اور اسے اٹھا کر گھاٹی کی طرف پھینک دیا اور خود فوراً بھاگ گئے۔
یوسف کی خوش بختی تھی کہ وہ نیچے ترائی میں گر کر پتھروں کے باعث قیمے میں تبدیل ہونے کے بجائے ایک ایسے درخت کی شاخوں میں اٹک کر رہ گیا جو ڈھلوان پر بالکل ترچھا کھڑا تھا۔ یوسف موت کے منہ سے تو بچ گیا لیکن ہوا میں معلق ہو کر رہ گیا۔ یہ ایک دوسری موت تھی۔ یہ سارا واقعہ جیسے پلک جھپکنے میں ہوگیا۔
اُدھر شیر غونڈہ کے پنگھٹ پر شیر بانو حیران کھڑی دیکھ رہی تھی کہ یوسف کے شکاری کتے بار بار پریشانی کے عالم میں کبھی ترلاندی کی طرف جاتے اور کبھی کڑامار کی طرف۔
شکاری کتوں کے یوں پریشانی کے عالم میں گھر کے بار بار چکر لگانے پر بندئی اور یوسف کی ماں کو بھی شک ہوا۔ وہ کتوں کے ساتھ کڑامار کی طرف بھاگیں۔ ان دونوں عورتوں کو پریشانی کے عالم میں کڑامار کی طرف جاتے دیکھ کر شیر بانو کا ماتھا ٹھنکا اور وہ بندئی سے اس کا سبب پوچھنے پر مجبور ہوگئی۔ بندئی کوئی خاطر خواہ جواب نہ دے سکی البتہ اس نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ یوسف ضرور کسی مصیبت میں گھر گیا ہے۔ بندئی اور اس کی ماں کے ساتھ شیر بانو بھی یوسف کی خیریت معلوم کرنے کڑامار کی طرف چل دی۔
حادثے کے مقام پر پہنچ کر کتوں نے اس درخت کی طرف منہ کر کے بھونکنا شروع کردیا۔ جب ان تینوں نے ڈھلوان میں ترچھے درخت کی طرف دیکھا تو یوسف کو درخت میں پھنسا ہوا پایا۔ یہ تینوں بہت پریشان ہوئیں لیکن ایک ترکیب شیر بانو کے ذہن میں آگئی۔ وہ نیچے گھاٹی میں اتر گئیں اور شیر بانو کی ہدایت پر انہوں نے اپنی چادریں یکجا کر کے درخت کے نیچے یوں پکڑلیں جیسے شہتوت اکٹھے کرتے وقت گاؤں کے لڑکے درخت کے نیچے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ ایک آدھ لڑکا درخت کی شاخیں جھاڑتا ہے اور شہتوت ٹپ ٹپ چادر پر گرنا شروع ہوجاتے ہیں۔
یوں یوسف خان بھی شہتوت کی طرح ان تہ در تہ چادروں پر آرہا۔ وہ شیر بانو کی اس ترکیب سے بہت متاثر ہوا۔
یہ پہلا دن تھا کہ ان دونوں کی محبت نے دلوں کی چار دیواری سے نکل کر اظہار کا روپ دھارا۔ عہدو پیمان ہوئے اور تمام عمر کے لیے ایک ہوجانے کے وعدے اور قسمیں ہوئیں لیکن یوسف نے شیر بانو کو بتایا کہ ان حالات میں اس کا گاؤں میں رہنا خطرے سے خالی نہیں اور یہ کہ اب وہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھے گا جب تک دشمنوں سے انتقام نہ لے لے۔
اور جب یوسف خان نے شیر بانو کو یہ بتایا کہ وہ اس سلسلے میں پردیس جانے کا ارادہ رکھتا ہے تو شیر بانو پر جیسے بجلی سی گری لیکن اسے اس کا بھی احساس تھا کہ بہتری اسی میں ہے کہ یوسف پردیس چلا جائے۔
شیر بانو نے وعدہ کیا کہ وہ زندگی بھر اس کی راہ دیکھتی رہے گی چنانچہ یوسف خان پردیس چلا گیا۔
بعض لوگوں کے خیال میں یہ واقعہ مغل شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ یوسف ترلاندی سے ہندوستان کی طرف چل دیا۔ منزلوں پر منزلیں مارتا وہ فرید آباد پہنچا۔ خوش قسمتی سے شہر کے دروازے پر ہی ایک ہم وطن سے اس کی ملاقات ہوگئی۔ اس شخص نے نہایت خندہ پیشانی سے یوسف کا استقبال کیا اور اسے اپنے پاس مہمان ٹھہرایا۔
اتفاق دیکھیے کہ اسی رات فرید آباد پر ڈاکا پڑا۔ یوسف خان، ڈاکوؤں کے مقابلے پر ڈٹ کھڑا ہوا۔ اس نے دو ڈاکوؤں کو جان سے مار ڈالا اور باقی بھاگ گئے۔ لوگ یوسف کی بہادری سے بے حد متاثر ہوئے۔ فرید آباد کے حاکم کو جب یوسف کی بہادری کا علم ہوا تو اس نے یوسف کو فوج کے ایک اعلیٰ عہدے پر ملازم رکھ لیا۔ یوسف خان ایمانداری اور محنت سے اپنے فرائض انجام دینے لگا چنانچہ چند ہی دنوں میں اس نے خاصی ترقی کرلی اور اس کی مالی حالت بھی بے حد مضبوط ہوگئی۔
لیکن اس تمام عرصے میں شیر بانو کی یاد اسے تڑپاتی رہی۔
اُدھر اس کے گاؤں میں اس کے چچا زاد بھائیوں کو علم ہوا کہ یوسف موت کے منہ سے بچ گیا ہے اور کہیں پردیس بھاگ گیا ہے تو انہوں نے اور ہاتھ پھیلائے اور یوسف کی بہن اور ماں کو نکال کر ان کے گھر پر قبضہ کرلیا۔
کچھ عرصہ گزر گیا تو یوسف نے مناسب سمجھا کہ گھر جا کر شادی کا بندوبست کرے۔ اس نے اپنے حاکم سے رخصت چاہی اور اپنے ساتھ چند سپاہی لے کر گاؤں کی طرف چل دیا۔
جب وہ ترلاندی پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کی ماں اور بہن کو گھر سے نکال دیا گیا ہے اور گھر پر دشمنوں نے قبضہ جمالیا ہے۔ اسے بڑا طیش آیا اور وہ اپنے سپاہیوں کو لے کر چچا زاد بھائیوں کے مقابلے پر ڈٹ گیا۔ فریقین میں زبردست لڑائی ہوئی جس میں یوسف اور اس کے سپاہیوں نے دشمنوں کو چن چن کر مار ڈالا۔
یوسف اپنی ماں اور بہن کو جو نہایت تنگ دستی کے دن گزار رہی تھیں اپنے گھر لے آیا۔ اس نے شیر بانو کے والد سے شیر بانو کا رشتہ مانگا جو اس نے منظور کرلیا۔ ان کی شادی ہوگئی اور یہ دونوں بچھڑے ہوئے دل ایک ہوگئے۔
شادی کے بعد چند دن انہوں نے بڑے چین و سکون سے گزارے۔
ایک دن شیر بانو نے یوسف سے کہا ”شکاری! بہت دن گزر گئے ہیں، تم نے شکار نہیں کیا۔“
یوسف کے لیے جو شکار کا دلدادہ تھا، یہی بات تازیانے کا کام کر گئی۔ اس نے شیر بانو سے کہا ”بہتر، آج ہی شکار کا گوشت کھلاؤں گا۔ یہ کون سی بڑی بات ہے۔“
یوسف اسی دن شکار کے سامان سے لیس ہو کر کڑامار کی طرف روانہ ہوگیا۔ راستے میں اسے ایک ہرن دکھائی دیا۔ وہ اس کے پیچھے لگ گیا۔ اچانک مغرب کی طرف سے آندھی کا ایک زبردست ریلا آیا۔ ایسا طوفان جو اندھا کیے دیتا تھا۔
یوسف آندھی کی پروا کیے بغیر ہرن کے پیچھے دوڑا اور اس نے ہرن پر تیر چلا دیا۔ اسے یوں معلوم ہوا کہ ہرن گر پڑا ہے..... اسی اثنا آندھی کا ایک اور زبردست ریلا آیا۔ ہر طرف ایک اندھیرا سا چھا گیا تھا لیکن یوسف اس اندھیرے میں بڑھتا ہی گیا اور پھر جیسے اس کا پاؤں پھسلا اور وہ بلندیوں سے لڑھکتا ہوا نیچے گھاٹیوں میں پہنچ گیا جہاں موت بڑی بے صبری سے اس کا انتظار کر رہی تھی...... شکاری آج خود شکار ہوگیا تھا۔
اور یہ وہی گھاٹی تھی جہاں ایک بار یوسف موت کے منہ سے بچ نکلا تھا۔
آندھی تھم گئی، دن گزر گیا اور شکاری کی تلاش شروع ہوگئی اور آخر اس کی لاش کڑامار کی گھاٹی میں پائی گئی۔
شیر بانو کی دنیا تاریک ہوگئی اور وہ ایسی بستر پر گری کہ ساتویں دن اس کا جنازہ ہی اٹھا۔
اب بھی ترلاندی کے مقام پر ان دونوں عاشقوں کی قبریں موجود ہیں۔
بعض ذرائع کہتے ہیں کہ یوسف خان اور شیر بانو کی قبریں کڑامار پہاڑ کی چوٹی پر پہلو بہ پہلو موجود ہیں۔
یوسف خان اور شیر بانو صدیوں پہلے محبتوں کی تاریخ رقم کر کے اس دنیا سے رخصت ہوگئے لیکن ان کی ہر دل عزیزی اور پسندیدگی کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ پشتو زبان کی سب سے پہلی فلم انہی رومانوی کرداروں پر بنائی گئی جس میں بدر منیر اور یاسمین خان نے بالترتیب یوسف خان اور شیر بانو کا کردار ادا کیا۔ اس فلم کی عکس بندی کڑامار پہاڑ کے گردو نواح میں کی گئی تاکہ ایک جانب تو اس میں حقیقت کا رنگ بھرا جاسکے اور دوسری طرف پشتو ثقافت کے ان عظیم کرداروں کو خراجِ تحسین پیش کیا جاسکے۔
☐

WWW.PAKSOCIETY.COM

عشقِ رسولؐ سے سرشار اس شخص کا تذکرہ جس نے بنامِ رسولؐ اپنی زندگی کو بھی قربان کردیا۔ انگریز حکومت نے آخر وقت تک کوشش کی کہ وہ صحتِ جرم سے انکار کردے لیکن اس نے پھانسی کا پھندا خود مانگ لیا۔

محمد ایاز راہی

عید میلادالنبیؐ کے حوالے سے ایک خصوصی تحریر

خطۂ ہزارہ کی حسین وادیٔ پکھل جہاں ظاہری خوبصورتی، مادی حُسن اور فطری جمال سے مالا مال ہے وہیں اس کا باطنی روپ اور روحانی سندرتا بھی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ سید احمد شہید بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید جیسی نامور، باعمل ہستیاں اسی سرزمین ہزارہ (بالاکوٹ) کی مٹی میں آسودۂ خاک ہیں۔ بالاکوٹ وادیٔ پکھل کے مشرق میں بلندی پر آباد ہے چنانچہ سورج ہر روز صبح ان شہیدوں کے مزارات سے ضیابار ہوکر ہی اپنے سفر کا آغاز کرتا ہے۔ تحریک ختمِ نبوت کے مجاہد اور راہ نما مولانا غلام غوث ہزاروی مرحوم وادی پکھل کے دل بفہ میں ہی پیدا ہوئے۔ پلے، بڑھے اور کامیاب جہاد کے بعد یہیں سپردِ خاک ہوئے۔ جنہوں نے ناموسِ رسالتؐ کے لیے مسلسل علمی اور قلمی جہاد کیا۔ تحریک کی کامیاب راہ نمائی کی۔ مرزائیت کو ہمیشہ کے لیے دائرہ اسلام سے نکال باہر کیا اور غلامیِ رسولؐ کے فریضے سے بہ خوبی عہدہ برآ ہوئے۔ اللہ کے حبیب کی عزت وناموس پر مر مٹنے والے عاشقانِ رسولؐ ہر دور میں پیدا ہوئے اور ہوتے رہیں گے۔ اسی قبیلۂ عشاق کے ایک گمنام مگر سچے عاشقِ رسولؐ کے ذکر سے قلم آج مشکبار ہونے چلا ہے۔ ہزارہ کی وادیٔ پکھل کے ضلع مانسہرہ کا ایک نواحی گاؤں صابر شاہ کے نام سے آباد ہے۔ موضع صابر شاہ ندی سرن کے عین کنارے پر واقع ہے۔ گزشتہ دوسرے ہزاریے اور بیسویں صدی کی پہلی دہائی کا ذکر ہے اسی دیہات کے ایک سواتی گھرانے میں ایک بچے نے جنم لیا۔ محترم والدین نے حتی المقدور خوشی کا زبانی وعملی اظہار کیا اور پھر ناموں کا اک ہجوم مثل نجوم پھڑپھڑاتے پرندوں کی مانند ان کے سامنے آن اکٹھا ہوا۔ آخر کار، عبدالرحمٰن نام کسی ہما کی طرح بچے کے سر پہ آن بیٹھا اور کامیابی وکامرانی کا نیک شگون ثابت ہوا۔ کیوں نہ ہوتا کہ یہ نام عبدالرحمٰن تاجدارِ مدینہ کا پسندیدہ نام ہے۔ آپؐ کسی بھی اجنبی آدمی کو بلاتے تو ”یا عبداللہ، یا عبدالرحمٰن“ کہہ کر صدا دیتے، پکارتے تھے۔ ندی سرن کے کنارے آباد موضع صابر شاہ اک عام سادہ گاؤں ہے۔ ندی سرن سے تازگی اور ٹھنڈک لے کر اٹھتی ہوائیں۔ سبز سایہ دار ثمر بار اور خوشبو بکھیرتے درختوں کے ذریعے ہر دم صاف ہوتی صحت بخش فضا۔ کم آبادی کا پُرسکون ماحول جس میں ندی سرن کی صاف شفاف بہتی لہروں کا ترنم دن کو اگر زندہ دلی کا باعث بنتا تو رات کو یہی ترنم میٹھی لوری بن کر گاؤں والوں کی بھرپور نیند کا سبب بنتا۔ پیچیدگیوں اور آلائش سے پاک گاؤں کی سادہ زندگی کا ظاہری حسن اپنی جگہ مگر یہ چھوٹی سی خاموش بستی ابھی تک روحانی خوب صورتی سے ناآشنا تھی چنانچہ نومولود عبدالرحمٰن کی صورت میں قدرت نے اس کمی کا اس خوبی سے ازالہ کیا کہ آگے چل کر مستقبل میں فرشتے بھی جھوم جھوم اٹھے۔ مادی حسن کے ساتھ ساتھ روحانی جمال بھی عطا ہوا تو موضع صابر شاہ خالقِ حقیقی کے آگے سجدۂ شکر بجالایا۔ نومولود عبدالرحمٰن کا بچپن اور لڑکپن گاؤں کے دیگر بچوں کی طرح عام انداز میں ہی گزر رہا تھا اس طرح یہ کہ گدڑی کا لعل لکھنے پڑھنے اور رسمی علوم سے بہرہ ور نہ ہوسکا۔ یقیناً اس لیے کہ مستقبل میں اس نوخیز نے بنا کر دند رسم خوش ”کے اعلیٰ وپاکیزہ عمل سے گزرنا تھا اور خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را“ کا حق دار ٹھہرنا تھا۔ بچپن اور لڑکپن کی بھول بھلیوں سے نکل کر جوانی کی راہ سامنے آئی تو بچپن کی شوخیوں اور لڑکپن کی شرارتوں نے عملی تگ وتاز کا چولا پہنا۔ مخالف کو خاطر میں نہ لاتا، مقابل کو بھرپور جواب دینا، دوستوں کے ہمراہ مختلف سرگرمیوں میں شامل ہونا۔ غرض جوانی کی اونچی نیچی راہ کے تمام لوازمات لہو گرم رکھنے کا بہانہ تھے۔ جس میں وقت کے ساتھ ساتھ کام کاج اور کھیتی باڑی کا عنصر بھی شامل ہوتا گیا۔ یوں اک ظاہری توازن کا سلسلہ بنتا چلا گیا۔ عبدالرحمٰن نے گھریلو ذمے داری کی خوش کن ادا اپنائی تو والدین محترم کو اس کا گھر بسانے کی سوجھی جو خصوصاً ماں کی دلی خواہش اور ارمان ہوتا ہے۔ خوش بخت عبدالرحمٰن نکاح اور شادی کی سنت نبوی سے ہم کنار ہوا تو زندگی اعتدال کی پھولوں بھری روش پر چل نکلی۔ کچھ عرصے بعد بیٹے محمد یوسف نے جنم لیا تو پورا گھر محمد یوسف سے جگمگا اٹھا۔ ننھے منے محمد یوسف کی آمد پر بلند اختر عبدالرحمٰن کو اپنے گھرانے کی تکمیل کا پُرمسرت احساس ہوا کہ نعمت عطا ہوئی مگر بخت آور عبدالرحمٰن خود اک نعمت عظمیٰ (غازی وشہادت) کے لیے قدرت کی طرف سے منتخب ہوچکا تھا۔ غازی وپُراسرار بندوں کی مثل جو لذتِ آشنائی اور ذوقِ خدا سے متصف ہوتے ہیں۔ ایک روایت کچھ یوں بھی ہے کہ ایک روز ندی سرن کے کنارے سوئے ہوئے عبدالرحمٰن کو کسی ہستی نے ٹھوکر لگا کر جگایا، غیبی آواز نے اسے جھنجوڑا۔

”اٹھ اے غافل کب تک غفلت میں مبتلا رہے گا۔“

یوں خوش نصیب عبدالرحمٰن دین کی طرف مائل ہوتا گیا خصوصاً جمعے کی نماز باقاعدگی سے مانسہرہ جا کر ادا کرنے لگا۔ اللہ کا چنیدہ بندہ منزل کی طرف گامزن ہوگیا۔ گزشتہ بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی کا ذکر ہے ہند میں انگریزی اقتدار بامِ عروج پر تھا۔ انہی دنوں ہندوؤں اور سکھوں کی طرف سے مسلمانوں کی دل آزاری کا آغاز ہوا، گستاخیِ رسولؐ کا فتنہ بڑے زور وشور سے اٹھ کھڑا ہوا۔ مسلمانوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ دے کر لہو کے چھینٹوں سے اس آگ کو بجھایا۔ جن میں سرفہرست عبدالرحمٰن تھا۔ گرفتاری کے بعد انگریزی قانون وعدالت کا سلسلہ چلا تو منصف نے غازی صاحب کو صحتِ جرم سے انکار کا مشورہ دیا کہ آپ کہہ دیں کہ میں ہوش میں نہیں تھا لیکن اس بزدلانہ سبقِ سفلی کو غازی نے پائے حقارت سے ٹھکرا دیا یہ فرما کر کہ ”زندگی میں اک یہی کام تو پورے ہوش و حواس سے کیا ہے میں نے۔“ اس ایمان افروز پُرجلال جواب پر وکیل اور منصف بغلیں جھانکتے رہ گئے۔ عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے۔ عشق بے چارہ نہ مُلّا ہے نہ زاہد نہ حکیم۔ آخر پھانسی کا فیصلہ اور حکم صادر ہوا تو غازی کے جذبۂ عشق اور ثابت قدمی، بے باکی پر پھانسی کا پھندا ابھی شرمندگی سے سمٹ کر رہ گیا کہ موت پھر بھی غازی کی روح کو مطلق چھو نہ سکی۔ غازی عبدالرحمٰن شہید کا جسم مبارک ایبٹ آباد سے واپس گاؤں صابر شاہ (مانسہرہ) کی طرف روانہ کیا گیا تو مراجعت کے اس عمل کو حتی الامکان خفیہ رکھا گیا کہ کہیں وادی پکھل کے غیور مسلمان مشتعل ہوکر امن وامان کے لیے مسئلہ نہ بن جائیں۔ یہ انگریز کا اقدام تھا چنانچہ آج سے تقریباً پون صدی (پچھتر برس) قبل پہلی بار وادی پکھل کی فضائی نگرانی ہوائی جہاز کے ذریعے کی گئی تاکہ کسی بھی ہنگامی صورتِ حال پر نظر رکھی جاسکے مگر پھر اتفاق کچھ یوں ہوا کہ غازی شہید کی میت جب گاؤں بھیر کنڈ سے پہلے ندی اچھڑ پر پہنچی تو اچانک پل ٹوٹ گیا اور مسلمان غازی شہید کی آمد سے باخبر ہوتے چلے گئے۔ سو بھیر کنڈ، خاکی، خواجگان نامی بستیوں سے ہوتے گزرتے غازی شہید کی میت جب موضع صابر شاہ پہنچی تو ایک بڑا قافلہ اس کے جلو میں تھا۔ یہ قافلہ ادب واحترام اور عقیدت کا استعارہ بنا ہوا ساتھ تھا۔ جنازہ پورے خشوع وخضوع کے ساتھ ادا کیا گیا اور پھر غازی شہید کو پُرنم آنکھوں سے مادرِ گیتی کے سپرد کردیا گیا۔ غازی عبدالرحمٰن شہید یقیناً زندہ ہے اور زندہ رہے گا یوں کہ ندی سرن میں ہر سال جب بھی طغیانی آتی ہے تو بپھرا ہوا سیلاب پہاڑوں سے تباہی مچاتا آتا ہے مگر غازی شہیدؒ کے گاؤں صابر شاہ کے قریب پہنچ کر یہ سرکش سیلاب ہمیشہ مودب ہوکر میانہ رو ہوجاتا ہے لہٰذا پیر صاحب حسین شاہ کے نام پر آباد گاؤں صابر شاہ کبھی بھی سیلاب کی زد میں نہیں آیا نہ ہی ان شاء اللہ کبھی آئے گا حالانکہ موضع صابر شاہ کسی اونچی جگہ پر نہیں بلکہ ندی سرن کی سطح کے برابر ہی آباد ہے۔ غازی عبدالرحمٰن شہیدؒ کے مزارِ اقدس کے قرب وجوار کا علاقہ اب غازی تکیہ کے نام سے معروف ہے پختہ سڑک کے کنارے جنوب کی طرف ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ مسجد سے متصل ہی جنوب میں غازی عبدالرحمٰن شہیدؒ کا مزارِ پُرانوار ہے جہاں پہنچ کر جنت کی ابدی زندگی کا یقین رگ و پے میں اتر جاتا ہے۔ جب تک نہ جلے دیپ شہیدوں کے لہو سے کہتے ہیں کہ جنت میں چراغاں نہیں ہوتا۔ ندی سرن ایک اور سچے واقعہ کی امین بن گئی۔

✸

WWW.PAKSOCIETY.COM

سراب

راوی : شہبازملک

تحریر: کاشف زبیر

قسط:70

وہ پیدایشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو ،مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب ...... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر اسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

WWW.PAKSOCIETY.COM

(گذشتہ اقساط کا خلاصہ)

بابا کا اصرار تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج بھیج دیا جائے جبکہ میں آرمی میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ سویرا جو میرے دل کا حصہ تھی وہ میرے بھائی کا مقدر بنادی گئی اور میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ میں نے کاروبار شروع کیا۔ ایک روز مری سے واپس آتے ہوئے نادر علی کا ہم سے ٹکراؤ ہوگیا پھر یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر تو ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئی تھیں۔ میں دوبارہ وطن لوٹا تو فتح خان سے ٹکراؤ ہوگیا۔ اس کے آدمیوں کو شکست دے کر میں اندرون ملک آ گیا۔ آتے وقت میرے ہاتھ حکومت چین کا ایک بریف کیس آ گیا۔ جو شہلا کے ہاتھ لگ گیا۔ شہلا کو راضی کیا کہ وہ مجھے بینک کے لاکر تک پہنچادے تاکہ میں چائنیز بریف کیس حاصل کرلوں۔ ہم بینک میں سیف سے بریف کیس نکال چکے تھے کہ شہلا نے فتح خان کے آدمیوں کو بلالیا تھا۔ وہ مجھے یرغمال بنا کر فتح خان کے گھر میں لے آئی۔ فتح خان نے مجھے مجبور کردیا کہ سویرا کو حاصل کرنے کے لیے مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کر کے دینے ہوں گے، میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ فتح خان، برٹ شا کو لے آیا جو پاگل ہوچکا تھا۔ پھر اس نے میری طرف سے میل کر کے ایمن کو بھی بلوالیا۔ فتح خان کے آدمیوں پر فائرنگ شروع ہوگئی۔ برٹ شا نے میرے پستول سے فتح خان کو نشانے پر لیا تھا کہ اس کے آدمی نے برٹ شا کو گولی ماردی۔ مرتے وقت برٹ شا بڑبڑایا" نارتھ...... ہکسٹ" دم توڑتے برٹ شا کی آواز صرف میں نے سنی تھی، تھوڑی دیر میں اندازہ ہوگیا کہ فتح خان نے اندازہ لگالیا ہے کہ اس پوری کارروائی میں میرا ہاتھ ہے، تبھی مائیک سے اعلان ہوا کہ جو بھی ہے، وہ ہاتھ اٹھا کر باہر آ جائے۔ وہ راجا صاحب کے آدمی تھے۔ وہاں سے میں محل میں آیا۔ وہاں ایمن بھی موجود تھی۔ اگلے دن ہم پنڈی جانے کے لیے نکلے۔ راستے میں فتح خان نے گھیر کر بے بس کردیا اور ایمن کو خودکش جیکٹ پہنادی جسے اتارنے کی کوشش کی جاتی تو دھماکا ہوجاتا۔ ہم عبداللہ کی کوٹھی میں اطلاع ملی کہ شہلا کا فون آیا تھا۔ میں نے اسے کال کر کے بریف کیس مانگا۔ اس نے بریف کیس دینے کے لیے ویران جگہ مقرر کی۔ ہم وہاں پہنچے اور بریف کیس لے کر چلے تو مجھے شک ہوا اور میں نے بریف کیس ڈھلان پر رکھ دیا۔ وہ دھماکے سے پھٹ گیا۔ ہم واپس ہو رہے تھے کہ وسیم کا فون آیا کہ سویرا کو فتح خان نے حویلی پہنچادیا ہے۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کردیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کے تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل بھاگا۔ جیپ تک پہنچا تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ کرنل زروبکی نے ہم دونوں کو پکڑلیا۔ وہ مجھے پھر سے انڈین آرمی کی تحویل میں دینا چاہتا تھا۔ میں نے کرنل کو زخمی کر کے بساط اپنے حق میں کرلی۔ زخمی فتح خان اور زروبکی کو لے کر چلا۔ راستے میں فتح خان کو اتار دیا۔ کچھ دور جانے کے بعد ایک کوٹھی نظر آئی جو ایک ملیٹری آفیسر کی تھی۔ میں نے اسے حالات بتا کر مدد طلب کی آفیسر زروبکی کو ملیٹری پولیس کے حوالے کرنے چلا گیا تھا کہ کوٹھی پر حملہ ہوگیا۔ میں نے حملہ پسپا کیا۔ مجھے اعلیٰ جنس والے ساتھ لے گئے۔ انہی لوگوں نے مجھے پنڈی پہنچانے کا انتظام کردیا۔ میں دوستوں کے درمیان آ کر ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی کہ ایک کوٹھی میں بم دھماکا۔ کوٹھی نادر علی کی تھی جسے کسی نے تباہ کیا تھا۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ مجھے شہلا کی تلاش تھی۔ اس لیے نادر کی کوٹھی کی جانب توجہ دی تبھی خبر ملی کہ شہلا کسی صابر نامی شخص سے ملنے جارہی ہے۔ میں دوستوں کے ساتھ اس کی تلاش میں نکل پڑا۔ کچھ کے ذمے کام یہ لگایا کہ وہ صابر کو پکڑلیں۔ صابر تو پکڑ میں آ گیا مگر شہلا نکل گئی۔ صابر نے بتایا کہ شہلا کالی کوٹھی میں ملے گی۔ ہم وہاں پہنچے تو شہلا آخری سانسیں لے رہی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ مونا وغیرہ کو حویلی بھیج دیا جائے۔ ہیلی کاپٹر ہائر کیا۔ جیسے ہی چوپر بلند ہوا اس پر فائرنگ شروع ہوگئی جو ایک ریموٹ کنٹرول گن سے کی جارہی تھی۔ یہ کام فاضلی کا تھا، ہم نے اسے اغوا کرلیا، اسے تہ خانے میں قید کر کے باہر نکلے۔ مجھے خیال آیا کہ ایک دو جگہیں مزید ہونی چاہیے جہاں ہم ٹھہر سکیں۔ اخبار میں ایک اشتہار نظروں سے گزرا جس میں فرنشڈ مکان کرائے پر دینے کی بات کی گئی تھی۔ ہم پتے پر جا پہنچے۔ مکان پسند آیا اور اسے دس لاکھ ایڈوانس دے کر لے لی۔ مگر اگلے دن سے مکان مالک اشفاق احمد نظر نہیں آیا۔ اس کی نگرانی کے لیے عبداللہ نے ایک آدمی کو لگادیا۔ پھر خود بھی رات میں وہاں پہنچا۔ تبھی اندر سے ایک آدمی بھاگتا ہوا نکلا تھا کہ افنان احمد نے اس پر فائر کردیا پھر اسے گھسیٹتا ہوا اندر لے گیا۔ دبے قدموں میں بھی اندر آ گیا۔ ایک کمرے میں تہ خانہ نظر آیا میں اندر جھانک رہا تھا کہ تاریکی میں ایک شعلہ چمکا۔ شعلہ لائٹر کا تھا۔ مالک مکان افنان احمد نے مجھ پر گولی چلائی۔ کافی دیر کی کشمکش کے بعد میں نے اسے پکڑلیا اور گاڑی میں ڈال کر حویلی کے لیے نکل پڑا۔ فاضلی قید میں تھا اور وسیم اسے ہیروئن کا انجکشن لگا کر عادی بنا رہا تھا۔ افنان احمد نے بتایا کہ وہ کسی بڑے آدمی کو پکڑتا ہے اور اس کے گھر پر قبضہ کر کے دس بیس لاکھ کی جعل سازی کرلیتا ہے۔ میں عبداللہ سے ملنے جارہا تھا کہ ڈی ایس پی اکرم چشتی نے مجھے گرفتار کیا اور بے پناہ تشدد کے بعد مرشد کے ہاں پہنچادیا۔ میں نے مرشد کو یرغمال بنا کر وہاں سے نکلنا چاہا تھا کہ فاضلی نمودار ہوا اور اس نے میرے سر پر وار کردیا۔

(اب آگے پڑھیں)

میرا سر گھوم رہا تھا۔ یہ سرنج میں موجود دوا کا اثر تھا جو میرے جسم میں داخل ہوچکی تھی، سر پر لگنے والی ضرب کا نتیجہ یا پھر حیرت کا جھٹکا تھا جو فاضلی کو یہاں دیکھ کر لگا تھا۔ وہ وسیم کی قید میں اتنا ہی بے بس تھا جیسے روح جسم کی قید میں ہوتی ہے اور اس کا چھوٹ جانا میرے نزدیک اتنا ہی ناممکن تھا جتنا خود اپنی روح کو جسم کی قید سے آزاد کرانا۔ لیکن یہ ناممکن، ممکن ہو گیا تھا۔ وہ فاضلی ہی تھا۔ مجھے انجکشن لگا کر وہ پیچھے صوفے پر گر گیا تھا اور یوں ہانپ رہا تھا جیسے میلوں دوڑ کر آیا ہے۔ ظاہر ہے اس کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ اس کے باوجود اس نے وہ کام کر دکھایا تھا جو مرشد کا سیکریٹری اور اس کے سارے محافظ نہیں کر سکے تھے۔ میں ضرب کھا کر گرا تو سیکریٹری نے جھپٹ کر میرے ہاتھ سے پستول نکال لیا اور اگر اسے موقع ملتا تو وہ فاضلی کو روک دیتا لیکن فاضلی نے سیکنڈ سے بھی پہلے انجکشن مرشد کی گردن سے نکال کر مجھے لگادیا تھا۔

"یہ تم نے کیا کیا؟" سیکریٹری بولا۔

"وہی جو یہ مرشد صاحب کے ساتھ کرنے والا تھا۔" فاضلی نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ "اس میں زہر ہے؟"

سیکریٹری نے افسوس سے سر ہلایا اور پھر محافظوں کو بلانے لگا۔ پھر اس نے واکی ٹاکی پر کسی ڈاکٹر کو طلب کیا۔ ڈاکٹر شاید مرشد ہاؤس میں موجود تھا کیونکہ وہ دو منٹ بعد ہی آ گیا تھا۔ اس دوران میں سیکریٹری نے ایک محافظ کی مدد سے مرشد کو اٹھا کر صوفے پر لٹایا تھا۔ میں خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر یہ سوچ کر ہی میرا دل ڈوب رہا تھا کہ کچھ دیر میں اپنی سوچوں اور اپنی شخصیت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوجاؤں گا۔ ممکن ہے مرشد نے اس انجکشن کے بارے میں مبالغے سے کام لیا ہو لیکن اس کی بات کو جھوٹ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ڈاکٹر کے آتے ہی سیکریٹری نے اسے مرشد کو ٹریٹ منٹ دینے کو کہا اور فاضلی کی طرف متوجہ ہوا۔ "تم کیسے چھوٹے..... تم اس کے ساتھیوں کی قید میں تھے؟"

فاضلی شاید مجھے گھور رہا تھا کیونکہ چکراتے سر کے ساتھ میں نظروں کو فوکس نہیں کر پا رہا تھا البتہ ان لوگوں کی آوازیں صاف سن رہا تھا۔ "میں نے وہاں ایک آدمی کو توڑ لیا۔ وہ مجھے ہیروئن کا انجکشن دیتا تھا..... میں نے نقد سودا کیا اور وہاں سے نکل آیا۔"

"نقد سودا کیسے کیا؟"

"میں نے اس سے سودا کیا کہ وہ مجھے آزاد کردے تو میں اسے دس لاکھ روپے دوں گا۔ یہ رقم میں نے ایک جگہ چھپا رکھی ہے۔ وہ لالچ میں آ گیا اور اس نے مجھے باہر نکال دیا۔"

"کہاں سے؟"

"میں نہیں جانتا کیونکہ وہ مجھے رات کی تاریکی میں آنکھوں پر پٹی باندھ کر باہر لایا اور پھر ایک گاڑی میں بٹھا کر وہاں سے نکال لایا۔ میں نہیں جانتا وہ جگہ کہاں ہے۔"

"وہ آدمی کہاں ہے؟"

"اسے میں نے ماردیا..... دس لاکھ کہاں تھے اسے دھوکا دیا تھا۔ میں اسے نہیں مارتا تو وہ مجھے ماردیتا۔" فاضلی بولا، اس کے لہجے میں بے چینی آ گئی تھی۔ "اس ڈاکٹر سے کہو مجھے دیکھے..... مجھے ہیروئن کی طلب ہو رہی ہے۔"

"فکر مت کرو تمہارا علاج ہوجائے گا۔" سیکریٹری نے اسے تسلی دی۔ اس کے انداز سے لگتا تھا کہ فاضلی اس سے کم تر درجے کا آدمی تھا۔ ظاہر ہے وہ مرشد کا سیکریٹری تھا اور آنے والے دنوں میں اس کی اہمیت اور بھی زیادہ ہو جاتی۔ ڈاکٹر نے مرشد کو کوئی دوا دی یا انجکشن لگایا تھا جس سے اس کی توانائی بحال ہوگئی اور وہ فاضلی پر برس پڑا۔ "یہ تم نے کیا کیا.....؟"

"جو میری سمجھ میں آیا جناب۔" فاضلی سہمے انداز میں بولا۔ "کیا میں نے غلطی کی ہے؟"

"تم اسے قابو کر چکے تھے انجکشن دینے کی کیا ضرورت تھی۔" مرشد نے غرا کر کہا۔

"میں خود پر قابو نہیں رکھ سکا تھا۔" فاضلی کا لہجہ مزید کمزور ہوگیا تھا۔ "ان لوگوں نے میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔"

"انہوں نے تم جیسے گدھے کے ساتھ بالکل ٹھیک سلوک کیا ہے۔" مرشد نے کہا اور ڈاکٹر کو حکم دیا کہ میرا معائنہ کرے۔ ڈاکٹر نے پین ٹارچ سے میری آنکھوں میں روشنی ڈال کر دیکھی۔ پھر نبض اور دل کی دھڑکن اور آخر میں بلڈ پریشر چیک کیا۔

"وائٹل سائن تقریباً نارمل ہیں، یہ بے ہوش نہیں ہے لیکن پوری طرح ہوش میں بھی نہیں ہے۔"

"کیا یہ ہماری باتیں سن رہا ہے؟"

"ہوسکتا ہے سن رہا ہو جناب۔"

"کیا مطلب ہوسکتا ہے۔" مرشد نے خفگی سے کہا۔ "یقین سے بتاؤ۔"

"یہ میں کیسے بتا سکتا ہوں جناب۔" وہ پریشان ہو گیا۔ "ویسے اس کے ساتھ ہوا کیا ہے؟"

WWW.PAKSOCIETY.COM

مرشد نے ڈاکٹر کو بتایا کہ مجھے کس قسم کا انجکشن دیا گیا ہے اور اس کے کیا نتائج نکل سکتے ہیں۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ”تب آپ کسی نرو کے ماہر کو دکھائیں، یہ دماغ کا معاملہ ہے اور میرے بس سے باہر ہے۔“

مرشد نے چراغ پا ہو کر ڈاکٹر اور فاضلی کو دفع ہو جانے کا حکم دیا۔ وہ سن چکا تھا کہ فاضلی کس طرح میرے ساتھیوں کی قید سے رہا ہوا تھا، مجھے اس شخص پر افسوس تھا جس نے دس لاکھ روپے کے لالچ میں اپنی زندگی فروخت کر دی تھی۔ اب وہ زندہ بھی نہیں تھا کہ اسے برا بھلا ہی کہا جاتا۔ اپنے کیے کی سزا وہ بھگت چکا تھا۔ البتہ یہ اچھی بات تھی کہ اس نے فاضلی کو حویلی یا اس کا جائے وقوع دیکھنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ مجھے قالین سے اٹھا کر صوفے پر لٹا دیا گیا تھا۔ اگرچہ مرشد اور سیکریٹری جانتے تھے کہ مجھے انجکشن لگا ہے اور سر پر چوٹ بھی آئی تھی اس کے باوجود وہ دونوں محتاط تھے اور انہوں نے دوسرے لوگوں سے مجھے اٹھوایا تھا۔ اس وقت بھی میرے سر پر ایک مسلح شخص موجود تھا۔

”اس کا کیا کرنا ہے جناب۔“ سیکریٹری نے مرشد سے میرے بارے میں پوچھا۔ ”میرا خیال ہے یہ کام سے گیا۔“

”یہ سب تمہاری نا اہلی کی وجہ سے ہوا ہے۔“ مرشد نے اپنی توپوں کا رخ سیکریٹری کی طرف موڑ دیا۔ ”وہ تو میری قسمت اچھی تھی کہ یہ کامیاب نہیں ہوا اور فاضلی بر وقت آگیا۔“

”میرا قصور نہیں ہے جناب جیسے ہی میں نے فائر کیا یہ گر گیا۔“ سیکریٹری پریشان ہو گیا۔ اسے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ اس نے اپنے آقائے ولی نعمت کو کرنٹ لگا دیا تھا۔ خود مرشد پریشانی میں یہ بات بھولا ہوا تھا اب اسے یاد آگیا اس نے سیکریٹری کو سنانی شروع کیں۔ وہ ملازم تھا خاموشی سے سنتا رہا۔ خود مرشد کا دماغ ٹھکانے پر نہیں تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ حالانکہ اسے سب سے پہلے فاضلی سے معلوم کرنا چاہیے تھا کہ اس نے اپنی محسن کی لاش کہاں چھوڑی تھی اور وہ کس گاڑی میں یہاں تک آئے تھے۔ فاضلی کو بھی ہیروئن کے ڈوز کی فکر لگ گئی تھی ورنہ وہ مرشد کو بتاتا۔ سب ہی بوکھلائے ہوئے تھے سوائے میرے کیونکہ میرے پاس کرنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ سر پر لگنے والی ضرب کا اثر کم ہو رہا تھا کیونکہ مجھے چکر آنا کم ہو گئے تھے۔ البتہ آنکھوں کے سامنے دھندلا پن موجود تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ انجکشن کی دوا جلد مجھ پر اثر کرنے والی تھی کیونکہ دس منٹ ہو گئے تھے یا ہونے والے تھے۔ یہ خیال مرشد کو بھی آیا اس نے سیکریٹری سے پوچھا۔

”دس منٹ ہو گئے ہیں؟“

”میرا خیال ہے ہو گئے ہیں جناب۔“ وہ بے دلی سے بولا۔

”اب تک اس پر اثر ہو جانا چاہیے۔“

”بالکل ہو گا جناب۔“ سیکریٹری نے کہا۔ ”شاید کچھ دیر لگے کیونکہ فاضلی نے انجکشن گوشت میں اتار دیا تھا اگر نس میں لگتا تو جلدی اثر کرتا۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ مرشد نے کہا۔

”آپ بلاوجہ پریشان ہو رہے ہیں۔“ سیکریٹری نے مرشد کو دھیما پایا تو اس کا حوصلہ لوٹ آیا تھا۔ اسے یاد آگیا کہ وہ مرشد کا مشیر تھا۔ ”آپ کا اصل پلان بالآخر یہی تھا۔ دیکھیں فاضلی خود چھوٹ کر آگیا اور آپ کو انجکشن لگانے کا حکم بھی نہیں دینا پڑا۔ سب فاضلی کے ہاتھ سے ہو گیا۔“

”ہاں یہ سب سے اچھی بات ہوئی کہ فاضلی ہاتھ آگیا۔“ مرشد نے بادلِ ناخواستہ سیکریٹری کی تائید کی۔ ”لیکن ابھی مجھے اس سے بہت کچھ پوچھنا تھا۔“

”جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا اب آگے کا سوچیں اس کا کیا کرنا ہے۔“ سیکریٹری نے درست مشورہ دیا۔

”میرا تو دماغ کام نہیں کر رہا ہے۔“ مرشد نے کہا۔ ”ابھی تو اسے اٹھواؤ یہاں سے....“

مرشد وہاں سے چلا گیا اور سیکریٹری ملازموں کو میرے بارے میں ہدایت دے رہا تھا۔ ”اسے گیسٹ ہاؤس شفٹ کر دو اور ہاں اس پر نظر رکھنا یہ کہیں اِدھر اُدھر ہوا تو تم لوگوں کو حساب دینا ہو گا۔“

”چل اٹھا اپنے اس پیونوں۔“ سیکریٹری کے جانے کے بعد کسی نے کہا اور پھر مجھے دو افراد نے پہلے بازوؤں اور ٹانگوں سے پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی لیکن یہ طریقہ خاصا مشکل تھا۔ میرا وزن تقریباً پچاسی کلوگرام تو تھا اس لیے ان میں سے ایک نے قربانی دی اور مجھے اپنے شانے پر ڈال لیا۔ مگر وہ راستے بھر مجھے سناتا ہی رہا تھا اور دوسرا ہنستا رہا اس نے مجھے نرم بستر پر لا کر پٹخ دیا اور دوسرے پر بگڑنے لگا۔ اس بار اس نے مجھے دوسرے کا والد ماجد قرار دیتے ہوئے کہا۔ ”اٹھا تا تاں اپنی پیے۔ بے دے خصم نوں۔“

میرا اندازہ تھا کہ مجھے انجکشن لگے پندرہ منٹ سے اوپر ہو گئے تھے لیکن اب تک میرا ذہن میرے قابو میں تھا اور میں بہ قول مرشد کے نہ تو نوزائدہ ہوا تھا اور نہ بلی کا بچہ بنا

تھا۔ شاید اس کی وجہ وہی تھی جو سیکریٹری نے بیان کی تھی۔ فاضلی نے انجکشن میرے بازو کے گوشت میں گھونپ دیا تھا۔ گوشت میں لگایا جانے والا انجکشن دیر سے اثر کرتا ہے مگر اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ اثر ضرور کرتا ہے۔ اس لیے مجھے کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔ مرشد کی قید میں آنے کے بعد میں اپنے ساتھ ہر سلوک کے لیے تیار تھا اور ذہنی طور پر میں نے تسلیم کر لیا تھا کہ صرف قسمت ہی مجھے مرشد کی قید سے زندہ سلامت نکال سکتی ہے۔ اس سے پہلے بھی کئی بار مرشد یا دوسروں کی قید میں آنے کے بعد میں نکلنے میں کامیاب رہا تھا اور اب بھی مجھے اللہ پر بھروسا تھا کہ میرے مقدر کی سانسیں باقی ہیں تو میں بچ نکلوں گا۔

مرشد کے آدمی مجھے یہاں لٹا کر آپس میں لڑتے جھگڑتے چلے گئے تھے۔ سیکریٹری نے مجھے گیسٹ ہاؤس میں بھجوایا تھا۔ اس جگہ پہرا تھا اور میرے بارے خاص طور سے خبردار کیا گیا تھا اس لیے اس کمرے کے باہر یقیناً مرشد کے محافظ موجود تھے۔ اگر مجھے انجکشن نہ دیا گیا ہوتا تب بھی اس کا امکان بہت کم تھا کہ میں یہاں سے فرار ہو سکوں گا۔ اب میرے پاس سوائے انتظار کے اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ آگے پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔ میرا ذہن صاف ہو گیا تھا یعنی چکر آنا بند ہو گئے تھے لیکن آنکھوں کے سامنے ہلکی سی دھند برقرار تھی۔ میں نے آہستہ سے سر گھما کر اس دھند کے پار کمرے کا معائنہ کیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس لیے میں نے اٹھ بیٹھنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ اس میں بھی کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی البتہ دھند ختم نہیں ہوئی تھی میں نے سر جھٹکا آنکھیں ملیں۔ دھند اپنی جگہ موجود رہی تھی اور یہ شاید دوا کا اثر تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں میرے قابو میں تھے۔ مگر اس دھند کے ہوتے ہوئے میں فرار کی کوشش میں صرف ٹھوکریں کھا سکتا تھا یا مرشد ہاؤس کے باہر جانے کے بجائے مرشد کے بیڈ روم میں گھس سکتا تھا۔

میں نے بہتر سمجھا کہ اٹھنے اور گھومنے پھرنے کے بجائے لیٹ جاؤں اور دھند چھٹنے کا انتظار کروں۔ میں نے لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ ابھی تک انجکشن کے اثرات ظاہر نہیں ہوئے تھے۔ اس وقوع کو تقریباً آدھا گھنٹا ہونے کو آیا تھا اور انجکشن لگنے کے بعد پہلی بار میرے دل میں امید کی کرن جاگی کہ شاید انجکشن کا اثر نہیں ہوا تھا۔ مگر اس امید کے باوجود خدشات باقی رہے تھے۔ وقت گزرتا رہا پھر کمرے کے باہر آہٹ ہوئی تو میں سنبھل گیا۔ کئی افراد اندر آئے اور میں نے فاضلی کی آواز سنی۔ ”آپ کو یقین ہے جناب کہ یہ انجکشن اسی طرح اثر کرتا ہے؟“

”یقین ہے۔“ مرشد بولا۔ ”میں نے اس کا تجربہ کرایا ہے۔“

”مجھے یقین نہیں آ رہا جناب عالی۔“ فاضلی نے ضدی لہجے میں کہا۔

”جلد تمہیں یقین آ جائے گا۔“ سیکریٹری بولا۔ اس کا لہجہ معنی خیز تھا لیکن فاضلی نے اس کی بات پر توجہ نہیں دی تھی۔ اس نے مرشد سے کہا۔

”آپ اس شخص کو اتنی اچھی طرح نہیں جانتے جتنی اچھی طرح میں جان گیا ہوں۔ یہ شخص قسمت کا دھنی ہے۔ اس وقت بھی بچ کر نکل جاتا ہے جب اسے خود اپنے بچنے کا یقین نہیں ہوتا ہے۔“

”احمقانہ باتیں مت کرو۔“ مرشد نے ناگواری سے کہا۔ ”کوئی شخص ہمیشہ نہیں بچ سکتا ....وہ کیا کہتے ہیں....اونٹ ہاتھی کے نیچے آتا ہے۔“ مرشد نے اپنی جہالت کا ثبوت دیتے کہا۔ سیکریٹری نے تصحیح کی۔

”پہاڑ تلے جناب۔“

”ایک ہی بات ہے، کہنے کا مطلب ہے کہ اپنے سے بڑی چیز کے نیچے آتا ہے تو یہ بھی میرے قابو میں آگیا۔ اب یہ ساری عمر اسی طرح رہے گا۔“

”میں تو کہتا ہوں اسے اس کے ساتھیوں کے پاس تحفے میں بھیج دیں۔“ سیکریٹری نے مشورہ دیا۔ ”وہ بھی کیا یاد کریں گے۔“

میں نے دل ہی دل میں سیکریٹری کو اتنا اچھا مشورہ دینے پر شاباشی دی۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ نادان دوست سے دانا دشمن بہتر ہوتا ہے۔ نادان دوست کا کردار وسیم کے آدمی نے کیا اور فاضلی کو آزاد کرا دیا نتیجے میں خود اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا اور اب دانا دشمن کا کردار مرشد کا سیکریٹری ادا کر رہا تھا۔ فاضلی کی یقیناً اس سے لگتی تھی اس لیے اس نے فوراً درمیان میں ٹانگ اڑائی۔ ”لیکن پہلے اس کی تصدیق تو ہو جائے کہ یہ سچ مچ ہمیشہ کے لیے اپنا ذہن کھو چکا ہے۔“

”کسی ڈاکٹر کو دکھانا ہو گا۔“

”لیکن جناب صرف دماغ کا ڈاکٹر ہی تصدیق کر سکتا ہے۔“ سیکریٹری دبے لہجے میں بولا۔ ”اور اسے دکھانا خطرے سے خالی نہیں ہو گا۔“

”وہ کیا کر لے گا۔“ فاضلی بدتمیزی سے بولا۔ اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ اس کا کوئی علاج کیا گیا تھا اور ہیروئن کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

''بات جرأت کی نہیں ہتھیاروں کی ہے۔ جب تم وہ خوفناک گن حاصل کر سکتے ہو اور اسے استعمال کر سکتے ہو تو شہباز کے ساتھی تم سے زیادہ ان چیزوں کے بارے میں جانتے ہیں۔ وہ بھی خطرناک اسلحہ حاصل کر سکتے ہیں۔ مرشد ہاؤس پر آس پاس کی کسی پہاڑی سے راکٹ فائر کیے جا سکتے ہیں اس کے بعد یہ ملبے کا ڈھیر نہیں بن جائے گا؟ میں ان لوگوں کی طرح چھپ کر تو نہیں بیٹھ سکتا......'' مرشد کے لہجے میں لرزتے خدشات سن کر مجھے حقیقی خوشی ہوئی تھی۔ یہ فرعون صفت شخص اب خوف کھانے لگا تھا۔ جب سے ہم نے اینٹ کا جواب پتھر سے دینا شروع کیا تھا اس کا دماغ ٹھکانے پر آ گیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کے کسی بھی عمل کا فوری ردِعمل ہوگا۔

''بلکہ ہو سکتا ہے وہ اس وقت بھی کسی کارروائی کا منصوبہ بنا رہے ہوں۔'' سکریٹری نے لقمہ دیا۔ ''بدقسمتی سے ہمارے تمام ٹھکانے ان کے علم میں ہیں۔''

''اور یہ سب تیری وجہ سے ہوا۔'' مرشد کا لہجہ غضبناک ہو گیا۔ ''تو کیا سمجھتا تھا جیمز بونڈ بن جائے گا۔ تیرا سارا منصوبہ جوتا بن کر تیرے منہ پر پڑ گیا اور الٹا میں بھی مصیبت میں پھنس گیا۔''

''کیا فرق پڑتا ہے جناب عالی۔'' فاضلی سہمے انداز میں بولا۔ ''یہ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔''

''پہلے نہیں بگاڑ سکتے تھے لیکن اب یہ بھی طاقتور ہو گئے ہیں اور ہماری نظروں سے چھپے ہوئے ہیں۔ وہ دشمن زیادہ خطرناک ہوتا ہے جو نظروں سے اوجھل ہو۔''

یہ ساری گفتگو، بحث اور مباحثہ میرے پاس ہی جاری تھا۔ مرشد اتنا کھل کر اس وجہ سے بھی بات کر رہا تھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ دوا مجھ پر اثر کر چکی ہے۔ مرشد نے مجھے بتایا تھا کہ میں دس منٹ میں اپنی شخصیت سے محروم ہو جاؤں گا یعنی میں بھول جاؤں گا کہ میں کون ہوں۔ لیکن اس نے یہ وضاحت نہیں کی تھی کہ میں انسانی خصوصیات سے بھی محروم ہو سکتا ہوں یا نہیں جس میں سب سے اہم بولنا ہے۔ اب تک میں نہ تو اپنے ذہن و سوچ سے محروم ہوا تھا اور نہ ہی میری یادداشت میں کوئی خلل آیا تھا اس کا مطلب تھا دوا مجھ پر اثر نہیں کر سکی تھی۔ مگر میں ان لوگوں کو ایسا ہی تاثر دینا چاہتا تھا کہ دوا مجھ پر اثر کر چکی ہے۔ اگر فاضلی وہاں نہ ہوتا اور مجھ پر شک کا اظہار نہ کرتا تو مجھے اداکاری کرنے میں دشواری پیش نہ آتی۔ مرشد اور سیکریٹری کتنے ہی ہوشیار سہی لیکن وہ اس

طلب دب گئی تھی کیونکہ اس کے لہجے میں نہ تو نشہ تھا اور نہ ہی طلب والی بے چینی تھی۔ ''اسے اپنی فیس سے غرض ہوگی۔''

''تم اپنا منہ بند رکھو۔'' سیکریٹری نے اسے جھاڑ دیا۔ ''وہ اسے دیکھ لے گا اور پھر یاد رکھے گا۔ کسی وقت وہ گواہی دے سکتا ہے کہ اس نے شہباز کو کہاں اور کس حال میں دیکھا تھا۔''

''وہ اس کی جرأت نہیں کرے گا اور کرے گا تو اسے دیکھ لیں گے۔'' فاضلی نے کہا۔ ''ویسے معلوم کرنے کے دوسرے طریقے بھی ہیں۔''

''دوسرے طریقے.....؟'' مرشد نے پوچھا۔

''آپ نے اسے اکرم چشتی کے حوالے کیا تھا اب میرے حوالے کریں میں اپنی تسلی کروں گا۔''

میں نے اس بار بھی دل ہی دل میں فاضلی کو بے نقط سنائیں۔ وہ یقیناً اس بہانے اپنے دل کی بھڑاس نکالنا چاہتا تھا۔ ہماری قید میں اسے تشدد کا نشانہ نہیں بنایا گیا تھا لیکن ہیروئن کا عادی ضرور بنا دیا تھا اور وہ ہمیں بہت کچھ بتانے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اب وہ بدلہ لینے کے لیے بے چین تھا۔ یہ بات مرشد بھی سمجھتا تھا اس لیے اس نے انکار کر دیا۔ ''ابھی تمہاری اپنی حالت ٹھیک نہیں ہے اور میں نے بھی کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ دو چار دن اسے دیکھتے ہیں۔''

''یہ ٹھیک ہے اسے یہیں رکھتے ہیں۔'' سیکریٹری نے کہا۔ ''پتا چل جائے گا کہ انجکشن نے اس پر کیا اثر کیا ہے۔''

''میں تو سمجھا تھا وہ زہر کا انجکشن ہے۔'' فاضلی نے کہا۔ ''ویسے میں ٹھیک ہوں جناب عالی۔''

''خاک ٹھیک ہو۔'' مرشد نے اسے جھاڑا۔ ''اگر ٹھیک ہوتے تو اس آدمی کو مارنے کے بجائے یہاں لے آتے اور پھر ہم اس سے شہباز کے ساتھیوں کے بارے میں پوچھ لیتے ابھی تو ہم بالکل اندھیرے میں ہیں۔ وہ سب بہت بڑا خطرہ ہیں۔ اب اکیلا شہباز ہی دردِ سر نہیں رہا ہے۔''

''لیکن ان کا سرغنہ یہی ہے۔'' فاضلی نے اصرار کیا۔ ''میں کہتا ہوں واپس کرنے کا خطرہ مول نہ لیں اسے ٹھکانے لگا دیں۔''

''یہ ممکن نہیں ہے اس کے ساتھیوں کو پتا چل گیا ہے کہ یہ میرے پاس ہے۔ کئی گم نام کالز مرشد ہاؤس آ چکی ہیں کہ اگر شہباز کو کچھ ہوا تو مرشد ہاؤس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی۔''

''اتنی جرأت نہیں ہے اُن میں.....''

میدان کے کھلاڑی نہیں تھے۔ ان کے مقابلے میں فاضلی عملی آدمی تھا اور مجھے اسی سے خطرہ تھا کہ وہ میری اداکاری بھانپ لے گا۔ لیکن مجھے یہ رسک تو لینا تھا۔

میں نے آنکھیں کھولیں اور اٹھ بیٹھا۔ مرشد، سیکریٹری اور فاضلی بے ساختہ پیچھے ہوئے تھے۔ ان کے اس ردِعمل پر میں نے ردِعمل ظاہر کیا اور یوں بیڈ پر سکڑ گیا جیسے ڈر گیا ہوں۔ میں سہمی نظروں سے ان تینوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میرے ردِعمل پر مرشد اور سیکریٹری نے سکون کا سانس لیا سیکریٹری بولا۔ ''دیکھا جناب دوا نے اثر کیا ہے۔''

''یہ اداکاری بھی ہو سکتی ہے۔'' فاضلی نے الٹی رائے دی پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''شہباز.....ذلیل آدمی بولو.....''

وہ گالیاں دینے لگا اور پھر ایسی باتوں پر اتر آیا کہ عام حالات میں میں اس کی گردن مروڑنے کو ترجیح دیتا لیکن اس وقت میں مجبور تھا۔ میں یوں اس کی بکواس سن رہا تھا جیسے سب کچھ میرے سر سے گزر رہا ہو اور میں اس کے غضبناک انداز سے سہم رہا ہوں۔ میں نے تکیہ سینے سے لگا لیا اور گویا اس کے عقب میں چھپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے اس ردِعمل سے فاضلی کو حوصلہ ہوا اور اس نے آگے آ کر مجھے تھپڑ مارنا چاہا تو میں نے تکیہ آگے کر دیا اور حلق سے سہمی سہمی آوازیں نکالیں۔

''تم بیکار کی مشق کر رہے ہو۔'' سیکریٹری نے حقارت سے اسے آگاہ کیا۔ ''ایک ایسے شخص سے دشمنی نکال رہے ہو جو اب دوستی اور دشمنی کا مفہوم ہی نہیں سمجھتا۔''

''میں نہیں مانتا۔'' فاضلی نے مشتعل ہو کر کہا۔ ''یہ اداکاری کر رہا ہے۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔''

''ہو سکتا ہے۔'' مرشد نے کہا۔ ''لیکن ابھی اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔''

''یہ مجھے مار رہا ہے۔'' میں نے مرشد سے شکایت کی۔ ''یہ گندہ ہے۔''

وہ تینوں چونکے تھے۔ مرشد نے مجھے غور سے دیکھا۔ ''تم کون ہو؟''

''میں.....'' میں نے کہا اور سوچ میں گم ہو گیا جیسے یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ میں کون ہوں۔ پھر میں نے مرشد کی طرف دیکھا اور الٹا اسی سے سوال کیا۔ ''میں کون ہوں۔''

فاضلی نے ایک بار پھر بکواس کی اور مجھے ناقابلِ بیان الفاظ میں بتایا کہ میں کون ہوں۔ میں نے پھر مرشد سے شکایت کی۔ ''یہ گالی دے رہا ہے۔''

''فاضلی اپنا منہ بند رکھو۔'' مرشد نے اسے گھر کا پھر نرمی سے مجھ سے کہا۔ ''تمہیں کچھ یاد نہیں ہے؟''

''کیا یاد نہیں ہے؟''

''تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟''

''میں کون ہوں اور کہاں سے آیا ہوں؟'' میں نے اس بار بھی اس کا سوال دہرایا تو مرشد کسی قدر جھنجھلا گیا۔

''جناب اس کے سوالوں سے بھی ظاہر ہے کہ یہ اپنی شخصیت اور ذہن کھو چکا ہے۔ یہ سوچ کر سوال بھی نہیں کر سکتا ہے صرف اپنی حاجت بیان کر سکتا ہے۔ اسے فاضلی سے خوف ہوا تو اس نے شکایت کر دی۔ اسے بھوک لگے گی تب یہ بولے گا ورنہ اسے باقی چیزوں سے کوئی غرض نہیں ہے۔''

''یہ اداکاری ہے۔'' فاضلی تیز لہجے میں بولا۔ ''میں کہتا ہوں اسے میرے حوالے کر دیں میں ایک گھنٹے میں اسے سیدھا کر دوں گا۔''

''ایک گھنٹے میں تم اسے ادھیڑ کر صرف اپنا بدلہ لے سکو گے۔'' سیکریٹری نے تیز لہجے میں کہا۔ ''تمہیں ویڈیو دکھاتے ہیں کہ اکرم چشتی نے اس کے ساتھ کیا کیا اور پورے دن تک اسے اذیت دیتا رہا لیکن وہ اس سے ایک چھوٹا سا مطالبہ نہیں منوا سکا۔ تم کیا تیر مار لو گے۔''

''تیری وجہ سے میں پہلے ہی مشکل میں پڑ گیا ہوں۔'' مرشد نے سیکریٹری کی تائید کی۔ ''اب تو جا کر آرام کر.....اس کی فکر نہ کر۔''

مرشد نے نرم لہجے میں حکم دیا تھا اور فاضلی اچھی طرح سمجھتا تھا اب اسے یہاں سے چلے جانا تھا۔ اس کے جانے کے بعد مرشد نے سیکریٹری سے کہا۔ ''بھئی اس کا اچھی طرح خیال رکھو۔''

''آپ فکر نہ کریں جناب۔'' سیکریٹری بولا اور وہ دونوں بھی کمرے سے نکل گئے۔ مجھے ان کے لہجے معنی خیز لگے تھے۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ انہوں نے مجھ پر سو فیصد اعتبار کر لیا تھا۔ مشکوک وہ بھی تھے لیکن فاضلی کی طرح شک نہیں کر رہے تھے۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ انجکشن نے سچ مچ اثر کیا تھا یا نہیں۔ اس کے بعد ہی وہ میرے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرتے۔ میں بستر پر بیٹھا لاتعلقانہ انداز میں کمرے اور اس کی سجاوٹ کو دیکھ رہا تھا۔ یہ مرشد ہاؤس کا کمرا تھا اور اسی کے معیار سے سجا ہوا تھا۔ کمرے کے ساتھ ہی اٹیچ باتھ تھا۔ دو دن سے مجھے باتھ روم جانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس لیے میں نے موقع غنیمت سمجھتے ہوئے باتھ روم کا رخ کیا۔ جب

WWW.PAKSOCIETY.COM

باہر نکلا تو کمرے میں ایک خادمہ موجود تھی۔ اگرچہ وہ خاصی خوب صورت تھی اور عمر بھی بیس بائیس برس سے زیادہ نہیں تھی۔ اس نے کپڑے بھی قیمتی پہن رکھے تھے۔ لیکن چہرے کا بھونڈا میک اپ اور اس سے زیادہ بھونڈے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہاں خادمہ تھی اور تمام اقسام کی خدمات مہیا کرتی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے بے تکلفی سے کہا۔

"میں صدقے کیسی ہے میری سرکار؟"

میں اسے سپاٹ نظروں سے دیکھتا رہا پھر جا کر بستر پر بیٹھ گیا۔ خادمہ اس عدم توجہی پر کھسیا گئی۔ حالانکہ زبان کے ساتھ اس نے جسم کی زبان بھی استعمال کی تھی۔ اس بار وہ روکھے لہجے میں بولی۔ "بھوک لگی ہے؟"

میں نے اپنا پیٹ ٹٹولا اور سر ہلایا۔ "ہاں بھوک لگی ہے۔"

میں بولنے کے معاملے بہت محتاط تھا۔ کوشش کرتا تھا وہی لفظ دہراؤں جو سامنے والے نے کہے ہوں تاکہ میرا غائب دماغی کا تاثر قائم رہے۔ کوئی ایسا جملہ یا لفظ نہ کہوں جس سے ذہانت نظر آئے۔ خادمہ چلی گئی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ ٹرے میں کھانا سجا کر لے آئی اور میں کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ میں نے بدتمیزی سے کھانا شروع کر دیا جیسے بچے کھاتے ہیں۔ میں ایک پر دوسرا نوالہ منہ میں ڈال رہا تھا اور بے پروائی سے کام لیتے ہوئے گرا بھی رہا تھا۔ یہ کڑاہی نما گوشت اور موٹی تندوری روٹی تھی۔ بہ ظاہر یہ ملازمین کا کھانا تھا۔ بوٹیاں بھی ادھ گلی تھیں۔ میں جان بوجھ کر مسالے میں انگلیاں ڈبو رہا تھا۔ ڈٹ کر کھانے کے بعد میں نے ملازمہ کی طرف دیکھے بغیر بستر پر دراز ہو کر سر تکیے سے لگا لیا تھا۔ اگرچہ مجھے خود پر بہت جبر کرنا پڑا تھا لیکن میں نے ایسا ظاہر کیا کہ مجھے اپنے گندے ہاتھوں اور ان سے گندے ہو جانے والے کپڑوں کی کوئی پروا نہیں تھی۔ ملازمہ ٹرے اٹھا کر لے گئی۔ ملازمہ کے جانے کے کچھ دیر بعد فاضلی کمرے میں داخل ہوا تو میں چوکنا ہو کر بستر کے کونے میں سمٹ گیا جیسے فاضلی سے خوفزدہ ہوں۔ وہ دانت پیس کر بولا۔

"میرے ساتھ چالبازی نہیں چلے گی۔"

"چالبازی۔" میں نے سوچ کر کہا۔ "وہ جو ابھی کھانا لائی تھی۔ وہ چلی گئی۔"

فاضلی کی حالت خاصی بہتر لگ رہی تھی۔ حویلی کے تہ خانے میں وہ تباہ حال پڑا تھا۔ کپڑے گندے ہو رہے تھے اور برائے نام خوراک پھر مسلسل ہیروئن کے ڈوز نے اسے کمزور کر دیا تھا لیکن اس وقت وہ نہا دھو کر صاف ستھرا لگ رہا تھا۔ یقیناً اس کا فوری علاج شروع ہو گیا تھا اور اس نے ہیروئن استعمال نہیں کی تھی۔ ورنہ وہ غسل نہ کرتا۔ تمام نشہ کرنے والے نہانے سے بھاگتے ہیں کیونکہ اس طرح نشہ اتر جاتا ہے اور انہیں دوبارہ نشے کے لیے تگ و دو کرنا پڑتی ہے۔ شاید اسے ہیروئن کے نشے کے خلاف کوئی زود اثر دوا استعمال کرائی گئی تھی۔ اب اس قسم کی دوائیں آ چکی ہیں جو ایک دو ہفتے میں نشہ چھڑوا دیتی ہیں لیکن اس میں اہم کردار نشہ کرنے والا کا ہوتا ہے۔ اگر وہ نشہ چھوڑنا چاہتا ہے تو علاج کارگر ہوتا ہے دوسری صورت میں دنیا کا کوئی علاج کارگر ثابت نہیں ہوتا۔ ..... فاضلی مضبوط قوتِ ارادی کا مالک تھا اور ہیروئن نے اتنی جلدی اس کے اعصاب کو تباہ نہیں کیا تھا اس لیے وہ سنبھل جاتا اور جلد اس نشے سے چھٹکارا حاصل کر لیتا۔

میرا خیال تھا کہ میرے جواب پر فاضلی سیخ پا ہو جائے گا لیکن وہ سنجیدہ رہا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ "شہباز میں جانتا ہوں تم ہوش میں ہو، لیکن فکر مت کرو میں مرشد سے یہ بات نہیں کروں گا۔ بہ شرط کہ تم بھی بھول جاؤ کہ ہیروئن کی طلب میں میں نے تم لوگوں کو کیا کیا بتایا ہے۔"

میں نے دل ہی دل میں اسے برا بھلا کہا۔ وہ مرشد کے دل میں شک پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اب کہہ رہا تھا کہ وہ مرشد کو کچھ نہیں بتائے گا۔ ساتھ ہی وہ نہایت چالاکی سے مجھے دھمکا رہا تھا کہ میں مرشد کو اس کے بارے میں نہ بتاؤں۔ اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ اس صورت میں خود میرا راز فاش ہو جاتا۔ میرے لیے زبان بند رکھنے اور انجان بنے رہنے میں عافیت تھی۔ فاضلی کی بات کے جواب میں، میں کوئی ردِ عمل ظاہر کیے بغیر اسے گھورتا رہا۔ فاضلی نے کچھ دیر بعد کہا۔ "مرشد تمہارا دشمن ہے وہ تمہیں مروا دے گا۔"

میں نے آنکھیں پھیلائیں اور ڈرے ڈرے انداز میں بولا۔ "مار دے گا۔"

"ہاں اسے یقین ہے تم بنے ہوئے پاگل ہو اور حقیقت میں پوری طرح ہوش میں ہو۔"

"میں پاگل ہوں؟" میں نے سوچ کر سوال کیا۔

فاضلی نے ایک بار پھر دانت پیسے۔ "شہباز میں کہتا ہوں ہوش میں آؤ ورنہ تمہارے ساتھ بہت برا ہونے والا ہے۔"

"بچاؤ..... بچاؤ۔" میں نے لاؤڈ اسپیکر جیسی آواز نکالی۔ اگرچہ اس کے لیے مجھے اپنے پھیپھڑوں اور گلے کی قوت کو آخری حد تک استعمال کرنا پڑا تھا لیکن میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ فوراً ہی سیکریٹری اندر گھس آیا۔ شاید کہیں آس پاس ہی موجود تھا۔ میں بستر سے کودا اور اس سے چمٹ گیا۔ وہ بوکھلا گیا اس کا خیال تھا کہ میں نے اس پر حملہ کیا ہے۔ اس نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی لیکن میں اس طرح چمٹا تھا کہ وہ آسانی سے نہیں چھڑا سکتا تھا۔ وہ جتنا خود کو چھڑانے کی کوشش کرتا۔ میں اتنا ہی اس سے چمٹ رہا تھا اور ساتھ ہی چلا چلا کر کہہ رہا تھا .... "بچاؤ..... بچاؤ۔"

"کس سے بچاؤں..... چھوڑ مجھے..... تیری تو....."

فاضلی اس کی مدد کرنے کے بجائے بے تحاشا ہنس رہا تھا۔ اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "اب خود کو چھڑا کر دکھاؤ سیکریٹری صاحب..... تمہیں بھی پتا چلے ان معاملات میں آدمی کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔"

اب سیکریٹری بھی شور کر رہا تھا اور شاید شور سن کر ہی مرشد خود وہاں چلا آیا۔ اس نے گرج کر کہا۔ "کیا ہو رہا ہے یہ؟"

میں نے سیکریٹری کو چھوڑا اور مرشد سے چمٹ گیا۔ "مجھے بچاؤ یہ مجھے مار دے گا۔"

میں نے کسی کی طرف اشارہ نہیں کیا تھا اور میری ساری توجہ مرشد کو پکڑے رکھنے پر تھی۔ وہ بھی بوکھلا گیا۔ اس نے پہلے خود چھڑانے کی کوشش کی پھر فاضلی سے کہا۔ "اسے دور کرو۔"

فاضلی نے مجھے گردن سے پکڑ کر کھینچا تو میں نے سعادت مندی سے مرشد کو چھوڑ دیا اور پھر شکایتی لہجے میں کہا۔ "یہ گندہ آدمی مجھے مارے گا۔"

مرشد نے خون خوار نظروں سے فاضلی کی طرف دیکھا۔ "تو یہاں کیا کر رہا ہے۔"

"میں اسے دیکھنے آیا تھا۔" فاضلی جلدی سے بولا۔

"اور میں شور سن کر آیا تو یہ مجھ سے چمٹ گیا۔" سیکریٹری نے مرشد کے پوچھنے سے پہلے وضاحت کی۔ "یہ بہت خوفزدہ تھا۔ جناب یہ ہوش کھو چکا ہے۔"

جب میں نے مرشد کو پکڑا تو وہ خوف زدہ ہو گیا۔ لیکن اب وہ بھی سوچ میں پڑ گیا تھا۔ میں نے صرف اسے پکڑا تھا اور اس کے خلاف کوئی جارحانہ کارروائی نہیں کی تھی۔ میرا انداز فطری تھا حالانکہ اس بہانے میں نے مرشد اور سیکریٹری کے کپڑوں سے اپنے گندے ہاتھ اچھی طرح صاف کر لیے تھے۔ میں اچھی طرح سمجھتا تھا کسی جارحانہ کارروائی کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میں مرشد یا کسی کو نقصان پہنچا کر یہاں سے نہیں نکل سکتا تھا۔ فی الحال میری عافیت اسی میں تھی کہ اپنا ڈراما جاری رکھوں۔ اگر مرشد کو یقین آ جاتا کہ دوا نے مجھے بیکار کر دیا تب وہ شاید مجھے رہا کرنے کا فیصلہ کر لیتا مگر فاضلی منحوس نے پہلے اس کے ذہن میں شک کے بیج بو دیے تھے اور اب میرے سامنے ہمدرد بن رہا تھا۔ سیکریٹری نے مجھ سے جان چھوٹنے پر سکون کا سانس لیا تھا اور وہ باہر جاتے ہوئے بولا۔ "اس سے جان چھڑائیں جناب..... یہ پورا پاگل ہو گیا ہے۔"

"اچھا۔" مرشد نے دلچسپی سے مجھے دیکھا۔

"بہتر ہوگا کسی دماغ کے ڈاکٹر کو دکھا لیں۔" فاضلی نے ایک بار پھر یوٹرن لیا۔ مرشد نے سرد نظروں سے اسے دیکھا اور وہاں سے دفع ہو جانے کا حکم دیا۔ خود مرشد مجھے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھتا رہا تھا۔ اس وقت وہ کمرے میں اکیلا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے خاصی حد تک یقین ہو گیا تھا کہ میں اپنا شعور کھو چکا ہوں۔ اس نے نرمی سے کہا۔ "تم شہباز ہو۔"

"میں شہباز ہوں۔" میں نے بے یقینی سے کہا۔

"نہیں تم بلی ہو۔"

"میں بلی ہوں۔" میں نے فوراً تسلیم کر لیا۔

"بلی کی طرح بول کر دکھاؤ۔"

اگر میں بلی کی طرح بولتا تو یہ حماقت ہوتی، اس سے ظاہر ہوتا کہ کچھ چیزیں میری یادداشت میں ہیں۔ اس لیے میں اس کی طرف دیکھا۔ "بلی کی طرح کیسے بولتے ہیں؟"

"تمہیں نہیں معلوم کہ بلی کی طرح کیسے بولتے ہیں؟"

میں بے تاثر رہا اور سوال کا جواب بھی نہیں دیا۔ مرشد نے میرا معائنہ جاری رکھا تھا اور اب اس نے بھی اپنا چہرہ سپاٹ کر لیا تھا۔ اچانک اس کے لباس سے ٹون کی آواز آئی اور اس نے ایک چھوٹا واکی ٹاکی سیٹ نکالا۔ شاید مرشد ہاؤس کی حد میں رابطے کے لیے واکی ٹاکی استعمال کیے جاتے تھے۔ اس نے ایک بٹن دبایا اور بولا۔ "ہاں بولو....."

"اکرم چشتی آیا ہے جناب آپ سے ملنا چاہتا ہے۔" میں نے سیکریٹری کی مدھم آواز سنی۔

"اسے یہاں بھیج دو، میں گیسٹ ہاؤس میں ہوں۔"

چند منٹ بعد اکرم چشتی اندر آیا۔ وہ سادہ لباس میں تھا۔ یہ بہت اعلیٰ درجے کا تھری پیس سوٹ تھا لیکن اس پر یوں چڑھا ہوا تھا جیسے کسی لکڑ بھگے کو سوٹ پہنا دیا جائے۔ اس نے آتے ہی مشکوک نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر مرشد سے بولا۔ "جناب عالی یہ میں کیا سن رہا ہوں..... یہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

پاگل ہوگیا ہے؟''

''ظاہر ہے۔'' مرشد نے سر ہلایا۔ ''تم نے اس کے ساتھ جو کیا تھا اس کے بعد آدمی پاگل ہی ہوتا ہے۔''

''ڈراما کررہا ہے یہ۔'' وہ بدمزگی سے بولا۔ ''مزید تفتیش سے بچنے کے لیے سارے ملزم اسی قسم کے ڈرامے کرتے ہیں لیکن ڈرائنگ روم میں جاتے ہی دو منٹ میں سارے ڈرامے بھول جاتے ہیں۔''

''خوب، تم آدمی کو مار مار کر انسان سے دنبہ بنادو، اس کی کھال کھینچو اور اس میں بھس بھر کر کہو کہ وہ ڈراما کررہا ہے۔'' مرشد نے طنز کیا۔

''جناب عالی آپ کے لیے ہی سب کرتے ہیں ہمیں کسی کو مفت میں مارنے کا شوق تو نہیں ہے۔'' اکرم چشتی نے جوابی طنز کیا۔

''میں سوچ رہا ہوں اسے چھوڑ دوں۔'' مرشد نے اس کا طنز نظر انداز کرکے کہا تو اکرم چشتی چوکنا ہوگیا۔

''اسے کیوں چھوڑ رہے ہیں؟ اگر آپ کے کام کا نہیں رہا ہے تو میرے حوالے کردیں۔ ویسے بھی اس کی گرفتاری کے لیے خصوصی ٹیم بنی ہے میری واہ واہ ہوجائے گی۔''

یہ سن کر میرا خون خشک ہوگیا۔ اکرم چشتی کے ہاتھ آنے کا مطلب تھا وہ مجھ پر مشقِ ستم کرنے کے لیے بالکل آزاد ہوجاتا۔ یہاں تو وہ جو کررہا تھا وہ مرشد کی ہدایات کے مطابق کررہا تھا۔ اس پر بھی اس نے میرا حشر نشر کردیا تھا۔ مگر مرشد کے انکار سے میری جان میں جان آئی۔ اس نے کہا۔ ''یہ ممکن نہیں ہے.... اس کے ساتھیوں کی طرف سے دھمکیاں مل رہی ہیں اور وہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔''

اکرم چشتی نے خطرناک لوگوں کو ایک غلیظ گالی دی اور بولا۔ ''آپ اُن کی فکر نہ کریں.... ایک بار اس سانپ کا سر کچل دیں باقی سنپولیے خود فرار ہوجائیں گے کوئی آپ کے سامنے نہیں آئے گا پھر ہم ہیں آپ کی حفاظت کے لیے۔''

''تم پولیس والے۔'' مرشد نے پھر طنز کیا۔ ''آج کل تم بے چاروں سے اپنی حفاظت نہیں ہو پارہی ہے میری حفاظت کہاں سے کروگے۔ ویسے بھی میں اپنی حفاظت خود کرنے کا قائل ہوں۔ لیکن میں اب ان لوگوں سے زیادہ الجھنا نہیں چاہتا۔''

''آپ پیچھے ہٹ رہے ہیں جناب عالی۔'' اکرم چشتی نے کسی قدر مشتعل لہجے میں کہا۔

مرشد معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ''میں پیچھے ہٹ رہا ہوں لیکن تم آگے رہوگے۔ اب ان لوگوں سے تم نمٹوگے۔''

اکرم چشتی شاید یہ سوچ کر مشتعل تھا کہ مرشد نے دشمنی کا باب ختم کرنے کا فیصلہ کیا تھا اس لیے اس کی اہمیت بھی ختم ہوگئی تھی دوسرے اس نے مرشد کی خاطر ہمیں بھی دشمن بنالیا تھا اب مرشد اس کی پشت پناہی سے ہٹ جاتا تو اسے یقیناً مشکل کا سامنا کرنا پڑتا۔ مگر مرشد کی بات سے لگ رہا تھا کہ ایک طرف وہ ہمیں بے وقوف بنارہا تھا تو دوسری طرف اکرم چشتی کو بھی بے وقوف بنارہا تھا۔ وہ اسے ہمارے پیچھے لگا رہا تھا۔ یہ ایک تیر سے دو شکار والی بات تھی۔ اکرم چشتی بے وقوف نہیں تھا وہ مرشد کی بات سن کر بدکا۔ ''یہ کیسے ہوسکتا ہے جناب عالی.... دشمنی آپ کی ہے اور میں ان سے نمٹوں۔''

''تم ان کو قانون کی مار مارو گے.... شہباز پر پہلے ہی خاصے کیس ہیں اس پر مزید کیس بناؤ.... اس کے دوسرے ساتھیوں کو بھی ملوث کرو۔''

''یہ آسان نہیں ہے جناب.... ہمارے سامنے صرف عبداللہ ہے لیکن وہ بھی آسان شکار نہیں ہے۔ یہاں وہ راجا عمر دراز کا آدمی ہے اور اس کی رسائی بھی آئی جی تک ہی نہیں حزبِ اقتدار کی بلند کرسیوں تک ہے۔''

''اثر و رسوخ کی بات مت کرو۔'' مرشد نے غرور سے کہا۔ ''اس معاملے میں وہ میرا مقابلہ نہیں کرسکتا..... ایک بار ان کو مقدمات میں الجھا دیا گیا تو ان کی توجہ خود بہ خود میری طرف سے ہٹ جائے گی۔''

''اچھا جی۔'' اکرم چشتی نے بے دلی سے کہا۔ وہ صاف محسوس کررہا تھا کہ مرشد اپنی جان چھڑا کر اپنے دشمن اس کے سر مارنا چاہتا تھا اور مرشد کی وفاداری میں اس نے پہلے ہی ہم لوگوں کو اچھا خاصا دشمن بنالیا تھا۔ ابھی اس نے مجھ پر مشقِ ستم کیا تھا اور اسے بجا طور پر خطرہ تھا کہ میں چھوٹ گیا اور میں ٹھیک ثابت ہوا تو میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔ اس نے جو کیا تھا اس کے بعد معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کا فکر مند ہونا برحق تھا۔ اس نے مرشد سے کہا۔ ''آپ کو یقین ہے کہ یہ اپنا دماغی توازن کھوچکا ہے؟''

''سو فیصد یقین تو میں کسی پر نہیں کرتا۔'' مرشد نے صاف گوئی سے کام لیا۔ ''لیکن اس کے بارے میں مجھے بھی خاصی حد تک یقین ہے کہ یہ اپنی شخصیت کھوچکا ہے میں اس کے سامنے یوں گفتگو کررہا ہوں۔''

اکرم چشتی کو یہ بات شاید ہضم نہیں ہورہی تھی اس نے مشکوک لہجے میں کہا۔ ''جناب عالی جب یہ آخری بار بے ہوش ہوا تھا تو بالکل باہوش لوگوں کی طرح مجھے گالیاں دیتا ہوا بے ہوش ہوا تھا۔ پھر یہ دیوانہ کیسے ہوگیا؟''

مرشد غالباً اکرم چشتی کو انجکشن کے راز میں شامل نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے میری حالت کی ٹوپی اس کے سر رکھ رہا تھا۔ اکرم چشتی کے سوال پر اس نے بے نیازی سے کہا۔ ''مجھے کیا پتا.... لوگ تشدد سے کیسے پاگل ہوجاتے ہیں یہ بات ہماری پولیس سے بہتر کون بتا سکتا ہے۔''

مرشد کے طنز پر اکرم چشتی نے برا سا منہ بنایا۔ ''میں اسے چھوڑنے کے حق میں نہیں ہوں جناب.... اگر یہ آپ کے کام کا نہیں رہا ہے تو اسے میرے حوالے کردیں۔''

''کیا میں نے تم سے پوچھا ہے کہ اس کا کیا کرنا ہے۔'' مرشد نے سرد لہجے میں کہا۔ ''یہ میرا مسئلہ ہے اور میں جو چاہے کروں تم کون ہوتے ہو اعتراض کرنے والے؟''

مرشد کو غصے میں دیکھ کر اکرم چشتی نے عیاری سے پینترا بدلا۔ ''میری کیا مجال جناب عالی کہ اعتراض کروں میں تو عرض کررہا ہوں کہ ...... یہ شخص میرا سخت دشمن بن گیا ہے۔ آپ کے حکم پر میں نے اسے دو دن رگڑا ہے، اب یہ مجھے کہاں چھوڑے گا؟''

''اتنے کمزور ہو تم کہ ایک ملزم سے ڈر رہے ہو۔'' مرشد نے اس بار حقارت سے کہا۔ ''تھانے میں کیسے کام کرتے ہو؟ میرا خیال ہے تمہیں تو کسی آفس میں کام کرنا چاہیے۔''

''یہ بات نہیں جناب عالی۔'' اکرم چشتی نے صفائی پیش کی۔ ''دل گردہ آپ نے دیکھا ہے میرا.... لیکن یہ اور اس کے ساتھی سکہ بند دہشت گرد ہیں۔ یہ تو انڈیا میں بھی بڑی کارروائیاں کرکے آیا ہے۔''

''مجھے معلوم ہے انڈیا کو بھی شہباز ملک مطلوب ہے۔''

''تو ان کے حوالے کردیں جناب عالی۔''

''کیا مطلب؟'' مرشد نے اسے کڑے تیوروں سے دیکھا۔ ''کیا میرے ان سے تعلقات ہیں جو وہ مجھ سے کہیں اور میں شہباز ملک کو ان کے حوالے کردوں؟''

اکرم چشتی اپنے الفاظ کے جال میں پھنستا جارہا تھا۔ اس نے بوکھلا کر کہا۔ ''میرا یہ مطلب نہیں ہے جناب عالی۔''

''تمہارا مطلب میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے تم کس لیے آئے ہو۔'' مرشد نے اپنے لباس سے ہزار کے نوٹوں کی دو گڈیاں نکال کر اکرم چشتی کی طرف اچھال دیں۔ ''یہ لو اپنا انعام اور اب دوبارہ اس وقت آنا جب میں بلاؤں۔''

اکرم چشتی کے دانت نکل آئے تھے۔ ''سمجھ گیا جناب عالی.... بالکل سمجھ گیا۔''

اس کے جانے کے بعد مرشد مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''تم نے دیکھا شہباز ملک.... دنیا کیسے مطلب کی ہوتی ہے۔ یہ اکرم چشتی میرے آگے دم ہلاتا ہے لیکن اگر میں اس کے آگے ہڈی نہ ڈالوں تو یہ مجھ پر بھونکتا ہے اور ہڈی ملتے ہی دوبارہ دم ہلانے لگتا ہے۔ یہاں ہر شخص ایسا ہی ہے۔''

مرشد کمرے سے نکل گیا اس کے انداز سے اور گفتگو سے لگ رہا تھا اسے خاصی حد تک یقین آگیا ہے کہ میں دوا کی وجہ سے اپنی یادداشت اور ذہانت کھوچکا تھا۔ موقع ملتے ہی میں واش روم گیا اور..... ہاتھ منہ اچھی طرح دھوکر بلکہ خود پر پانی گرا کر واپس آیا۔ اکیلے ہونے کے باوجود میں نے اداکاری جاری رکھی تھی کیونکہ یہ مرشد ہاؤس تھا اور اس بات کا پورا امکان تھا کہ اس کمرے میں نگرانی کے آلات ہوں۔ یہاں اتنی چیزیں تھیں کہ خفیہ کیمرے اور مائک بہ آسانی ان میں چھپائے جاسکتے تھے۔ اگر میں کسی موقع پر عقل مندی کا مظاہرہ کرتا نظر آتا تو میرا بھانڈا پھوٹ جاتا اور اس کے بعد زیادہ خطرناک بات یہ ہوتی کہ مرشد مجھے دوبارہ انجکشن لگا دیتا۔

میں نہیں جانتا کہ انجکشن کا نیلا سیال مجھ پر کیوں اثر نہیں کرسکا تھا۔ اس کی کئی ایک وجوہات ہوسکتی تھیں۔ اول انجکشن ایکسپائر ہوگیا تھا اور اپنی افادیت کھوچکا تھا۔ نمبر دو مرشد نے اسے ایک سرد کنٹینر میں رکھا تھا یعنی دوا کو گرمی سے بچانا ہوتا ہے۔ لیکن میں نے انجکشن کنٹینر سے نکال کر خاصی دیر اپنے ہاتھ میں رکھا تھا اور پھر فاضلی نے اسے میرے بازو میں انجیکٹ کردیا تھا۔ وہ تقریباً دس منٹ کنٹینر سے باہر رہا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اتنی دیر میں باہر کی گرمی نے دوا کی کمپوزیشن کو متاثر کیا ہو اور وہ اپنی افادیت کھو بیٹھی ہو۔ ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی تھی کہ یہ نروکی دوا تھی اور فاضلی نے میرے بازو کے پٹھے میں سوئی گھسا دی تھی۔ ظاہر ہے دوا بھی پٹھے میں گئی اور اسے خون میں شامل ہونے میں خاصا وقت لگا جس سے دوا بے اثر ہوگئی۔ ان میں سے کوئی وجہ ہوسکتی تھی۔ بہرحال اصل وجہ اللہ کی طرف سے مدد تھی۔ جب تک اس کا حکم نہ ہو کوئی آپ کو نقصان نہیں پہنچا سکتا اور جب اس کا حکم آجائے تو کوئی آپ کو بچا نہیں سکتا...... یہ ایسا ہی ہے کہ جب وقت نہیں آتا تو لوگ بدترین حادثوں اور بیماریوں سے بھی بچ جاتے ہیں اور جب وقت آتا ہے تو بیٹھے بیٹھے مر

WWW.PAKSOCIETY.COM

جاتے ہیں۔

خادمہ دوپہر کا کھانا لائی تھی۔ اس کے خاصی دیر بعد مجھے رات کا کھانا ملا تھا۔ حالانکہ دوپہر میں میں نے ڈٹ کر کھایا تھا۔ مگر اس وقت مجھے دوبارہ بھوک لگ گئی تھی۔ اس بار چاول کے ساتھ دال تھی اور آلو کی بھجیا تھی۔ ظاہر ہے اس بار بھی کھانا ملازموں کے کچن سے آیا تھا اور یہ بھی غنیمت تھا ورنہ اب تک تو مار ہی کھانا آیا تھا۔ شکر ہے اس بار وہ چمچ لائی تھی اس لیے میرے ہاتھ گندے ہونے سے بچ گئے اور کھانا اس نے میز پر لگایا تھا اس لیے بستر بھی صاف رہا۔ میں نے ندیدے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے میز پر گرایا جو خادمہ نے خاصا برا مان کر صاف کیا اور جاتے جاتے مجھے بہت کچھ سنا گئی۔ میں نے اس کی بک بک ایسے سنی جیسے بھینس بین کی آواز سنتی ہے۔ کھانے کے بعد میں بچوں کی طرح سکڑ سمٹ کر بیڈ پر لیٹ گیا حالانکہ یہ خاصا بڑا بیڈ تھا۔ میں نے چہرہ تکیے میں چھپالیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہاں کوئی کیمرا لگا ہو اور اس میں میرے چہرے پر فکر انگیز تاثرات نظر آئیں۔

کچھ دیر میں کروٹیں لیتا رہا پھر اٹھ کر لائٹ کے سوئچ آف کردیے۔ کمرے میں تاریکی چھا گئی اور میں سکون سے لیٹ کر سوگیا۔ اگرچہ رات کی تاریکی میں بھی دکھانے والے کیمرے اب عام ہیں لیکن وہ چہرے کے تاثرات نہیں دکھاتے ہیں۔ رات کسی نے مداخلت نہیں کی اور میں آرام سے سوتا رہا۔ صبح ہوئی تو میری آنکھ خود کھل گئی۔ رات مجھے غور و فکر کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ مگر اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ اصل کام یہ تھا کہ میں اپنی اداکاری برقرار رکھوں اور مرشد کے یقین کو پکا کرتا رہوں کہ میں اپنی یادداشت اور عقل کھو چکا ہوں۔ اس اداکاری پر ہی میری رہائی کا انحصار تھا۔ لیکن دوسری طرف مرشد کو بہکانے والوں کی کمی بھی نہیں تھی۔ ان میں سرفہرست فاضلی تھا جو تنہائی میں میرا ہمدرد بن رہا تھا لیکن اصل میں وہ بہر صورت مجھے اس دنیا سے رخصت کرنا چاہتا تھا۔ اسے شدید خطرہ تھا کہ میری یادداشت درست ہوگئی اور میں نے مرشد کے سامنے اس کا بھانڈا پھوڑ دیا تو میرے بجائے اسے دنیا سے رخصت ہونا پڑے گا۔

مجھے بھوک اتنی نہیں لگ رہی تھی لیکن میں نے بے قراری زیادہ دکھائی تھی۔ کچھ دیر کمرے میں ٹہلتا رہا پھر دروازے پر ہاتھ مارے۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ اس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا یعنی آدھے گھنٹے بعد وہی طرحدار خادمہ ناشتا لے آئی۔ پہلی بار وہ آئی تو خاصی پُرجوش تھی۔ اس کے خیال میں اس کے حلقۂ عشاق میں ایک احمق کا مزید اضافہ ہوگا لیکن جب اس نے دیکھا کہ متوقع احمق تو کسی تو لو مور کی طرح اس سے بے نیاز تھا تو اس کا سارا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا تھا اور اب وہ میری شکم سیری کی خدمت مارے باندھے کررہی تھی اور جب میں کھاتے ہوئے گراتا تو وہ ڈانٹ ڈپٹ کے ساتھ برا بھلا کہنے سے بھی گریز نہیں کرتی تھی۔ اس وقت بھی وہ مجھے سنا کر اور برتن لے کر رخصت ہوئی تو میں مسکرا رہا تھا۔ اس کے بعد میں انتظار کرنے لگا کہ ابھی مرشد یا اس کے گرگوں میں سے کوئی آئے گا۔ لیکن دن گزرتا گیا اور کوئی سندیسہ نہیں آیا۔ میرا اضطراب بڑھ رہا تھا کیونکہ مرشد کو سوچ و بچار کا جتنا موقع ملتا میرے بارے میں اس کے ذہن میں زیادہ منفی خیالات آتے اور ان خیالات کے نتیجے میں اس کے شکوک بڑھتے تو میری رہائی کا امکان اتنا ہی کم ہوتا جاتا۔

مگر میں اس معاملے میں بے بس تھا۔ اس سے زیادہ اور کیا کرسکتا تھا جو اس وقت کررہا تھا۔ ہاں دعا ضرور کرسکتا تھا کہ اللہ میرے دشمنوں سے عقلِ سلیم چھین لے اور ان کو غلطی کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ لیکن ان کو اس غلطی پر پچھتانے کی مہلت نہ دے۔ یہ پورا دن بھی اداکاری کرتے گزر گیا اور شام تک میں اتنا عادی ہوگیا تھا کہ اب مجھے فاتر العقلی کی اداکاری کرنے کی کوشش نہیں کرنا پڑ رہی تھی بلکہ خود بہ خود اداکاری جاری تھی۔ مجھے لگنے لگا کہ اسی طرح میں اداکاری کرتا رہا تو چند دن بعد سچ مچ ہوش و حواس سے ہاتھ دھو بیٹھوں گا۔ سارا دن کمرے کی چیزوں اور آرائشی اشیا کا معائنہ کرکے مجھے خاصی حد تک یقین ہوگیا تھا کہ یہاں کوئی خفیہ کیمرا نہیں ہے لیکن مائک کی موجودگی عین ممکن تھی۔ اس کے باوجود میں نے ہوش کے مظاہرے سے گریز کیا۔ رات کا کھانا حسبِ معمول خادمہ کو طیش دلا کر کھایا اور وہ صفائی کے بعد مجھے برا بھلا کہتی ہوئی رخصت ہوئی۔

میں سونے کے لیے لیٹا تھا کہ فاضلی ایک مسلح آدمی کے ساتھ اندر آیا۔ اس نے کہا۔ ''اٹھ جا شہزادے تیری طلبی ہوئی ہے۔''

میں نے اٹھ کر اسے سوالیہ انداز میں دیکھا تو اس نے مجھے ہاتھ پکڑ کر بستر سے کھینچ لیا۔ میں چاہتا تو اسے جواباً کھینچ کر بستر پر لٹا دیتا اور ہمیشہ کی نیند سلا دیتا۔ جیسے ہی میں اپنے پیروں پر کھڑا ہوا اس نے مجھے دروازے کی طرف دھکا دیا۔ اس کے ساتھ آنے والا مسلح شخص پوری طرح مستعد تھا وہ اس کے ہاتھ میں چھوٹی نال والی لیکن نہایت مہلک گن تھی۔ اس کا فائر نزدیک سے کسی کے چیتھڑے اڑانے کے لیے کافی تھا۔ گارڈ تربیت یافتہ تھا کیونکہ اس نے مجھ سے مخصوص فاصلہ برقرار رکھا تھا۔ وہ مجھے لے کر باہر آئے۔ مرشد ہاؤس کا یہ حصہ عام ملازموں کے لیے ممنوع تھا کیونکہ وہاں گنے چنے افراد ہی نظر آئے۔ فاضلی مجھے ایک بڑے کمرے میں لایا اور بہ ظاہر یہ طبی امداد کے لیے مخصوص لگ رہا تھا کیونکہ وہاں دواؤں کی بو تھی اور فرسٹ ایڈ میں کام آنے والا سامان رکھا تھا۔ ایک اسٹیچر نما بیڈ تھا جس پر لٹا کر زخمی یا مریض کا معائنہ کیا جاتا تھا۔

''یہاں لیٹ جاؤ۔'' فاضلی نے مجھے حکم دیا اور میں نے اس کی تعمیل کی۔ میں اس سے خوف ظاہر کررہا تھا اور میں دیکھ رہا تھا اسے اس کی بہت خوشی ہورہی تھی اس لیے وہ کوشش کررہا تھا کہ مجھ سے زیادہ سے زیادہ درشت انداز میں پیش آئے تاکہ میں اور سہم جاؤں۔ فاضلی کمرے سے نکل گیا تھا۔ ایک منٹ بعد ایک ادھیڑ عمر اور گول مٹول سا شخص اندر آیا۔ اس نے گول فریم والی عینک لگا رکھی تھی۔ فاضلی اس کے پیچھے تھا اس نے گول مٹول آدمی سے کہا۔

''اس کو دیکھو..... یہ پاگل بنا ہوا ہے یا سچ مچ پاگل ہو گیا ہے۔''

گول مٹول آدمی ڈاکٹر تھا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے اسے زبردستی اس کام کے لیے لایا گیا تھا اس نے بادل ناخواستہ میری طرف پیش قدمی کی اور پاس آکر پہلے میری آنکھوں کا معائنہ کیا۔ نبض دیکھی اور پھر فاضلی کی طرف دیکھا۔ ''تم اسے پاگل کیوں کہہ رہے ہو؟''

''کیا یہ اپنی یادداشت اور شخصیت کھو چکا ہے؟''

گول مٹول آدمی نے بے بسی سے کہا۔ ''یہ میں کیسے بتا سکتا ہوں۔''

''تم نیورو فزیشن ہو۔'' فاضلی غرایا۔ ''اتنی سی بات نہیں بتا سکتے؟''

''ایسے کیسے بتا سکتا ہوں۔'' گول مٹول ڈاکٹر نے رو دینے والے لہجے میں کہا۔ ''تم مجھے میرے کلینک سے گن پوائنٹ پر اٹھا لائے ہو اور مجھ سے اس شخص کی ذہنی حالت کے بارے میں پوچھ رہے، خود اپنی حالت خراب ہورہی ہے۔ پتا نہیں صبح کس کا منہ دیکھا تھا..... ہاں یاد آیا اپنا ہی دیکھا تھا شیو کرتے ہوئے..... پہلی بیوی اللہ اسے کبھی نہ بخشے مجھے منحوس کہا کرتی تھی۔ آج خیال آتا ہے ٹھیک کہتی تھی۔''

مجھے ہنسی آنے لگی لیکن میں بالکل سنجیدہ رہا کیونکہ ڈاکٹر رو رہا تھا اور اس کی ذہنی حالت واقعی خراب نظر آرہی تھی۔ وہ جلدی جلدی بول کر اپنی فرسٹریشن نکال رہا تھا درحقیقت خود اسے طبی امداد کی ضرورت تھی۔ میں نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔ ''یہ رو رہا ہے؟''

''نہیں گا رہا ہوں۔'' ڈاکٹر نے جل کر کہا۔ ''جب میں روتا ہوں تو میری دوسری بیوی یہی کہتی ہو۔ اللہ اسے جلد جہنم رسید کرے۔''

بہ ظاہر ڈاکٹر بیویوں کا ستم رسیدہ لگ رہا تھا۔ وہ دوسروں کے اعصاب اور دماغ کا علاج کرتا تھا لیکن خود اس کے ذاتی اعصاب تباہ لگ رہے تھے۔ فاضلی کو اٹھا لانے کے لیے یہی ایک نمونہ ملا تھا۔ اس نے زچ لہجے میں کہا۔ ''ٹھیک ہے تم ایسے نہیں بتا سکتے لیکن پھر کس طرح بتا سکتے ہو اس شخص کے بارے میں۔''

''اسے میرے کلینک لے آؤ میں اسے وہاں داخل کر لیتا ہوں پھر مختلف ٹیسٹوں کی مدد سے پتا چلے گا۔''

فاضلی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اگر اسے کسی کلینک یا اسپتال لے جاسکتے تو تمہیں اٹھا لانے کا مشکل کام کیوں کرتے؟''

''پھر میں کیسے پتا کرسکتا ہوں۔ یہ دماغ کا معاملہ ہے اوپر سے کچھ پتا نہیں چلتا ہے۔''

''تم اس سے سوال کرکے تو کچھ اندازہ کرسکتے ہو؟''

گول مٹول ڈاکٹر نے میری طرف دیکھا اور اپنے ماتھے پر آئے پسینے کو صاف کرکے مجھ سے پوچھا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

میں نے غور کیا اور الٹا سوال کیا۔ ''میرا نام کیا ہے؟''

''اسے تو اپنا نام بھی نہیں معلوم۔'' ڈاکٹر نے فاضلی سے کہا۔

''اداکاری کررہا ہے یہ۔'' فاضلی بگڑ کر بولا۔

اپنی جان چھڑانے کے لیے ڈاکٹر نے مجھ سے کئی سوالات کیے اور میں نے تقریباً ہر سوال سے ایک سوال پیدا کرلیا۔ اس نے مایوس ہوکر نفی میں سر ہلایا۔ ''ایسے پتا نہیں چلے گا..... کہ یہ اداکاری کررہا ہے یا سچ مچ اپنی شخصیت کھو چکا ہے۔ ویسے اس نے جو جواب دیے ہیں وہ ایک یادداشت اور عقل سے محروم شخص ہی دے سکتا ہے۔''

فاضلی نے شک سے پوچھا۔ ''تمہارا مطلب ہے یہ اداکاری نہیں کررہا ہے؟''

WWW.PAKSOCIETY.COM

"امکان ہے۔" ڈاکٹر اب کسی قدر سنبھل گیا تھا۔

"ویسے اسے ہوا کیا ہے؟"

"ممکنہ طور پر اسے کوئی ایسی دوا دی گئی ہے جو دماغ پر اثر کرتی ہے اور یادداشت ختم کر دیتی۔"

"اس صورت میں تو یہ معاملہ اور بھی پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ اس کے ٹیسٹ ہوں گے اور پتا چلایا جائے گا کہ اسے کون سی دوا دی گئی ہے۔ تب جا کر فیصلہ ہوگا کہ اس کا دماغ متاثر ہوا ہے اور کس حد تک متاثر ہوا ہے۔"

"ٹیسٹ کی ضرورت نہیں ہے ویسے بھی وہ دوا اپنا نشان نہیں چھوڑتی ہے ہمیں صرف یہ پتا چلانا ہے کہ اس کے دماغ پر کس حد تک اثر ہوا ہے۔"

"اس کے لیے اسے کلینک لے جانا ہوگا۔"

فاضلی بگڑ گیا۔ "لگتا ہے تم ڈاکٹر نہیں گھسیارے ہو۔"

"میری دوسری بیوی بھی یہی کہتی ہے۔" ڈاکٹر جلدی سے بولا۔

"ٹھیک کہتی ہے۔" فاضلی نے اسے دروازے کی طرف دھکیلا اور پھر گارڈ سے بولا۔ "ہوشیار رہنا میں اسے ٹھکانے لگا کر آتا ہوں۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں جناب؟" ڈاکٹر چلّایا۔ "آپ نے تو کہا تھا مجھے بہ حفاظت واپس چھوڑ دیں گے۔"

"تجھے بہ حفاظت تیرے ٹھکانے تک ہی چھوڑنے جا رہا ہوں۔" فاضلی نے اسے کمرے سے باہر دھکیلا۔ کچھ دیر ڈاکٹر کا واویلا سنائی دیتا رہا پھر خاموشی چھا گئی۔ گارڈ کمرے میں آتے ہی ایک کونے میں چلا گیا تھا جہاں سے وہ مجھے پوری طرح نشانے پر رکھے ہوئے تھا اور اس دوران میں اس نے ایک لمحے کے لیے بھی توجہ مجھ پر سے نہیں ہٹائی تھی۔ وہ مرشد کے عام گارڈز سے مختلف نظر آ رہا تھا۔ اس کے انداز میں ایک پیشہ ورانہ جھلک تھی۔ جیسے وسیم کے ساتھیوں میں تھی۔ مجھے اس غدار کا خیال آیا جسے غداری کا صلہ موت کی صورت میں ملا تھا۔ اس نے دس لاکھ کے لالچ میں اپنی زندگی فروخت کر دی تھی اور اللہ ہی بہتر جانتا تھا کہ سستی بیچی تھی یا مہنگی۔ فاضلی کی پہلی کوشش ناکام رہی تھی۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ آرام سے بیٹھ جاتا۔ دو دن میں اس کی حالت میں نمایاں فرق آیا تھا اور کم سے کم ایسا لگ رہا تھا کہ اس نے ہیروئن کی ذہنی طلب سے نجات حاصل کر لی تھی۔ جسمانی طلب کے لیے یقیناً اس کا علاج جاری تھا۔ دواؤں اور خوراک سے اس کا سابقہ دم خم لوٹ آیا تھا۔

فاضلی کے جانے کے آدھے گھنٹے بعد مرشد اور سیکریٹری کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ ایک اضافی محافظ اور بھی تھا۔ وہ دروازے پر رک گیا تھا۔ مرشد نے کمرے میں موجود محافظ سے رپورٹ طلب کی اور اس نے لفظ بہ لفظ رپورٹ دی۔ مرشد کے چہرے پر ناگواری نظر آنے لگی۔ "یہ کیا احمقانہ حرکتیں کر رہا ہے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں اسے خود ڈاکٹر کو دکھانے کی ضرورت ہے۔" سیکریٹری نے مرشد کی تائید کی۔ "ہیروئن کے اثرات آدمی کا دماغ بھی الٹ دیتے ہیں۔"

میں اٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور بیڈ سے پاؤں لٹکا کر جھلا رہا تھا۔ مرشد نے غور سے میری طرف دیکھا۔ "میرا خیال ہے اب اسے چھوڑ دینا چاہیے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" سیکریٹری نے پھر تائید کی تو میں نے دل ہی دل میں اسے شاباشی دی۔

"لیکن فاضلی...." مرشد بولتے بولتے رک گیا۔

"آپ اس کی بات پر اتنی توجہ کیوں دیتے ہیں۔" سیکریٹری نے اسے قائل کرنے کی کوشش جاری رکھی۔ "مالک آپ ہیں وہ صرف ایک معمولی نوکر ہے۔"

سیکریٹری غالباً فاضلی کی اصل حقیقت سے واقف نہیں تھا لیکن مرشد کے انداز سے لگتا تھا وہ جانتا ہے کہ فاضلی اس کا بیٹا ہے اور شاید کسی وجہ سے مرشد اس کے بارے میں نرم گوشہ بھی رکھتا تھا۔ اسی وجہ سے وہ فاضلی کو عام ملازم سے زیادہ اہمیت دینے پر مجبور تھا۔ بلکہ عام ملازم کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ مرشد انہیں شطرنج کے پیادوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔ وہ بے دریغ انہیں استعمال کرتا اور جب ضرورت پڑتی تو پٹوا کر ایک طرف ڈال دیتا تھا۔ فاضلی کی اس کے نزدیک اہمیت تھی اور وہ اسے واپس حاصل کرنے کے لیے بے چین تھا۔ پہلے میرا خیال تھا کہ مرشد اس لیے اسے واپس حاصل کرنا چاہتا ہے کہ فاضلی اس کے اہم ترین رازوں سے واقف ہے۔ لیکن اب مجھے لگ رہا تھا کہ فاضلی کی واپسی میں مرشد اور اس کے درمیان اس تعلق کا عمل دخل تھا جو ان دونوں نے سب سے اور شاید ایک دوسرے سے بھی چھپا رکھا تھا۔ یعنی مرشد جانتا تھا کہ فاضلی اس کا نطفہ ہے لیکن وہ سمجھتا تھا فاضلی یہ بات نہیں جانتا ہے۔ اسی طرح فاضلی سمجھتا تھا کہ اس حقیقت سے مرشد ناواقف ہے کہ وہ اس کا باپ ہے۔

لیکن مرشد واقف تھا ورنہ وہ فاضلی کو اتنی اہمیت نہ دیتا اور نہ اسے اپنے آدمیوں میں سب سے اوپر لاتا۔ سیکریٹری اس کے خلاف تھا لیکن وہ مرشد کو فاضلی کی مرضی کے خلاف قدم اٹھانے پر آمادہ کرنے میں ناکام نظر آ رہا تھا۔ کم سے کم اس وقت مجھے مرشد کے تاثرات سے ایسا ہی لگ رہا تھا کہ وہ فاضلی کی مرضی کے بغیر مجھے رہا کرنے پر آمادہ نہیں تھا اور دوسری طرف فاضلی میرے دماغی معائنے پر بضد تھا۔ اس نے خود مجھے وہ مہلک انجکشن لگایا تھا اور مرشد نے یقیناً اسے دوا کے بارے میں بتا دیا ہوگا اور اس شخص کو بھی دکھا دیا ہوگا جس پر اس نے انجکشن کا تجربہ کیا ہوگا۔ اس کے باوجود فاضلی کو یقین نہیں آ رہا تھا غالباً اسے یہ یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اتنی آسانی سے کیسے شکار ہو گیا اور اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا تھا۔ وہ اپنا شک رفع کرنا چاہتا تھا۔ سیکریٹری اس دوران میں مرشد کو قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجھ سے نجات حاصل کر لے اور میرے ساتھیوں کے حوالے کر دیا جائے۔ انہیں یہی بتایا جائے کہ تشدد نے میرا دماغ الٹ دیا اور وہ بے چارے اس امید پر میرا علاج کراتے رہیں گے۔

"وہ اس میں لگ جائیں گے اور آپ کی جان چھوٹ جائے گی۔"

"وہ اتنی آسانی سے جان چھوڑنے والے لوگ نہیں تھا۔" مرشد نے نفی میں سر ہلایا۔ "لیکن یہ خیال بھی اچھا ہے اس طرح ان کی توجہ عارضی طور پر ہٹ جائے گی۔"

سیکریٹری اس جواب سے خوش ہوا اور اس نے کوشش مزید تیز کر دی۔ "اس کا ایک پہلو اور بھی ہے جناب، جب تک اسے رہا نہیں کیا جائے گا اس کے ساتھی چین سے نہیں بیٹھیں گے اور وہ اسے رہا کرانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ وہ ہمارے کسی ٹھکانے پر حملہ بھی کر سکتے ہیں۔"

مرشد کے ماتھے پر شکنیں آ گئیں۔ اس کا امکان تھا کہ وسیم اور میرے دوسرے ساتھی میرے لیے مرشد کے کسی ٹھکانے پر کارروائی کریں۔ اسے نقصان برداشت کرنا پڑتا۔ اس نے پھر تائید کی۔ "ہاں اس کا امکان تو ہے، ویڈیو دیکھنے کے بعد ان کے مشتعل فون آ رہے تھے۔"

"بس تو مناسب یہی ہے کہ اس سے جلد از جلد جان چھڑا لی جائے۔"

ایسا لگ رہا تھا کہ مرشد سیکریٹری سے تو متفق تھا لیکن وہ فاضلی کو قائل نہیں کر پایا تھا اور اصل مسئلہ یہی تھا۔ فاضلی کمرے میں داخل ہوا تو سیکریٹری برا سا منہ بنا کر خاموش ہو گیا۔ فاضلی نے اسے گھورا اور مرشد سے کہا۔ "اسے کسی اسپتال یا کلینک میں لے جا کر دکھانا ضروری ہے۔"

"یہ بالکل مناسب نہیں ہوگا، بات جتنے زیادہ لوگوں تک جائے گی ہمارے لیے اتنی ہی مشکلات پیدا ہوں گی۔"

"کوئی مشکل نہیں ہوگی۔" فاضلی نے تیز لہجے میں کہا۔ "اگر ہوئی بھی تو ہم کس لیے ہیں، کیا ہم نے چوڑیاں پہن رکھی ہیں۔"

سیکریٹری نے پھر برا سا منہ بنایا اور مرشد سے بولا۔ "میرا خیال ہے جناب عالی آپ اسے ہی اپنا مشیر بنا لیں، آنے والے انتخابات میں آپ کے راستے کی تمام رکاوٹیں یہ اکیلا دور کر لے گا۔"

"تم نے ٹھیک کہا، یہ کام بالآخر ہم جیسے لڑنے مرنے والوں کو کرنا پڑے گا الیکشن اب مشوروں کا کھیل نہیں ہے۔" فاضلی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"تم دونوں اپنی بکواس بند کرو۔" مرشد نے گرج کر کہا۔ "مجھے کنفیوژ کر دیا ہے۔"

"دیکھیں جناب میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں اسے جتنی دیر روکا گیا آپ کے لیے اتنی ہی مشکل ہوگی۔ اس کے ساتھیوں نے کوئی جوابی کارروائی کی تو ہمیں وہ نقصان بھی برداشت کرنا پڑے۔"

"تمہیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے تم مرشد ہاؤس میں بالکل محفوظ ہو۔" فاضلی نے حقارت سے کہا اور مرشد سے بولا۔ "آپ سن لیں جناب، جب تک پوری تسلی نہیں کر لیتے ہیں اسے چھوڑنا بالکل ٹھیک نہیں ہوگا، ویسے آپ جو حکم کریں۔"

فاضلی نے اپنی بات سامنے رکھ کر چالاکی سے فیصلہ مرشد پر چھوڑ دیا اور اب وہ سیکریٹری کی طرح دم سادھے مرشد کے جواب کا منتظر تھا۔ مرشد سوچ میں پڑ گیا تھا اور اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ خاصی مشکل میں ہے۔ ظاہر ہے اس کے لیے فیصلہ آسان نہیں تھا اگر وہ مجھے رہا کر دیتا اور بعد میں اسے پتا چلتا کہ میں بقائمی ہوش و حواس اسے احمق بناتا ہوا رخصت ہوا تو صدمے کے علاوہ اسے آنے والے حالات سے بھی نمٹنا پڑتا۔ دوسری طرف اگر مجھے رہا نہیں کرتا اور اس دوران میں میرے ساتھی کوئی کارروائی کرتے، مرشد کو جانی یا مالی نقصان ہوتا تو یہ بھی اس کے لیے اچھی بات نہیں تھی۔ زیادہ خطرہ اس بات کا تھا کہ اسے کوئی ناقابلِ تلافی نقصان نہ ہو جائے اور وہ مجھے گرفتار رکھنے پر مجبور ہو اور یوں اس جنگ کا دائرہ وسیع ہوتا جائے جسے مرشد

WWW.PAKSOCIETY.COM

اب سمیٹنا چاہتا تھا۔ خاصی دیر بعد اس نے گہری سانس لی اور فاضلی سے کہا۔ ”تمہیں کتنی مہلت چاہیے؟“
سیکریٹری کا چہرہ مرجھا گیا اور فاضلی کھل اٹھا تھا اس نے کہا۔ ”میں نے ڈاکٹر سے بات کی ہے اسے تین دن کا وقت چاہیے۔“
”ٹھیک ہے تمہارے پاس تین دن کا وقت ہے۔“ مرشد نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔
”اگر یہ ثابت ہوگیا کہ یہ مکاری کر رہا ہے؟“ فاضلی نے پوچھا۔
”تو میرے پاس ایسے درجن بھر انجکشن موجود ہیں۔“ مرشد نے مسکرا کر کہا اور وہاں سے روانہ ہوگیا۔ سیکریٹری مایوس تھا لیکن فاضلی خوش تھا۔ میرا دل ڈوبنے لگا لیکن میں بہ ظاہر جماہیاں لے رہا تھا۔ مرشد کے جانے کے بعد فاضلی نے مرشد ہاؤس کے ڈاکٹر کو طلب کیا شاید اسے میرے حوالے سے پہلے ہی کوئی ہدایت دی جا چکی تھی اس لیے اس نے آتے ہی انجکشن تیار کیا میری شرٹ کی آستین الٹ کر بازو پر ڈوری باندھی، نس ابھار کر اس نے انجکشن نس میں داخل کیا اور دوا انجیکٹ کر دی۔ میں دیکھ چکا تھا کہ انجکشن ڈائزاپام کا تھا یعنی نیند کی دوا تھی اس لیے میں نے مزاحمت نہیں کی ورنہ میں ضرور مزاحمت کرتا۔ انجکشن لگتے ہی میرا سر چکرانے لگا اور گرنے سے پہلے میں دوبارہ اسٹیچر نما بیڈ پر لیٹ گیا تھا اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔
جب میں بیدار ہوا تو ایک کمرے میں ایک بیڈ پر اس حالت میں لیٹا ہوا تھا کہ میرے دونوں ہاتھ فولادی ہتھکڑیوں سے بیڈ کے سرہانے والے کنڈے سے بندھے تھے اور میرے پاؤں بیڈ کے سامنے والے اینگل آئرن سے بندھے تھے۔ بستر بھی کسی اسپتال یا کلینک کا لگ رہا تھا اور وہاں وہ مخصوص بو بھی جو اسپتالوں میں آتی ہے۔ یہ دواؤں اور جراثیم کش دواؤں کی بو تھی۔ کمرے میں صرف ایک یہی بیڈ اور ایک اس کی سائیڈ دراز کے ساتھ ڈرپ اسٹینڈ تھا جو کونے میں رکھا تھا۔ وہاں خاموشی تھی اور سناٹا تھا جس میں صرف اے سی چلنے کی ہلکی سی سرسراہٹ سنائی دے رہی تھی۔
کمرے میں صرف ایک دروازہ تھا اور اس کے سوا کوئی کھڑکی یا روزن نہیں تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ یہ کمرا ساؤنڈ پروف تھا۔ میں کتنا ہی چلاؤں یہاں سے آواز باہر نہیں جائے گی۔ میں نے تجربے کے لیے کسی کو آواز دینے کا سوچا تھا کہ مجھے خیال آگیا کہ میں فاترالعقل تھا اور مجھے کسی ہوش مند آدمی کا شور شرابا نہیں کرنا چاہیے تھا اس لیے میں کسی چھوٹے بچے کی طرح شور شرابا اور مدد کے لیے چیخ و پکار کرنے لگا۔ میں انجانے لوگوں سے درخواست کر رہا تھا۔
”کوئی کھولو...... مجھے کھولو...... مجھے باندھا ہوا ہے...... مجھے کھولو۔“ میری کوشش تھی کہ میری آواز میں درد کے ساتھ بچکانہ پن رہے۔ مگر اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا۔ کسی نے ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میری آواز کسی کے کانوں تک نہیں جا رہی تھی یا جا رہی تھی تو اس نے توجہ نہیں دی۔ کمرے کی دیواریں اور چھت بالکل سادہ تھی۔ ایک طرف ٹیوب لائٹ لگی تھی۔ کوئی ایسی چیز یا جگہ نظر نہیں آئی جس میں کیمرا لگایا جا سکتا۔ یعنی یہاں کیمرا نہیں تھا البتہ مائک کی موجودگی کا امکان تھا۔ اس کا میں نے شور شرابے میں بھی خیال رکھا تھا۔ میں نے ہتھکڑیوں کو آزمایا کہ شاید ان میں کوئی کمزوری ہو۔ لیکن وہ بہت مضبوط تھیں۔ البتہ اس کو جھٹکے دینے سے بیڈ ہلا تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس کے نیچے پہیے لگے تھے۔ یعنی اسے ہلا کر کہیں لے جایا جا سکتا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ مجھے کسی اسپتال یا کلینک منتقل کر دیا گیا تھا اور شاید یہ اسی گول مٹول ڈاکٹر کا کلینک تھا جسے پہلے فاضلی نے گن پوائنٹ پر اٹھایا تھا لیکن شاید بعد میں اس نے اس سے مک مکا کر لیا تھا اور اب وہ پیسے کی خاطر یہی کام ہنسی خوشی کرنے کو تیار ہو گیا تھا۔ فاضلی نے مجھے نیند کا انجکشن لگوا کر یہاں منتقل کر دیا تھا۔ اب ڈاکٹر مشینوں یا ٹیسٹوں کی مدد سے میری دماغی حالت کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتا۔ کیونکہ اس سے پہلے میں نے کبھی اپنے دماغ کا معائنہ نہیں کرایا تھا اور نہ ہی کسی اور نے یہ زحمت کی تھی اس لیے میں نہیں جانتا تھا کہ آج کی میڈیکل سائنس اور ماہرین کس حد تک ترقی کر چکے تھے۔ وہ کسی شخص کی دماغی حالت کا اندازہ درست لگا سکتے تھے کہ وہ اپنے پورے ہوش میں ہے یا نہیں۔
البتہ میں نے سنا تھا کہ بہت سارے ملزم جیل میں پاگل بن جاتے ہیں تاکہ ان پر مقدمہ نہ چلایا جا سکے۔ ظاہر ہے ایسے شخص پر کیسے مقدمہ چلایا جا سکتا تھا جو اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے اپنے ہوش میں نہ ہو۔ ایسے لوگوں کا دماغی معائنہ کرایا جاتا ہے لیکن وہ ماہرین اور جدید ترین مشینوں کو بھی دھوکا دے جاتے ہیں۔ یعنی آج تک کوئی ایسی مشین یا طریقہ ایجاد نہیں ہوا جو انسان کے اندر کی خبر من و عن دے۔ ہر جگہ انسان اپنی قوت ارادی اور ذہنی مضبوطی سے شکست دے سکتا ہے۔ اس خیال سے مجھے حوصلہ ہوا تھا اگر میں ثابت قدم

رہوں تو کوئی ڈاکٹر اور کوئی مشین مجھے ہوش مند ثابت نہیں کر سکتی تھی۔ میں اندر ہی اندر خود کو مضبوط کرنے لگا کہ مجھے کسی صورت فاضلی کے حربوں سے شکست نہیں کھانی ہے۔
مرشد نے میرے خدشوں کی تصدیق کر دی تھی کہ اگر میں باہوش ثابت ہوا تو وہ ٹرائی ٹرائی اگین کے فارمولے پر عمل کرتے ہوئے مجھے پھر اسی دوا کا انجکشن دے گا اور اگر پھر بھی نتیجہ حسبِ پسند نہیں نکلا تو اس نے بتایا تھا کہ اس کے پاس درجن سے زیادہ انجکشن موجود تھے۔ وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے یہ سارے انجکشن مجھ پر خرچ کر سکتا تھا۔ میری عافیت اسی میں تھی کہ میں کسی طرح مرشد اور اس سے پہلے خبیث فاضلی کو یقین دلا سکوں کہ میں اپنے حواس اور شخصیت کھو چکا ہوں۔ میرے ہاتھ پیروں پر پڑی فولادی بیڑیاں اور کڑے بہت مضبوط اور ناقابلِ شکست تھے اس لیے تھک ہار کر میں نے کوشش ترک کر دی۔ فاضلی مجھے اچھی طرح جانتا تھا اسے معلوم تھا کہ میں ذرا سی کوتاہی اور کمی سے فائدہ اٹھا سکتا ہوں اس لیے اس نے کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی۔ اس نے اسپتال منتقل کرنے کے بعد مجھے پوری طرح بے بس کر دیا تھا۔ مجھے یقین تھا اس کمرے کے باہر فاضلی کے مسلح ماتحت ہوں گے جو میرے فرار کی کوشش کو ناکام بنانے کے لیے مستعد ہوتے۔ فاضلی نے انہیں اچھی طرح سمجھا دیا ہوگا کہ میرے فرار کی صورت میں انہیں کیا سزا ملے گی۔
میرے لیے صبر سے آنے والے حالات کا انتظار کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا اس لیے میں انتظار کرنے لگا۔ میرا اندازہ ہے کہ کوئی ایک گھنٹے بعد دروازہ کھلا اور ایک نرس ایک آدمی کے ساتھ اندر آئی۔ نرس نے ناشتے کی ٹرے اٹھا رکھی تھی اور آدمی خالی ہاتھ تھا لیکن اس کے لباس میں یقیناً کوئی ہتھیار تھا۔ وہ فاضلی کا گرگا تھا۔ نرس نے ناشتے کی ٹرے سائیڈ دراز پر رکھی اور نیپکن میرے سینے پر پھیلا کر چمچ سے مجھے دودھ ملا پورج کھلانے لگی۔ میں نے بلاتکلف پورج کھایا، اس کے بعد اس نے مجھے دو عدد ابلے انڈے چھلکے کر کے اور نمک کالی مرچ چھڑک کر کھلائے۔ آخر میں اس نے گھونٹ گھونٹ کر کے مجھے چائے پلائی تھی۔ یہ خاصا تسلی بخش قسم کا ناشتا تھا اور اب میں فاضلی اور ڈاکٹر سمیت ہر آفت کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھا۔ نرس قبول صورت اور تجربے کار تھی اس لیے اس کا انداز مشینی تھا۔ اپنی ڈیوٹی بھگتا کر وہ آدمی سمیت چلی گئی۔ اس دوران میں ان دونوں نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں نے نرس سے شکایت کرنے کے انداز میں کئی بار کہا کہ مجھے باندھ کر رکھا ہے مجھے درد ہو رہا ہے لیکن اس نے کوئی توجہ نہیں دی اور اپنا کام کرتی رہی۔
میرا خیال تھا کہ جلد مجھے کسی آزمائش سے گزرنا پڑے گا اور میرا خیال درست نکلا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد دروازہ دوبارہ کھلا اور اسی آدمی کے ساتھ ایک تنومند اور نوجوان وارڈ بوائے اندر آیا۔ اس نے میرے بیڈ کو عقب سے پکڑ کر دھکیلنا شروع کیا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ فاضلی کا آدمی بھی ساتھ تھا۔ راہداری کے جس سرے پر یہ کمرا تھا اس کے آخری سرے پر ایک بڑا ہال نما کمرا تھا جس میں کئی طرح کی جدید مشینیں لگی تھیں۔ وہاں وہی گول مٹول ڈاکٹر اور فاضلی موجود تھے۔ ان کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ ان کے درمیان انڈر اسٹینڈنگ ہو چکی ہے اور وہ میرے معاملے میں ایک ہیں۔ ”اسے کھول دو۔“ ڈاکٹر نے وارڈ بوائے سے کہا۔
”اسے کھولنا ضروری ہے؟“ فاضلی نے مداخلت کی۔
”ظاہر ہے اسے بیڈ سمیت تو اسکینر میں نہیں ڈال سکتے۔“ ڈاکٹر نے ایک بڑی مشین کی طرف اشارہ کیا جس کے درمیان میں گول خلا تھا اور اس خلا سے فولادی تختہ باہر نکلا ہوا تھا۔ فاضلی نے سر ہلاتے ہوئے پستول نکال لیا۔ ڈاکٹر کا رنگ اُڑ گیا تھا اس نے بوکھلا کر کہا۔ ”اس کی کیا ضرورت ہے؟“
”ضرورت ہے تم اس شخص کو نہیں جانتے، اسے موقع مل گیا تو یہ مجھ سمیت سب کو لمبا لٹا کر نکل جائے گا۔“
نوجوان وارڈ بوائے نے یوں ڈرتے ڈرتے میری ہتھکڑیاں کھولیں جیسے میں کوئی زہریلا سانپ ہوں اور آزاد ہوتے ہی اسے ڈس لوں گا۔ میں بیڈ سے نیچے اترا تو وہ فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ ڈاکٹر نے دور سے مجھ سے کہا۔ ”اس پر لیٹ جاؤ۔“ اس کا اشارہ مشین سے نکلے تختے کی طرف تھا۔ یہ شاید سی ٹی اسکین یا اسی قسم کی کوئی مشین تھی۔ میں نے غور سے مشین کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلایا۔
”نہیں تم مجھے اس میں بند کر دو گے۔“
”نہیں ہم تمہارا علاج کر رہے ہیں۔“ ڈاکٹر نے چمکار کر کہا۔ ”شاباش اس میں لیٹ جاؤ۔“
میں نے ظاہر کیا کہ ڈاکٹر کے پیار بھرے لہجے نے مجھے متاثر کیا ہے اور میں خاموشی سے تختے پر لیٹ گیا۔ ڈاکٹر کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

اشارے پر وارڈ بوائے نے آگے آ کر میرے دونوں ہاتھ سیدھے کر کے سینے پر بیلٹ باندھ دی۔ ایسی ہی دو بیلٹیں اس نے میرے پیٹ اور نیچے گھٹنوں سے ذرا اوپر کسی تھیں۔ اب میں تختے میں بالکل فکس ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے میرے سر اور سینے پر کوئی چار عدد الیکٹروڈ لگائے اور پھر ایک طرف لگے کمپیوٹر کے کی بورڈ پر چند بٹن دبائے۔ اس کے ساتھ ہی مشین آن ہو گئی اور تختہ خود بہ خود کھسک کر اندر جانے لگا۔ ایک منٹ کے اندر میں مشین کے اندر تھا اور اس میں دائرے میں تیز روشنیاں جل بجھ رہی تھیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ کس قسم کی مشین تھی اور میرے ساتھ کیا فنکشن کرتی۔ روشنیوں کے ساتھ ساتھ پانی کے کھولنے جیسی سنسناتی ہوئی آواز بھی آ رہی تھی۔ شاید اس وجہ سے مجھے باہر کی کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ شروع میں گھومتی روشنیوں کی تیزی سے میرا سر چکرایا تھا لیکن جلد میں نے خود پر قابو پالیا تھا۔ میں شاید آدھے گھنٹے مشین میں رہا اور اس دوران صبر سے کام لیتا رہا۔ ورنہ مجھے تو اسپتال کے ماحول سے وحشت ہوتی ہے۔ چہ جائیکہ اس چھوٹی سی مشین میں بند ہو جانا۔

جب مجھے باہر نکالا گیا تو شاید میرے چہرے پر بھی اس وحشت کے آثار نظر آ رہے تھے۔ ڈاکٹر اور فاضلی دونوں خاموش تھے اور مجھے نہیں معلوم کہ ان کے درمیان کیا بات ہوئی تھی۔ وارڈ بوائے نے بیلٹ کھولیں اور میں کود کر نیچے اتر آیا۔ ''مجھے اس میں کیوں بند کیا؟'' میں نے ڈاکٹر سے پوچھا اصل میں، میں اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ وہ کس نتیجے پر پہنچے تھے۔

''کچھ نہیں ہم تمہارا علاج کر رہے ہیں۔'' وہ پہلے کی طرح نرمی سے بولا۔ ''تمہیں کچھ یاد نہیں ہے۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ تمہیں تمہارا ماضی یاد آ جائے۔''

''میرا ماضی؟''

''ہاں تم سب بھول چکے ہو۔'' ڈاکٹر بولا۔

میں نے محسوس کیا کہ فاضلی ڈاکٹر کی باتوں سے متفق نہیں تھا۔ لیکن اس نے ڈاکٹر کی رائے کو مسترد بھی نہیں کیا تھا۔ وہ خاموش تھا۔ یقیناً اس ٹیسٹ میں ڈاکٹر کو ایسا کوئی سراغ نہیں ملا تھا جس سے وہ میری سمجھ بوجھ کے بارے میں حتمی فیصلہ کر سکتا تھا بلکہ وہ میری اداکاری سے متاثر نظر آ رہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں دعا کی کہ وہ اس اداکاری سے متاثر ہی رہے۔ مجھے ایک بار پھر بیڈ پر لٹا کر ہتھکڑیوں سے باندھ دیا گیا۔ حالانکہ ڈاکٹر نے دبی زبان میں کہا۔ ''اس سے مجھے مشکل پیش آئے گی یوں باندھنے سے آدمی کی ذہنی حالت ویسے ہی ڈسٹرب ہو سکتی ہے۔''

''تم اس معاملے میں دخل مت دو۔'' فاضلی نے رکھائی سے جواب دیا۔ ''تم اس کام کی طرف توجہ دو جس کے لیے تمہیں پچاس ہزار معاوضہ دیا گیا ہے۔''

''میں اسی کام کے لیے کہہ رہا ہوں۔'' گول مٹول ڈاکٹر نے خفگی سے کہا۔ ''خیر تمہاری مرضی... اب اس کے کچھ بلڈ اور یورین ٹیسٹ ہوں گے۔''

بلڈ سیمپل تو وارڈ بوائے نے وہیں لے لیا تھا اور یورین ٹیسٹ اس نے مجھے کمرے میں لا کر لیا۔ اس دوران میں فاضلی کا آدمی بھی وہاں موجود تھا لیکن میں شرما بھی نہیں سکتا تھا۔ اس طرح باندھنے کے بعد ظاہر ہے مجھے بیڈ پان ہی کرنا تھا۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر میں نے یہ مرحلہ بھی طے کر لیا۔ اگرچہ مجھے گھن آ رہی تھی لیکن مجبوری تھی۔ فاضلی مجھے آزادی کا ایک لمحہ دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ مرشد کے آدمیوں میں وہی مجھ سے سب سے زیادہ واقف تھا بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ وہ مرشد سے زیادہ مجھے جانتا تھا۔ ہمارا کئی بار آپس میں براہِ راست ٹکراؤ ہو چکا تھا۔ اس کا خدشہ درست تھا کہ اگر میں اداکاری کر رہا تھا تو مجھے آزادی کا موقع نہیں دیا جا سکتا تھا۔ وہ اسی مفروضے کے تحت مجھ سے پیش آ رہا تھا۔

فاضلی نے ڈاکٹر کو بتا دیا تھا کہ مجھے دی جانے والی دوا کا میرے جسم میں اب کوئی نشان نہیں ملے گا اس کے باوجود وہ میرا بلڈ اور یورین ٹیسٹ لے رہا تھا۔ ممکن ہے وہ دوا کے بجائے کچھ اور معلوم کرنا چاہ رہا ہو۔ وارڈ بوائے کے جانے کے کچھ دیر بعد وہی نرس آئی جس نے مجھے ناشتا کرایا تھا اس نے مجھے ایک انجکشن دیا اور ایک منٹ سے بھی پہلے میں سو چکا تھا۔ جیسا کہ جاگنے کے بعد مجھے علم ہوا کہ یہ فاضلی کے حکم پر ہوا تھا۔ مجھے جاگ آئی تو میں کمرے میں اکیلا نہیں تھا۔ فاضلی اور گول مٹول ڈاکٹر بھی موجود تھے۔ وہ آپس میں بات کر رہے تھے۔ ڈاکٹر برہم تھا اس نے فاضلی سے کہا۔ ''تم اچھا نہیں کر رہے ہو اس طرح مداخلت کر کے۔''

''یہ مداخلت نہیں ہے میں بہتر سمجھتا ہوں اس شخص کو کس طرح رکھنا چاہیے۔''

''یہ مداخلت ہی ہے جب میں نے کہا تھا اسے نیند کی یا کسی قسم کی کوئی دوسری دوا نہیں دینی ہے تو پھر تم نے اسے کیوں انجکشن لگوایا؟''

''میں نے کہا نا یہ ضروری ہے۔''

''اس طرح میں نہیں بتا سکتا کہ یہ شخص ہوش میں ہے یا نہیں ہے۔'' ڈاکٹر نے واضح کہا۔ ''ناکامی کی تمام ذمے داری تم پر ہوگی اور تم مجھے الزام نہیں دے سکتے۔''

''تم اپنا کام کرو۔'' فاضلی نے سرد لہجے میں کہا۔ ''میں تمہیں الزام نہیں دوں گا۔ یہ بتاؤ کہ ٹیسٹ کے کیا نتائج نکلے؟''

''نیگیٹو۔'' ڈاکٹر نے مایوسی سے کہا۔ ''اگر یہ لاشعوری طور خوف زدہ ہوتا تو اس کے خون میں کچھ ہارمون شامل ہو جاتے لیکن ٹیسٹ میں ہارمون نہیں آئے۔''

''لاشعوری، سے کیا مراد ہے؟''

باشعور آدمی خود پر قابو رکھ سکتا ہے اس لیے ایسی سچویشن میں جب آدمی خوف محسوس کرتا ہے تو یہ ہارمون خون میں شامل نہیں ہوتے لیکن لاشعوری طور پر خوف بہت مضبوط ہوتا ہے اس لیے ہارمون لازمی خون میں شامل ہوتے ہیں اور ان کا اثر یورین میں بھی آتا ہے۔ اس لیے میں نے اسکین کے فوراً بعد اس کے ٹیسٹ لیے تھے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ اس نے خود پر قابو رکھا اور یہ ہوش میں ہے۔'' فاضلی نے فوراً نتیجہ اخذ کیا۔

''یہ تمہارا خیال ہے۔'' ڈاکٹر نے تلخی سے کہا۔ ''تم نے اسے بندھوا کر اچانک خوف زدہ ہونے والی کیفیت سے دوچار ہونے نہیں دیا۔ یہ پہلے سے اس سلوک کے لیے تیار تھا۔ اس لیے ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ یہ ہوش میں ہے یا نہیں ہے۔''

اس جواب سے فاضلی مایوس ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ''تم دونوں باتیں کر رہے ہو۔''

''میں اور کیا کروں یا تو تم مداخلت بند کر دو اور مجھے میرا کام کرنے دو یا پھر نتائج کی ذمے داری قبول کرو۔''

''مداخلت تو میں کسی صورت نہیں چھوڑ سکتا۔'' فاضلی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''ہاں ذمے داری قبول کر سکتا ہوں۔''

''آخر تم یہ سب کیوں کر رہے ہو کیا یہ شخص تمہارا دشمن ہے؟''

''ہاں اور یہ پولیس کو بھی مطلوب ہے۔''

''تو اسے پولیس کے حوالے کرو۔''

''یہی کرنا ہے۔'' فاضلی نے چالاکی سے کہا۔ ''مجھے شبہ ہے یہ بچنے کے لیے ڈھونگ رچا رہا ہے اس کا پتا چلنا چاہیے کہ یہ ہوش میں ہے یا نہیں۔''

''دیکھو میں تمہیں بتا رہا ہوں اس قسم کے دھوکے کا پتا چلانا بہت دشوار ہے۔ آج تک کوئی ایسی مشین یا طریقہ ایجاد نہیں ہوا جو انسان کی درست دماغی کیفیت کی نشان دہی کر سکے۔ میرے علم میں چار افراد کا قاتل شخص ہے جو دس برس تک کامیابی سے ڈاکٹروں کو پاگل پنے کا دھوکا دیتا رہا۔ وہ دس سال پاگل خانے میں رہا اور موقع ملنے پر فرار ہو گیا لیکن بدقسمتی سے دو دن بعد ہی پکڑا گیا اور اس پر عدالت میں مقدمہ چلا، اسے پھانسی کی سزا ہو گئی۔ اس مقدمے کے دوران اس نے اعتراف کیا کہ وہ دس سال تک پاگل بن کر ڈاکٹروں کو دھوکا دیتا رہا۔ میں عدالت کی طرف سے بنائے جانے والے میڈیکل بورڈ میں شامل تھا۔''

''میں نے سنا ہے کہ ایسی دوائیں ہیں جو انسان کے لاشعور پر اثر کرتی ہیں اور وہ بے اختیار سچ بولنے لگتا ہے۔''

''ایسی دوائیں ہیں لیکن ان کو خاص حالات میں ہی استعمال کیا جاتا ہے اور عام طور سے مریض کی رضامندی سے استعمال کیا جاتا ہے اگر وہ راضی نہیں ہوتا اور مدافعت کرتا ہے تو یہ دوائیں بھی اثر نہیں کرتی ہیں، یوں سمجھ لو کہ دماغ دنیا کی طاقتور ترین مشین ہے اور جب تک یہ خود اجازت نہ دے باہر سے کوئی اس میں مداخلت نہیں کر سکتا۔''

''میں بھی ایسا ہی سمجھتا تھا۔'' فاضلی نے کہا۔ ''لیکن جانتے ہو اس شخص نے میرے ساتھ کیا کیا؟... اس نے مجھے ہیروئن کا عادی بنا دیا اور میری ساری مزاحمت ختم ہو گئی۔''

''وہ دوسری بات ہے، نشے کی جسمانی طلب نے تمہیں مجبور کیا۔ ویسے تم چاہو تو یہ حربہ اس پر بھی آزما سکتے ہو۔''

''اتنا وقت نہیں ہے، یہ بتاؤ اسے کتنی دیر میں ہوش آئے گا؟''

''مزید ایک گھنٹا لگے گا۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ''لیکن میں اس کا جو اگلا ٹیسٹ کرنے والا تھا وہ اب ذرا تاخیر سے ہوگا جب یہ نیند کی دوا کے اثر سے مکمل نجات حاصل کر لے گا۔''

''اگلا ٹیسٹ کیا ہے؟''

''میں اسے جھوٹ اور سچ پکڑنے والی مشین سے ٹیسٹ کروں گا اسے پولی گراف کہتے ہیں۔''

''اچھا۔'' فاضلی نے دلچسپی سے کہا۔ ''یہ کس طرح جھوٹ پکڑتی ہے؟''

''مختلف طریقوں سے۔ اس میں انسان کی سانس، دل

WWW.PAKSOCIETY.COM

کی دھڑکن، بلڈ پریشر اور دماغ کی لکیروں کے گراف کی مدد سے اندازہ کیا جاتا ہے کہ بولنے والا سچ بول رہا ہے یا جھوٹ۔"

"صرف اندازہ۔" فاضلی نے مایوسی سے کہا۔

"ہاں اور اہم بات یہ ہے کہ بچے، پاگل اور نشے کے عادی فرد پر یہ ٹیسٹ بیکار رہے۔ اسی طرح جو شخص مستقل بلڈ پریشر کا مریض ہو اس کے ٹیسٹ کا نتیجہ بھی نہیں نکلتا۔"

"یعنی یہ سچ مچ پاگل ہو گیا ہے تو اس ٹیسٹ کا نتیجہ تب بھی درست نہیں ہوگا۔"

"یہ تو ہے۔" گول مٹول ڈاکٹر نے اعتراف کیا۔ "لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں؟ کسی شخص کے پاگل ہونے یا نہ ہونے کا اندازہ اسی طرح لگا سکتے ہیں۔"

"ایک دماغ کا ٹیسٹ بھی ہوتا ہے جیسے مشین دل کا ٹیسٹ کرتی ہے جسے ای سی جی کہتے ہیں۔"

"دماغ کے ٹیسٹ کو ای ای جی کہتے ہیں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "یہ گراف کی مدد سے دماغی حالت بتاتا ہے۔ لیکن اس سے بھی یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ انسان سوچنے سمجھنے کے قابل ہے یا نہیں اور وہ اپنی یادداشت کھو چکا ہے یا نہیں۔"

"تب اس ٹیسٹ سے کیا معلوم کیا جا سکتا ہے؟" فاضلی نے بدمزگی سے کہا۔

"اس سے ٹیومر یا کسی فزیکلی ڈس آرڈر کا پتا چلتا ہے اور اگر دماغ مکمل ڈس آرڈر کا شکار ہو چکا ہو یعنی آدمی ایک سیکنڈ کے لیے بھی درست انداز میں نہ سوچ سکے اور اس کا ذہن اندر سے مچھلی بازار بن جائے تو الیکٹرونک لہریں اس کا پتا دیتی ہیں۔"

"یہ مکمل پاگل نہیں ہے صرف یادداشت کھو بیٹھا ہے اور عقل استعمال نہیں کر پا رہا ہے بس یوں سمجھ لو یہ پانچ چھ سال کے بچے جیسا ہو گیا ہے۔"

"پانچ چھ سال کا بچہ۔" گول مٹول ڈاکٹر نے سرد آہ بھری۔ "میرے دو بچے پانچ اور چھ سال کے ہیں۔ الگ الگ بیویوں سے، لیکن دونوں میرے بھی باپ ہیں۔"

"کیونکہ تم ان کے باپ ہو۔" فاضلی خطرناک لہجے میں بولا۔ "ڈاکٹر مجھے لگ رہا ہے تم اس معاملے میں سنجیدہ نہیں ہو۔ یہ مت سمجھنا کہ تم ناکام رہے تو میں اپنی رقم واپس مانگوں گا بلکہ یہاں تمہارے کلینک کی جگہ ملبے کا ڈھیر چھوڑ کر جاؤں گا۔"

گول مٹول ڈاکٹر ان چند دنوں میں دیکھ چکا تھا کہ یہ کتنے خطرناک لوگ تھے اور سچ مچ ایسا کرنے کے اہل تھے۔ وہ ڈر گیا اس نے منمنا کر کہا۔ "جناب پوری کوشش کر رہا ہوں اور آپ بھی میرے سر پر ہو دیکھ ہی رہے ہو۔ بے شک کسی دوسرے ڈاکٹر سے پوچھ لینا اس سے زیادہ کوئی نہیں کر سکتا۔"

"میں یہ سب نہیں جانتا مجھے بہر صورت اس کے بارے میں معلوم کرنا ہے کہ یہ ہوش میں ہے یا نہیں۔"

"تب آپ اسے میرے سپرد کر دیں۔ ابھی یہ ہوش میں آئے گا اور دوا کے اثرات مکمل ختم ہونے میں کئی گھنٹے لگیں گے اس کے بعد ہی اس کا پولی گراف ہوگا۔"

میرے ہاتھ پاؤں سے ہتھکڑیاں ہٹا دی گئی تھیں اور اب میں کم سے کم بستر کی قید سے آزاد تھا لیکن اس کمرے سے نکل جانا ممکن نہیں تھا۔ اول تو دروازہ ہی بند ہوتا اور اگر دروازہ کھول بھی لیتا تب بھی باہر فاضلی اور اس کے گرگے موجود تھے وہ مجھے بھلا کہاں جانے دیتے؟ بہر حال میں اس قید سے آزادی پر گول مٹول ڈاکٹر کا شکر گزار تھا جس نے فاضلی سے اختلاف کر کے مجھے بیڑیوں سے آزاد کرایا تھا۔ مجھے قبل از وقت ہوش آ گیا تھا اور میں نے فاضلی اور ڈاکٹر کی گفتگو سن لی تھی۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ مجھے آنے والے حالات کا پتا چل گیا تھا۔ پولی گراف ٹیسٹ کے بارے میں، میں نے سن رکھا تھا۔ ترقی یافتہ ممالک میں اس ٹیسٹ کی مدد سے بعض اوقات مجرم پکڑے بھی جاتے تھے لیکن عدالت اسے بہ طور ثبوت نہیں مانتی ہے۔ اسے صرف رائے قرار دیا جاتا ہے اور اس کی وجہ سے کسی کی بے گناہی یا جرم کا فیصلہ نہیں کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر کی بات درست ہے۔ دماغ دنیا کی طاقتور ترین مشین ہے۔ یہ مشین ایک سیکنڈ میں چھوٹے بڑے تیس فیصلے کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور اس کی رفتار کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا کا تیز ترین سپر کمپیوٹر بھی تین سال کے بچے کے دماغ کا مقابلہ نہیں کر سکتا...... یادداشت ذخیرہ کرنے کی صلاحیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ دو گھنٹے کسی مصروف بازار میں گزار کر ایک انسان جتنی یادداشت اپنے دماغ میں محفوظ کرتا ہے ان کو بھرنے کے لیے دنیا کی تمام ہارڈ ڈسک اور ڈیٹا اسٹور تیج بھی ناکافی ہیں۔

ماہرینِ نفسیات دماغ کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس کے تین حصے ہوتے ہیں ایک شعور، دوسرا لاشعور اور تیسرا تحت الاشعور۔ شعور انسان کی جاگتی حالت کو کہتے ہیں۔ لاشعور اس کے پیچھے کام کرتا ہے لیکن انسان اسے اپنی مرضی سے کنٹرول نہیں کر سکتا...... انسان کی شخصیت اور کردار اصل میں اس کے لاشعور کا عکس ہوتا ہے شعور میں رہ کر انسان اداکاری کر سکتا ہے لیکن لاشعور میں اداکاری ممکن نہیں ہے اسی لیے انسان کی اصلیت یا اس کے نفسیاتی مسائل کا کھوج لگانے کے لیے ماہرین لاشعور کو سامنے لانے کی کوشش کرتے ہیں اس کے لیے وہ انسان سے سوالات کا سیشن کرتے ہیں اگر مسئلہ اس سے حل نہ ہو تو پھر دواؤں اور ہپناٹزم جیسی تکنیکوں کا سہارا لیتے ہیں۔ ماہرین کہتے ہیں کہ شعور کو قابو میں نہیں کیا جا سکتا..... اسے معطل یا بے حس کیا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس لاشعور کو معطل یا بے حس نہیں کیا جا سکتا..... لیکن اسے قابو میں کیا جا سکتا ہے۔ جدید دور میں پروپیگنڈا تحریکیں اسی طرح سے کامیاب ہوتی ہیں۔ انسان کو جب تواتر سے ایک بات بتائی جائے چاہے وہ تصویر کی صورت میں، ویڈیو کی صورت میں یا لکھے اور بولے جانے والے الفاظ کی صورت میں ہو تو لاشعور اس سے متاثر ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ اسے قبول کر لیتا ہے۔ جیسے دہشت گردی کی اصطلاح ہے۔ مغرب کے میڈیا اور سیاست دانوں نے اسے اس طرح استعمال کیا ہے کہ اب دہشت گردی اور مسلمان یا اسلام ایک ہی چیز کے دو نام بن کر رہ گئے ہیں۔ اس پروپیگنڈے نے دنیا کے لاشعور پر قبضہ کر لیا ہے۔

تحت الشعور کے بارے میں کہا جاتا ہے جیسے لاشعور شعور کو کنٹرول کرتا ہے اسی طرح تحت الشعور لاشعور کو کنٹرول کرتا ہے۔ یہاں انسان کا ضمیر، اس کا کردار اور اس کی فطرت محفوظ ہوتی ہے۔ ماہرین کہتے ہیں کہ تحت الشعور کو کوئی قابو نہیں کر سکتا..... یہاں فیڈ پروگرام بچہ اپنی پیدائش کے ساتھ لے کر آتا ہے۔ روحانیت کے ماہر اسکالر اس بارے میں کہتے ہیں یہ پروگرام قدرت کی طرف سے دیا جاتا ہے اور ہدایت کا پیغام ہوتا ہے۔ جیسے حدیث نبوی ﷺ ہے۔ اس کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ ہر بچہ دینِ فطرت پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ اور اس کا ماحول اسے عیسائی، یہودی، ہندو، سکھ یا کسی اور مذہب کا ماننے والا بنا دیتے ہیں۔ یہ دینِ فطرت اس کے تحت الشعور میں موجود ہوتا ہے۔

پولی گراف ٹیسٹ بڑے سادہ اصولوں پر کام کرتا ہے۔ جب انسان جھوٹ بولتا ہے تو اس کے دل کی رفتار اور بلڈ پریشر میں تبدیلی آتی ہے جب کہ سچ بولنے کی صورت میں کوئی تبدیلی نہیں آتی ہے۔ مگر یہ کوئی حتمی ٹیسٹ نہیں ہوتا ہے

آغا خان ایوارڈ

فنِ تعمیر کا عظیم ایوارڈ۔ 1976ء میں آغا خان نے اسلامی روح کے مطابق ایسی عمارات کی تعمیر کی حوصلہ افزائی کے لیے ایک ایوارڈ قائم کرنے کا اعلان کیا جو مقامی ثقافت اور آب و ہوا سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ساتھ جدید ضروریات بھی پوری کریں گی۔ اس سلسلے کا پہلا ایوارڈ 1980ء میں دیا گیا جس میں فنِ تعمیر، منصوبہ سازی، عمرانیات اور آرٹ کے ماہرین پر مشتمل ایک جیوری نے پندرہ منصوبوں کو اعزاز بخشا، اس کے علاوہ مصر کے ماہرِ فنِ تعمیر، فن کار اور شاعر حسن فتحی کو دنیائے اسلام میں تعمیر کے میدان میں عمر بھر خدمات انجام دینے پر چیئرمین ایوارڈ دیا گیا۔ حسن فتحی ملکی طرزِ تعمیر کے حامی ہیں۔ انہوں نے مصر میں لکسر کے قریب غورنہ جدید گاؤں میں یہ ثابت کر دکھایا کہ اینٹوں اور گارے کی عمارتیں شاندار، باکفایت اور آب و ہوا کے عین مطابق ہوتی ہیں۔ فروری 1996ء میں آغا خان ایوارڈ برائے فنِ تعمیر 1995ء کا اعلان کر دیا گیا۔ 1993ء۔ 1995ء کی سہ سالہ مدت کے لیے دنیا بھر میں جان بارہ تعمیراتی منصوبوں پر انعام دیا گیا۔ ان میں حیدر آباد سندھ کی نو تعمیر شدہ رہائشی کالونی خدا کی بستی شامل تھی۔ اس کا منصوبہ ماہرِ تعمیرات تسنیم اے صدیقی نے پیش کیا تھا۔ ماسٹر جیوری کا فیصلہ کن اجلاس انڈونیشیا کے شہر سولو کی تاریخی عمارت کراٹون سورا کرتا یعنی سلطان کے محل میں منعقد ہوا۔ ایوارڈ کی رقم 5 لاکھ ڈالر مقرر کی گئی ہے۔ اس کی تقسیم ہر تین سال کے بعد ہوتی ہے۔ 1986ء میں جو ایوارڈ دیا گیا وہ صادق آباد کے قریب واقع بھونگ مسجد کو دیا گیا۔ یہ مسجد فنِ تعمیر کا ایک نادر نمونہ ہے۔ اس اعتبار سے پاکستان کی کسی عمارت کو دیا جانے والا یہ پہلا انعام ہے۔

مرسلہ: سلطان مہکری، کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

اور عدالتیں اس کے نتیجے پر اہم فیصلے کرنے سے گریز کرتی ہیں لیکن ترقی یافتہ ملکوں کی خفیہ ایجنسیاں اور تفتیشی ادارے ملزموں سے حقیقت اگلوانے کے لیے پولی گراف کا استعمال کرتے ہیں کیونکہ انہیں اپنا یقین حاصل کرنا ہوتا ہے اور وہ اس کے بعد ملزم سے مناسب سلوک کرتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ حتمی نہیں ہوتا ہے کیونکہ اگر کوئی شخص اتنے مضبوط اعصاب کا ہو کہ دورانِ ٹیسٹ خود پر قابو رکھے تو وہ دھوکا بھی دے سکتا ہے۔

میں اپنے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں اتنے مضبوط اعصاب رکھتا ہوں کہ جھوٹ بول سکوں اور میرے نبض کی رفتار اور بلڈ پریشر میں کوئی تبدیلی نہ آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں ڈاکٹر سے اس ٹیسٹ کا سن کر پریشان ہو گیا تھا۔ مجھے کسی عدالت میں پیش نہیں کرنا تھا بلکہ میرا واسطہ مرشد اور فاضلی جیسے لوگوں سے تھا جن کے لیے معمولی سا شک بھی کافی ہوتا ہے اور وہ اس کی بنیاد پر دوسروں کی زندگی و موت کے فیصلے کرتے ہیں۔ اگر دورانِ ٹیسٹ میں خود پر قابو نہیں رکھ پاتا اور ٹیسٹ سے ظاہر ہو جاتا کہ میں نے کچھ سوالات کے جواب میں جھوٹ بولا ہے تو فاضلی کا مقصد پورا ہو جاتا اور وہ مرشد کو یقین سے بتاتا کہ دوا نے مجھ پر اثر نہیں کیا ہے اور وہ مجھے بلا تکلف دوسرا انجکشن لگا دیتا۔ اس سے بھی مقصد پورا نہیں ہوتا تو وہ باقی انجکشن بھی میرے جسم میں اتار دیتا۔

اس بارے میں سوچتے ہوئے اچانک مجھے خیال آیا کہ انسان کا دماغ خراب کرنے والی دواؤں کی کمی نہیں ہے اور ہمارے ملک میں بھی دستیاب ہوتی ہیں۔ تب کیا وجہ ہے مرشد نے یہی خاص انجکشن استعمال کیا؟ کیا اس وجہ سے کہ اس دوا کا جسم میں کوئی سراغ نہیں ملتا ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ مجھے پاگل یا فاترالعقل بنایا گیا ہے بلکہ یہی کہا جاتا کہ کسی صدمے نے میرا دماغ الٹ دیا ہے۔ دوسری وجہ شاید یہ ہو سکتی تھی کہ دوسری دوائیں انسان کو پچ مچ کا پاگل بنا دیتی ہیں اس کا شعور تباہ ہو جاتا ہے۔ اسے اپنی سوچوں، زبان اور جسم پر کوئی اختیار باقی نہیں رہتا ہے لیکن مرشد کے مطابق یہ دوا انسان کو صرف یادداشت اور شخصیت سے محروم کر کے کسی بچے کی طرح معصوم بنا دیتی ہے۔ اسے پاگل نہیں کہا جا سکتا ہے۔ اگر کسی کو شدید صدمہ پہنچے تو دماغ اس کے اثرات سے بچانے کے لیے شعور سے اس کی یادداشت محو کر دیتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ اس کی یادداشت بحال ہو جاتی ہے۔ اگر انجکشن مجھ پر اثر کر جاتا تو میں بھی ایسا ہی ہو جاتا اور مجھ سے ملنے والے لواحقین اسے کسی دوا کی کارستانی سمجھنے کو تیار نہ ہوتے۔ یوں مرشد کا مقصد پورا ہو جاتا۔

مجھے ہوش میں آئے ہوئے ایک گھنٹا گزر گیا تھا۔ اس لیے میں نے مقررہ وقت پر آنکھیں کھول دیں اور بستر سے اتر کر فرش پر چلنے پھرنے لگا۔ اتنے دن سے بندھے بندھے جسم بھی بندھ گیا تھا۔ ان لوگوں کو پتا چل گیا کہ میں جاگ گیا ہوں کیونکہ چند منٹ بعد دروازہ کھلا اور اسی نرس کی صورت دکھائی دی۔ اس کے پیچھے فاضلی کا وہی ہوشیار گرگا تھا۔ میں نے نرس کو دیکھتے ہی منہ بنا کر کہا۔ ”مجھے بھوک لگی ہے۔“

”تم یہاں لیٹو۔“ نرس نے پیشہ ورانہ بے حسی سے کہا اور مجھے ہاتھ سے پکڑ کر بستر تک لے آئی۔

”میں.....بہت لیٹ گیا ہوں۔“ میں نے اٹک کر کہا جیسے وضاحت نہیں کر پا رہا ہوں کہ لیٹ لیٹ کر تھک گیا ہوں۔

”اب تمہیں اجازت مل جائے گی تم خوب چلنا پھرنا۔“ نرس بولی۔ وہ میرا چیک اپ کرنے آئی تھی اس نے درجہ حرارت لیا، پھر نبض اور بلڈ پریشر چیک کر کے نوٹ کیا۔ یہ یقیناً پولی گراف ٹیسٹ کی تیاری تھی۔ اپنا کام کر کے اس نے مجھے اٹھنے کی اجازت دے دی۔ ”میں ابھی تمہارے لیے کھانا لاتی ہوں۔“

نرس فاضلی کے گرگے کے ساتھ کمرے سے نکل گئی۔ اس کی واپسی آدھے گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ خلافِ توقع وہ مرغن کھانا لائی تھی۔ میں اس کھانے کا مقصد بھی سمجھ گیا تھا۔ مرغن کھانے سے انسانی ذہن ویسے ہی سست ہو جاتا ہے۔ بہر حال میں نے انہیں مایوس نہیں کیا اور ڈٹ کر کھایا۔ کھانے کے بعد جب نرس برتن لے جا رہی تھی تو میں نے نہایت سادگی سے اس سے باتھ روم جانے کی حاجت بیان کر دی۔ وہ جھینپ گئی تھی لیکن سر ہلا کر کمرے سے نکل گئی تھی۔ اس بار میں نے ذرا تمیز سے کھایا تھا جیسے میں سیکھ رہا ہوں کہ کوئی کام کیسے ہوتا ہے۔ کچھ دیر بعد فاضلی کا گرگا ایک اور مسلح آدمی کے ساتھ آیا۔ اس نے مجھے ساتھ چلنے کو کہا۔ اس کمرے کے ساتھ کوئی واش روم نہیں تھا بلکہ واش روم کامن تھا اور اسی راہداری کے آخری سرے پر تھا۔ وہ دونوں بہت محتاط انداز میں میرے پیچھے تھے اور میرے ایک ایک قدم پر نظر رکھے ہوئے تھے۔

یہ بڑا واش روم تھا جس میں الگ الگ تین لیٹرین لائن سے بنے ہوئے تھے اور تینوں میں کموڈ تھے۔ ایک طرف بڑا سا واش بیسن لگا تھا اور آخری حصے میں باتھ روم تھا غسل کیا جا سکتا تھا۔ یہ حصہ ایک نیم شفاف پردے سے الگ کیا گیا تھا۔ میں لیٹرین سے فارغ ہو کر آیا تو میرا دل چاہ رہا تھا کہ نہا لوں۔ کتنے دنوں سے نہیں نہایا تھا۔ میں نے ملتجی انداز میں فاضلی کے گرگے سے کہا۔ ”میں نہا لوں؟“

وہ سوچ میں پڑ گیا لیکن شاید اسے ایسی کوئی ہدایت نہیں تھی کہ مجھے نہانے بھی نہ دیا جائے اس لیے اس نے سر ہلا دیا۔ ”لیکن جلدی کرنا۔“

میں جلدی سے پردے کے پیچھے آیا اسپتال کا لباس اتار کر کھونٹی پر لٹکایا اور شاور کھول کر اس کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ اکرم چشتی کے لگائے زخم بھر گئے تھے۔ اس لیے نہانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ میں نے کئی مرتبہ صابن لگا کر جسم پر جمع میل بہایا تو لگا جیسے میں اندر اور باہر سے ہلکا پھلکا ہو گیا ہوں۔ اس دوران میں میری نظر صابن رکھنے والی دیوار سے لگی صابن دانی کی طرف گئی اور اس کے ساتھ ایک چیز دیکھ کر اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا تھا۔ دس منٹ بعد میں کپڑے پہن کر باہر آ گیا تو گیلا تھا لیکن موسم گرم ہو رہا تھا اور میرے کمرے میں اے سی چل رہا تھا اس لیے امید تھی کہ جلد جسم و بال خشک ہو جائیں گے۔ میں آ کر بستر پر لیٹ گیا۔ پیٹ بھر کر کھانے اور نہانے کے بعد ایک سکون آمیز غنودگی سی جسم اور ذہن پر طاری ہو رہی تھی لیکن یہ کہنا چاہیے کہ میں ڈاؤن ہو گیا تھا۔ کیونکہ بھاری کھانے کے بعد جسم کا دورانِ خون معدے کی طرف ہو جاتا ہے اور دماغ کی طرف جانے والے خون میں کمی آ جاتی ہے۔ پھر میں نہا بھی لیا تھا جس سے جسم کا مساج ہوا تو دماغ کو ملنے والے خون میں مزید کمی آ گئی اس لیے مجھ پر غنودگی جیسی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔

میں شاید نیند میں تھا یا کچھ جاگ رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور فاضلی کے دونوں آدمیوں کے ساتھ وہی وارڈ بوائے اندر آیا جو مجھے سی ٹی اسکین کے لیے لے گیا تھا۔ اس نے میرا بازو ہلایا۔ ”اٹھو۔“

میں جاگ گیا تھا لیکن نیند کے انداز میں دوسری طرف کروٹ لے لی اور بڑبڑایا۔ ”سونے دو۔“

”اٹھو۔“ اس بار وارڈ بوائے نے مجھے جھنجوڑا۔ ”تمہیں بلایا ہے۔“

میں خوف زدہ انداز میں اٹھ بیٹھا۔ ”بلایا ہے.....کس نے.....کیوں؟“

”ابھی چلو گے تو سب پتا چل جائے گا۔“

میں ان تینوں کے ہمراہ روانہ ہوا۔ اس بار بھی مجھے اسی کمرے میں لایا گیا۔ وہاں ڈاکٹر کے ساتھ فاضلی بھی موجود تھا۔ وارڈ بوائے نے مجھے ایک طرف کاؤچ پر لٹا کر الیکٹروڈ میرے سینے، بازو اور ماتھے سے لگا دیے۔ یہ الیکٹروڈ جدید قسم کی کمپیوٹرائزڈ مشین سے منسلک تھے اور ظاہر ہے یہی پولی گراف مشین تھی۔ میرے دونوں ہاتھ سیدھے اور رانوں کے ساتھ لگے تھے اور میں آرام دہ..... پوزیشن میں تھا۔ پھر وارڈ بوائے نے ایک ایسا ہیڈ فون لا کر میرے کانوں پر چڑھا دیا جس نے میرے کانوں کو پوری طرح ڈھانپ لیا تھا اور اب مجھے کوئی دوسری آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کے ساتھ ای مائک بھی تھا۔ شاید میری آواز کی لہروں کا تجزیہ بھی کیا جاتا۔ فاضلی کے دونوں گرگوں نے کمرے کے ایسے کونے میں جگہ سنبھال لی تھی جہاں میری نظر براہِ راست ان پر نہیں جاتی اسی طرح فاضلی بھی ہٹ گیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ابھی ٹیسٹ شروع ہو گا اور ڈاکٹر مجھ سے سوال جواب شروع کرے گا لیکن اسی لمحے دروازہ کھلا اور ایک نہایت حسین عورت جدید مغربی لباس میں اندر آئی۔ اس نے سیاہ رنگ کے اسکرٹ کے ساتھ ململ جیسے کپڑے کی شرٹ پہن رکھی تھی اور اس کے سامنے کے دو اوپری بٹن سرے سے نہیں تھے اور تیسرا کھلا تھا۔ اسکرٹ کی لمبائی مشکل سے گھٹنوں تک آ رہی تھی۔ اس لباس میں اس کی جسمانی ساخت نمایاں تھی۔ اس کی عمر تیس سے چالیس تک کچھ بھی ہو سکتی تھی لیکن اس میں شبہ نہیں تھا اس نے خود کو بہت سنبھال کر رکھا تھا۔ اگرچہ اس قسم کی مغرب یافتہ خواتین ہمارے ہاں کم نظر آتی ہیں لیکن بہرحال اب نظر آنے لگی ہیں۔ وہ سیدھی میری طرف آئی اور کسی قدر جھک کر میرے رخسار پر ہاتھ کا الٹا رخ پھیرا۔ اس نے کچھ کہا لیکن مجھے سنائی نہیں دیا تھا۔ اس کے کھلے بال آگے ڈھلک آئے تھے اس لیے میں فیصلہ نہیں کر سکا کہ بھینی سی خوشبو اس کے وجود سے آ رہی تھی یا بالوں سے۔ جھکنے سے چاک گریبان اور چاک ہو گیا تھا اور مجھے خود کو نظریں چرانے سے روکنے کے لیے خاصی جدوجہد کرنی پڑی تھی۔ میں سپاٹ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کوئی ردِعمل نہ پا کر وہ مایوسی کے عالم میں پیچھے ہٹ گئی اور پولی گراف مشین کی اسکرین کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس نے ویسا ہی ہیڈ فون اپنے کانوں پر چڑھا لیا تھا جیسا میرے کانوں پر تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

”ملک شہباز احمد۔“ میرے کانوں میں عورت کی آواز گونجی، اس کی آواز میں مخصوص لوچ اور کشش تھی جسے عرفِ عام میں سیکس اپیل کہتے ہیں۔

”جی؟“

”تمہارا نام شہباز ہے؟“

”جی.... یہ لوگ کہتے ہیں۔“

عورت کی نظریں اسکرین پر مرکوز تھیں۔ ”تمہارے باپ کا نام کیا ہے؟“

”پتا نہیں۔“

”تم کہاں سے تعلق رکھتے ہو؟“

”پتا نہیں۔“

”اپنے ماضی کے بارے میں کیا جانتے ہو؟“

اس بار میں نے ذرا دیر سے جواب دیا میں مختصر جواب بھی رک کر دے رہا تھا۔ ”کچھ نہیں..... مجھے یاد نہیں ہے۔“

مجھے حیرت تھی۔ اس عورت نے اگر یہ پولی گراف ٹیسٹ کی ماہر تھی نہایت اناڑی انداز میں ٹیسٹ کا آغاز کیا تھا۔ اس نے پہلے مجھ سے عام قسم کے سوالات نہیں کیے تھے بلکہ براہِ راست ان سوالوں پر آ گئی جو بعد میں پوچھنے تھے۔ وہ اپنے انداز سے ماہرِ نفسیات بھی نہیں لگ رہی تھی۔ اچانک اس نے سوالوں کا انداز بدل دیا۔ ”تمہیں کھانے میں کیا اچھا لگتا ہے؟“

”کھانا؟“

میرے جواب پر وہ جھنجلا گئی تھی۔ یہ چیز اس کے تاثرات میں نظر آئی۔ اس نے اگلا سوال کیا۔ ”تمہیں کیا اچھا لگتا ہے؟“

”میں باہر جانا چاہتا ہوں۔“

”باہر کہاں؟“

”پتا نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”بس یہاں سے باہر جانا چاہتا ہوں۔“

سوالات کا یہ سیشن تقریباً آدھا گھنٹے جاری رہا تھا۔ عورت نے اس دوران میں کئی مرتبہ سوالات بدلے۔ کبھی وہ مجھ سے براہِ راست میرے بارے میں سوال کرتی تھی اور کبھی میرے ماضی کو کریدنے کی کوشش کرتی تھی۔ ظاہر ہے میں نے اس کے کسی ایک سوال کا جواب بھی درست نہیں دیا تھا۔ چند ایک بار اس کے خوب صورت چہرے پر جھنجلاہٹ ضرور آئی تھی لیکن اس کے علاوہ اس کا چہرہ سپاٹ ہی رہا تھا جس سے میں یہ اندازہ کرنے سے قاصر تھا کہ پولی گراف کیا کہہ رہا ہے۔ کیا میرا جھوٹ پکڑا جا رہا ہے یا نہیں۔ آدھے گھنٹے بعد اس نے ہیڈ فون اتار دیا اور وارڈ بوائے کو اشارہ کیا۔ اس نے آ کر میرے جسم سے لگے الیکٹروڈ اور پھر ہیڈ فون اتارا۔ فاضلی اور ڈاکٹر آگے آئے تھے۔ ڈاکٹر اسکرین پر غالباً گراف کا ریپلے دیکھ رہا تھا جواب جاننے کے لیے اس نے کانوں سے ہیڈ فون لگا لیا تھا۔ اس عورت کے مقابلے میں اسے اپنے تاثرات پر قابو نہیں تھا اور میں دیکھ سکتا تھا کہ وہ جیسے جیسے میرے جوابات کے ساتھ گراف دیکھ رہا ہے اس کے چہرے پر مایوسی چھا رہی تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ نتیجہ اس کی اور فاضلی کی مرضی کے مطابق برآمد نہیں ہوا تھا۔ فاضلی اسے دیکھ رہا تھا اور اسے بھی نتیجہ جاننے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ اس کے تاثرات بگڑ گئے۔ اس نے اپنے گرگوں کو حکم دیا۔

”اسے یہاں سے لے جاؤ۔“

ظاہر ہے اشارہ میری طرف تھا۔ دونوں گرگوں نے وارڈ بوائے کو اشارہ کیا اور اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر کاؤچ سے اٹھایا۔ وہ لوگ اتنے محتاط تھے کہ کسی بھی مرحلے پر میرے قریب نہیں آتے تھے ہمیشہ نرس یا وارڈ بوائے میرے پاس آتا تھا اور اگر میں انہیں قابو کرتا تو انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے اپنے قابو میں رکھنے کے لیے وہ ان دونوں کی قربانی بھی دے سکتے تھے۔ بے شک میں انہیں مار دیتا لیکن وہ مجھے یہاں سے فرار نہ ہونے دیتے۔ مسلح افراد میرے پاس نہیں آتے تھے اور خود فاضلی بھی مجھ سے محتاط رہتا تھا۔ اتنا محتاط تو مجھ سے فتح خان بھی نہیں ہوتا ہے جسے میں اپنا سب سے ذہین دشمن سمجھتا ہوں اور جو مجھے سب سے زیادہ جانتا ہے۔ جب دونوں گرگے مجھے لے کر کمرے سے نکل رہے تھے تو فاضلی اور ڈاکٹر کے درمیان چخ چخ شروع ہو گئی تھی۔

یہ ڈاکٹر کے کلینک یا اسپتال کا اوپری فلور تھا۔ میں نے کسی کھڑکی یا رخنے سے نہیں دیکھا تھا کہ ہم کتنی بلندی پر تھے لیکن یہ کم سے کم پہلا فلور تو تھا کیونکہ ایک جگہ میں نے سیڑھیاں بھی نیچے جاتے دیکھی تھیں۔ البتہ مجھے یہاں ان گنے چنے افراد کے علاوہ کوئی اور نظر نہیں آیا تھا سوائے اس حسین عورت کے جو آج ہی دکھائی دی اور اس نے میرا پولی گراف لیا تھا۔ وارڈ بوائے نے مجھے لے جا کر بستر پر لٹایا اور میں سعادت مندی سے لیٹ گیا۔ اس نے جاتے ہوئے کہا۔ ”اب تم آرام کرو۔“

ان کے جاتے ہی میں نے ٹراؤزر اوپر کر کے ران کو سہلایا جہاں میں لوہے کی وہ چھوٹی سی کیل چبھوتا رہا تھا جو میں نے نہانے کے دوران واش روم کی دیوار سے نکالی تھی۔ پولی گراف کے دوران میں انگلیوں کے درمیان دبی کیل مسلسل خود کو چبھوتا رہا تھا اس سے میرا دھیان اس کی تکلیف کی طرف رہا اور میں نے سوالات پر زیادہ غور نہیں کیا اور نہایت آسانی سے پولی گراف کو دھوکا دے دیا۔ تکلیف نے مجھے ٹینشن لینے کا موقع نہیں دیا تھا۔ ران پر وہ جگہ سرخ ہو رہی تھی جہاں میں کیل چبھوتا رہا تھا۔ یہ معمولی سا زخم تھا جو ایک دن میں ٹھیک ہو جاتا لیکن اس نے مجھے بچا لیا تھا۔ میں سونا چاہتا تھا اس لیے کچھ دیر میں سچ مچ سو گیا۔ مجھے نہیں معلوم میں کتنی دیر سویا۔ کسی نے مجھے جھنجوڑ کر بیدار کیا۔ یہ فاضلی تھا اور کسی قدر بوکھلایا ہوا تھا اس نے مجھ سے کہا۔ ”اٹھو ہمیں یہاں سے جانا ہے۔“

میں آرام سے لیٹا یوں دیکھتا رہا جیسے اس کی بات میرے سر سے گزر گئی ہو میرے اس انداز پر وہ جھنجلا گیا۔ ”میں بھی کس سے مغز ماری کر رہا ہوں۔“

فاضلی کے ساتھ کمرے میں ایک ہی گرگا تھا دوسرا نہ جانے کہاں تھا۔ چند لمحے بعد وہ بھی اندر آیا اور اس نے فاضلی سے کہا۔ ”میں گاڑی گیٹ پر لے آیا ہوں، ابھی کوئی نہیں ہے ہم آسانی سے نکل سکتے ہیں۔“

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ گرگے کی بات سے لگ رہا تھا کہ فاضلی اینڈ پارٹی یہاں سے فرار کی تیاری کر رہی تھی اور ظاہر ہے میں اس پارٹی کا ایک زبردستی کا رکن تھا اس لیے مجھے بھی ساتھ جانا تھا یہی وجہ تھی کہ فاضلی مجھے اٹھانے آیا تھا۔ فاضلی نے آنے والے کو حکم دیا۔ ”اسے ساتھ لے کر باہر آؤ لیکن بہت ہوشیار رہنا کوئی مسئلہ ہوا تو تمہاری خیر نہیں ہوگی۔“

فاضلی کمرے سے نکلا تو گرگے نے برا سا منہ بنایا اور میری طرف دیکھا۔ ”چلو لاٹ صاحب.... تم نے سن لیا نا.... کوئی گڑبڑ کی تو..... میں گولی ماروں گا۔“ اس نے ایک ناقابلِ تذکرہ جگہ کا ذکر کیا۔ میں بستر سے اتر آیا۔ میرے پیروں میں کوئی جوتا یا چپل نہیں تھی اور جسم پر اسپتال کا لباس تھا۔ میں ان دونوں کے ساتھ باہر آیا۔ وہ مجھے اسی ہال نما کمرے کی طرف لائے جہاں دوبار میرا معائنہ ہوا تھا۔ میں اندر داخل ہوتے ہی ٹھٹک گیا کیونکہ فرش پر ڈاکٹر اور نوجوان وارڈ بوائے کی لاشیں پڑی تھیں۔ دونوں کو سروں میں گولی ماری گئی تھی لیکن آواز اس کمرے سے باہر نہیں گئی ہوگی کیونکہ وہ ساؤنڈ پروف کمرا تھا۔ لگتا تھا ڈاکٹر اور فاضلی کا تنازعہ اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ اسے اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے تھے۔ ذرا آگے آیا تو وہ حسین عورت پولی گراف کے سامنے کرسی پر نظر آئی، اس کی گردن ایک طرف ڈھلکی ہوئی تھی۔ فاضلی نے اس عورت پر بھی رحم نہیں کھایا تھا۔ وارڈ بوائے عینی شاہد ہونے کی وجہ سے مارا گیا تھا۔ مجھے نرس کا خیال آیا کہ وہ یہاں نہیں تھی اس لیے بچ گئی۔ مگر ذرا آگے آتے ہی میری یہ غلط فہمی دور ہو گئی۔ نرس کی بے لباس اور بے آبرو لاش پردے کے پیچھے فرش پر پڑی تھی۔ یہ کام یقیناً فاضلی اور اس کے گرگوں کا تھا۔ انہوں نے صرف اس کی جان لینا کافی نہیں سمجھا تھا بلکہ اسے مارنے سے پہلے بے آبرو بھی کیا تھا۔

اشتعال کی لہر اٹھی لیکن میں نے اسے قابو میں رکھا اگر میں اسے بے قابو ہونے دیتا تو وہاں پڑی لاشوں میں میری لاش کا بھی اضافہ ہو جاتا۔ میں نے خود کو سمجھایا کہ میری زندگی ہے اور مجھے آزادی ملے گی تو یقیناً مجھے موقع بھی ملے گا۔ میں یوں رک گیا جیسے لاشیں دیکھ کر سہم گیا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ دونوں مجھے یہاں کیوں لائے تھے۔ کیا یہ سب دکھانے کے لیے لائے تھے۔ دوسرا خیال یہ تھا کہ انہوں نے اس عام سی صورت والی ادھیڑ عمر نرس کے ساتھ تو یہ سلوک کیا مگر حسین عورت کو صرف مارا۔ میں نے دیکھ لیا تھا اسے کسی نے چھیڑا نہیں تھا۔ جب ایک گرگے نے مجھے آگے دھکیلا تو میں نے کمرے کے آخر میں وہ دروازہ دیکھ لیا جو کھلا ہوا تھا۔ فاضلی اس سے اندر آیا۔ مجھے دیکھ کر اس نے کہا۔ ”اس کی آنکھوں پر کپڑا باندھ دو اور دونوں ہاتھ بھی پیچھے باندھ کر نیچے گاڑی میں لے جاؤ۔“

انہوں نے حکم کی تعمیل کی۔ نرس کے پٹی نما دوپٹے سے میری آنکھوں پر پٹی باندھی گئی اور باقی دوپٹے سے میرے ہاتھ پشت سے باندھ دیے گئے۔ اب ایک گرگا مجھے ہاتھ سے پکڑ کر چلا رہا تھا اور دوسرا ہمارے پیچھے تھا۔ میرے ساتھ چلنے والا بتا رہا تھا کہ آگے کیا ہے۔ ہم سیڑھیاں اتر کر نیچے آئے اور فوراً ہی کسی گاڑی کا عقبی دروازہ کھول کر مجھے اس میں دھکیل دیا گیا۔ گاڑی میں ڈرائیور پہلے سے موجود تھا دونوں گرگے میرے ساتھ آ گئے۔ وہاں ایسی خاموشی تھی جیسی عام طور سے پوش رہائشی علاقوں میں ہوتی ہے۔ تقریباً دو تین منٹ بعد فاضلی کی آواز آئی۔ ”یہاں کہاں گھس گئے ہو ایک پیچھے بیٹھے۔“

میرے ایک طرف بیٹھا گرگا بادلِ ناخواستہ گاڑی کے عقبی حصے میں چلا گیا۔ میں سمجھا کہ فاضلی نے اپنے لیے

WWW.PAKSOCIETY.COM

جگہ بنانے کو کہا تھا لیکن گُرگے کے ہٹتے ہی ایک نرم و نازک سا وجود میرے ساتھ آ گرا اور اس کا خاصا بوجھ مجھ پر آیا تھا۔ میں دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن مخصوص بھینی خوشبو نے بتایا کہ یہ اسی حسین عورت کا بدن تھا جس نے میرا اپولی گراف لیا تھا۔ میں اسے مردہ سمجھا تھا لیکن اس کا دہکتا اور دھڑکتا بدن بتا رہا تھا کہ وہ زندہ تھی۔ شاید اسے بے ہوش کر دیا گیا تھا اور فاضلی کسی وجہ سے اسے اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔ وہ بے سدھ تھی اس لیے خود کو سنبھال نہیں سکتی تھی، میرے ہاتھ بندھے تھے اور میں اسے سہارا دینے سے قاصر تھا اس لیے وہ تقریباً مجھ پر لڑھک آئی تھی۔ میرے برابر میں بیٹھے گُرگے نے حسد سے کباب ہو کر آہستہ سے کہا۔

"مزے ہیں تیرے۔"

حالانکہ میں خاصی مشکل میں تھا کیونکہ خاتون کی کہنی ایک نہایت نامناسب جگہ چبھ رہی تھی اور سر میری بغل میں گھسا ہوا تھا۔ فاضلی آگے بیٹھا کیونکہ دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی اور ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ انجن کی آواز بتا رہی تھی کہ یہ کوئی بڑی جیپ نما گاڑی تھی اور فاضلی نے جتنی بے خوفی سے عورت کو میرے برابر میں ڈال دیا تھا اس سے یہ بھی ظاہر تھا کہ گاڑی کے شیشے اندھے تھے اور ہمیں باہر سے دیکھ لیے جانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ شاید ہمیں واپس مرشد ہاؤس لے جا رہا تھا۔ کپڑے کے پیچھے سے جھلکتی ہلکی سی روشنی سے پتا چل رہا تھا کہ یہ دن کا وقت تھا۔ دوپہر تھی یا شام ہونے والی تھی۔ گاڑی تقریباً آدھے گھنٹے تک تو ہموار راستوں سے گزرتی رہی اس کے بعد ایسا لگا جیسے وہ کثرت سے استعمال ہونے والی کسی کچی سڑک سے گزر رہی ہے اور آخر میں کچا راستہ نہایت خراب ہو گیا تھا کیونکہ جھٹکے شدید ہو گئے تھے۔ ایک موقع پر خاتون لڑھک کر سیٹوں کے درمیان چلی گئی۔ لیکن کسی نے اس کی پروا نہیں کی تھی۔ بہرحال یہ راستہ زیادہ طویل نہیں تھا چند منٹ بعد گاڑی رک گئی۔

"ان دونوں کو اندر لے آؤ۔" فاضلی نے نیچے اترتے ہوئے حکم دیا اور پھر ڈرائیور کے خاندان سے کچھ ناجائز رشتے جوڑتے ہوئے اسے بھی ہاتھ بٹانے کا حکم دیا۔ "لاٹ صاحب بن کر بیٹھا نہ رہ۔"

لاٹ صاحب نے سب سے آسان اور مناسب کام یہ سمجھا کہ عورت کو اٹھا لیا۔ اس نے میرے اترنے یا ہٹنے کا انتظار بھی نہیں کیا تھا اس پر دونوں گرگوں میں سے ایک نے کہا۔ "ٹھیک کہا ہے اس کے بارے میں، ایک نمبر کا حرامی ہے۔ چل بھئی تو بھی آرام سے بیٹھا ہے۔"

مجھے بازو سے پکڑ کر کھینچا۔ گُرگے کا خیال تھا کہ میں مزاحمت کروں گا لیکن میں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی اور آرام سے کھنچا چلا گیا نتیجے میں اس کے اوپر جا گرا اور ہم دونوں ہی زمین پر ڈھیر ہو گئے۔ وہ چلایا اور مجھے ایک طرف دھکیل دیا اس کا ساتھی ہنس رہا تھا۔ میں جس پر گرا تھا وہ گالیاں دے رہا تھا اس نے میرے پیر پر ٹھوکر ماری۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ جگہ کسی ویرانے میں تھی، زمین کچی تھی اور جنگلی پودوں اور جڑی بوٹیوں کی مہک آ رہی تھی۔ وہاں خاموشی تھی اور رہ رہ کر کسی پرندے کی آواز آ رہی تھی۔ میں گاڑی ٹٹولتے ہوئے اٹھا اور جلدی سے بولا۔ "تم نے خود کھینچا تھا اب گالیاں دے رہے ہو۔"

"تو اس طرح آٹے کی بوری کی طرح کیوں لڑھک گیا۔"

"کیا ہو رہا ہے، ابھی تک اسے اندر کیوں نہیں لائے۔" فاضلی کی گرجدار آواز سنائی دی۔ اس کے دونوں گرگوں نے جلدی سے مجھے بازو سے پکڑا اور اندر لے آئے۔ میرے پیروں تلے پختہ زمین تھی۔ دروازہ بند ہوتے ہی کسی نے میری آنکھوں سے بندھی پٹی کھینچ لی۔ ہم ایک خالی اور گرد آلود کمرے میں کھڑے تھے۔ کھڑکیاں خالی تھیں اور سلاخوں کی جگہ تختے لگا کر ان کا خلا بند کر دیا گیا تھا۔ کمرا بارہ بائی بارہ فٹ کا تھا اور کسی کیبن کا حصہ لگ رہا تھا۔ ایک کونے میں چھوٹا سا آتش دان بنا تھا۔ مجھے عورت یہاں نظر نہیں آئی تھی۔ فاضلی مجھے گھور رہا تھا۔ پٹی اسی نے اتاری تھی لیکن میرے ہاتھ کھولنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس ویران جگہ کو دیکھتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ اب ابتلا کا کوئی نیا دور شروع ہونے والا ہے۔ ورنہ فاضلی مجھے مرشد ہاؤس لے جاتا۔ فاضلی نے سرد لہجے میں کہا۔ "شہباز تم مرشد کو، اس ڈاکٹر کو اور ساری دنیا کو دھوکا دے سکتے ہو لیکن فاضلی کو دھوکا نہیں دے سکتے۔"

"دھوکا کیا ہوتا ہے؟" میں نے بیگانہ انداز میں پوچھا۔ گرگوں میں سے ایک ہنسا تو فاضلی نے اسے کاٹ جانے والی نظروں سے دیکھا تو اس کی ہنسی فوراً رک گئی تھی۔

"دفع ہو جاؤ تم دونوں اور باہر کا خیال رکھو... اس ڈرائیور کی اولاد سے کہو جا کر کہیں قریب سے کھانے اور پینے کے لیے کچھ لے کر آئے، پانی لازمی لائے۔"

وہ دونوں باہر نکل گئے۔ میرے ہاتھ بندھے تھے اس لیے فاضلی مجھ سے خطرہ محسوس نہیں کر رہا تھا۔ میں نے پھر بیگانہ لہجے میں کہا۔ "تم نے ڈاکٹر کو کیوں مار دیا وہ اچھا آدمی تھا؟"

"اسی لیے مار دیا میں ہر اچھے آدمی کو مار دیتا ہوں اور جلد اس فہرست میں تمہارا بھی اضافہ ہونے والا ہے۔"

میں عورت کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا لیکن میری چھٹی حس نے بروقت خبردار کیا اور میں پوچھتے پوچھتے رہ گیا۔ فاضلی نے خود کہا۔ "تمہیں معلوم ہے تمہارے ساتھ کون بیٹھی تھی؟"

"نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"یہ وہی خوب صورت عورت ہے جو تمہیں ملی تھی اور تم سے سوال پوچھ رہی تھی۔"

"اچھا یہ وہ عورت ہے۔" میں نے بے پروائی سے کہا اور آس پاس دیکھا۔ "یہ کون سی جگہ ہے؟"

"اب تمہیں یہاں رہنا ہے ہمیشہ۔" فاضلی بولا۔

"وہ عورت کہاں ہے؟"

"اس کمرے میں۔" فاضلی نے ایک مضبوط دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ "کچھ دیر بعد تمہیں بھی اسی جگہ بند کر دیا جائے گا۔"

"کیوں؟"

"تاکہ تم دونوں بھوک و پیاس سے ہلاک ہو جاؤ۔" فاضلی نے بے رحم لہجے میں کہا۔

"مگر کیوں۔" میں نے رو دینے والے لہجے میں کہا۔ "تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟"

فاضلی کچھ دیر مجھے گہری نظروں سے دیکھتا رہا۔ "شہباز تم میرے سب سے بڑے دشمن ہو کیونکہ تم میرے باپ کے دشمن ہو اور اگر تم ہوش میں ہو تو خیریت اسی میں ہے کہ ہوش میں ہونے کا اقرار کر لو اور اگر ایسا نہیں ہے تم سچ مچ پاگل ہو گئے ہو تو بھوکے پیاسے مرنا تمہارا مقدر ہے۔"

"یہ عورت بھی تمہاری دشمن ہے؟"

"نہیں یہ اس ڈاکٹر کی بیوی ہے میں اسے بھی مار دیتا لیکن نہ جانے کیوں مجھے اس پر رحم آ گیا، میں اسے چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا اس لیے یہاں لے آیا اب یہ بھی تمہارے ساتھ مرے گی۔"

یہ میرے لیے انکشاف تھا کہ یہ ماڈرن اور روشن خیال نظر آنے والی خوب صورت عورت اصل میں اس گول مٹول ڈاکٹر کی بیوی تھی اور یقیناً وہی اس کی دوسری بیوی تھی۔ فاضلی کا منصوبہ سچ مچ نہایت خوفناک تھا۔ اس نے میرے لیے زندہ بچنے کا ایک ہی راستہ چھوڑا تھا کہ میں ہوش میں ہونے کا اقرار کر لوں۔ ورنہ بھوک اور پیاس سے تڑپ تڑپ کر مرنے کے لیے تیار ہو جاؤں۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا میں اس کمرے میں آسانی سے بند ہو جاؤں جہاں سے امکان یہی تھا کہ میری روح ہی آزاد ہو سکے گی یا مجھے مزاحمت کرنی چاہیے۔ میرے ہاتھ بندھے تھے اور فاضلی کے بارے میں مجھے ذرا بھی شبہ نہیں تھا کہ وہ ایک اچھا لڑاکا ہے۔ صرف پیروں کی مدد سے میں اسے قابو نہیں کر سکتا تھا دوسرے میری طرف سے کوئی بھی جارحانہ قدم میرا بھید کھول دیتا۔ اگر میں فاضلی پر قابو پانے میں ناکام رہتا تو دوسرا انجکشن میرا مقدر بن جاتا۔ میں معاملے کو اس حد تک جانے سے روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں سر جھکائے سوچ رہا تھا کہ فاضلی میرے تاثرات نہ دیکھ سکے۔ جب میں نے سر اٹھایا تو اسے پستول بدست پایا۔ وہ چالاک آدمی جانتا تھا کہ میں ہوش میں ہوں، اس صورتِ حال میں جان کی بازی لگا کر آزاد ہونے کی کوشش کر سکتا ہوں اس لیے اس نے اپنی بات کرتے ہی پستول نکال لیا تھا اب میں اسے لاتوں کا بھوت بھی نہیں سمجھ سکتا تھا کیونکہ وہ اس سے پہلے ہی مجھے گولی مار دیتا۔ میں نے سہم کر کہا۔ "یہ کیوں نکالا ہے، مجھے بھی مار دو گے؟"

"چلو شاباش اندر چلو۔" اس نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ یہ دیودار کی موٹی لکڑی سے بنا ہوا ایسا دروازہ تھا جس پر اندر باہر موٹے تختے لگا کر اسے مزید مضبوط بنا دیا گیا تھا۔ دروازے پر ایک انچ موٹی فولادی کنڈی تھی۔ جسے توڑنا تو کیا اس میں خم پیدا کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ میں بادلِ ناخواستہ آگے بڑھا اور کنڈی سرکا کر دروازہ کھولا۔ فاضلی نے عقب سے دھکا دیا تو میں جان بوجھ کر اندر جا گرا۔ میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش نہیں کی حالانکہ نہایت آسانی سے سنبھال سکتا تھا۔ فاضلی نے ایک قہقہہ لگایا اور دروازہ بند کر دیا۔

ڈاکٹر کی بیوی میرے سامنے فرش پر بے سدھ پڑی تھی۔ اسے ابھی تک ہوش نہیں آیا تھا، پتا نہیں فاضلی نے اس کے سر پر ضرب لگائی تھی یا کوئی دوا استعمال کی تھی۔ میں اٹھنے کے بجائے سرک کر اس کے پاس پہنچا۔ وہ نیم کروٹ کے بل لیٹی تھی ایک ہاتھ پشت پر تھا اور دوسرا سامنے فرش پر پھیلا تھا، ٹانگیں گھٹنوں سے خم کھا رہی تھیں۔ ایک ہاتھ پشت کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

طرف ہونے سے سینہ نمایاں ہورہا تھا اور ظاہر ہے بٹن کھلا ہوا تھا اس لیے کچھ زیادہ ہی نمایاں ہورہا تھا۔ میں نے دروازے کی طرف دیکھا اور اس کا ہاتھ سامنے کی طرف کرکے اس کی شرٹ کا آخری بٹن بند کرکے شرٹ ممکنہ حد تک درست کردی۔ اسی لمحے اس نے کراہنا شروع کردیا۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ مجھے اتنے قریب دیکھ کر نہ جانے کیا ردِعمل ظاہر کرے۔ مگر ایک بار کراہ کر وہ خاموش ہوگئی۔

میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ اس میں دو طرف کھڑکیاں تھیں لیکن ان پر لکڑی کے تختوں کے بجائے لوہے کی سلاخیں تھیں اور ان کے باہر جھاڑیاں یوں کھڑکی تک آگئی تھیں کہ انہوں نے ایک سائبان سا بنادیا تھا ان کی وجہ سے باہر کا کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ دیواریں ٹھوس تھیں اور مجھے کھڑکیوں اور دروازے کی چوکھٹ سے اندازہ ہورہا تھا کہ یہ خاصی موٹی ہیں۔ آمد و رفت کے لیے ایک ہی دروازہ تھا۔ فرش بھی کنکریٹ کا تھا اور اس پر گرد کی خاصی موٹی تہ موجود تھی۔ ہم اسی خاک پر پڑے تھے۔ ساکت ہوکر میں نے آوازوں سے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ فاضلی باہر موجود تھا یا نہیں۔ مگر باہر سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ مجھے یاد آیا فاضلی نے ڈرائیور کو کھانا پانی لینے کے لیے بھیجا تھا اگر ہمیں یہاں چھوڑ کر واپس جانا ہوتا تو وہ یہ حکم کیوں دیتا۔ اس کا مطلب تھا اسے بھی یہیں رکنا تھا۔ مجھ پر شک ہونے کے باوجود فاضلی پوری طرح محتاط نہیں تھا اور اکثر ایسی باتیں کر جاتا تھا جو اسے میرے سامنے نہیں کرنی چاہئیں۔

اس سے ایک مطلب اور نکالا جاسکتا تھا کہ فاضلی خود مرشد ہاؤس واپس نہیں جارہا تھا اور اس کا بھی امکان تھا کہ اس نے یہ کام مرشد کی مرضی کے خلاف کیا تھا اور اب وہ فی الحال اس کا سامنا کرنا نہیں چاہ رہا تھا۔ مرشد کی دی ہوئی تین دن کی مہلت پوری ہوگئی تھی اور وہ میری ذہنی حالت کے بارے میں کوئی رپورٹ نہیں لے سکا تھا۔ مرشد کے حکم کے مطابق فاضلی کو مجھے واپس مرشد ہاؤس لے جانا تھا۔ مگر فاضلی کسی صورت میری صحیح سلامت واپسی نہیں چاہتا تھا۔ وہ مجھے مارنا چاہتا تھا ورنہ مجھے پاگل بنا کر واپس کرنا چاہتا تھا اور اس کے لیے وہ مجھے یہاں لے آیا تھا۔ یہاں روشنی کی کوئی صورت نہیں تھی۔ بجلی تو سرے سے نہیں تھی لیکن کوئی لیمپ یا دِیا جیسی چیز بھی نہیں تھی۔ شام ہورہی تھی اور کمرے میں ماحول نیم تاریک ہوگیا تھا۔ کچھ دیر اور گزرتی تو یہاں بالکل تاریکی ہوجاتی۔ مگر فاضلی جو ہمیں بھوکا پیاسا مرنے کے لیے اس کمرے میں بند کرچکا تھا اسے اس کی کیا فکر ہوتی کہ یہاں کچھ دیر میں تاریکی چھا جائے گی۔ میں دیوار سے لگا سوچ میں گم تھا کہ کراہ سن کر چونکا۔ ڈاکٹر کی بیوی ہوش میں آرہی تھی۔

اس بار وہ سچ مچ ہوش میں آرہی تھی اور اس نے کراہنے کے بعد کروٹ بھی لی تھی۔ یہ کروٹ خاصی ہوش رُبا تھی کیونکہ وہ میری طرف گھومی تھی۔ میں نے اس کی شرٹ بند کی تھی وہ دوبارہ سامنے سے کھل گئی۔ اس نے اپنا سر تھام لیا تھا اور جھومتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کی تو دوبارہ لیٹ گئی۔ اس کی حالت اچھی نہیں تھی۔ شاید اس کے سر پر ضرب لگائی گئی تھی ورنہ وہ اتنی جلدی ہوش میں نہ آتی۔ مگر اس کی حالت ابھی خراب ہو رہی تھی۔ مجھے اس چیز کا خوب تجربہ تھا۔ میں نے اپنی جگہ سے بیٹھے بیٹھے کہا۔ ”لیٹ جاؤ ابھی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور دوبارہ چونکی کیونکہ میرا لہجہ بیگانہ تھا اور اسے سامنے ایک مرد نظر آیا تھا اس نے شاید مجھے پہچانا نہیں تھا۔۔ اس کی حالت سچ مچ خراب تھی اس لیے اس نے انکوائری کا کام ملتوی کردیا اور دوبارہ لیٹ گئی۔ شکر ہے اس نے اپنی شرٹ درست کرلی۔ وہ متناسب الاعضا عورت تھی۔ چہرے کے نقوش بھی بہت دل کش تھے۔ مگر وہ ان عورتوں میں سے تھی جن کے حسن میں خوب صورتی کم اور ایک قسم کی حیوانی کشش زیادہ ہوتی ہے۔ ممکن ہے میرا یہ اندازہ درست نہ ہو کیونکہ اتنی ہنگامہ خیز زندگی میں آئے دن نت نئی عورتوں سے واسطہ پڑنے کے باوجود اس صنف کے بارے میں میرا تجربہ کم تھا۔ میں نے اس کے بارے میں یہ رائے شاید اس کے حلیے اور اس کے بے باک انداز کی وجہ سے قائم کی تھی۔ حسن میں وہ زرین سے کم نہیں تھی لیکن زرین مجھے ہمیشہ خوب صورت لگی تھی۔ میں نے اس میں یہ حیوانی کشش محسوس نہیں کی تھی۔

دس منٹ بعد وہ اٹھ بیٹھی اور خود کو گھسیٹ کر مخالف دیوار تک لے گئی۔ تاریکی تیزی سے چھارہی تھی اور اب ہم ایک دوسرے کو واضح دیکھ بھی نہیں سکتے تھے۔ اس نے لہجے میں کہا۔ ”تم وہی ہو..... یہ کون سی جگہ ہے؟“

”میں نہیں جانتا..... ہمیں فاضلی یہاں لایا ہے۔“

”فاضلی کون ہے؟“

”وہی جس کے لیے تمہارا شوہر کام کررہا تھا۔“

وہ اب تک ڈھیلی بیٹھی تھی لیکن میرا جواب سن کر چونک کر سیدھی ہوگئی۔ ”تمہارا دماغ درست ہے میرا شوہر کہاں سے آگیا۔“

”مجھے کیا معلوم..... مجھ سے فاضلی نے کہا ہے۔“

”تمہیں کیسے معلوم اس کا نام فاضلی ہے؟“ اس نے سوال کیا۔ غالباً اس کا مطلب یہ تھا کہ جب میں یادداشت کھو چکا ہوں تو مجھے فاضلی کا نام کیسے یاد ہے؟

”وہ دونوں کہتے ہیں جن کے پاس بندوق ہوتی ہے۔“

اس نے سر ہلایا اور اگلا سوال کیا۔ ”میرا شوہر کون ہے؟“

”ڈاکٹر۔“

”بکواس وہ میرا شوہر نہیں ہے۔“ اس نے پھر تیز لہجے میں کہا۔ ”وہ میرا واقف کار ہے اور اس نے مجھے تمہارے پولی گراف کے لیے بلایا تھا۔ اس کی مشین جدید قسم کی ہے اسے خود آپریٹ کرنی نہیں آتی ہے۔“

”وہ مرگیا ہے..... ان لوگوں نے دوسرے آدمی اور نرس کو بھی ماردیا۔“

وہ ایک بار پھر چونکی۔ ”کیا انہوں نے مجتبیٰ کو ماردیا؟“

”مجتبیٰ کون ہے؟“

”ڈاکٹر کا نام ہے۔“ عورت اب خوف زدہ ہوگئی۔ یہ ساری قتل و غارت گری اس کے علم میں نہیں تھی۔ ”یہ فاضلی بہت خطرناک آدمی ہے۔“

”ہاں اس نے ہمیں یہاں بھوکا پیاسا مرنے کے لیے بند کردیا ہے۔“

”بھوکا پیاسا۔“ اس کے لہجے میں خوف بڑھ گیا تھا۔ ذرا سی دیر میں تاریکی اتنی گہری ہوگئی تھی کہ اب وہ ایک ہیولے کی طرح نظر آرہی تھی۔ ”وہ ہمیں یہاں بند کرکے چلے گئے ہیں؟“

”ہاں ہمیں یہاں بند کردیا ہے۔“

عورت نے اٹھ کر دروازہ پیٹنا شروع کردیا۔ ”کوئی ہے..... ہماری مدد کرو..... پلیز ہمیں یہاں سے نکالو۔“

میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا، مجھے معلوم تھا کہ فاضلی یا اس کے آدمیوں کے کان پر جوں بھی نہیں رینگے گی اور اگر رینگی بھی تو اس عورت کی شامت آئے گی۔ یہاں مدد کرنے کوئی نہیں آئے گا لیکن میں نے اسے منع کرنے کی کوشش نہیں کی۔ تھک ہار کر وہ بیٹھ گئی اور سہمے انداز میں بولی۔ ”یہاں تو کوئی نہیں ہے شاید یہ جگہ ویران ہے۔“

جگہ اتنی ویران بھی نہیں تھی باہر فاضلی اور اس کے گرگے موجود تھے اور عین ممکن تھا یہاں ہونے والی تمام گفتگو سن رہے ہوں۔ بلکہ ایسا ہی ہورہا تھا۔ یہ کمرا خالی تھا لیکن اس کی اونچی چھت لکڑی کی موٹی بلیوں اور تختوں سے بنی تھی اور چھت پر کہیں بھی طاقت ور مائک چھپایا جاسکتا تھا جو یہاں کی جانے والی سرگوشی بھی نشر کرتا۔ تاریکی ہونے کے بعد وہ خوف زدہ ہوگئی تھی اور اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے پاس آگئی۔ ”فاضلی تمہارا دشمن ہے؟“

”ہاں اس نے مجھے پکڑ رکھا ہے..... ایک آدمی اور بھی تھا..... اس نے سر پر اونچی سے پگڑی پہن رکھی تھی۔ پھر یہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے آئے۔“

”تمہاری ان سے کیا دشمنی ہے؟“

”میں نہیں جانتا۔“

اسے یاد آگیا کہ میری یادداشت گم ہے۔ ”دیکھو مجھ سے کہا گیا تھا کہ ایک شخص یادداشت گم ہونے کا ڈراما کررہا ہے اور اس کا پولی گراف ٹیسٹ کرنا ہے۔“

”اچھا وہ شخص کون ہے؟“

”وہ تم ہو بے وقوف، لگتا ہے اپنی یادداشت ہی نہیں عقل بھی کھو بیٹھے ہو۔“ وہ جھنجلا کر بولی۔

”تم ڈانٹ کیوں رہی ہو۔“ میں نے روہانسے لہجے میں کہا۔ ”میں اب تم سے بات نہیں کروں گا۔“

”سوری۔“ وہ کچھ دیر بعد نرم لہجے میں بولی۔ ”میں پریشان ہوں۔“

”تو میں کون سا..... خوش ہوں۔“

”تم صورتِ حال کو نہیں سمجھ رہے ہو۔ یہ لوگ کسی وجہ سے تمہارے دشمن ہیں۔ کیا تمہیں اپنا ماضی بالکل یاد نہیں ہے؟“

”مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔“

”پولی گراف ٹیسٹ سے بھی تم سچے ثابت ہوتے ہو۔“ عورت نے وہ بات کہی جو میں اس سے پوچھنا چاہ رہا تھا لیکن پوچھ نہیں پارہا تھا۔ ”تمہارے کسی جواب پر تمہارے دل کی دھڑکن اور بلڈ پریشر میں تبدیلی نہیں آئی تھی۔“

”پولی گراف کیا ہوتا ہے؟“

وہ مجھے تفصیل سے سمجھانے لگی کہ پولی گراف کیا ہوتا ہے۔ وہ ماہرِ نفسیات نہیں تھی بلکہ پولی گراف مشین کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

استعمال کی ماہر تھی۔ میں خاموشی سے سنتا رہا اور اسے ذرا تاخیر سے احساس ہوا کہ وہ فضول میں بول رہی ہے۔ اس لیے وہ اصل موضوع پر آگئی۔ "انہوں نے مجتبیٰ اور اس کے ماتحتوں کو کیوں مار دیا؟"

"مجھے نہیں معلوم ..... میں نے ان کی لاشیں دیکھی تھیں۔ میں تو سمجھا تم بھی مر گئی ہو۔ یہ تمہیں میرے ساتھ یہاں لے آئے۔"

"مجھے نہیں معلوم وہاں کیا ہوا تھا۔ یہ شخص فاضلی ڈاکٹر مجتبیٰ سے لڑ رہا تھا کہ اچانک میری کرسی کے پیچھے آیا اور اس نے اچانک ہی کوئی چیز میرے سر پر ماری اور میں بے ہوش ہوگئی جب ہوش آیا تو یہاں پڑی تھی۔"

اس کا مطلب تھا کہ فاضلی نے قتل بعد میں کیے تھے۔ عورت کو بے ہوش کر کے اس نے پہلے ڈاکٹر اور وارڈ بوائے کو مارا تھا پھر نرس کو اپنے درندہ صفت ساتھیوں کے حوالے کر دیا۔ انجام اس کا بھی موت ہی ہوا تھا۔ یعنی عورت کے لیے اس کی شروع سے نیت تھی کہ وہ اسے ساتھ لے کر آئے گا۔ یہ خیال آتے ہی میں چونک گیا۔ اگر فاضلی کو عورت کو مارنا ہوتا تو اسے وہیں مار دیتا اسے اتنی دور لانے اور میرے ساتھ یہاں بند کرنے کی زحمت نہ کرتا۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ فاضلی نے مجھے دھمکی دی تھی وہ ہمیں سچ مچ بھوک پیاس کے ہاتھوں مارنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر اس عورت کو میرے ساتھ بند کرنے کا کیا مقصد ہو سکتا تھا؟ یہ میں فی الحال سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس دوران میں تاریکی مکمل ہو چکی تھی اور نظر آنا بالکل بند ہو گیا تھا۔ عورت نے ڈر کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"مجھے بھوک لگ رہی ہے۔" میں نے اپنی فریاد کی۔

"بے وقوف..... یہاں سے نکلنے کی سوچو۔"

"کیا سوچنے سے یہاں سے نکل جائیں گے؟" میں نے خوش ہو کر پوچھا تو وہ جھنجلا گئی۔

"نہیں کوئی ترکیب سوچو کہ کسی طرح سے یہاں نکلیں۔"

"دروازے سے نکلیں؟"

"نہیں دروازہ بہت مضبوط ہے یہ تو ٹارزن سے بھی نہیں ٹوٹے گا۔"

"پھر کھڑکیوں سے نکل جائیں۔"

عورت نے دیکھ لیا تھا کہ کھڑکیوں پر کوئی پون انچ موٹی لوہے کی سلاخیں تھیں اگرچہ یہ بری طرح زنگ کھا چکی تھیں لیکن ان کی مضبوطی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اس لیے اس نے یہ تجویز بھی مسترد کر دی۔ "چھوڑو میں خود سوچتی ہوں۔"

"تیری مہربانی۔" میں نے دل میں کہا اور زبان سے بولا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"نعمانہ لیکن سب مجھے نومی کہتے ہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "یہ لوگ تمہیں شہباز کہتے ہیں کیا یہ تمہارا اصلی نام ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" میں نے جھنجلائے انداز میں کہا۔ "پتا نہیں میں کون ہوں اور کہاں پھنس گیا ہوں۔"

"انہوں نے تمہیں مارا پیٹا بھی ہے؟"

"نہیں، لیکن باندھ کر رکھا تھا۔"

"تمہاری ان سے دشمنی ہے لیکن مجھے یہاں کیوں لائے ہیں۔"

"ہو سکتا ہے تم فاضلی کو اچھی لگی ہو۔"

"احمقانہ باتیں مت کرو۔" اس بار وہ جھنجلا گئی۔ "اگر اچھی لگتی تو یہاں بند کرتا۔"

"ہاں، یہاں تو ہمیں بھوکا پیاسا مرنے کے لیے بند کیا گیا ہے۔"

"پلیز ایسی باتیں مت کرو۔" وہ مجھ سے چپک گئی۔ "مجھے مرنے سے بہت ڈر لگتا ہے۔"

"مرنے سے ڈرو یا نہ ڈرو مرنا تو ہوتا ہے۔"

"پھر بھی، اس کا ذکر بھی مت کرو۔ بس اب چپ رہو۔"

خوف سے اس کا جسم سرد پڑ رہا تھا لیکن اس کی گدازیت اور اس کے وجود سے آتی خوشبو تو باقی تھی اور مجھے یہ ٹھیک نہیں لگ رہا تھا اس لیے میں اس سے ذرا دور سرک گیا۔ "پیچھے ہو کر بیٹھو نا۔"

وہ کھسیانے انداز میں ہنسی۔ "سوری، مجھے ڈر لگ رہا تھا اس لیے تمہارے پاس آگئی۔"

وہ مجھ سے ذرا دور ہوئی تھی لیکن اٹھ کر نہیں گئی تھی۔ تاریکی کے کچھ دیر بعد میری آنکھیں کسی قدر دیکھنے کی عادی ہو گئیں۔ میں اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا اور اس کے تختوں کے درمیان رخنوں سے باہر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا تختے آپس میں جوڑ کر لگائے گئے تھے اور اگر ان میں رخنے تھے وہ زمانے کی گرد اور لکڑی کے پھولنے سے بند ہو چکے تھے۔ میں نے فرش پر لیٹ کر نیچے سے باہر دیکھا تو مجھے معمولی سی روشنی کا احساس ہوا تھا۔ اس کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔

کوئی آواز تھی اور نہ کوئی آہٹ تھی۔ اگر وہ یہاں سے گئے تھے تب بھی کیبن کے اندر نہیں تھے۔ دروازہ بند ہونے کے باوجود کھلی کھڑکیوں سے کسی قدر تازہ ہوا اندر آرہی تھی اس لیے حبس کا احساس نہیں تھا۔ اچانک نومی نے کہا۔ "کیا کر رہے ہو دروازے کے پاس؟"

"الو کی پٹھی۔" میں نے دل ہی دل میں کہا اور بولا۔ "مجھے بھوک لگ رہی ہے۔"

"واپس آجاؤ۔" اس نے مشورہ دیا۔ "انہوں نے میری اتنی پکاروں کا کوئی جواب نہیں دیا۔"

میں اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اس نے میرا بازو پکڑا اور سرگوشی میں بولی۔ "میری سمجھ میں نہیں آرہا یہ لوگ مجھے یہاں کیوں لے آئے ہیں؟"

"بھوکا پیاسا مارنے کے لیے۔"

"نہیں، مارنا ہوتا تو وہیں مار دیتے یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی۔" اس نے بھی وہی نتیجہ نکالا جو میں نے نکالا تھا۔ نومی ذہین عورت تھی۔

"فاضلی کہہ رہا تھا تڑپا تڑپا کر مارے گا۔"

"پلیز پلیز۔" وہ گھگھیائی۔ "اب اس طرح مت کہنا۔"

"تم ڈاکٹر کے ساتھ کام کرتی ہو؟"

"نہیں، میں میڈیکل مشینیں سیل کرنے والی ایک فرم میں سیلز ایگزیکٹو ہوں۔ ہم باہر سے مشینیں منگوا کر یہاں سیل کرتے ہیں۔ ڈاکٹر کو یہ مشین ہم نے ہی فروخت کی تھی۔"

اس لیے ڈاکٹر نے اسے بلایا تھا کہ وہ مشین آپریٹ کرے۔ مگر اس کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ ڈاکٹر مجتبیٰ اس پر اعتبار کرتا تھا ورنہ وہ اسے ہرگز نہ بلاتا۔ معاملہ بہت رازداری کا تھا۔ اعتبار صرف اسی صورت میں ہو سکتا تھا کہ ڈاکٹر اور نومی کے تعلقات معمول سے ہٹ کر ہوں۔ یہ کہنا تو مشکل تھا کہ وہ ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے کیونکہ ڈاکٹر مجتبیٰ کی شخصیت اتنی ہی بے کشش تھی جتنی پُرکشش نومی کی شخصیت تھی۔ مگر کیا کہا جا سکتا ہے بعض اوقات بالکل بے جوڑ لوگ بھی ایک دوسرے کو پسند کر بیٹھتے ہیں۔ اس سے ہٹ کر کاروباری تعلقات ہو سکتے تھے اور ان کی وجہ سے ڈاکٹر نومی پر اعتماد کرتا تھا۔ وہ اپنی فرم میں سیلز ایگزیکٹو تھی خود کاروبار نہیں کرتی تھی بلکہ اوپری درجے کی ملازم تھی۔ ممکن تھا اس نے اسی حیثیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے کوئی متوازی کام شروع کر رکھا ہو اور ڈاکٹر اس میں نومی کا معاون ہو۔ اس لیے جب اسے ضرورت پڑی تو اس نے نومی کو بلا لیا۔

میں کم سے کم بولنے کی کوشش کر رہا تھا کیونکہ جتنا بولتا پھنسنے کے اتنے ہی زیادہ امکانات تھے۔ کچھ وقت گزرا تو میں نے محسوس کیا کہ باہر روشنی ہوئی ہے۔ مجھے چاند کی تاریخ یاد نہیں تھی۔ لیکن جب میں ان لوگوں کے ہاتھ آیا تو مجھے یاد ہے ایک رات پہلے آسمان پر تقریباً نصف چاند تھا جو بڑا ہو رہا تھا اب اسے مزید بڑا ہو جانا چاہیے تھا۔ باہر چاندنی تھی اس کی روشنی بلاواسطہ طریقے سے اندر کمرے کی تاریکی کو کسی

قارئین متوجہ ہوں
پرچا نہیں ملتا
کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔
☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل فون نمبر
رابطے اور مزید معلومات کے لیے
ثمر عباس
03012454188
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں
35802552-35386783-35804200
ای میل: jdpgroup@hotmail.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

قدر کم کر رہی تھی۔ ایک بار مجھے پھر نومی کا ہیولہ نظر آنے لگا تھا۔ اس کی نظر کا نہیں پتا تھا کہ کتنی تیز ہے۔ میں نے کہا۔ ”تم مجھے تھوڑی سی نظر آ رہی ہو۔“

”وہ تو تم بھی نظر آ رہے ہو آج آسمان پر پورا چاند ہو گا اسی کی روشنی اندر آ رہی ہے۔“

میں نے اٹھ کر کھڑکی کا معائنہ کیا اور پھر سلاخوں سے ہاتھ باہر نکال کر جھاڑیاں ہٹانے کی کوشش کی۔ لیکن جھاڑیاں بہت گھنی تھیں اور ان کی شاخیں آپس میں یوں گتھ گئی تھیں کہ انہیں الگ کرنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ میں نے ہاتھ واپس اندر کھینچ لیا۔ یہ کام صبح کی روشنی میں بہتر طور پر کیا جا سکتا تھا میں فرش پر لیٹ گیا۔ فرش سرد تھا لیکن اتنا بھی نہیں کہ ناقابلِ برداشت ہو جاتا۔ نومی نے کہا۔ ”یہ کیا کر رہے ہو؟“

”سو رہا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”بھوک لگ رہی ہے کھانا تو مل نہیں رہا تو سو ہی جاؤں۔“

نومی کو غصہ آ گیا۔ ”ان لوگوں کو کیا حق ہے ہمیں اس طرح بند کر دیں۔“ اس نے کہا اور پھر دروازہ پیٹنے لگی۔ میرا خیال تھا کہ اس بار بھی کوئی جواب نہیں ملے گا لیکن خلافِ توقع ایک منٹ سے بھی پہلے دروازہ کھل گیا۔ یہ بات نومی کے لیے بھی غیر متوقع تھی وہ ڈر کر پیچھے ہٹی اور میں اٹھ بیٹھا۔ باہر روشنی تھی کوئی لیمپ جل رہا تھا اور اس کی روشنی میں فاضلی کسی سائے کی طرح نظر آ رہا تھا۔ مجھے لگا اب نومی کی شامت آئے گی لیکن خلافِ توقع وہ نرم لہجے میں بولا۔

”کیا بات ہے؟“

”تم نے ہمیں یہاں کیوں بند کیا ہے۔“ نومی دبے لہجے میں بولی۔ ”میرا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”تعلق تو ہے۔“ فاضلی نرمی سے ہی بولا۔ ”آخر تم اس شخص کی اصلیت جاننے کے لیے آئی تھیں۔“ اس کا اشارہ میری طرف تھا۔ ”اسی تعلق کی وجہ سے تم یہاں آئی ہو اور یہی شخص تمہاری جان بچا سکتا ہے ورنہ اس نے تمہیں بتا دیا ہو گا کہ تم دونوں کی موت کس طرح واقع ہو گی۔“

نومی کانپ اٹھی تھی۔ ”تت.... تو کیا تم سچ مچ ہمیں بھوک پیاس سے مر جانے دو گے؟“

”اس میں کوئی شک نہیں ہے مجھے بہر صورت اس کی اصلیت درکار ہے ورنہ میں یہی چاہوں گا کہ اس کی لاش ہی یہاں سے باہر آئے۔“

”لیکن میرا کیا قصور ہے؟“

”میں نے کہا نا تم نے خود ذمے داری قبول کی تھی اس لیے اب یا تو اسے پورا کرو یا سزا بھگتو۔“

”میں نے ذمے داری پوری کی تھی۔ پولی گراف سے ثابت ہوا تھا کہ یہ سچ بول رہا ہے۔“

”یہ سچ نہیں بول رہا۔“ فاضلی قطعی لہجے میں بولا۔ ”تم اس شخص کو نہیں جانتی ہو یہ تم جیسے دس ماہرین نفسیات کو بیچ کر کھا جائے اور تمہیں پتا بھی نہ چلے۔“

”مشین تو جھوٹ نہیں بولتی ہے۔“

”مشین انسان نے بنائی ہے اس لیے انسان مشین کو دھوکا دے سکتا ہے۔“ فاضلی اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔ ”اب تمہاری عافیت اسی میں ہے کہ اس سے حقیقت اگلوا دو یا اس کے ساتھ ہی سسک سسک کر مر جاؤ۔ اب دوبارہ دروازہ نہیں بجانا ورنہ میں ایک گھنٹے کے لیے تمہیں اپنے آدمیوں کے حوالے کر دوں گا وہ عورت کا کیا حشر کرتے ہیں شہباز سے پوچھ لو۔“

دروازہ بند ہوا تو نومی اپنی جگہ واپس آ گئی۔ فاضلی کی دھمکی نے اسے خوف زدہ کر دیا تھا۔ اس نے آہستہ سے مجھ سے کہا۔ ”یہ کیا بکواس کر رہا ہے مجھے اپنے آدمیوں کے حوالے کر دے گا؟“

”اس کے آدمیوں نے بے چاری نرس کو مار دیا اس کے سارے کپڑے اتار دیے تھے۔“ میں نے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق نومی کو بتایا کہ نرس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔

”مائی گاڈ یہ درندے ہیں۔“ وہ سہم گئی۔

”بہت گندے لوگ ہیں۔“ میں نے تائید کی۔ ”مجھے ڈر ہے یہ تمہیں لے گئے تو اس نرس جیسا کریں گے۔“

اچانک اسے خیال آیا اور اس نے میری طرف جھک کر کہا۔ ”سنو تم ہوش مند ہو۔“

”ہاں۔“ میں نے فخریہ انداز میں کہا۔

وہ جھنجلا گئی۔ ”میرا مطلب ہے تمہیں اپنا ماضی یاد ہے؟“

”نہیں یاد ہے اسی لیے تو یہ ساری مصیبت ہے۔“

”سنو اگر تم اداکاری کر رہے ہو تو فوراً ترک کر دو ورنہ ہمارا بہت برا حشر ہو گا۔“

”یہ بات تو فاضلی کہتا ہے۔“ میں اس سے ذرا دور سرک گیا وہ ویسے بھی گھسی آ رہی تھی۔ ”وہ میرا دشمن ہے تم بھی دشمن ہو۔“

”نہیں .... نہیں میں دشمن نہیں ہوں۔“ اس نے جلدی سے کہا۔ ”میں تمہاری دوست ہوں ورنہ مجھے یہاں کیوں بند کیا جاتا۔“

”اچھا تم دوست ہو لیکن فاضلی والی بات کیوں کر رہی ہو وہ بھی یہی کہتا ہے۔“

”اچھا اب نہیں کہوں گی۔“

ہمارے درمیان خاموشی چھا گئی۔ میں ایک بار پھر فرش پر لیٹ گیا میرا تجربہ رہا ہے کہ بھوک پیاس کے عالم میں جب انسان کچھ نہ کر سکے تو توانائی بچانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ سو جائے۔ اس لیے میں بھی سو گیا۔ سچی بات ہے اس وقت بھوک اور پیاس سے زیادہ مجھے یہ فکر تھی کہ کہیں اخراج کا کوئی مسئلہ نہ پیدا ہو جائے۔ یہاں اس بند کمرے میں اس کی کوئی گنجائش نہیں تھی اور فاضلی سے امید نہیں تھی کہ وہ کسی بھی صورت میں ہمیں یہاں سے باہر جانے کی اجازت دے گا۔ بلکہ اسے تو خوشی ہو گی کہ ہم لوگوں کو ذہنی اذیت بھی برداشت کرنی پڑے گی۔ ایک بند کمرے میں بول و براز کا مطلب ہے بدبو آپ کا دماغ الگ خراب کرے گی اور اس وقت ہم دونوں میں سے کوئی یہ اذیت برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں بے خبر سو رہا تھا جب نومی نے جھنجوڑ کر مجھے اٹھایا میں بوکھلا کر اٹھا۔

”کیا ہوا.... کون ہے؟“

کمرے میں تاریکی تھی لیکن کھڑکیوں سے ہلکی سی سفیدی جھلک رہی تھی جیسے باہر صبح ہونے والی ہے۔ ”میں ہوں۔“ نومی نے جھینپی آواز میں کہا۔ ”میرے ساتھ یورین کا مسئلہ ہو رہا ہے؟“

”یورین کیا؟“

”احمق سمجھتے نہیں ہو۔“ وہ بولی اور ذرا کھل کر مجھے سمجھایا حالانکہ سمجھ میں پہلے ہی آ گیا تھا لیکن انگریزی کے لفظ سے واقفیت ظاہر کرنا ٹھیک نہیں تھا۔ میں فکر مند ہو گیا۔

”اب کیا ہو گا یہاں تو بدبو ہو جائے گی۔“

وہ بھنا گئی۔ ”تمہیں بدبو کی پڑی ہے۔ میرا خیال نہیں ہے۔“

”تمہارا کیا خیال کرنا۔“ میں نے حیرت سے کہا۔

”تم واقعی عقل سے ہاتھ دھو چکے ہو۔“ وہ بولی اور اس نے اٹھ کر ایک بار پھر دروازہ پیٹنا شروع کر دیا اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ ایمرجنسی کتنی شدید تھی کیونکہ رات کو ہی فاضلی نے اسے دھمکی دی تھی کہ دوبارہ دروازہ بجانے پر وہ اسے اپنے آدمیوں کے حوالے کر دے گا۔ اس بار جواب ذرا دیر سے ملا باہر سے فاضلی کے آدمی کی غصیلی آواز آئی۔

”کیا بات ہے؟“

”مجھے یورین آ رہا ہے۔“ نومی نے چلا کر کہا۔ ”مجھے باہر جانے دو۔“

جھاڑکھنڈ

بھارت کی 28ویں ریاست۔ اس کا قیام 2000ء میں عمل میں آیا۔ اس کے شمال میں بہار، مشرق میں مغربی بنگال، جنوب میں اڑیسہ اور مغرب میں چھتیس گڑھ کی ریاست واقع ہیں۔ ریاست کا رقبہ 74677 مربع کلومیٹر اور 2001ء کی مردم شماری کے مطابق آبادی 32 ملین ہے۔ صدر مقام رانچی ہے۔ یہ ریاست معدنی اعتبار سے مالا مال ہے، یہاں کوئلہ، تانبا، لوہا، چونے کا پتھر، عمارتی سامان اور مینگانیز کے بڑے بڑے ذخائر موجود ہیں۔ آبادی کی اکثریت زراعت پیشہ ہے۔

مرسلہ: واحد خان، لاہور

”وہیں کر لو۔“ فاضلی کا گُرگا ہنس کر بولا۔

”تم لوگ درندے ہو۔“ نومی چلائی۔ ”اگر تم نے مجھے باہر جانے کی اجازت نہیں دی تو میں اسی دروازے کے نیچے کر دوں گی اور وہ بہہ کر تمہارے کمرے میں بھی آئے گا۔“

نومی نے بڑی اچھی دھمکی دی تھی۔ دروازے کے نیچے اتنا خلا ضرور تھا کہ کوئی مائع چیز بہہ کر باہر چلی جائے۔ ظاہر ہے بدبو ان کا بھی دماغ خراب کرتی کیونکہ اس کیبن میں بس یہی دو کمرے تھے۔ گرگا خاموش ہو گیا اور شاید پھر فاضلی کو بتانے چلا گیا کیونکہ فاضلی کی آواز نہیں آئی تھی وہ کیبن میں نہیں تھا یا کہیں گیا ہوا تھا اگر وہ گیا ہوا تھا تو نومی کی دھمکی بیکار تھی۔ وہ لوگ کسی صورت دروازہ نہیں کھولتے۔ ہاں فاضلی ہوتا تو وہ کوئی فیصلہ کرتا۔ نومی کو اجازت مل جاتی یا شاید نہ ملتی۔ نومی خاموشی کے باوجود کچھ دیر دروازہ پیٹتی رہی اور پھر تھک کر واپس آ گئی وہ دبی زبان میں گالیاں دے رہی تھی اور ان میں سے بعض خاصی وزنی تھیں۔ اس کے خیال میں میرے سامنے ایسی گالیاں دینے میں کوئی حرج نہیں تھا کیونکہ ذہنی لحاظ سے میں ”بچہ“ تھا۔

”نہیں جانے دیا نا۔“

”بہت ذلیل اور گھٹیا لوگ ہیں۔“ وہ بولی۔ ”میرے لیے برداشت کرنا مشکل ہو رہا ہے۔“

مسئلہ ایسا تھا کہ مجھے بھی اس کا کوئی حل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ نومی کچھ دیر بیٹھی رہی پھر اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”اب میں برداشت نہیں کر سکتی، پلیز تم منہ دوسری طرف کر لو۔“

میں نے دل ہی دل میں فاضلی کو برا بھلا کہتے ہوئے

WWW.PAKSOCIETY.COM

منہ دوسری طرف کرلیا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ کبھی ایسی مشکل سے بھی گزرنا پڑے گا۔ نومی خاصی آزاد خیال عورت تھی لیکن وہ بھی اس پچویشن میں بری طرح جھینپی ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آئی اور سامنے والی دیوار سے ٹک کر بیٹھ گئی۔ فضا میں ہلکی سی بو آگئی تھی اور مجھے معلوم تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ یہ بڑھے گی۔ لیکن ساتھ ہی دوسرے مسائل جن میں بھوک و پیاس کا مسئلہ سرفہرست ہوتا اس سے کہیں زیادہ تیزی سے سامنے آتا اور جلد ہم انسانی رکھ رکھاؤ بھول کر صرف کھانے اور پانی کے بارے میں سوچتے۔ میں نے آخری کھانا اچھی طرح کھایا تھا اس لیے بھوک کا مسئلہ ابھی زیادہ نہیں تھا مگر پیاس نے پریشان کرنا شروع کردیا تھا۔

''مجھے پیاس لگ رہی ہے۔'' میں نے کہا تو اس نے بے دلی سے صرف سر ہلایا۔ باہر روشنی تیز ہوتی جارہی تھی اور اب ہم بہتر طور پر دیکھ سکتے تھے۔ مٹی پر لیٹنے بیٹھنے سے ہمارے کپڑے اور جسم مٹی سے بھر گئے تھے۔ نومی کے بالوں پر بھی مٹی لگی تھی اور شاید میرے بالوں پر بھی لگی تھی لیکن اس سے مفر ممکن نہیں تھا۔ سورج نکل آیا تو کمرے میں بھی اتنی روشنی ہوگئی تھی کہ ہم سب صاف دیکھ سکتے تھے۔ میں نے اٹھ کر ایک کھڑکی کے ساتھ آئی جھاڑیاں اندر کی طرف کھینچیں۔ یہ نرم شاخوں اور بڑے پتوں والی جھاڑیاں تھیں۔ میں انہیں کھینچ کھینچ کر توڑنے اور اندر ڈھیر کرنے لگا۔ نومی اٹھ کر میرے پاس آئی۔ ''یہ کیا کررہے ہو؟''

''کھڑکی کے سامنے سے انہیں ہٹا رہا ہوں۔'' میں نے سادہ جواب دیا۔ ذرا دیر میں کچھ جھاڑیاں صاف ہوئیں تو نومی بھی اٹھ کر اس کام میں شامل ہوگئی۔ شاخیں اور پتے فرش پر ڈھیر کررہے تھے۔ دس پندرہ منٹ کی محنت کے بعد کھڑکی سے دو فٹ کی دوری تک جھاڑیاں صاف ہوگئی تھیں لیکن کھڑکی سے اوپر اب بھی جھاڑیاں تھیں۔ میں چوکھٹ پر کھڑا ہوا اور یہ جھاڑیاں بھی صاف کرنے لگا اندر اچھی خاصی آگئی تھیں اس لیے اب میں توڑی جانے والی جھاڑیاں نیچے گرانے لگا۔ اوپر کی جھاڑیاں صاف ہوئیں تو کسی قدر آسمان نظر آنے لگا اور روشنی تیز ہوگئی تھی۔ مگر اس مشقت کا یہ نقصان ہوا کہ پیاس لگنے لگی تھی۔ میں فرش پر ڈھیر جھاڑیوں پر بیٹھ گیا۔ نومی نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''پیاس لگ رہی ہے۔''

''مجھے بھی لگ رہی ہے۔'' میں نے کہا اور دوبارہ اٹھ کر باہر دیکھنے کے بہانے سلاخوں کا جائزہ لینے لگا۔ میں اوپر سے نیچے تک سلاخوں کو ہاتھ سے کھینچ کر ان کی مضبوطی کا اندازہ کررہا تھا لیکن تمام ہی سلاخیں اپنی جگہ جمی ہوئی تھیں اور ان میں کسی میں جنبش کے آثار بھی نظر نہیں آئے تھے۔ تمام سلاخیں لکڑی کی مضبوط چوکھٹ میں گہرائی تک گڑی ہوئی تھیں۔ زنگ کا اثر بھی صرف اوپر تھا اندر سے لوہا روزِ اول کی طرح مضبوط تھا۔ زور آزمائی کے دوران زنگ اتر کر میری ہتھیلیوں پر آگیا اور نیچے سے سیاہ دھات جھلکنے لگی تھی۔ میں نے پتوں سے رگڑ رہا تھ صاف کیے۔ ان میں ہلکی سی نمی تھی۔ میں نے تجربے کے طور پر ایک پتے کی نمی کو ہاتھوں میں دبا کر چند قطروں کی صورت میں حاصل کیا اور انہیں چکھ کر دیکھا۔ ذائقہ ہلکا سا کسیلا تھا لیکن یہ پانی ہی تھا۔ نومی بیزار اور خود میں گم ایک طرف بیٹھی تھی اس لیے اس نے توجہ نہیں دی کہ میں کیا کررہا ہوں اور یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ وہ توجہ دیتی تو لازمی سوالات شروع کردیتی اور فاضلی اینڈ پارٹی کو پتا چل جاتا کہ میں کچھ کررہا ہوں۔ میں نے غیر محسوس انداز میں ہاتھ مار کر شاخیں اور پتے فرش پر بچھا دیے اور ان پر لیٹ گیا۔ سخت اور گرد آلود فرش کے مقابلے میں یہ خاصا نرم بچھونا تھا۔ پتوں اور شاخوں کی نمی سے ایک طرح کا سکون مل رہا تھا۔ پتے اور شاخیں اچھی خاصی مقدار میں تھے میں نے جو بچھونا بنایا تھا اس کے علاوہ بھی اتنے بچ گئے تھے کہ نومی بھی بستر بنا سکتی تھی اس نے کچھ دیر بعد دیکھا۔

''تم اتنے مزے سے لیٹے ہو اور مجھے بتایا نہیں۔''

''تم بھی لیٹ جاؤ۔'' میں نے پیشکش کی۔ ''بہت مزہ آرہا ہے۔''

نومی پاس آئی اس نے شاخیں اور پتے زمین پر پھیلائے اور ان پر بیٹھ گئی۔ ''ہاں فرش سے تو اچھا ہے لیکن کہیں کہیں چبھ رہا ہے۔''

میں خود بھی چاہتا تھا کہ ہم اس بارے میں بات کریں لیکن میں خود سے نہیں کرنا چاہتا تھا اب نومی بول اٹھی تھی اور میں منتظر تھا کہ فاضلی اینڈ پارٹی کی طرف سے اس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے اگر وہ ہماری باتیں سن رہے تھے تو لازمی تجسس کا شکار ہوتے کہ ہم نے اس اجاڑ قید خانے میں کون سی سہولت حاصل کرلی ہے۔ توقع کے عین مطابق کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور فاضلی کے ایک گرگے نے اندر جھانکا۔ ہمیں شاخوں اور پتوں پر لیٹے دیکھ کر اس نے غرا کر کہا۔ ''یہ کیا

WWW.PAKSOCIETY.COM

حرکت ہے؟''

''کون سی؟'' میں نے معصومیت سے پوچھا۔

''تم نے جھاڑیاں کیوں توڑی ہیں؟''

''بس روشنی زیادہ کرنے کے لیے توڑی تھیں اب ان پر لیٹے ہیں۔''

نومی نے اسے گھورا۔ ''تمہیں کیا ہے تم سے تو کچھ نہیں مانگا ہے؟''

''تیری زبان بہت چلتی ہے۔'' اس نے دانت پیس کر کہا۔ ''اگر استاد اجازت دے تو آدھے گھنٹے میں تیرے سارے کس بل نکال دوں۔'' اس نے جملے کے آخر میں ایک فحش اشارہ کیا۔ نومی کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا لیکن اس نے کچھ کہا نہیں اور میں انجان بنا رہا۔ دروازہ دھڑام سے بند ہوا تو نومی نے دبی زبان میں پھر کچھ گالیاں دیں۔ وہ سخت مشتعل تھی اور اس کی سانسوں کی تیزی کے آگے شرٹ کا تیسرا بٹن جواب دے گیا۔ کمزوری بٹن میں نہیں تھی بلکہ شرٹ ہی کچھ تنگ تھی۔ کچھ دیر بعد اس کے غصے کا رخ میری طرف مڑ گیا تھا۔ اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

''تم اتنے کم عقل نہیں ہو جتنا بن رہے ہو۔''

''پھر کتنا کم عقل ہوں؟''

''اب مجھے بھی شبہ ہونے لگا ہے تم بن رہے ہو۔ ورنہ اس طرح جھاڑیاں توڑ کر ان سے بستر بنانے کا خیال تو مجھے بھی نہیں آیا۔''

''میں نے روشنی کے لیے جھاڑیاں توڑی تھیں۔'' میں نے صفائی پیش کی۔

''لیکن اب ان کا بستر بنالیا۔''

''پتا نہیں تم کیا کہہ رہی ہو۔'' میں انجان بن گیا اور پھر آنکھیں بند کرلیں۔ ''مجھے نیند آرہی ہے۔''

اس نے مجھے جھنجوڑ دیا۔ ''اٹھو..... یہ وقت سونے کا نہیں ہے..... اگر تم اپنی یادداشت کھو چکے ہو تب بھی ان لوگوں سے کہہ سکتے ہو تمہیں سب یاد آگیا ہے۔''

''اس سے کیا ہوگا؟'' میں نے منہ کھول کر پوچھا۔

''یہ ہمیں چھوڑ دیں گے۔''

میں خوش ہوگیا۔ ''بس اتنی سی بات کہہ دینے سے چھوڑ دیں گے، میں ابھی کہتا ہوں۔'' میں کہتے ہوئے کھڑا ہوگیا لیکن اس نے ہاتھ سے پکڑ کر مجھے دوبارہ بٹھا لیا اور بولی۔

''احمقانہ باتیں نہ کرو..... انہیں اس طرح یقین نہیں آئے گا۔''

''پھر کس طرح یقین آئے گا؟''

''تمہیں کہنا ہوگا کہ تمہیں کچھ کچھ یاد آنے لگا ہے جیسے تمہارا نام شہباز ملک ہے اور فاضلی تمہارا دشمن ہے تم نے اسے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔''

''واقعی؟'' میں نے سہم کر کہا۔ ''میں قتل کرسکتا ہوں۔''

نومی جھنجلائی لیکن خود پر قابو پالیا۔ ''کرسکتے ہو، جب آدمی کی جان پر بنی ہو تو وہ کچھ بھی کرسکتا ہے۔ ابھی تم نے ظاہر یہی کرنا ہے۔''

''ٹھیک ہے میں فاضلی سے کہتا ہوں مجھے اپنا نام یاد آگیا ہے اور میں نے اسے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔''

''اس طرح نہیں..... وہ بہت چالاک آدمی ہے سمجھ جائے گا۔''

''پھر کس طرح؟''

''تم اسے بلاؤ اور کہو کہ مجھے جانے دے پھر تم اسے حقیقت بتاؤ گے۔''

''مجھے جانے دے گا وہ؟''

''تمہیں نہیں مجھے۔'' وہ جھنجلا گئی۔ ''تم ذرا عقل مندوں کی طرح بات کرنا۔''

''وہ کیسے کرتے ہیں؟''

اس کا صبر جواب دے رہا تھا اور میں جانتا تھا فاضلی یا اس کے آدمی ہماری گفتگو کا ایک ایک لفظ سن رہے ہیں لہٰذا اس کی اسکیم پر عمل درآمد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے بھنا کر کہا۔ ''جیسے ابھی تم کررہے ہو۔''

''ٹھیک ہے میں کرلوں گا، کیا دروازہ بجا کر اسے بلاؤں۔ پہلے وہ تمہیں جانے دے اور جب میں اسے بتادوں کہ مجھے کچھ کچھ یاد آگیا ہے تو وہ مجھے بھی جانے دے گا۔''

''ہاں وہ تمہیں بھی جانے دے گا۔'' نومی نے صفائی سے جھوٹ بولا۔

میں نے اٹھ کر دروازہ پیٹا۔ ''دروازہ کھولو مجھے یاد آگیا ہے..... نہیں مجھے کچھ کچھ یاد آگیا ہے۔''

نومی نے سر پر ہاتھ مارا تھا لیکن اس نے مجھے روکا نہیں۔ میں دروازہ پیٹتا رہا اور میری توقع کے مطابق کسی نے جواب نہیں دیا۔ میں مایوس ہوکر واپس آگیا۔ ''کوئی آ ہی نہیں رہا ہے۔ میں کس سے بات کروں۔''

''کوشش کرتے رہو کبھی نہ کبھی تو جواب دیں گے۔''

میری کوشش سے حوصلہ پا کر نومی مجھے سکھانے بڑھانے میں لگ گئی تھی۔ کبھی کبھی وہ جھنجلا جاتی اور غصہ کرتی لیکن فوراً ہی خود پر قابو پا کر نئے سرے سے لگ جاتی۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ یہ زندگی و موت کا مسئلہ ہے۔ وہ کسی بھی طریقے سے یا میری قربانی دے کر یہاں سے نکل سکتی ہے تو اسے نکل جانا چاہیے۔ یہ سارا دن اسی طرح گزرا تھا۔ میں نے وقفے وقفے سے دروازہ پیٹا لیکن کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ شام ہوئی پھر رات ہوئی تو نومی کا حوصلہ اور طاقت دونوں جواب دے گئے۔ بھوک و پیاس نے اسے نڈھال کر دیا تھا اور وہ لیٹ گئی۔ میری حالت اتنی بری نہیں تھی۔ مجھے اس سے پہلے بھی بھوک و پیاس کا کئی بار تجربہ ہو چکا تھا لیکن میں ظاہر یہی کر رہا تھا کہ میری حالت خراب ہے۔ نومی نے مجھے دن میں سونے نہیں دیا تھا اس لیے رات ہوتے ہی میں لیٹتے ہی ..... سو گیا۔ پیٹ میں بھوک کروٹیں لے رہی تھی اور پیاس سے حلق خشک ہو رہا تھا۔ اگرچہ اسے کانٹے پڑنا تو نہیں کہا جا سکتا تھا مگر کیفیت اس سے کچھ مختلف بھی نہیں تھی۔ بہر حال ابھی میں برداشت کر سکتا تھا۔ البتہ نومی کی حالت بری تھی وہ سوتے میں کراہ رہی تھی اور کھانے پینے کو مانگ رہی تھی۔

مجھے افسوس تھا لیکن میں اپنے لیے ہی کچھ نہیں کر سکتا تھا اس کے لیے کیا کرتا۔ مجھے معلوم تھا کہ ایک بار فاضلی کو میری حقیقت کا علم ہو گیا تو میرے ساتھ وہ جو کرے گا وہ کرے گا لیکن نومی کا مقدر صرف موت ہوگی جو نہایت اذیت سے گزر کر نصیب ہوگی۔ وہ اسے عینی گواہ کی حیثیت سے چھوڑنے کا خطرہ مول لے ہی نہیں سکتا تھا۔ اس لیے مجھے صبر کے ساتھ اپنی اداکاری پر جمے رہنا تھا اسی میں میری اور نومی کی بچت تھی۔ اندر سے مجھے یقین تھا کہ فاضلی ہمیں ڈرا رہا ہے اس کا مقصد ہرگز ہمیں بھوک و پیاس سے ہلاک کرنے کا نہیں تھا۔ اس کا اصل پلان کیا تھا میں سمجھ نہیں پایا تھا۔ یہ تو وقت آنے پر ہی پتا چلتا کہ وہ کیا چکر چلا رہا تھا۔ میں رات کسی وقت جاگ گیا تھا۔ نومی سو رہی تھی یا غشی میں تھی۔

وہ بہر حال نرم و نازک عورت تھی اور شاید ان حالات سے پہلی بار واسطہ پڑا تھا۔ بھوک پیاس اس کے لیے اجنبی چیز تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھی جو صبح سے شام تک عادتاً کھاتے پیتے ہیں اور ان کا حقیقی بھوک پیاس سے واسطہ بہت کم پڑتا ہے۔ میں بنا آہٹ کیے اٹھا اور ایک بار پھر کھڑکی کی سلاخوں کو ٹٹولنے لگا۔ لیٹے لیٹے چھت کا بہ غور معائنہ کرنے سے مجھے اس کا تو سو فیصد یقین ہو گیا تھا کہ وہاں کوئی کیمرا پوشیدہ نہیں تھا۔ ورنہ میں رات میں بھی اپنی اداکاری جاری رکھتا۔ اب ایسے سی سی ٹی وی کیمرے عام ہیں جو گھپ اندھیرے میں بھی دکھاتے ہیں۔ کھڑکی کی سلاخیں چھ چھ انچ کے بعد لگی تھیں۔ اگر ان میں سے ایک سلاخ نکل جاتی تو اتنا خلا بن جاتا جس سے ہم کوشش کر کے گزر سکتے تھے۔

اس بار میں نے تسلی سے اور پوری طاقت لگا کر کھڑکی کی سلاخوں کو آزمایا۔ مگر ان میں جنبش نہیں ہوئی تھی۔ ظاہر ہے فاضلی نے بھی اپنی تسلی کے بعد ہی ہمیں یہاں قید کیا ہوگا۔ اس نے یقیناً ان سلاخوں کو چیک کیا ہوگا۔ سلاخیں اور لکڑی کی چوکھٹ پوری طرح اپنی جگہ جمی ہوئی تھیں۔ پھر میں نے سلاخوں سے ہاتھ باہر نکال کر جہاں تک یہ جا رہا تھا دیوار اور زمین کو چیک کیا۔ کھڑکی پرانے طرز کی تھی اور فرش سے صرف تین فٹ اوپر تھی۔ باہر مسلسل مٹی جمع ہونے سے زمین اونچی ہو گئی تھی اور میرا ہاتھ زمین کو چھو رہا تھا۔ میں خاصی دیر تک کھڑکی سے ہاتھ نکال کر باہر ٹٹولتا رہا۔ اس دوران میں پتے توڑ کر اور انہیں مسل کر ان کی نمی اپنی زبان پر لیتا رہا۔ ایک پتے سے بہ مشکل ایک بوند پانی نکل رہا تھا لیکن ان حالات میں یہ بھی غنیمت تھا۔ جب میں اس شغل سے تھک گیا تو واپس اپنی جگہ آ کر لیٹ گیا۔ نومی بے سدھ پڑی تھی۔ میں نے اسے چیک کرنے کی کوشش نہیں کی۔ صبح کی روشنی پھیلی تو میں نے اسے ہلایا۔ وہ نیم غنودگی میں تھی۔

''ہاں..... ہاں..... پانی ہے؟''

''نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''بہتر ہے سو جاؤ۔''

وہ اٹھ بیٹھی۔ ''میں ابھی خواب میں پانی دیکھ رہی تھی۔''

''کاش کہ میں بھی سو جاتا۔''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''تم نے عقل مندی کی بات کی ہے۔''

''میں بے وقوف نہیں ہوں۔'' میں نے خفگی سے کہا۔ ''بس مجھے کچھ یاد نہیں ہے لیکن میں عقل رکھتا ہوں۔''

وہ زبردستی مسکرائی تھی۔ دو دن کے فاقے اور پیاس سے اس کا چہرہ ستا گیا تھا اور چہرے پر جھریاں نمودار ہونے لگی تھیں۔ وہ یک لخت ہی چالیس سال سے زیادہ کی لگنے لگی تھی اور اس تاثر نے اس کی ساری کشش ختم کر دی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''اب مجھے یقین آ گیا ہے یہ لوگ سچ مچ ہمیں اس طرح مار دینا چاہتے ہیں۔''

''اس سے تو بہتر ہے یہ ہمیں گولی مار دیں جیسے ڈاکٹر اور دوسرے آدمی کو ماری تھی پھر نرس کو بھی مار دیا تھا۔''

گولی کا سن کر اُس کے چہرے پر خوف نمودار ہوا۔ ''میں مرنا نہیں چاہتی ہوں۔''

''مرنا تو ویسے بھی ہے تو سسک سسک کر کیوں مریں؟''

''مگر میں گولی کھا کر نہیں مرنا چاہتی۔'' اس کا لہجہ ہذیانی ہو گیا۔

میں نے اٹھ کر دروازہ پیٹا اور بھوک پیاس کا رونا رونے لگا۔ ظاہر ہے ان لوگوں کے کان پر جوں.... نہیں رینگنی تھی۔ میری چیخ و پکار اور داد و فریاد رائگاں گئی۔ نومی میں یہ سب کرنے کی ہمت نہیں تھی اس لیے وہ لیٹی ہوئی فاضلی اور اس کے آدمیوں کو گالیاں دیتی رہی۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''واپس آ جاؤ..... یہ بے رحم لوگ ہماری نہیں سنیں گے۔''

میں واپس آ کر بیٹھا تو پہلی بار میرے دل میں خیال آیا کہ کہیں فاضلی نے سچ مچ تو ہمیں مرنے کے لیے بند نہیں کر دیا ہے۔ میں بدترین حالات کا حوصلے سے مقابلہ کرتا آیا ہوں اور ہار ماننے کا خیال بھی میرے ذہن میں کبھی نہیں آیا لیکن مجھے اعتراف ہے اس خیال نے مجھے خوف زدہ کر دیا تھا۔ بھوک و پیاس سے سسک سسک کر ہلاک ہونے کا خیال ہی بہت خوفناک تھا۔ میرا خیال تھا بلکہ یقین تھا کہ فاضلی ڈراما کر رہا ہے، وہ مجھے خوف زدہ کر رہا ہے اور اس عورت کو میرے ساتھ بند کرنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ مجھ پر دباؤ ڈالے۔ مگر اس لمحے یہ یقین ڈانواں ڈول ہو گیا تھا۔ فاضلی دشمن تھا اور دشمن کا کیا بھروسا، اس کی تو یہی خواہش ہوتی ہے کہ دشمن دنیا میں نہ رہے۔ شاید فاضلی نے بھی یہ فیصلہ کر لیا تھا اور وہ اس لیے یہاں موجود تھا کہ ہمارے مرنے کا تماشا دیکھے۔

مگر میں نے فوراً ہی اس خیال کو جھٹک دیا۔ واقعات اور حالات بتا رہے تھے فاضلی کسی پلان پر عمل کر رہا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ پلان مرشد کا ہو اور اس نے خود پس پردہ رہتے ہوئے فاضلی کو آگے کیا ہو۔ ورنہ فاضلی کچھ بھی صحیح تھا تو اس کا ماتحت۔ وہ اس کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتا تھا۔ جیسے جیسے دن چڑھ رہا تھا نومی کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ وہ بار بار غشی میں چلی جاتی تھی۔ موسم سرد نہیں رہا تھا لیکن گرم بھی نہیں تھا۔ اگر موسم گرم ہوتا تو ان دو دنوں میں ہماری حالت خراب ہو جاتی۔ اس وقت کچھ کھائے پیے بغیر اڑتالیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ میں نے یہ دن بھی سو کر گزارا تھا۔ شام کے قریب نومی اٹھ بیٹھی اور اس نے مجھ سے کہا۔ ''مجھے لگ رہا ہے میں مر جاؤں گی۔''

''حوصلہ کرو ہو سکتا ہے کوئی مدد آ جائے۔''

اس نے مایوسی سے کہا۔ ''کہاں سے.... یہ جگہ ویرانے میں ہے۔ دو دن سے ہمیں کوئی آواز سنائی نہیں دی ہے۔ مدد کو کون آئے گا۔ آئے گا تو پہلے ان لوگوں سے نمٹے گا۔''

''تمہارا کوئی نہیں ہے جو تمہاری مدد کرے؟''

''میرا۔'' اس نے تلخی سے کہا۔ ''میرے جو ہیں وہ صرف گدھ ہیں جنہیں موقع ملے تو مجھے نوچ کر کھا جائیں۔ کہنے کو وہ بہن بھائی اور ماں باپ ہیں۔''

''ان کو پتا چل گیا ہوگا کہ تم غائب ہو؟''

''نہیں، میں اکیلی رہتی ہوں اور کوئی مجھ سے ملنے نہیں آتا ہے۔ میں خود اپنے گھر والوں سے ملتی ہوں۔''

''ان کو تو پتا ہوگا جہاں تم کام کرتی ہو؟''

''ہاں ان کو پتا ہوگا۔'' اس نے چونک کر میری طرف دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں، اسے میرے سوالات سے پھر شک ہو رہا تھا۔

''تب وہ تمہیں تلاش کر رہے ہوں گے۔''

''نہیں..... میں دو تین دن دفتر نہ جاؤں تو کسی کو بھی شک نہیں ہوگا، ہاں اس دوران میں وہ مجھے کال کریں گے اور میرا نمبر بند ملے گا۔''

ابھی دو دن ہوئے تھے اس لیے دفتر والوں کا حرکت میں آنے کا کوئی پروگرام نہیں ہوگا اور اگر وہ حرکت میں آ بھی جائیں تو زیادہ سے زیادہ پولیس میں رپورٹ درج کرانے کے اور کیا کر سکتے تھے۔ پولیس نومی کو تلاش کرتی یہاں نہیں آ سکتی تھی۔ وہ مجھے اپنے بارے میں بتانے لگی۔ وقفے وقفے سے وہ رک جاتی تھی کیونکہ گلا پہلے ہی خشک ہو رہا تھا بولنے سے مزید خشک ہو جاتا تھا۔ اس نے بہت غریبانہ پس منظر سے اٹھ کر اتنی ترقی کر لی تھی۔ اس کے پاس واحد اثاثہ اس کی خوب صورتی تھی۔ آج اس کے پاس بہت اچھی جاب تھی، اسلام آباد میں ذاتی فلیٹ تھا، لگژری کار تھی۔ وہ بہت محنت کر کے اور بہت ''قربانیاں'' دے کر اس مقام تک پہنچی تھی اور اب اس کا سب کچھ خطرے میں تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ پچھتا بھی رہی تھی۔ مگر اس نے الفاظ میں اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

وہ بولتی رہی اور تاریکی چھا گئی۔ پھر وہ خاموش ہوگئی جیسے اس کے پاس کہنے کو کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ کچھ دیر میں چاند طلوع ہوا تو اس کی روشنی کمرے میں جھلکنے لگی۔ نومی لیٹ گئی تھی۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”سوگئی ہو؟“

”نہیں پیٹ میں کوئی نوکیلی سی چیز چبھ رہی ہے۔“

ہمیں بھوک پیاس برداشت کرتے ہوئے یہ صرف دوسرا دن تھا۔ میں نے سنا ہے کہ انسان تین ہفتے تک بغیر خوراک کے زندہ رہ سکتا ہے اور پانی کے بغیر مشکل سے ایک ہفتہ۔ مگر یہ ایک اوسط اندازہ ہے ممکن ہے بعض لوگ کھائے پیے بغیر اس سے زیادہ عرصے زندہ رہ سکتے ہیں اور بعض جلدی مر سکتے ہیں۔ اس کا انحصار جسمانی قوت اور عزم و حوصلے پر بھی ہو سکتا ہے اور اس کا انحصار بھوک پیاس برداشت کرنے کی صلاحیت پر بھی ہوتا ہے۔ افریقا میں قحط کی شکار اقوام کے افراد اس معاملے میں حیرت انگیز قوتِ مدافعت رکھتے ہیں۔ وہ کھائے بغیر مہینوں بھی زندہ رہتے ہیں۔ لیکن وہ آزاد ہوتے ہیں۔ ہمیں قید کر دیا گیا تھا اور اب ہمارے مرنے کا تماشا دیکھا جا رہا تھا۔ ہمارے قریب کچھ لوگ کھا پی رہے تھے اور انہوں نے ہم پر خوراک کا ایک ذرہ اور پانی کا ایک قطرہ بھی بند کر دیا تھا۔ یہ احساس خوراک کی بندش سے زیادہ جان لیوا تھا۔ کم سے کم نومی اسی وجہ سے ادھ موئی ہوئی جا رہی تھی اسے معلوم تھا کہ بچنے کی امید نہیں ہے اس ناامیدی نے اسے قبل از وقت ہی قریب المرگ کر دیا تھا۔ وہ ساری رات سوتی اور روتی رہی۔ جب جاگتی تو اس کی ہچکیاں صاف سنائی دیتی تھیں۔ نیند بھی کہاں آتی تھی بس غشی طاری ہو جاتی تھی۔

اس کے مقابلے میں میری حالت اتنی بہتر ضرور تھی کہ میں اپنی مرضی سے سو سکتا تھا۔ اس لیے اس رات کا بڑا حصہ بھی سو کر گزارہ تھا۔ جب صبح کی روشنی پھیلی تو میں نے نومی کو عجیب حالت میں پایا۔ ایسا لگا جیسے اس کا سراپا سکڑ گیا ہو۔ اس کے رخساروں کی ہڈیاں نمایاں ہوگئی تھیں اور جو شرٹ اسے پہلے تنگ تھی اب پہلے جیسی تنگ نہیں رہی تھی۔ اس کی گردن، بازوؤں اور پنڈلیوں کا جو حصہ کھلا ہوا تھا اس پر کھال سکڑ سی گئی تھی اور اس پر باریک سلوٹیں پڑ گئی تھیں۔ اس کے جسم میں پانی کی کمی شدت اختیار کر گئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اسے آج کے دن پانی نہیں ملا تو وہ اس جہان سے گزر جائے گی۔ وہ ہوش میں تھی لیکن سوائے آنکھیں کھلی رکھنے کے وہ اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ آج کے دن خود میری حالت بھی خراب ہو رہی تھی۔ کمزوری کی وجہ سے سانس بھی کھینچ کر لینا پڑ رہی تھی۔

اچانک دروازہ کھلا اور فاضلی اندر آیا۔ اس نے ہمارا جائزہ لیا اور مسکرایا۔ ”میرا خیال ہے یہ عورت شاید کل تک زندہ نہیں رہے گی۔“

میں دیوار کے ساتھ نیم دراز ہانپتا رہا اور اسے دیکھتا رہا۔ میں نے بولنے کی کوشش نہیں کی۔ فاضلی کچھ دیر ہمیں دیکھتا رہا پھر وہ چلا گیا اور دروازہ بند ہوگیا۔ فاضلی دیکھنے آیا تھا کہ ہماری حالت اب کیسی ہے۔ وقت گزرتا رہا، نومی کبھی آنکھیں بند کر لیتی تھی اور کبھی کھولتی تب بھی بولنے یا اٹھنے کی کوشش نہیں کرتی تھی۔ اس میں ہمت باقی نہیں رہی تھی۔ شام کے وقت میں ہمت کر کے اٹھا اور کھڑکی سے باہر ہاتھ نکال کر جھاڑیاں ٹٹولنے لگا۔ پھر واپس آ کر اسی انداز میں لیٹ گیا جیسے پہلے لیٹا ہوا تھا۔ نومی مجھ سے کچھ دور چت لیٹی ہوئی تھی لیکن اس کا یہ پوز بالکل بھی کشش انگیز یا جذبات ابھارنے والا نہیں لگ رہا تھا۔ بھوک و پیاس انسان کے احساسات کس طرح بدلتی ہے اس کا مجھے خوب تجربہ ہو رہا تھا۔ ابھی تاریکی چھانے میں کچھ وقت تھا کہ دروازہ پہلے کی طرح اچانک کھلا اور فاضلی اندر آیا۔ اس کا خاص گرگا دروازے پر موجود تھا اور اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ میں فاضلی کے ہاتھ میں سلینڈر دیکھ کر چونکا جن میں وہ نیلے سیال والے انجکشن رکھے جاتے ہیں۔ یہ دو سلینڈر تھے۔ مگر میں نے اپنے اندر کے تاثرات چہرے پر آنے نہیں دیے تھے۔ نیم کروٹ لیے فرش پر دیوار کا سہارا لیے لیٹا رہا۔

”اسے پہچانتا۔“ فاضلی نے سلینڈر لہرائے۔ ”یہ میں تمہارے اور اس حسینہ کے لیے لایا ہوں جس کی اصلیت کھل گئی ہے۔“ اس نے نومی کی طرف دیکھا۔ ”اس سے اچھی تو وہ نرس تھی کم سے کم جوان تو تھی۔“

”یہ کیا ہے؟“ میں نے بہت دھیمی آواز میں پوچھا۔

”یہ ایک دوا ہے جو میں پہلے اسے انجیکٹ کروں گا۔“ اس نے نومی کی طرف اشارہ کیا۔ ”اور اس کا نتیجہ دیکھنے کے بعد تمہیں دوں گا۔“

”اس سے کیا ہوگا؟“

”اس سے تمہاری ساری بھوک پیاس ختم ہو جائے گی۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

”تب پہلے مجھے دو۔“ میں نے بے تابی سے کہا۔

”صبر.... صبر۔“ اس نے سلینڈر کھول کر اس میں سے سرنج نکالی جس میں نیلا سیال پہلے ہی موجود تھا۔ وہ نومی کے پاس گھٹنے کے بل بیٹھا اور اس نے نومی کا ہاتھ سیدھا کیا وہ اس پر نس تلاش کر رہا تھا لیکن پانی کی کمی سے اس کی نس غائب ہوگئی تھی۔ فاضلی کچھ دیر نس تلاش کرتا رہا پھر جھنجلا کر بولا۔ ”لعنت ہو.... ایسے ہی لگا دیتا ہوں۔“

فاضلی کا گرگا بھی دلچسپی سے نومی اور فاضلی کی طرف دیکھ رہا تھا اور وہ اس لمحے میری طرف سے غافل ہو گیا تھا۔ اس کے خیال میں مجھ میں اتنا دم خم کہاں رہا تھا کہ میں اپنی جگہ سے حرکت بھی کر سکوں۔ مگر یہ اس کی غلط فہمی تھی اس نے بے پروائی سے کام لیا اور مجھے موقع دیا۔ میں نقاہت اور کمزوری کے باوجود ہر ممکن تیزی سے حرکت میں آیا تھا۔ فاضلی اس طرح بیٹھا تھا کہ اس کی آنکھیں میری طرف بھی دیکھ سکتی تھیں لیکن سرنج نکالنے کے بعد اس کی ساری توجہ سرنج اور نومی کی طرف تھی۔ اسے ذرا تاخیر سے احساس ہوا اور میرا گھومتا ہوا ہاتھ اس کے سر پر لگا۔ اگر یہ خالی ہاتھ ہوتا تو اسے کچھ بھی نہ ہوتا لیکن میرے ہاتھ میں ایک گول اور تقریباً پون سیر کا پتھر دبا ہوا تھا اور اس نے فاضلی کو تارے دکھا دیے تھے وہ کراہ کر نومی پر ڈھیر ہوگیا۔

”خبردار.... خبردار۔“ فاضلی کا آدمی بوکھلا کر دھمکیاں دیتا رہ گیا لیکن میں نے اتنی دیر میں سرنج اٹھا کر فاضلی کے بازو میں داخل کر دی۔ وہ گولی نہیں چلا سکتا تھا کیونکہ فاضلی اور میں بالکل پاس تھے اور اسے گولی لگنے کا پورا امکان تھا۔ میں نے دانت پیس کر کہا۔

”جہنم میں جاؤ۔“ اور سرنج کا پسٹن دبا دیا۔ دوا فاضلی کے جسم میں داخل ہوگئی۔ وہ بے ہوش نہیں ہوا تھا البتہ چکرا ضرور گیا تھا بہرحال سوئی کی تکلیف اور پھر جسم میں دوا کے داخل ہونے سے اسے ہوش آگیا اور وہ حلق پھاڑ کر چلایا۔

”نہیں.... شازی اسے گولی مار دے۔“

”ضرور۔“ میں نے فاضلی کو گردن سے جکڑ کر سامنے کر لیا۔ ”پہلے یہ تمہارا آقا مرے گا اس کے بعد گولی میرے جسم میں اترے گی۔“

شازی تذبذب میں پڑ گیا تھا اور اسی میں مارا گیا۔ میں فاضلی کا لباس ٹٹول رہا تھا اور مجھے اس کی قمیص تلے پتلون کی بیلٹ میں اڑسا ہوا پستول مل گیا۔ میں نے پستول نکالتے ہی شازی پر گولی چلا دی۔ گولی اس کے شانے پر لگی تھی اور وہ فرش پر گر پڑا۔ میں فاضلی کو دھکیل کر باہر کی طرف لپکا۔ فاضلی کا دوسرا گرگا شاٹ گن سنبھالے اندر آ رہا تھا اور اس نے گن میری طرف اٹھا دی تھی اسے موقع دینا خودکشی کرنے کے مترادف تھا۔ میں نے دوسری گولی اس کے ماتھے میں اتار دی اور وہ جھٹکے سے کیبن کے دروازے سے باہر جا گرا۔ اس وقت میں اپنی حالت بھول کر پوری طرح فعال ہوگیا تھا۔ یہ زندگی و موت کا معرکہ تھا اس میں ذرا سی غفلت سے بازی پلٹ جاتی۔ شازی ہوش میں تھا میں نے پستول کا دستہ اس کی کنپٹی پر مارا اور وہ بے ہوش ہوگیا۔ میں واپس اندر کی طرف لپکا۔ فاضلی کے گرگوں سے نمٹ کر مجھے اس کی فکر لاحق ہوگئی تھی۔ ضروری نہیں تھا کہ اس کے پاس یہی ایک ہتھیار ہوتا۔ لیکن وہ نومی کے برابر فرش پر چت پڑا تھا اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ بے تاثر انداز میں چھت کو گھور رہا تھا۔ اس کی وقفے وقفے سے جھپکتی پلکیں بتا رہی تھیں کہ وہ ہوش میں ہے۔ میں نے اس کی مکمل تلاشی لی۔ اس کے پاس سے ایک چھوٹا بند ہو جانے والا خنجر نکلا تھا اس کے سوا صرف گاڑی کی چابیاں اور اس کا پرس تھا جس میں اچھی خاصی رقم تھی۔ میں نے تمام چیزیں نکال لیں اور آخر میں وہ پتھر کھڑکی سے باہر اچھال دیا جو میں نے وہیں سے حاصل کیا تھا۔ نومی کو سہارا دے کر اٹھایا اور باہر لا کر دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ اسے اپنا ہوش نہیں تھا بس وہ میرے سہارے چلی جا رہی تھی۔ اسے ایک طرف بٹھا کر میں مارے جانے والے کی لاش بھی اندر لے آیا تھا۔

اسی جگہ موجود ہونے کے باوجود نومی کو لاش اور زخمی شخص نظر نہیں آیا تھا۔ میں باہر آیا تو حسبِ توقع یہ جگہ ویرانہ ثابت ہوئی تھی۔ کیبن نہایت خستہ اور قدیم تھا۔ اس کے چاروں طرف دس سے پندرہ فٹ اونچی جھاڑیاں تھیں اور ایک کچا گھاس سے ڈھکا راستہ بتا رہا تھا کہ یہاں آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ کیبن کے سامنے ڈبل کیبن جیپ کھڑی تھی ہمیں اسی میں یہاں لایا گیا تھا۔ میں نے اس کا پچھلا حصہ کھولا تو میرے منہ سے خود بہ خود کلکاری نکل گئی تھی۔ وہاں ایک بڑے سائز کی باسکٹ اور منرل واٹر کی بڑی والی بوتل موجود تھی۔ میں نے نومی کو نیچے لٹایا اور سب سے پہلے بوتل سے کچھ پانی ایک گلاس میں نکال کر اسے تھوڑا تھوڑا پیا۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ سات آٹھ لیٹرز کی یہ پوری بوتل منہ سے لگا کر ایک ہی بار میں خالی کر دوں لیکن یہ نقصان دہ ہوتا۔ اس لیے میں نے دل پر جبر کر کے گلاس آہستہ آہستہ خالی کیا اور اس پانی نے مجھے پھر سے تر و تازہ کر دیا تھا۔ دوسرا گلاس میں نے تھوڑا تھوڑا کر کے اسی طرح

WWW.PAKSOCIETY.COM

نومی کو پلایا اور اس کی عجلت کی کوشش کو بہ زور ناکام بنایا۔ وہ پانی پیتی رہی اور مجھے برا بھلا کہتی رہی۔ ایک گلاس پانی پی کر اس کے حواس بھی بحال ہو گئے تھے۔ میں نے باسکٹ کا جائزہ لیا۔ اس میں ڈبل روٹی اور مکھن کے ساتھ کھانے کو اور بھی بہت کچھ تھا لیکن میں نے مکھن اور ڈبل روٹی کو ترجیح دی۔ یہ سادہ اور قوت بخش غذا تھی۔

جتنی دیر میں نومی نے تین پیس حلق سے اتارے میں پوری ڈبل روٹی صاف کر چکا تھا۔ اس نے خفگی سے خالی شاپر دیکھا۔ ''اب میں کیا کھاؤں گی؟''

''باسکٹ میں بہت کچھ ہے۔'' میں نے آدھا گلاس پانی اور پیا۔ ''کھاؤ لیکن احتیاط سے اور پانی تو بہت احتیاط سے پینا ورنہ یہیں بے ہوش ہو جاؤ گی اور دوبارہ ان لوگوں کی قید میں چلی جاؤ گی۔''

اگر اس کا بے دھڑک کھانے پینے کا ارادہ تھا تو اس نے فوراً ترک کر دیا۔ ''لیکن یہ ہوا کیسے....تم نے ان پر قابو پالیا اور تم تو عقل مند لگ رہے ہو۔''

''اس لیے کہ میں عقل مند ہوں۔'' میں نے جواب دیا اور اندر کی طرف روانہ ہوا۔ فاضلی اٹھ بیٹھا تھا اس نے دروازہ کھلنے پر سپاٹ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''کیسے ہو فاضلی؟''

اس سوال پر بھی وہ مجھے اسی طرح دیکھتا رہا ایسا لگ رہا تھا انجکشن نے اثر کر دیا تھا۔ میں نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا تو بغیر مزاحمت کے کھڑا ہو گیا۔ میں اسے باہر لایا اپنے دونوں آدمیوں کو خون میں لت پت پا کر اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات آئے تھے۔ میں اسے باہر لایا تو نومی اچھل پڑی تھی۔ ''میرے خدا یہ آزاد ہے۔''

''فکر مت کرو۔'' میں نے جیپ کے عقبی حصے سے رسی نکالتے ہوئے کہا اور فاضلی کے دونوں ہاتھ پشت سے باندھ کر اسے جیپ کے پچھلے حصے میں دھکیل دیا۔ اس سے پہلے اطمینان کر لیا تھا کہ وہاں کوئی ہتھیار یا ایسی چیز تو نہیں ہے جس سے فاضلی خود کو آزاد کرا لے اگرچہ ایسا لگ رہا تھا کہ انجکشن کی وجہ سے فاضلی اپنی شخصیت اور یادداشت کھو چکا تھا لیکن میں اس پر بھروسا کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ممکن ہے جس طرح یہ انجکشن مجھ پر بے اثر ثابت ہوا تھا فاضلی پر بھی اثر نہ کرتا۔ اس کا امکان تھا کہ میری چال مجھ پر ہی الٹ دے اس لیے میں اس کی طرف سے پوری طرح محتاط تھا۔ نومی نے پیٹ بھر لیا تھا اور اس کی توانائی بحال ہو گئی تھی۔ میں نے اسے فاضلی کی نگرانی پر لگا دیا۔ باہر گرنے والے نگراں کی لاش میں پہلے ہی اندر پہنچا چکا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ نومی یہ لاش دیکھے۔ اب مجھے دوسرے کا فیصلہ کرنا تھا۔ وہ بے ہوش تھا اور اسے ہوش میں لانے کے لیے ایک گلاس پانی استعمال کرنا پڑا تھا۔ گولی نے اس کا شانہ توڑ دیا تھا۔ لیکن یہ اس کے کرتوتوں کی بہت کم سزا تھی۔ وہ ہوش میں آیا اور کراہنے لگا۔

''پانی....''

''میرے بس میں ہو تو تمہیں پیشاب پلاؤں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن میں تمہاری طرح حیوان نہیں ہوں اس لیے یہ لو۔'' میں نے گلاس میں بچا پانی اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے بے تابی سے پانی پیا۔

''تمہارا شکریہ۔'' اس نے ہچکچا کر کہا۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے یہ تمہارا آخری پانی تھا جو تم نے پیا اور اب تم زندگی سے محروم ہونے جا رہے ہو۔''

میں نے پستول سیدھا کیا تو اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ ''مگر کیوں؟''

''یہ سوال تم سے اس نرس نے بھی کیا ہوگا تم نے کیا جواب دیا تھا۔''

وہ خاموش رہا اور اس کی خاموشی ہی اقرارِ جرم تھا میں نے ٹریگر دبا دیا۔ گولی اس کے دل میں اتر گئی اور وہ بغیر آواز نکالے لڑھک گیا تھا۔ جب میں نے نرس کی لاش دیکھی تھی تو اسی وقت عہد کیا تھا کہ مجھے موقع ملا تو میں اس کے مجرموں کو ضرور کیفرِ کردار تک پہنچاؤں گا۔ قدرت نے مجھے یہ موقع دے دیا تھا۔ میں نے پستول قمیص کی جیب میں رکھا تھا کہ باہر سے نومی کی چیخ سنائی دی۔ میں باہر کی طرف لپکا اور پھر ٹھٹک گیا نومی گاڑی کے سامنے زمین پر پڑی تڑپ رہی تھی۔ اس کا گلا کٹا ہوا تھا اور اس سے خون فوارے کی طرح اچھل رہا تھا۔ میں اس کے پاس آیا اس نے مجھے دیکھ کر ہاتھ اوپر کیا جیسے مجھے خبردار کر رہی ہو لیکن کس سے وہاں کوئی نہیں تھا۔ نومی کا ہاتھ گر گیا اور آنکھیں ساکت ہو گئیں۔ اسی لمحے مجھے فاضلی کا خیال آیا اور اس سے پہلے میں اپنی جگہ سے حرکت کرتا اچانک جیپ کا انجن غرا کر اسٹارٹ ہوا اور فاضلی ڈرائیونگ سیٹ پر نمودار ہوا وہ نیچے جھکا ہوا تھا۔ جیپ جھٹکے سے آگے آئی میں مشکل سے دو گز کے فاصلے پر تھا بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

(جاری ہے)

بیت بازی

قارئین

(سلیم کامریڈ کھاڑاں کا جواب)

سید اسرار علی..........لاہور

نہ ٹھکراؤ سمجھ کر خاک یہ تو ان کی تربت ہے
مجھے سرمہ سمجھ کر اس کو آنکھوں میں لگانے دو

نعمان صفدر رضوی..........ملتان

نہ چمکے درد کا سورج تو کرنوں کو ترس جائیں
کہ اہلِ تیرہ شب کو اور سامانِ ضیاء کیا ہے

(ابتہال سلیم حیدرآباد کا جواب)

سلیم کامریڈ..........کھاڑاں

ہاں میں نے لہو اپنا گلستاں کو دیا ہے
مجھکو گل و گلزار پہ تنقید کا حق ہے

اظہر ارتضٰی..........منڈی بہاؤالدین

ہو گئے راکھ پتنگے وہ جمالِ
شمع کی لو جو بجھانے آئے

(انجم سعید بخاری سکھر کا جواب)

شاہد حفیظ..........سرائے عالمگیر

وہ کلی کہاں چلی بیکلی کی چھاؤں میں
سادگی نے چھو لیا دامنِ حیات کو

عبدالحلیم..........لاہور

وہ جس کے دم سے ہے روشن ہماری بزمِ خیال
ستارہ رخ ہے کوئی کہکشاں جبیں ہے کوئی

(نصرت ہانی سکھر کا جواب)

ذوالفقار فضل کریم..........برہ زئی چھچھ

نہ کلی ہے وجہ نظر کشی نہ کنول کے پھول میں تازگی
فقط ایک دل کی شگفتگی سبب نشاطِ بہار ہے

(ڈاکٹر محمود فیضانی ایبٹ آباد کا جواب)

ابتہال سلیم..........حیدرآباد

حوصلہ اس چراغ کا دیکھو
جو ہواؤں میں جلتا رہتا ہے

امیہ حجل..........حیدرآباد

حنا کا اب نہ بہانہ تراش میں خوش ہوں
کہ دل کا آخری قطرہ بھی تیرے کام آیا

(یوسف گردیزی ملتان کا جواب)

ابریز علی تیموری..........العین یو اے ای

رشک سے دل میں کسک اٹھے گی راتیں بیرن بن جائیں گی
امیاری کے جھرمٹ سے جب چاند تجھے چھپ کر جھانکے گا

عاشق حسین..........چنیوٹ

رچ رہی ہے فضاؤں میں خوشبو
زلف ہے یا دھواں ہے صندل کا

منہال حیدر..........جھنگ

رو میں آئے تو وہ خود گرمئی بازار ہوئے
ہم جنہیں ہاتھ لگا کر ہی گنہگار ہوئے

ریحانہ افتخار ملک..........شیخوپورہ

رک گئی یورش آرام تو پھر کیا ہوگا
تھم گئی گردشِ ایام تو پھر کیا ہوگا

انور سجاد..........سرگودھا

رات دن جس بتِ کافر کی پرستش کی تھی
بدگماں اس کو ہر اک گام پہ پایا ہم نے

(ارتضٰی حسین میرپورخاص کا جواب)

علی جوہر..........شادی پور

لفظ کی حرمتیں چھن گئیں حرف سے
ہو گیا بے مزہ میرا طرزِ سخن

انیس آفاق..........حاصل پور

لکھتے لکھتے زندگی کی شام ہو گئی
یوں ہی آخر زندگی تمام ہو گئی

(نثار فاروقی جیکب آباد کا جواب)

ناز اختر ناز..........حیدرآباد

ہر ذرہ خاکی کو کرن ہم نے بنایا
مٹی کو لہو دے کے چمن ہم نے بنایا

WWW.PAKSOCIETY.COM

عباس ملتانی.........ملتان
ہائے وہ دھڑکنوں سے بھری ساعتیں مجید
میں ان کو دیکھتا تھا کوئی دیکھتا نہ تھا
نیاز حیدر.........فیصل آباد
ہوا جب چلی پھڑ پھڑا کر اڑے
پرندے پرانے محلات کے
(تنویر آصف چوہدری دینہ جہلم کا جواب)
نازش سحر.........کراچی
اس کو بھی تو جا کر دیکھو اس کا حال بھی مجھ سا ہے
چپ چپ رہ کر دکھ سہنے سے تو انساں مرجاتا ہے
تسنیم ضیا.........کراچی
اس زمانے کو ترس جائیں گے ہم
آہ یہ تشنگی ہجر و وصال
میمونہ عباسی.........حیدر آباد
آنکھوں میں دھند سی ہے گزرے کل کی
دل پر اس کی یاد کی ہر دم دستک
راحت خان.........ڈی جی خان
اللہ رکھے عمر ہے جتنی بھی مری
بجلی سے لگیں گزرتے یہ ماہ و سال
زاہد جمال.........سکرنڈ
اپنے پہلو کی صدا سے ہم اچانک چونک اٹھے
دل کی دھڑکن پہ ہوا دھوکا تری آواز کا
(بھگوان داس گوتم مل سکرنڈ کا جواب)
رام جی دیوریا.........سکرنڈ
یاد رکھئے مجھے دعاؤں میں
بس یہی التماس ہے اے دوست
شاہد آفاق.........حیدر آباد
یہ تری تلخ نوائی ہے کہ گمرا ہوں میں
اپنی منزل پر پہنچنے کی کسک باقی ہے
شاہد انجم.........کراچی
ایک خواہش نے فروزاں کردیے کتنے چراغ
اک تمنا نے رقم کتنے مقالے کردیے
وقار الحسن.........سرگودھا
ایسی ہی ایک رت میں ہوا تھا میرا کوئی
آنکھوں میں اشک بھر گئی برسات کی ہوا

عنایت مسیح.........لاہور
اب کس کو ہے معلوم کہ اشعار ہیں میرے
پیغام ترے دل کو میرے دل کی طرف سے
(فیض عالم لاہور کا جواب)
انعم سعید بخاری.........سکھر
اک دامن رنگین سراپا مستی سی فضا میں چھا ہی گئی
جب سیر چمن کو وہ نکلے پھولوں کی جبیں شرما ہی گئی
عرفان خان.........چنیوٹ
اف وہ بیگانہ نگاہوں کی کرم فرمائی
فطرت عشق باانداز جنوں تھرائی
نادیہ گبول.........کراچی
آ دیکھ میرے سینے میں ہے دل ہی دل تمام
اور وہ بھی تیرے شور وشغف سے بھرا ہوا
عبدالرحمٰن.........ساہیوال
ادھر ادھر ہے عبث یہ تلاش قاتل
لہو بسا ہے لہو رنگ آستینوں میں
(ناہید عمر سکھر کا جواب)
نازش سحر.........کراچی
یہ سرد مہر اُجالی یہ جیتی جاگتی رات
ترے خیال سے تصویرِ ماہ جلتی ہے
جویریہ ابراہیم.........سرگودھا
یاد کا پرانا زخم یونہی رستا رہے
یہ کنول شاداب رہے تو اچھا ہے
نسرین رانا.........فیصل آباد
یہ اہل ظرف کی باتیں ہیں آپ کیا جانیں
ہمارے ہاتھ میں ترکش ہے اور نشانہ بھی ہم
اصغر بنگش.........ڈی آئی خان
یاد ہیں اس لب شریں کے کچوکے اب تک
ڈر کے دل اب بھی مرا میٹھی زباں سے چونکے

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کردیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

علمی آزمائش۔ 88

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماھنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماھنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک صفحی سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 28 فروری 2013ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری لی اور 1936 میں سیاست میں آگئیں۔ 1937 میں مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی۔ 1946ء میں لاہور سے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی کا انتخاب جیت لیا۔ 1946ء میں بہار میں ہندو مسلم فساد برپا ہوا تو آپ نے پورے بہار کا دورہ کیا۔ 1948ء میں ریلیف سیکریٹری مقرر ہوئیں اور دہلی کا دورہ کیا۔ 1982ء تا 1985ء مجلس شوریٰ کی رکن رہیں، 1995ء میں انتقال ہوا۔

علمی آزمائش 86 کا جواب

اردو کے نامور شاعر خواجہ حیدر علی آتش کے والد کا نام خواجہ علی بخش تھا دہلی کے رہنے والے تھے۔ نواب شجاع الدولہ کے عہد میں فیض آباد آئے۔ یہیں خواجہ حیدر علی کی پیدائش ہوئی نواب مرزا محمد تقی خان کے ملازم ہو کر ان کے ہمراہ لکھنو چلے گئے۔ وضع قطع سپاہیانہ تھی۔ بزرگوں میں پیری مریدی تھی، گیروا تہ بند باندھتے تھے اور کاکل رکھتے تھے۔

انعام یافتگان

1-نصرت حسن، شیخوپورہ 2-محمد باقر رضا، جھنگ 3-انعام شیخ، لیہ
4-ناصر علی، کراچی 5- فہد مصطفی، کوئٹہ

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے نگار جہاں، محمد خواجہ، سید احترام حسین رضوی، مریم ریاض، سید عزیز الدین، بختاور شاہ، عارضہ سلطان، کہکشاں تبسم

وجاہت علی، ابرار احمد، عنایت مسیح، کاوش اختر، علی احمد، نجم الدین حیدر، تنویر حسین زیدی، کلیم اللہ فہمی، رجب علی مرزا، نوازش علی شاہ، منور علی، نجم الدین حیدر، ناصر افروز، ملک سرفراز گوندل، نصرت فاروقی، ممتاز الحسن، کاشف حیدر، فہیم احمد، وجاہت ایثار، جاوید علی، انعام خان، انصار حسین، مظفر محسن، سیام فاروقی، خالد عثمانی، افتخار احسن، قائم علی، ناظم پاشا، کائنات فاطمہ، نذر علی برمانی۔ لاہور سے مسرت اسلم، ارشاد علی، تابش عطاری، احمد علی شرقی، نیاز احمد ملک، ممتاز الحسن، برق ضیائی، خالد علی، عقیل سندھو، احمد بشیر بٹ، نعمان اشرف، فہیم مرزا، ارباز خان، حدیقہ اشرف، گل زیب، اکرم صدیقی، پروین ضیائی، ملک واحد الحق، نعمان اشرف، نثار اختر، ابرار احمد انعام، نازش خان، ہما جبیں، حمیرا خاتون، تابش اطہر، نازش حسین، زبیر اسلم، ممتاز الحق۔ راولپنڈی سے نرجس علی، زویا بخاری، بخت خان، کائنات بانو، سید محمد تقی، زبیر شاہ اشرفی، تنویر الحسن، رانا فتح یاب صفدر شیرازی، نسرین اشرف، زاہد عباسی، خاقان خان، محمد رفیق خان۔ اسلام آباد سے شاہین اشفاق، خضر حیات عباسی، محمد متین، سعید اختر بشیر فاروقی، روا ممتاز، انور یوسف زئی، شہباز فیضی، محمد شہزاد، ثمین جاوید، ڈاکٹر ثروت جاوید۔ میرپور خاص سے ضوریز اختر۔ کوئٹہ سے راوٗر شید، ارباز خان، فیض اللہ خان، تقی چنگیزی، قتیل سید پوری، نگار بٹ، صالح بشیر، خاقان عمران، نصرت چنگیزی۔ سرگودھا سے نادر شاہ، حیات خان، فصیح الزمان، عظمیٰ اکمل ٹونہ، خلیق الحق، خضر حیات، سید امتیاز حسین بخاری چکڑالوی، ظفر اقبال جاوید (سلانوالی)۔ ملتان سے قدوس بخش، سعیدہ جلال، فاضل خان اچکزئی، لبنیٰ ظہیر، نصیر الدین واصف، اقبال حمیدی، فاروق ابرار، صلاح الدین احمد، رضوانہ اختر، اللہ دتہ، محمد عتیق، فرزانہ ملک، زینب چوہان، قدوس بخش، محمد احمد۔ جہانیاں سے محمد سہیل انجم، رانا وجدانی، اصغر میئو، نصیر الدین، کاشف زیدی، زبیر ملک، فرہاد اصغر، نوشین سلطان۔ کوٹ ادو سے ممتاز احمد، فرخ بشیر، نعمان بشیر، احمد یار خان، ناصر رند، فیاض چوٹالہ، الہ ڈینو، آفاق سعید۔ حسن ابدال سے سید محمد رضا، کرم الٰہی، ارشاد خان، نیاز احسن، ذوالفقار، مرتضیٰ حسن، شہزاد خان۔ چوٹالہ سے چوہدری بشیر ملک، نثار احمد، نثار مظفر، رفیق احمد مغل، احمد سلیم، عباس خان، کمال فیاضی۔ پاک پتن سے نواب علی، سدرہ شفیق، ذریاب خان، نرجس زیدی، ذریاب خان، عطا المصطفیٰ محمد فاروق، سلطان قادری۔ جھنگ سے زویا رفیق، امتیاز حسن، عجب گل، زاہد ملک، ملک سرفراز، احباب زیدی، ناصر ترمذی۔ سکھر سے ارشاد بھٹو، نعمان شیخ، رام جیٹھ ملکھانی، خالد مغل، تصویر فاطمہ، علی اکبر، ذیشان حسن۔ مانسہرہ سے عباس خان، رفیق لاہوری، زاہد خاور، نسیم ارشاد۔ پارہ چنار سے زاہد علی طوری، فائق مانسہروی، لیاقت علی، حسن بخش، زاہد خان۔ اوکاڑہ سے اظہر الدین، سید احسن محمود، نعمان بشیر، صاحب خان، راجا احسن، ملک صفدر، اظہر الدین۔ سیالکوٹ سے نوید شہزاد خواجہ آصف ملک، اقرار الحسن، مہ جبیں خٹک، نصرت مرزا، محمد رضا، احتشام، اسلام الدین، ارباز ملک، لیاقت علی، ضامن رند، ظہیر فرقانی۔ شجاع آباد سے سید عباس علی، ارباز خان، زوار حسین زیدی، نسیم اختر نیازی، فتح ملک۔ اٹک سے خالد چوہدری زبیر اللہ خان، فیض اختر، شاہ جبران، خورشید اختر، زبیر اللہ مروت، فاطمہ ملک، سرفراز گل، ثناء اللہ، فرحت بابر زمان، سعید بھٹی، نثار فراز، سید اختر، سعید خان، شیخ ثنا، زبیر اللہ مروت، اکرم خان۔ حافظ آباد سے نعمان حسن خان، فرحت جان، الدجاوید، شیریں فاطمہ، نسرین رانا۔ نواب شاہ سے عزیز حسن، ارحم شاہ، عزیز الدین۔ شہر سلطان سے سنجیدہ احمد، بازق بخاری، ارشد حسن، نوید انصاری، عباس علی، ارباب خان، راجا یونس۔ میرپور آزاد کشمیر سے کاشف حسین، نعمان سلطان، کمال احد کمال، احسن بھٹ، نصرت خان، یونس ایاز، چوہدری محمد مبشر نذیر (سہو ہیرہ، پونچھ)۔ میانوالی سے احمد علی فوقی، ایاز علی رند، ملک سرفراز، خیر الدین کھر، ضامن خان اشرفی، عبد اخلاق (کالا باغ)۔ بھکر سے حسن چنگیزی، غازی شاہ، شاہد حسن خان، نیاز احسن، زاہد اسلم چٹھہ، ملک سرفراز منگیرا، زبیر شاہ، تقی بنگش۔ ٹنڈو آدم سے فاطمہ عباسی، نیاز ملکانی، خالد خان چوٹالہ، ناصر بھکیو، نیاز عباس۔ کمالیہ سے محمد کمال، ذیشان مجاد، ناصر ملک، فہد حسن، ابرار الحق، نثار علی، فہیم عثمانی، فردوس بشیر، ابرار خان اعظم، ظہیر الدین۔ لیہ سے شباب الاسلام، شجاعت خان، راجا ابرار، سردار توفیق، انصار حسین، مالک حسن ملک۔ کولارچی سے ارشد خان۔ شاہ جمال سے فہد مشتاق۔ نارووال سے انعام احسن کمالی۔ مردان سے ابرار خان۔ تربیلہ ڈیم سے حسن بیگ، نعیم اللہ فاروقی۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے سرفراز احسان، صفدر حسن، خالد خان، ناصر انجم، ابار حسن زئی۔ ڈیرہ غازی خان سے احمد علی، واصف احمد۔ پشاور سے غازی توفیق، مانک اسلم، فرید ملک، نسیم نیاز احمد، خالد کنول، وقار احمد، قیصر حسن، توفیق الاسلام، افضل میو، ثنا وقار، نہال زیدی، ابشام رضا خان، نعیم شیرازی، فخر اسلام، سردار علی مینگل، فرقان اختر، نسیم اچکزئی، بینش ملک، نسیم فردوس، ارہام خان، جویریہ، گلشن خان، نعیم الحسن، فرقن اختر، شیر نواز، اطہر نواز، شمیم فاروقی، ضیاء الحق، اطہر شاہ، ضیاالحق، جمال شاہ، فراست خان، نوید فہیم، اصغر طوری بنگش، محمود اچکزئی، خزانہ شاہ، ارباب خان، دردانہ شاہ، نسیم نیازی۔ چشتیاں سے معظم علی۔ مردان سے محمد انور (باڑی چم)۔ برہ زئی چھچھ سے ذوالفقار، فضل کریم، ملک جاوید محمد خان سرکانی۔ ممالک غیر سے انور حمیدی، واصف علی (العین یو اے ای) نصیر خان ناصری، نصرت جاوید (جدہ سعودیہ)، حافظ تصدیق بشیر الہندی (سلطنت اومان)، انعام ملک (جرمنی)، فہد فاروق (ٹوکیو، جاپان)۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

انگارا

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم
کافی عرصے سے سرگزشت زیرِمطالعہ ہے۔ اس بار میں بھی اس قافلے میں شرکت کا متمنی ہوں۔ آپ کی خدمت میں خود اپنی سرگزشت ارسال کررہا ہوں۔ مجھے یقین ہے یہ سرگزشت آپ کو بہت پسند آئے گی۔ کیونکہ اس میں بہت بڑا سبق ہے۔ اب آپ فیصلہ کریں کہ میں نے غلط کیا یا صحیح۔

عمران
(لاہور)

میں گھر میں داخل ہوا تو میری سب سے چھوٹی بہن میمونہ دوڑی ہوئی آئی۔ ''عمران بھائی آپ نے سنا؟''

''کیا؟'' میں کرسی پر گرتے ہوئے بولا۔ آج دفتر میں کام بہت زیادہ تھا۔ لنچ کا وقت بھی مشکل سے ملا تھا۔ میں ایک بڑی فرم میں اکاؤنٹس کے شعبے میں کام کرتا تھا اور میری جاب کو ایک سال ہی ہوا تھا۔ اپنے شعبے میں سب سے جونیئر میں تھا اس لیے جب کام کا بوجھ ہوتا تو میں مارا جاتا تھا۔ اب انکار بھی نہیں کرسکتا تھا، دوسرے مجھے خود کام کرنے میں مزہ آتا تھا اور اپنے حصے کا کام نمٹا کر دفتر سے اٹھتا تھا یہی وجہ تھی کہ عام طور سے گھر آتے آتے سات آٹھ بج جاتے تھے۔ گھر میں، میں سب سے بڑا تھا۔ مجھ سے چھوٹی دو بہنیں تھیں اور پھر ایک بھائی تھا سب سے چھوٹی میمونہ تھی جسے سب پیار سے مونا کہتے تھے۔

والد صاحب سیلف میڈ آدمی تھے ۔ انہوں نے ہمیں پڑھانے لکھانے کے ساتھ یہ چھوٹا سا مکان بنا دیا تھا اس لیے جب اچانک ہی ان کا انتقال ہوا تو ہم بے سائباں نہیں ہوئے تھے۔ لیکن مالی مشکلات بہت پیش آئی تھیں۔ امی نے ہمت کی اور ایک اسکول میں پڑھانے لگی تھیں۔ کچھ ہم بہن بھائیوں نے ٹیوشن اور سلائی کر کے یہ مشکل وقت گزارہ۔ پھر میں بی کام کر کے ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ اس سے ہمارا گھر مشکل حالات سے نکل آیا۔ امی اب بھی جاب کر رہی تھیں اور بہنیں سلائی کرتی تھیں اس سے جو ملتا اس سے امی مجھ سے چھوٹی شائستہ کا جہیز تیار کر رہی تھیں۔ شائستہ گریجویشن کر چکی تھی۔ وہ مجھ سے تین سال چھوٹی تھی لیکن پڑھائی میں بہت تیز تھی۔

''مونا۔'' امی نے کچن سے پکارا۔ ''بھائی تھکا ہوا آیا ہے پانی پوچھا ہے کہ نہیں۔''

''بھائی میں پانی لاتی ہوں پھر بتاتی ہوں۔'' مونا نے کہا اور اندر بھاگ گئی۔ چند سیکنڈ بعد پانی کے گلاس سمیت نمودار ہوئی۔ اس نے مجھے گلاس تھمایا اور شروع ہو گئی۔ ''بھائی، شارق بھائی مولوی بن گئے ہیں۔''

میں پانی پی رہا تھا مونا کی بات سن کر مجھے ٹھسکا لگ گیا۔ ایسی کھانسی آئی کہ بہت دیر تک تو سانس ہی قابو نہیں آئی، امی دوڑی آئیں اور میری پشت سہلاتے ہوئے مونا کو جھاڑنے لگیں۔ میں نے سانس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''کوئی... بات.....نہیں امی۔''

مونا منہ بسور رہی تھی۔ ''میرا کیا قصور ہے میں تو بھائی کو صرف بتا رہی تھی۔''

امی نے گلاس دے کر اسے وہاں سے جانے کا حکم دیا وہ چلی گئی۔ میں اندر آیا اور کپڑے بدل کر منہ ہاتھ دھویا۔ اتنی دیر میں امی کھانا لگا چکی تھیں اور دسترخوان پر بھی یہی خبر گردش کر رہی تھی کہ شارق مولوی بن گیا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''مولوی سے کیا مراد ہے۔ وہ کیسے مولوی بن سکتا ہے اسے تو شاید ٹھیک سے کلمہ پڑھنا بھی نہیں آتا ہے؟''

''پتا نہیں بھائی۔'' شائستہ سے چھوٹی فرحانہ بولی۔ ''لیکن سارے خاندان میں یہ خبر گردش کر رہی ہے۔''

ہمارا خاندان ماشااللہ سے خاصا بڑا ہے۔ امی ابو آپس میں کزن ہیں اس لیے ننھیال اور ددھیال آپس میں ملا ہوا ہے۔ ابو کے سات بہن بھائی ہیں اور امی کے بہن بھائیوں کی تعداد نو ہے اس لیے براہ راست رشتے دار ہی خاصے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے کزن بھی ہیں۔ بڑے خاندان میں واقعات بھی زیادہ ہوتے رہتے ہیں۔ پھر یہ واقعات فوراً ہی سب کے علم میں آجاتے ہیں۔ مگر فی الحال یہ سنی سنائی بات تھی۔ شارق کے بارے میں جہاں تک میں جانتا تھا اس میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی کہ اسے مولوی کہا جا سکتا۔ وہ برا نہیں تھا لیکن نہ جانے کیوں اسے مذہب اور اس سے متعلقہ باتوں سے چڑ تھی۔ عبادات سے بے رغبتی کا یہ عالم تھا کہ جمعے کی تو چھوڑیں وہ عید کی نماز بھی نہیں پڑھتا تھا اور کسی نے کبھی اسے روزہ رکھتے نہیں دیکھا تھا۔ باقی دینی شعار کا وہ مذاق اڑاتا تھا اور خاندان میں دین کی طرف رجحان رکھنے والے خاص طور سے اس سے کتراتے تھے کیونکہ وہ کوئی نہ کوئی موضوع لے کر بالآخر مذہب کی طرف آجاتا اور پھر اسے پروا نہیں ہوتی تھی کہ اگلے کی دل آزاری ہو رہی ہے۔ خود میں بھی اس سے اس موضوع پر بات نہیں کرتا تھا۔ اگرچہ مجھے اچھا مسلمان ہونے کا دعویٰ نہیں ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ دین عمل کرنے کے لیے ہوتا ہے اور اگر آپ اس پر عمل نہیں کر سکتے تو کم از کم اس کا مذاق بھی نہ اڑائیں۔ مجھے کسی معمولی سے انسان کا مذاق اڑانا بھی اچھا نہیں لگتا تو یہ تو بہت بڑی بات تھی۔ اس لیے جب اس نے دو تین بار میرے ساتھ ایسی بات کی تو میں نے اسے سنجیدگی سے ٹوک دیا۔

''دیکھو شارق اول تو کسی چیز کا بھی مذاق اڑانا اچھی بات نہیں ہے اور خاص طور سے جب معاملہ مذہب کا ہو تو انسان کو خاص طور سے احتیاط برتنی چاہیے کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو۔ تم ویسے اتنے اخلاق والے انسان ہو لیکن اس معاملے میں تمہارا اخلاق نظر نہیں آتا۔''

شارق چپ ہو گیا تھا اور اس کے بعد سے اس نے مجھ سے مذہب کے حوالے سے کوئی ایسی بات نہیں کی جو ناگوار گزرتی۔ لیکن دوسروں کے ساتھ وہ یہ حرکت کر جاتا تھا۔ خاص طور سے ہمارے ایک خالو تھے۔ شارق میرا خالہ زاد بھائی ہے۔ اس لیے امتیاز انکل میرے بھی خالو لگتے تھے۔ جوانی کے دنوں میں وہ بہت شوقین مزاج تھے۔ تفریح کی ہر چیز سب سے پہلے ان کے گھر آتی تھی۔ جیسے سب سے پہلے

WWW.PAKSOCIETY.COM

رنگین ٹی وی اور وی سی آر انہوں نے لیا۔ پھر جب ڈش آئی تو انہوں نے ڈش بھی لگوائی اور کیبل ٹی وی آتے ہی کیبل بھی لگوالیا۔ مگر چند سال پہلے ان کی حالت بدلی اور وہ مذہب کی طرف مائل ہو گئے۔ گھر سے ٹی وی اور کیبل نکلوا دیا۔ بچوں کا کمپیوٹر اٹھا کر ڈبے میں بند کر دیا۔ موسیقی قطعی ممنوع ہو گئی۔ اپنی بیٹیوں کے معاملے میں وہ اتنے حساس ہو گئے کہ وہ ہم کزنز سے بھی بات کرتیں تو انہیں ناگوار گزرتا تھا۔

یہ تبدیلی بری نہیں تھی۔ لیکن بدقسمتی سے خالو امتیاز نے دوسروں کے ساتھ ایسا رویہ اپنا لیا جیسے اس زمانے میں صرف وہی متقی اور پرہیزگار ہیں۔ باقی سب گناہ گار ہیں اور اگر انہوں نے اپنی حرکتیں ٹھیک نہ کیں تو لازمی جہنم میں جائیں گے۔ پھر وہ بالکل بھول گئے کہ چند سال پہلے تک ان کا کیا حال تھا۔ وہ بات بات پر اپنی دین داری کا یوں حوالہ دینے لگے جیسے بچپن سے ہی ایسے چلے آرہے ہوں۔ ایک دن میں ان کے گھر گیا۔ امی نے کسی کام سے بھیجا تھا۔ جب سے خالو نے کچھ کزنز کو باتیں سنائی تھیں میں ان کے گھر جاتے ہوئے احتیاط برتنے لگا تھا۔ اپنی خالہ زاد بہنوں سے صرف سلام دعا کرتا تھا۔ میں واپس جا رہا تھا کہ امتیاز خالو مسجد سے آگئے۔ وہ پانچ وقت کی نماز مسجد میں ادا کرتے تھے۔ انہوں نے سلام کا جواب دے کر تنقیدی نظروں سے مجھے دیکھا۔

"برخوردار، یہ جینز غیر شرعی لباس ہے اس سے اجتناب کیا کرو۔"

"جی خالو۔" میں نے دبے لفظوں میں کہا۔ اصل میں مجھے اتنی معلومات نہیں تھیں کہ لباس میں کیا شرعی ہے اور کیا غیر شرعی۔ دوسرے مجھے بڑوں سے بحث کی عادت بھی نہیں تھی، امی ابو نے بچپن سے بڑوں کی بات کان دبا کر سننے کی عادت ڈالی تھی۔ خالو امتیاز نے میری دبی زبان کا کچھ اور مطلب لیا اور اس کے بعد ان کا لمبا چوڑا لیکچر شروع ہو گیا۔ بڑی مشکل سے مجھے جانے کی اجازت ملی تھی اور میں نے کانوں کو ہاتھ لگایا تھا کہ آئندہ خالہ کے گھر جینز پہن کر نہیں جاؤں گا۔ مگر جب خالو امتیاز نے اسی طرح شارق پر اعتراض کیا۔ خاندان میں ایک شادی کے موقع پر سب جمع تھے۔ شارق گٹار بہت اچھا بجاتا تھا۔ وہاں بھی وہ گٹار لے آیا تھا اور سب نوجوانوں کو جمع کر کے مختلف دھنیں بجا رہا تھا۔ بہت سارے لوگ انجوائے کر رہے تھے اور جن کو پسند نہیں تھا وہ اپنی باتوں میں لگے ہوئے تھے، لیکن امتیاز خالو پیچ و تاب کھا رہے تھے اور زیرِ لب شارق کی مذمت کر رہے تھے۔ آخر ان کی برداشت جواب دے گئی اور وہ اٹھ کر نوجوانوں کی ٹولی میں پہنچ گئے۔

"بند کرو یہ بے ہودگی۔"

گٹار پر شارق کا ہاتھ رک گیا اور اس نے حیرت سے امتیاز خالو کو دیکھا۔ "کیا ہوا خالو خیریت تو ہے؟"

"تمہیں معلوم نہیں ہے کہ موسیقی حرام ہے۔"

"جی جب آپ کی عمر کو پہنچیں گے تو معلوم ہو جائے گا۔" شارق نے اتنے سکون سے کہا کہ سب کی ہنسی نکل گئی۔

"سب جہنم میں جاؤ گے۔" امتیاز خالو نے غصے سے کہا۔

"یہ بتائیں کہ انسان اپنے حالیہ اعمال کی وجہ سے جہنم رسید ہوتا ہے یا جو ماضی میں کر چکا ہوتا ہے اس کی وجہ سے جہنم جاتا ہے۔"

امتیاز خالو چونکے۔ "کیا مطلب؟"

"خالو میرے پاس خاندان کی شادیوں کی کئی ویڈیوز ہیں جن میں آپ بڑی تیز میوزک پر خواتین کے درمیان رقص کر رہے ہیں۔"

"تم بدتمیز ہو، میں اپنے ان اعمال پر توبہ کر چکا ہوں۔"

"ٹھیک ہے لیکن دوسروں کو انجوائے کرنے سے منع نہیں کر سکتے جب ہمارا وقت آئے گا تو ہم بھی توبہ کر لیں گے۔"

شارق کی اس بات پر امتیاز خالو آپے سے باہر ہو گئے اور اسے گالیاں دینے لگے۔ لوگ جمع ہو گئے تھے۔ بڑی مشکل سے انہیں چپ کرایا۔ شارق خاموشی سے سن رہا تھا اس نے صرف اتنا کہا۔ "میں نہیں سمجھتا کہ کسی کو گالیاں دینا اچھی حرکت ہے۔"

اس وقت شارق کو سب بڑوں سے بہت کچھ سننا پڑا تھا۔ اسے امتیاز خالو کے سامنے بولنا نہیں چاہیے تھا، لیکن وہ کچھ اسی قسم کا آدمی تھا۔ بعد میں اس نے نوجوانوں کی ایک محفل میں کہا۔ "یار امتیاز خالو کا ڈبل اسٹینڈرڈ ہے اپنے لیے کچھ ہے اور دوسروں کے لیے کچھ اور ہے۔ اپنی لڑکیوں کے لیے وہ پسند نہیں کرتے ہیں کہ وہ اپنے کزنز سے ملیں یا ان سے بات کریں۔ لیکن وہ خود اپنی کزنز سے ابھی تک اتنی بے تکلف انداز میں پیش آتے ہیں۔"

امتیاز خالو کا یہ ڈبل اسٹینڈرڈ سب ہی محسوس کرتے تھے۔ لیکن فساد کے خوف سے کوئی کچھ کہتا نہیں تھا۔ اس وقت بہت سارے لوگ حیران رہ گئے جب پتا چلا کہ خالو نے ریٹائرمنٹ پر ملنے والی رقم ڈیپازٹ میں فکس کرا دی اور اب اس سے ملنے والا انٹرسٹ لے رہے تھے۔ انہوں نے یہ بات سب سے چھپائی تھی لیکن ہمارے خاندان میں کوئی بات چھپی نہیں رہتی تھی۔ کسی طرح شارق کے علم میں آگئی تھی اور اس نے سب میں پھیلا دی۔ امتیاز خالو اس پر بہت تلملائے تھے، لیکن شارق کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ پہلے ہی اس کے منہ لگ کر پچھتا رہے تھے۔

اب پتا چل رہا تھا کہ وہی شارق مولوی ہو گیا تھا۔ جاب کی مصروفیت کی وجہ سے میں اب کم ہی کسی کے ہاں جاتا تھا۔ ہفتے کے چھ دن تو گھر آنے کا موقع ملتا تو اسی کو غنیمت سمجھتا تھا۔ چھٹی والے دن بے شمار کام نمٹانے ہوتے تھے۔ البتہ جب ایک ساتھ ہی کئی چھٹیاں آجاتیں تو کہیں جانے کا موقع ملتا تھا۔ شارق کے بارے میں سنا تو میں بھی متجسس تھا۔ مگر اس کے گھر جانے کا موقع مجھے اس کے کوئی دو مہینے بعد ملا تھا۔ یہ عید کا موقع تھا۔ عید کے دوسرے دن امی اور سب گھر والے مختلف رشتے داروں کے ہاں جاتے تھے۔ میں خالہ کے گھر پہنچا تو دستک پر اندر سے ایک باریش نوجوان نکلا جس نے کرتے کے ساتھ ٹخنوں سے اوپر پاجامہ پہن رکھا تھا۔ میں حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ شارق تھا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ "ایسے کیا دیکھ رہے ہو بھائی؟"

"مجھے لگ رہا ہے جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہوں یا یہ حقیقت ہے۔"

وہ ہنستے ہوئے میرے گلے لگ گیا اور پھر مجھے اندر لے گیا۔ خالہ اور سب سے عید مل کر میں شارق کو ایک طرف لے گیا۔ "کیا چکر ہے یار، یہ کایا کلپ کیسے ہوئی؟"

"کیسی کایا کلپ؟" وہ انجان بنا۔

"یہ داڑھی، یہ ٹخنوں سے اوپر پاجامہ اور یہ بدلا ہوا لہجہ اور انداز، مجھے تو لگ رہا ہے میں بالکل کسی اجنبی شخص کو دیکھ رہا ہوں۔"

"کچھ بھی نہیں بدلا ہے دوست بس ذرا اوپر کے حلیے میں تبدیلی آئی ہے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اوپر کے حلیے میں اس وقت تبدیلی آتی ہے جب اندر سے تبدیلی آئے۔"

وہ ہنسنے لگا۔ "چلو ایسا سمجھ لو لیکن یہ کوئی کایا کلپ نہیں ہے بس یوں سمجھ لو کہ تبدیلی کی کوشش ہے۔"

"اگر یہ کوشش بھی ہے تو میرے لیے ناقابلِ یقین ہے۔"

"بھائی ناقابلِ یقین اور ناممکن تو ہمارے لیے ہے۔ اللہ کے لیے تو کچھ ناممکن نہیں ہے۔" اس نے نرمی سے کہا اس کا لہجہ تک بدل گیا تھا۔ کہاں بلند آہنگ اور شوخ لہجے میں بولتا ہوا شارق اور کہاں یہ نرم اور دھیمے لہجے میں بولنے والا شارق۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو، لیکن پھر بھی مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔ آخر یہ سب ہوا کیسے؟"

"اللہ نے کچھ نیک لوگوں سے ملایا اور ان کی باتوں نے مجھ پر اثر کیا اور اب میں تمہارے سامنے ہوں۔"

"پھر بھی یار کہیں تو آغاز ہوا ہوگا۔"

شارق نے بتایا کہ وہ ایک دن پارک میں بیٹھ کر گٹار کی مشق کر رہا تھا اسے کہیں کنسرٹ میں کام کرنے کا موقع ملا تھا۔ گٹار بجاتے ہوئے اسے احساس نہیں ہوا کہ ایک شخص اسے غور سے دیکھ رہا ہے۔ جب اس نے ہاتھ روکے تو اس شخص نے اسے بے ساختہ داد دی اور شارق کو حیرت ہوئی کیونکہ اس کا حلیہ امتیاز خالو سے مختلف نہیں تھا۔ پھر وہ شخص اس کے پاس آبیٹھا اور ذرا سی دیر میں شارق سے یوں بے تکلف ہو گیا جیسے برسوں کی جان پہچان ہو۔ شارق کو لگا کہ ابھی وہ تبلیغ شروع کر دے گا لیکن اس کے بجائے وہ شارق کو بتانے لگا کہ ایک زمانے میں اسے بھی موسیقی کا بہت شوق تھا۔ وہ الیکٹرک پیانو بہت اچھا بجاتا تھا بلکہ کئی ایک بار اسے ویڈیوز میں کام کرنے کا موقع ملا۔ اس لیے جب اس نے شارق کو گٹار بجاتے سنا تو بے اختیار اس کے پاس آگیا۔ پھر شارق کی اس سے دوستی ہو گئی اور وہ اس سے ملنے لگا۔ اس کا ایک مخصوص حلقۂ احباب تھا۔ اس میں سب اس جیسے تھے صرف شارق الگ سے تھا لیکن وہ اس کے ساتھ بھی ویسے ہی پیش آتے تھے جیسے آپس میں ہوتے تھے۔ انہوں نے شارق سے کبھی دین کے موضوع پر خود سے بات نہیں کی، جب اس نے کی تو انہوں نے شارق کو وضاحت کر دی۔ ان کی ملاقات کے دوران نماز کا وقت ہوتا تو وہ اٹھ کر مسجد چلے جاتے تھے مگر شارق سے نہیں کہتے تھے۔ ایک بار شارق نے ان سے پوچھ لیا۔

"آپ لوگ نماز کے لیے جاتے ہیں تو مجھے نہیں کہتے۔"

"ہم نہیں کہتے ہیں بھائی اللہ بلاتا ہے۔" شارق کے دوست نے کہا۔ "اذان اور کیا ہے؟"

"وہ آپ بھی سنتے ہیں، میں آپ کی بات کر رہا ہوں آپ کیوں مجھے نہیں کہتے؟"

"اس لیے کہ تم کہیں دل نہ چاہتے ہوئے بھی صرف ہماری خاطر نماز پڑھنے چلو اور نماز ہمارے لیے تھوڑی ہے

WWW.PAKSOCIETY.COM

یہ تو اللہ کے لیے ہے۔ جب وہ توفیق دے گا تو تم ضرور پڑھو گے کسی کے کہنے کی ضرورت نہیں پڑھے گی۔"

پھر ایک دن وہ نماز کے لیے جا رہے تھے کہ شارق بھی ان کے ساتھ چلا گیا لیکن اس نے ان کو بتا دیا کہ اسے نماز میں بہت ساری چیزیں نہیں آتی ہیں۔ انہوں نے اسے تسلی دی کہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ باجماعت نماز میں صرف امام کی پیروی کی جاتی ہے اور اس کی کی دعا پر آمین کہا جاتا ہے۔ باقی اگر وہ نماز پڑھنا چاہتا ہے تو جلد ہی سب سیکھ جائے گا۔ یوں شارق نے نماز شروع کی اور پھر وہ خود بہ خود بدلتا چلا گیا۔ ایک دن اس نے اپنا گٹار اٹھا کر اسٹور روم میں ڈال دیا۔ اس کے بعد دوبارہ اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔

شارق میں یہ تبدیلی حیران کن تو تھی لیکن رفتہ رفتہ خاندان والے اور شارق کے ملنے جلنے والے اس کے عادی ہوتے چلے گئے۔ شارق نے اس تبدیلی کے بعد لاابالی پن بھی چھوڑ دیا تھا اس نے یونیورسٹی سے ایم بی اے کیا اور ایک فرم میں کام کرنے لگا۔ جن دنوں ہم شائستہ کی شادی کی تیاری کر رہے تھے وہ دبئی چلا گیا تھا اور اسے وہاں بہت اچھی جاب مل گئی تھی۔ شائستہ کی شادی پر وہ خود تو نہیں آیا تھا لیکن اس نے مجھے بڑی رقم کا ڈرافٹ بھیجا تھا۔ اس میں یہ تبدیلی بھی آئی تھی وہ دوسروں کا بہت خیال رکھنے لگا تھا۔ امتیاز خالو اس سے بعد میں بھی خفا رہے تھے حالانکہ اس نے معافی مانگی تھی۔ مگر نہ جانے کیا بات تھی شارق پر ان کا غصہ کم نہیں ہو رہا تھا۔ اب اسے دیکھ کر ان کا منہ بن جاتا تھا۔

یہ ذرا مشکل دور تھا۔ شائستہ کی شادی پر بہت خرچ آیا تھا اور ہم زیر بار بھی ہو گئے تھے۔ پھر مجھے دفتر میں بہت کام کرنا پڑتا تھا اور اس کے ساتھ میں اکاؤنٹس کا ایک کورس بھی کر رہا تھا۔ چوبیس گھنٹے میں سے بہ مشکل چار پانچ گھنٹے سکون کے ملتے تھے۔ مگر کچھ عرصے بعد اس کا صلہ بھی ملا۔ کورس مکمل ہونے پر کمپنی نے مجھے ترقی دے دی۔ اب میں اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ تھا۔ اسی لحاظ سے تنخواہ بھی بڑھ گئی۔ پھر شائستہ کی شادی میں لیا ہوا قرض بھی اتر گیا تھا اس لیے امی کو میری شادی کا خیال آیا۔ میں نے ان سے کہا۔

"امی آپ پہلے فرحانہ کا سوچیں۔"

"ابھی اس میں وقت ہے وہ پڑھ رہی ہے اور ایم بی اے کرنا چاہتی ہے۔ تم جانتے ہو میں نے تم بہن بھائیوں کی ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کی ہے۔"

فرحانہ نے یونیورسٹی میں بی بی اے میں داخلہ لیا تھا۔ چار سال کا تو اس کا آنرز تھا۔ اور سب سے چھوٹی مونا تو ابھی میٹرک میں تھی۔ امی کی سوچ یہ تھی کہ بیٹا بیٹی سب برابر ہوتے ہیں تعلیم اور شادی دونوں میں ان کا حق ایک جیسا ہوتا ہے۔ اس لیے شائستہ کو رخصت کرتے ہی ان کو میری شادی کی فکر لاحق ہو گئی تھی۔ میں نے دبی زبان میں کہا۔ "امی آپ جانتی ہیں شادی کے بعد اخراجات کتنے بڑھ جاتے ہیں پھر اتنی بچت نہیں ہو سکے گی۔"

"عمران آنے والی اپنا نصیب لائے گی اور میری بیٹیاں اپنا نصیب لے کر جائیں گی اس لیے تم فکر مت کرو۔ تم یہ بتاؤ کہ تمہیں کوئی لڑکی پسند ہے۔"

میں گڑبڑا گیا۔ "کیا کہہ رہی ہیں امی! میں نے کبھی ایسا سوچا بھی نہیں ہے۔"

"اگر سوچا ہوتا تو اس میں بھی کوئی برائی نہیں ہے۔ بہرحال یہ بتاؤ تمہیں کیسی لڑکی پسند ہے۔"

"بس ٹھیک ہو صورت شکل کے لحاظ سے اور ہاں تعلیم لازمی ہے۔"

امی نے لڑکی کی تلاش شروع کر دی۔ شادی کے بارے میں امی کا کہنا تھا کہ بالکل اجنبی لوگوں میں نہیں کرنی چاہیے۔ تھوڑی بہت واقفیت ہوتا کہ خاندان اور ان کے طور طریقوں کا علم ہو۔ آدمی کسی معاملے میں دھوکا نہ کھائے۔ شائستہ کی شادی بھی انہوں نے جان پہچان کے لوگوں میں کی تھی اور وہ اپنے گھر میں خوش تھی۔ اسی طرح میرے لیے لڑکی بھی وہ جاننے والوں میں تلاش کر رہی تھیں۔

ترقی کے بعد میری تنخواہ میں اضافہ ہوا تو میں نے ایک سیکنڈ ہینڈ بائیک لے لی تھی ورنہ اس سے پہلے بسوں میں دھکے کھانے پڑتے تھے۔ تنخواہ بڑھنے کے بعد میں نے امی سے اسکول کی جاب چھڑوا دی تھی۔ ان کی عمر ہو گئی تھی اور اب انہیں آرام کی ضرورت تھی۔ فرحانہ پڑھنے کے ساتھ ٹیوشن پڑھا رہی تھی۔ اسی طرح نعمان ایف ایس سی فائنل میں تھا اور ساتھ ہی ٹیوشن کر کے اپنی تعلیم کا خرچ خود پورا کر رہا تھا۔ مونا پڑھنے کے ساتھ گھر کے کام دیکھتی تھی۔ یوں ہم سب بہن بھائی مل جل کر گھر چلا رہے تھے۔ اتفاق کی بات ہے کہ خاندان میں باقی سب ہی مالی لحاظ سے ہم سے کہیں بہتر تھے لیکن ہمیں کبھی احساس نہیں ہوا تھا اور رشتے دار بھی اس لحاظ سے اچھے تھے کہ انہوں نے کبھی ہمیں احساس نہیں دلایا۔

امی کی تلاش کامیاب رہی اور انہوں نے اپنی ایک اسکول فیلو کی بیٹی کو پسند کر لیا۔ صبیحہ آنٹی امی کی پرانی دوست تھیں اور ان کے گھر امی اور بہنوں کا آنا جانا تھا۔ ان کے گھر کا ماحول ذرا مذہبی تھا اس لیے کبھی مجھے جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا اور نہ ہی میں نے سائرہ کو دیکھا تھا۔ دیکھ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ تو جوانی سے پردہ کر رہی تھی اور اس نے گریجویشن کے ساتھ عالمہ کا کوئی شارٹ کورس بھی کر رکھا تھا۔ امی اور بہنوں نے اسے دیکھا ہوا تھا۔ جب رشتے کی بات چلی تو امی نے مجھے سائرہ کی تصویر بھی لا کر دکھائی تھی۔ شکل صورت اور قد و قامت کے لحاظ سے وہ دلکش تھی۔ امی کا کہنا تھا کہ وہ نہ صرف تعلیم یافتہ ہے بلکہ سلجھے ہوئے ذہن کی لڑکی ہے۔ امی اسے بچپن سے دیکھتی آئی تھیں۔

"عمران وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں امی۔" میں نے کہا۔ "آپ مناسب سمجھتی ہیں تو یہاں بات پکی کر لیں۔"

یوں سائرہ اور میری نسبت طے ہو گئی۔ باقاعدہ منگنی نہیں ہوئی تھی اور شادی ایک سال بعد طے پائی تھی۔ یہاں سے میری پریشانی کا آغاز ہو گیا۔ کیونکہ در حقیقت میرے ہاتھ میں کچھ نہیں تھا۔ بڑی مشکل سے تو ابھی شائستہ کی شادی پر لیا ہوا قرض ادا ہوا تھا۔ میری کل تنخواہ سولہ ہزار تھی اور اس میں ایک پورا گھر چلانے کے ساتھ مجھے شادی کے لیے بچت بھی کرنی تھی۔ میں کتنا بچا سکتا تھا اور کوشش کرتا تو شاید پچاس ساٹھ ہزار بچا لیتا۔ اس کا مطلب تھا کہ مجھے پھر قرض لینا پڑتا۔ شادی کے بعد لازمی اخراجات میں بھی اضافہ ہوتا تو قرض کیسے ادا کرتا۔ رشتہ طے ہونے کے بعد پہلی عید آئی تو امی نے سائرہ کی عیدی لے جانے کو کہا۔

"امی اس کی کیا ضرورت ہے یہ تو بس ایک رسم ہے۔"

"تمہی تو لے جا رہی ہوں۔ دیکھو شائستہ کا رشتہ ہوا تو اس کی عیدی آئی تھی تو میں اپنی بہو کی کیوں نہ لے کر جاؤں۔"

امی کی بات نے مجھے مجبور کر دیا۔ ورنہ میں اس قسم کے رسم و رواج کو نہیں مانتا تھا۔ یہ رسمیں بن گئی تھیں اور ان کو پورا نہ کرنا نہایت برا سمجھا جاتا تھا۔ اس وقت میرا خیال تھا کہ شادی کی بنیادی رسومات تو بہرحال کرنی ہوتی ہیں جیسے جہیز، شادی اور ولیمے کی تقریبات۔ مگر ان کے لیے ہاتھ میں رقم ہونا لازمی تھی۔ میرے پاس مشکل سے چالیس ہزار جمع ہوئے تھے اور جیسے جیسے شادی کا وقت قریب آ رہا تھا میری پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں امی یا دوسرے گھر والوں پر اپنی پریشانی ظاہر نہیں کر رہا تھا۔ پھر شادی میں صرف دو مہینے رہ گئے تھے۔ امی نے بری کے کپڑوں کی تیاری شروع کر دی اور مجھ سے رقم مانگی تو میں نے جو پاس تھا وہ امی کے حوالے کر دیا۔

"صرف چالیس ہزار۔" امی نے کہا۔ "اس میں تو صرف کپڑے آ سکتے ہیں، زیور بھی بنانا ہے تمہیں معلوم ہے آج کل سونا کس قدر مہنگا ہو رہا ہے۔"

"امی اس کی تو گنجائش نہیں ہے میرے پاس تو کل رقم ہی اتنی ہے۔"

"تو بیٹا کہیں سے قرض لے لو۔ شادی تو کرنی ہے۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں دفتر سے بات کرتا ہوں اور کچھ دوست ہیں ان سے کہتا ہوں۔"

اس کے بعد میں نے بھاگ دوڑ شروع کر دی۔ دفتر میں بات کی۔ وہاں سے مجھے ستر ہزار روپے کا لون مل رہا تھا اور میری تنخواہ سے ساڑھے تین ہزار مہینے کے کٹ جاتے۔ لیکن میرے باس نے تسلی دی تھی کہ وہ اوور ٹائم کی مد میں مجھے ڈھائی تین ہزار ہر مہینے دلوا دیا کریں گے اس طرح مجھے تقریباً پوری تنخواہ ملے گی۔ یہ ستر ہزار لے کر میں نے امی کے حوالے کیے اس سے زیور بن جاتا اب مجھے ولیمے اور دوسرے اخراجات کا بندوبست کرنا تھا۔ میں اس سلسلے میں بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ دو تین دوستوں سے بات کی لیکن اتفاق کی بات ہے خود ان کا ہاتھ اس وقت تنگ تھا۔ شادی میں اب ایک مہینا رہ گیا تھا۔

ان دنوں شارق دبئی سے آیا ہوا تھا مجھے خیال آیا کہ اس سے بات کروں لیکن اس سے پہلے میں اس سے ملنے جاتا وہ خود گھر آ گیا۔ گلے لگ کر گرم جوشی سے کہا۔ "عمران، شادی کی خوشی مبارک ہو۔"

"خوشی کہاں یار اچھی خاصی ٹینشن ہے۔"

وہ فکر مند ہو گیا۔ "خیریت، گھر میں رشتے کے حوالے سے کوئی مسئلہ ہوا ہے؟"

"نہیں رشتہ تو بہت اچھا ہے، تمہیں سن کر خوشی ہو گی کہ تمہاری ہونے والی بھابی شرعی پردہ کرتی ہے اور اس نے عالمہ کا کورس بھی کر رکھا ہے۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے پھر مسئلہ کیا ہے؟"

"مسئلہ یہ ہے کہ میرے پاس رقم نہیں ہے اور ابھی مجھے ولیمے اور دوسرے اخراجات کا بندوبست کرنا ہے۔ میں اسی سلسلے میں تم سے ملنا چاہتا تھا کہ تم آ گئے۔"

"میں ہر طرح سے حاضر ہوں۔" اس نے خلوص سے کہا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"مجھے ایک لاکھ روپے کی ضرورت ہے۔ میں یہ رقم ادھار لے رہا ہوں اور دو سے تین سال میں اتار دوں گا۔"

شارق نے سوچا اور کہا۔ "ٹھیک ہے میں کل تمہارے پاس آؤں گا۔"

میں خوش ہو گیا کیونکہ شارق کا انداز مان جانے والا تھا۔ پھر ہم دوسری باتوں میں لگ گئے۔ جانے سے پہلے شارق نے کہا۔ "میں کل آؤں گا لیکن گھر نہیں آؤں گا تمہارے محلے کی مسجد میں ملیں گے عشا کے بعد۔"

اگلے دن میں دفتر سے آنے کے بعد محلے کی مسجد پہنچا۔ عام طور سے میں یہیں نماز پڑھتا تھا۔ جماعت ہونے تک شارق بھی آ گیا۔ نماز کے بعد جب نمازی رخصت ہو گئے تو میں اور شارق ایک گوشے میں آ بیٹھے۔ سلام دعا کے بعد اس نے ایک لفافہ جیب سے نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔

"عمران اس میں ایک لاکھ روپے ہیں۔" اس نے کہا اور پھر ذرا رک کر بولا۔ "لیکن اگر تم مانو تو میرے پاس اس بھی ایک قیمتی چیز ہے۔"

"وہ کیا؟"

"سادگی سے شادی سنت نبوی ﷺ ہے۔ اگر تم اس ایک سنت کو اپنی حد تک زندہ کر لو تو مجھے یقین ہے اس کی برکت سے تمہاری آنے والی زندگی سنور جائے گی۔"

میں اس بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا۔ "شارق میں ٹھیک سمجھا نہیں۔"

"آپ ﷺ نے جتنی بھی شادیاں کیں یا آپ ﷺ کے اصحابؓ نے شادیاں کیں وہ نہایت سادگی سے ہوئیں۔ ان میں نہ تو لڑکی اور۔ لڑکے کی طرف سے کچھ لینا دینا ہوتا تھا، نہ نکاح اور ولیمے کی تقریب پر بے جا اصراف ہوتا تھا۔ سادگی سے مسجد میں نکاح ہوتا تھا اور اس کے بعد مرد اپنے جاننے والوں کو استطاعت کے مطابق ولیمہ کھلاتا تھا۔ اس میں کوئی شرط نہیں ہوتی تھی۔ خود آپ ﷺ کا ایک ولیمہ صرف ستو کے شربت پر مشتمل تھا۔"

میں ہچکچایا۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن تم جانتے ہو آج کل کے دور میں یہ سب کرنا کتنا مشکل ہے۔ غیر تو چھوڑو پہلے اپنے ہی چڑھائی کر دیتے ہیں۔"

"میں جانتا ہوں۔ اس کے باوجود میں تمہیں کہوں گا کہ یہ کام کر گزرو۔ یقین کرو تمہیں ایسا سکون ملے گا جو اتنی مشکل میں پڑ کر شادی کرنے سے کسی صورت نہیں ملتا ہے۔ تم خود سوچو تم ایک لڑکی کو بیاہ کر لاؤ گے۔ اس پر توجہ دینے کے بجائے تمہارا وقت یہی سوچتے اور جدوجہد کرتے گزرے گا کہ کس طرح لیا جانے والا قرض جلد از جلد ادا کر دو۔ مجھے یقین ہے تم نے کہیں اور سے بھی قرض لیا ہوگا۔"

"ہاں میں نے کمپنی سے بھی ستر ہزار قرض لیا ہے لیکن وہ سہولت سے ادا ہو جائے گا۔ ہاں تم سے جو لاکھ لوں گا اس کی فکر رہے گی۔"

شارق نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں عمران تمہیں صرف اسی کی فکر نہیں رہے گی۔ بلکہ ان رسومات اور فضول خرچیوں کا جو طوق ہم نے اپنے گلے میں ڈال رکھا ہے یہ کسی نہ کسی طرح اپنا خراج وصول کرتا رہے گا۔ اس کا ایک ہی حل ہے کہ ہم اس طوق کو مکمل طور پر اپنے گلے سے اتار پھینکیں۔"

شارق نے کہا اور لفافہ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ "اب سوچنا تمہارا کام ہے میری طرف سے کوئی فورس نہیں ہے تم جیسا مرضی چاہے کرو۔ یہ معاملہ صرف میرے اور تمہارے درمیان میں رہے گا۔"

شارق مجھ سے ہاتھ ملا کر چلا گیا اور میں لفافہ لیے گھر آ گیا میں نے اسے کھول کر نہیں دیکھا تھا کہ اس میں کتنی رقم تھی۔ شارق نے ایک لاکھ ہی دیے تھے۔ میں نے لفافہ الماری میں رکھ دیا اور سوچنے لگا۔ شارق نے جو مشورہ دیا وہ ہمارے معاشرے میں لوگوں کو قبول نہیں ہے۔ رسومات اور فضول کی بے بنیاد باتوں کو لوگوں نے سینے سے لگا رکھا ہے اور ہمیں جو سادگی کا درس ہمارے مذہب نے دیا ہے اسے ہم فراموش کر چکے ہیں اب کوئی یہ سبق یاد کرنا چاہتا ہے تو لوگ اسے نہیں بخشتے ہیں۔ شارق کی تبدیلی پر ان لوگوں نے بھی اس کے خلاف ایسی باتیں کی تھیں جو اس سے پہلے اس سے نالاں تھے۔ اب وہ اس کی تبدیلی سے بھی خوش نہیں تھے۔

میں سوچتا رہا اور ان ہی سوچوں میں ساری رات گزر گئی۔ میں۔۔۔ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سویا تھا۔ فجر کی اذان سن کر میں اٹھا اور وضو کر کے مسجد چلا گیا۔ نماز پڑھ کر میں نے اللہ سے گڑگڑا کر دعا کی کہ میں جو فیصلہ کرنے جا رہا ہوں اس میں میری مدد فرما کیونکہ یہ تیرے حبیب ﷺ کی سنت مبارک ہے۔ مسجد سے آ کر میں تیار ہوا اور دفتر جانے کے وقت سے پہلے گھر سے نکلا پہلے شارق کے گھر پہنچا۔ وہ مجھے اتنی صبح دیکھ کر مسکرانے لگا۔ جب میں نے اسے لفافہ دیا تو اس نے مجھے سینے سے لگا کر کہا۔

"اللہ تمہیں ثابت قدم رکھے اور زندگی کی اصل خوشیوں سے نوازے۔"

"شارق مجھے ایسی ہی دعاؤں کی ضرورت ہے۔" میں نے کہا اور اس کے اصرار کے باوجود رکا نہیں تھا۔ مجھے جلد دفتر پہنچنا تھا۔ شام کو میں گھر پہنچا تو امی اور فرحانہ مل کر سائرہ کے لیے زیور لینے کا پروگرام بنا رہی تھیں۔ میں نے امی سے کہا۔ "اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

امی چونک گئیں۔ "کیا کہہ رہے ہو؟"

فرحانہ شوخی سے مسکرائی۔ "خیریت ہے بھائی، کہیں ارادہ تو نہیں بدل گیا؟"

"خدا نہ کرے، یہ میری ماں اور گھر والوں کی عزت کا معاملہ ہے میں کسی کی بیٹی کو کیسے انکار کر سکتا ہوں۔ یہ شادی ہوگی پر اب سادگی سے ہوگی۔"

"سادگی سے کیسے عمران بھائی؟" فرحانہ نے کہا۔

"نہ ان کی طرف سے جہیز آئے گا اور نہ ہماری طرف سے بری جائے گی۔ صرف لڑکی کا شادی کا جوڑا جائے گا۔ نکاح مسجد میں ہوگا اور رخصتی کے لیے امی چند خواتین کو لے کر جائیں گی اور سائرہ کو رخصت کرا کے لے آئیں گی۔ کوئی لڑکی کے گھر کھانا نہیں کھائے گا۔ میں سادگی سے ولیمہ کروں گا اور بجائے رشتے داروں کو کھلانے کے ان غریب لوگوں کو کھلاؤں گا جو دن میں ایک وقت بھی مشکل سے کھاتے ہیں۔"

جس وقت میں اپنا ارادہ بیان کر رہا تھا باقی گھر والے بھی وہیں آ گئے تھے اور سب حیرت سے منہ کھولے میری بات سن رہے تھے۔ جب میں چپ ہوا تو سب سے پہلے امی بولیں۔ "عمران یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو، ہم اس طرح سے شادی نہیں کر سکتے۔"

"کیوں نہیں کر سکتے.... امی؟" میں جذباتی ہو گیا۔ "جب ہمارے نبی ﷺ اور ان کے ساتھیوں نے اس طرح شادیاں کیں، جب ہماری تاریخ کے بڑے بڑے لوگوں نے اسی طرح شادیاں کیں۔ آج بھی مذہب سے قریب لوگ اسی طرح شادیاں کرتے ہیں تو میری کیوں نہیں ہو سکتی؟"

"تم جن شخصیتوں کا حوالہ دے رہے ہو ہم ان کے پاؤں کی دھول بھی نہیں ہیں۔" امی نے کہا۔ "ہم کسی معاملے میں ان کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں؟"

"امی یہ مقابلہ نہیں ہے۔ یہ تو ان کی اتباع ہے۔ ہمارے پیارے نبی ﷺ کی سنت ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن بیٹا ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں وہاں یہ ممکن نہیں ہے۔ تم خود سوچو اگر ہم نے اس طرح شادی کی تو خاندان والے کیا کہیں گے۔"

"مجھے اس سے غرض نہیں ہے کہ خاندان والے کیا کہیں گے۔"

"لیکن مجھے تو ہے۔" امی نے غصے سے کہا اور وہاں سے اٹھ کر چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد فرحانہ، نعمان اور مونا بھی مجھ پر زور دیتے رہے کہ میں اپنا فیصلہ تبدیل کر لوں۔ مونا نے کہا۔

"بھائی اس طرح تو مزہ نہیں آئے گا۔"

"ٹھیک ہے مزہ نہیں آئے گا لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ جب تمہاری بھابی آئے تو تمہیں اس کے ساتھ زیادہ مزہ آئے۔" میں نے پیار سے مونا کو سمجھایا۔

"عمران بھائی کیا آپ نے فیصلہ کر لیا ہے؟" فرحانہ بولی۔

"ہاں میں نے قطعی فیصلہ کر لیا ہے کہ میں اسی طرح شادی کروں گا۔"

"امی یا آپ کی سسرال والے کوئی یہ فیصلہ نہیں مانے گا۔" فرحانہ نے سنجیدگی سے کہا۔ "عمران بھائی آپ کو سب مل کر مجبور کر دیں گے کہ آپ اسی طرح شادی کریں جیسا کہ آج کل رواج ہے۔"

"میں اسی رواج کو توڑنا چاہتا ہوں۔" میں نے فرحانہ کی طرف دیکھا۔ "مجھے یقین ہے اللہ میری مدد کرے گا اور کوئی مجھے مجبور نہیں کر پائے گا۔"

فرحانہ، مونا اور نعمان کسی کو یقین نہیں تھا کہ میں اس فیصلے پر قائم رہ سکوں گا۔ کیونکہ گھر میں امی کا حکم چلتا تھا اور امی کا سب سے زیادہ کہنا بھی میں ہی مانتا تھا اس لیے انہیں یقین تھا کہ جب امی اصرار کریں گی تو میں ہتھیار ڈال دوں گا۔ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ امی نے مجھ سے کوئی بات کہی ہو اور میں نے ماننے سے انکار کیا ہو۔ رات کو میں سونے کے لیے لیٹا تھا کہ امی میرے کمرے میں آئیں۔ میں اٹھ بیٹھا۔

"مجھے بلا لیا ہوتا، آپ کیوں آئیں؟"

"عمران تم نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔" امی بولیں۔

"امی اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ آپ غور کریں ہم لوگ شادی بیاہ کے نام پر جو کرتے ہیں کیا وہ صرف بے کار کی رسومات نہیں ہیں۔"

"لیکن بیٹے یہ شروع سے ہوتی آئی ہیں۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

”شروع سے نہیں امی بلکہ یہ غلط چیزیں ہم میں پیدا ہوئی ہیں۔ ہمارے مذہب میں جہیز کا کوئی تصور نہیں ہے۔ لیکن ہمارے ہاں ماں باپ بیٹیوں کو جہیز دے کر مقروض ہو جاتے ہیں۔ بیکار کی رسموں پر خرچ کر کے اپنے آپ کو زیر بار کر لیتے ہیں۔“

”عمران اگر تمہیں مالی مسئلہ ہے تو میرے پاس فرحانہ کے لیے بنایا ہوا کچھ زیور موجود ہے۔“

”امی بات یہ نہیں ہے۔ رقم تو میں بھی لے لیتا اور ویسے ہی شادی کر سکتا تھا جیسے آپ چاہتی ہیں لیکن امی میں ان غلط رسم و رواج کو توڑنا چاہتا ہوں۔ میں بالکل سادگی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

”ہمارے ہاں ایسا ہوتا نہیں ہے۔ اگر تم ایسا کرو گے تو خاندان والے ہمیں نہیں چھوڑیں گے۔ تم خود سوچو صرف خاندان ہی اتنا بڑا ہے ہم تھوڑی سی برات لے کر کیسے جا سکتے ہیں۔“

”امی میں نہیں جانتا کہ یہ سب کیسے ہوگا لیکن میں آپ کو بتا دوں کہ میں فیصلہ کر چکا ہوں میں شادی بالکل سادگی سے اور شرعی طریقے سے کروں گا۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”یہ بات آپ میری سسرال والوں کو بھی بتا دیں۔“

اس رات امی بہت دیر تک مجھے قائل کرنے کی کوشش کرتی رہیں کہ میں نے غلط فیصلہ کیا ہے۔ مگر میں اپنے ارادے پر قائم رہا۔۔۔ حتیٰ کہ امی نے سمجھ لیا کہ میں فیصلہ بدلوں گا نہیں۔ اگلے روز میں سو کر اٹھا تو مجھے لگا جیسے پورے گھر کا ماحول بدلا ہوا تھا۔ امی اور بہن بھائی سب خاموش اور روٹھے ہوئے تھے۔ ان کی صورتیں دیکھ کر مجھے احساس ہونے لگا کہ جیسے میں نے کوئی غلط کام کیا ہے۔ میں نے دفتر جانے سے پہلے امی سے کہا۔ ”آپ آج میری سسرال والوں کو بتا دیں کہ ہم بالکل سادگی سے اور شرعی طریقے سے شادی کریں گے۔“

امی نے صاف انکار کر دیا۔ ”میں نہیں بتا سکتی، میں تو اپنی سہیلی سے آنکھ بھی نہیں ملا سکوں گی' یہ فیصلہ تمہارا ہے اس لیے تم ہی جا کر ان سے کہو اور ان کا ردِعمل دیکھو۔“

”امی پلیز۔“ میں نے التجا کی لیکن امی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں گھر سے نکل آیا۔ سارا دن دفتر میں اسی ادھیڑ بن میں رہا کہ اپنی سسرال والوں سے کس طرح بات کروں گا۔ سائرہ کے ابو بھی تھے اور ایک بڑا بھائی بھی تھا اس کے علاوہ خاندان بھی بہت بڑا تھا گویا ان کے ساتھ بھی وہی مسئلہ تھا جو ہمارے ساتھ تھا کہ خاندان والے کیا کہیں گے۔ لگ رہا تھا کہ انہیں بھی میرا فیصلہ آسانی سے ہضم نہیں ہوگا اور مجھے اپنی بات منوانے کے لیے خاصی جدوجہد کرنا پڑے گی۔ میں نے سوچ لیا کہ دفتر سے واپسی پر پہلے اپنی ہونے والی سسرال جاؤں گا اور ان سے اس سلسلے میں بات کروں گا۔ ویسے میں نے سوچا نہیں تھا کہ اس فیصلے کی پہلے ہی مرحلے میں مجھے اتنی شدید مخالفت کرنا پڑے گی۔ جب میرے گھر والوں کا رویہ اتنا سخت تھا تو دوسروں سے میں کیا توقع لگا سکتا تھا۔

شام کو میں سسرال پہنچا اور بن بتائے پہنچا تو کچھ دیر کو ان کے گھر میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ میری سسرال اچھی کھاتی پیتی تھی۔ میرے سسر صدیق انکل ایک وفاقی کارپوریشن میں اچھے عہدے پر کام کر رہے تھے اسی طرح ان کا بیٹا مزمل چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ فرم میں کام کرتا تھا۔ صبیحہ آنٹی کو ملازمت کی ضرورت نہیں تھی وہ صرف وقت گزاری کے لیے اسکول میں پڑھانے لگی تھیں۔ ایک اچھی سوسائٹی میں ان کے پاس اپنا بنا ہوا چھوٹا سا بنگلا تھا۔ مزمل مجھے گھر میں لایا پھر میرے سسر بھی چلے آئے۔ ”کیسے ہو عمران بیٹے؟ سب خیریت ہے نا؟“

”جی انکل سب اللہ کا شکر ہے۔“ میں نے کہا تو ان لوگوں کے چہرے پر اطمینان نظر آنے لگا۔ پھر صبیحہ آنٹی بھی آ گئیں۔ ”میں آپ سے ایک اہم بات کرنے آیا ہوں۔“

اس پر وہ سب کچھ دیر کے لیے چپ ہوئے تھے پھر انکل صدیق نے کہا۔ ”ہاں کہو بیٹے؟“

”انکل میں چاہتا ہوں اور اپنے طور پر فیصلہ بھی کر چکا ہوں کہ یہ شادی سادگی سے اور شرعی اصولوں کے مطابق ہوگی۔“

”کیا مطلب؟“ آنٹی نے تعجب سے کہا۔

”آنٹی نکاح مسجد میں ہوگا اور میرے گھر سے امی کچھ دوسری خواتین کے ساتھ سائرہ کو رخصت کرا کے لے جائیں گی۔ آپ سائرہ کو جہیز میں کچھ نہیں دیں گی اس کے لیے شادی کا جوڑا بھی ہماری طرف سے آئے گا اور نہ میں آپ سے کچھ لوں گا۔ برات کا کوئی کھانا نہیں ہوگا اور ولیمہ بھی میں سادگی سے کروں گا۔“

”یہ کس طرح ممکن ہے؟“ انکل صدیق بولے۔

”اگر میں اور آپ مان جائیں تو بالکل آسان اور ممکن ہے۔“

”ایسا نہیں ہو سکتا ہے۔“ آنٹی بولیں۔ ”ہمیں دنیا والوں کو منہ دکھانا ہوتا ہے۔ اگر ہم نے اپنی بچی کو اس طرح رخصت کیا تو لوگ کیا کیا باتیں نہیں بنائیں گے۔“

”آنٹی آپ لوگوں کی پروا کیوں کر رہی ہیں۔ ہمیں جو ہمارا دین کہتا ہے ہمیں اس پر عمل کرنا چاہیے۔“

”برخوردار۔۔۔“ انکل صدیق نے کہا۔ ”کیا تمہارے ساتھ کوئی مالی مسئلہ ہے۔“

”اللہ کا شکر ہے اگر ایسا کوئی مسئلہ ہے بھی تو میں اسے حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ آپ میری بات کو سمجھیں' ہمیں بلاوجہ کی رسموں اور نمائش کے پیچھے خود کو مشکل میں نہیں ڈالنا چاہیے۔ اصل خوشی تو آنے والی زندگی میں ہوتی ہے۔“

آنٹی اور انکل کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ میری بات سے متفق نہیں ہیں۔ یعنی یہاں بھی وہی گھر والی صورتِ حال تھی۔ مزمل خاموش بیٹھا تھا۔ میں کچھ دیر ان لوگوں سے بحث کرتا رہا۔ پھر میں نے ان سے کہا۔ ”میں اس معاملے میں قطعی فیصلہ کر چکا ہوں۔ آپ جو مرضی آئے کریں بس تین باتیں یاد رکھیں۔ اول نکاح مسجد میں ہوگا، دوسرے ہماری طرف سے برات صرف سائرہ کو لینے آئے گی کچھ کھانے پینے نہیں اور تیسرے میں جہیز میں ایک چھلا بھی نہیں لوں گا۔“

آنٹی صبیحہ غصے میں آ گئی تھیں۔ ”پتا نہیں تم کیسی باتیں کر رہے ہو، میں تمہاری ماں سے بات کروں گی۔ رشتے کی بات انہوں نے کی تھی۔“

”جی مجھے اس سے انکار نہیں ہے لیکن شادی تو مجھے کرنی ہے تو کیا میری کوئی مرضی نہیں ہونی چاہیے۔“ میں نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ ”اب مجھے اجازت دیجیے۔“

مزمل نے میرا ہاتھ پکڑ کر بٹھا دیا۔ ”اختلاف والی بات اپنی جگہ لیکن آپ کھانا کھائے بغیر نہیں جائیں گے۔“

میں بیٹھ گیا۔ آنٹی نے کھانا لگایا اور میں کھانا کھا کر وہاں سے چلا آیا۔ انہوں نے اسی رات امی سے فون پر بات کی اور جب میں صبح دفتر جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا تو امی نے پوچھا۔ ”تم کل صبیحہ کی طرف گئے تھے؟“

”جی امی، میں نے ان سے بھی کہہ دیا ہے کہ میں شادی سادگی سے کروں گا اور جہیز نہیں لوں گا۔“

”عمران وہ کسی صورت نہیں مانیں گے۔“

”نہ مانیں' جہیز نہ لینا تو میرے اختیار میں ہے' اس طرح میں نکاح ان کے گھر کی نزدیکی مسجد میں۔۔۔ کروں گا اور برات میں صرف آپ اور خاندان کی چند خواتین جائیں گی اور سائرہ کو رخصت کر کے لے آئیں گی۔ اس کے علاوہ ان کی جو مرضی وہ کر سکتے ہیں۔“

”تو اس کے علاوہ رہ کیا جاتا ہے عمران، دیکھو اگر انہوں نے تمہاری بات مان لی تو ان کی بھی خاندان میں بے عزتی ہوگی۔ لوگ باتیں بنائیں گے کہ اچھے خاصے پیسے والے ہوتے ہوئے بھی اکلوتی بیٹی کو اس طرح رخصت کر رہے ہیں۔ اگر وہ نہیں مانیں گے تو خدانخواستہ رشتہ ختم ہو جائے گا۔“

”ایسا نہیں ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے امید ہے وہ میری بات مان جائیں گے۔ اس میں مشکل ہی کیا ہے' میں ان کو کچھ کرنے کو نہیں بلکہ نہ کرنے کو کہہ رہا ہوں۔“

”بیٹا ہمارے معاشرے میں کرنے کے مقابلے میں نہ کرنا ہی تو بہت دشوار ہے۔“

”امی ہمیں اچھی امید رکھنی چاہیے۔“

”میں نے تمہارے تایا سے بات کی ہے، ان کا بھی یہی کہنا ہے تم غلط کر رہے ہو اس طرح بعد میں بھی بہت مسائل اٹھیں گے۔“

”امی میں سب سے بات کر سکتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں فیصلہ کر چکا ہوں اب یہ شادی اسی طرح ہوگی۔“

اس شام کو میں دفتر سے آیا تو تایا جان آئے ہوئے تھے۔ وہ ابو کے سب سے بڑے بھائی ہیں۔ غصے کے تیز تھے اور انہوں نے اسٹیٹ کے کام میں خاصا کمایا تھا۔ اس لیے سب سے ذرا اونچے ہو کر پیش آتے ہیں۔ انہوں نے مجھے طلب کر لیا اور حقارت سے بولے۔ ”عمران' میں کیا سن رہا ہوں تم سادگی سے شادی کرنا چاہتے ہو؟“

”جی تایا جان۔“

”برخوردار اگر تمہارے پاس رقم نہیں ہے تو مجھ سے لے لو لیکن شادی تو ڈھنگ سے کرو، اس طرح تو آج کل فقیر بھی شادی نہیں کرتے ہیں۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، اگر انسان میں نمائش کا جذبہ ہو تو وہ فقیر ہوتے ہوئے بھی اچھا خاصا دھوم دھڑکا کر سکتا ہے لیکن میں اسے ایک سنت نبوی ﷺ کے طور پر اپنانا چاہتا ہوں۔“

اس کے بعد تایا جان سے جو میری گفتگو ہوئی وہ کسی حد تک دل آزار بھی تھی۔ میں اسے یہاں بیان نہیں کر سکتا۔ جب لوگ مذہب کے حوالے سے طعنے دینے پر اتر آئیں تو آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ میں نرمی سے تایا جان کی باتوں کا جواب دیتا رہا۔ آخر میں انہوں نے جھنجلا کر کہا۔ ”برخوردار تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ اس

WWW.PAKSOCIETY.COM

گھر میں صرف تم نہیں ہو تمہاری دو بن بیاہی بہنیں بھی ہیں۔ اگر تم اپنی شادی اس طرح کرو گے تو ان کے رشتے کون لے کر آئے گا۔"

"تایا جان میں یہ کام اللہ کے لیے کر رہا ہوں اور مجھے پورا یقین ہے وہ آنے والے کسی بھی وقت مجھے اکیلا نہیں چھوڑے گا۔"

"برخوردار یہ کتابی باتیں مت کرو۔ حقیقت کا سامنا کرو۔" تایا جان نے کہا اور اٹھ کر چلے گئے۔ میں سر تھام کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مجھے اس ایک فیصلے پر ہر طرف سے اتنی شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ کوئی ایک فرد بھی میرا ساتھ دینے پر آمادہ نہیں ہو گا۔ میری اپنی امی اور گھر والے اسی طرح میری ہونے والی سسرال میری مخالف تھی۔ پھر خاندان والے تو براہِ راست سنا رہے تھے۔ پہلے تایا جان آئے تھے اس کے بعد امی اور ابو کے بہن بھائیوں نے مجھے سمجھانے کا ٹھیکا اٹھا لیا اور جب میں ان کی بات سے متفق نہیں ہوتا تھا تو وہ مجھ سے ناراض ہو جاتے تھے۔ اس طرح ایک ایک کر کے تقریباً سارا ہی خاندان مجھ سے ناراض ہو گیا اور اس بات نے تو ناراضی میں مزید اضافہ کر دیا کہ میں اتنی حیثیت نہیں رکھتا تھا کہ سارا خاندان شادی سے کئی دن ہمارے گھر میں رہنے کے لیے آ جائے۔ اول تو گھر میں جگہ نہیں تھی اور دوسرے میرے حالات بھی اس کی اجازت نہیں دیتے تھے۔

میں نے ابھی تک کسی کو نہیں بتایا تھا کہ میں نے شارق کے مشورے پر یہ فیصلہ کیا تھا ورنہ ایک نیا پینڈورا بکس کھل جاتا اور خاندان میں فساد کھڑا ۔ ہو جاتا -- اس لیے میں نے شارق کا نام بھی نہیں لیا۔ میرے گھر والے بھی اس بارے میں نہیں جانتے تھے۔ سسرال والوں کی طرف سے دباؤ کا سلسلہ جاری تھا۔ جیسے جیسے شادی کی تاریخ قریب آ رہی تھی اس دباؤ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ میری سسرال والے یہ بات تو مان گئے تھے کہ نکاح مسجد میں ہو گا لیکن رخصتی کے لیے وہ مُصر تھے کہ یہ شادی ہال سے اور دھوم دھام سے ہو گی۔ اسی طرح وہ اپنی بیٹی کو جہیز ضرور دیں گے۔ جب کہ میں اپنے فیصلے پر ڈٹا ہوا تھا کہ نہ تو ہم برات لے کر ہال میں آئیں گے اور نہ ہی میں جہیز لوں گا۔

دوسروں کا تو مجھے نہیں معلوم لیکن میرے گھر کا ماحول عجیب سا ہو گیا تھا۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہاں کچھ دنوں بعد شادی ہونے والی ہے۔ سب چپ اور اداس تھے۔ ایک دن میں دفتر میں تھا کہ نعمان کا فون آیا۔ "بھائی امی کی طبیعت خراب ہو گئی۔ میں انہیں لے کر اسپتال آیا ہوں۔"

میں نے اسپتال کا پوچھا اور دفتر سے نکل کر روانہ ہو گیا۔ امی گھر میں اچانک بے ہوش ہو گئی تھیں اور نعمان انہیں قریبی اسپتال کے آئی سی یو میں لے آیا تھا۔ جب میں پہنچا تو امی کی طبیعت سنبھل گئی تھی۔ ڈاکٹر کے مطابق انہیں کوئی ٹینشن تھی جس کی وجہ سے ان کے اعصاب کمزور ہوئے اور وہ بے ہوش ہو گئیں۔ امی کو گھر لے جانے کی اجازت دے دی تھی اس لیے ہم انہیں گھر لے آئے۔ فرحانہ اور مونا کا رو رو کر برا حال تھا۔ امی کو کمرے میں پہنچا کر فرحانہ نے مجھ سے کہا۔ "بھائی خدا کے لیے اپنی ضد سے باز آ جائیں امی کی حالت دیکھیں۔"

میں خود امی کی حالت دیکھ کر دہل گیا تھا۔ میں نے فرحانہ کے سر پر ہاتھ رکھا۔ "تم فکر مت کرو میں امی سے بات کرتا ہوں اس کے بعد جیسا امی کہیں گی میں ویسا ہی کروں گا۔"

ڈرپ اور اعصابی طاقت کی دواؤں کی وجہ سے امی کی حالت سنبھل گئی تھی۔ اس وقت مونا امی کو سوپ دے رہی تھی۔ میں امی کے پاس بیٹھ گیا۔ "امی اب کیسی طبیعت ہے؟"

"ٹھیک ہوں بیٹا تم فکر مت کرو۔"

"امی میرے لیے آپ سے بڑھ کر اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ میں نے صرف ایک بار آپ کے حکم سے انحراف کیا ہے وہ بھی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کو سامنے رکھ کر۔ آپ مجھے صرف ایک بار سوچ کر بتا دیں کہ آپ کے نزدیک ان کے حکم کی اہمیت ہے یا لوگوں کی، پھر جیسا آپ کہیں گی میں ویسا ہی کروں گا۔"

یہ سن کر امی خاموش ہو گئی تھیں۔ میں اُن کے پاس سے اٹھ آیا۔ مجھے دفتر واپس جانا تھا۔ امی کی طرف سے اطمینان کے بعد میں دوبارہ دفتر چلا گیا۔ شام کو میں واپس آیا تو مونا نے اندر گھستے ہی میرے شانے سے لگ کر کہا۔ "امی اب بالکل ٹھیک ہیں۔"

میں امی کے پاس آیا تو ان کا چہرہ چمک رہا تھا۔ ورنہ اسپتال سے آنے کے بعد بھی وہ نڈھال لگ رہی تھیں۔ امی نے اٹھ کر مجھے گلے لگایا پیار کیا اور بولیں۔ "بیٹے میں نے سوچا ہے کہ جو تم نے سوچا ہے وہی ٹھیک ہے کیونکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم سے بڑھ کر تو کچھ بھی نہیں ہے۔ جب اللہ سب کرنے والا ہے تو ہم لوگوں کی پروا کیوں کریں۔"

میں خوش ہو گیا تھا۔ "شکر ہے امی آپ بھی اس بات کو سمجھ گئیں۔"

امی فکر مند تھیں۔ "صبیحہ اور اس کے گھر والوں کو سمجھانا ہو گا۔"

"مجھے امید ہے جس طرح آپ مان گئی ہیں اسی طرح وہ بھی مان جائیں گے۔"

"اللہ کرے کیونکہ سب سے سخت ردِ عمل ان ہی کا تھا۔ ایک وقت تو ایسا لگ رہا تھا کہ صدیق بھائی رشتہ ہی ختم کر دیں گے۔"

"آپ نرمی سے ان سے بات کریں، مجھے یقین ہے کہ ان کے دل پر اثر کرے گی۔ اس طرح رشتہ کر کے توڑ دینا شریفوں کا کام نہیں ہے۔"

"وقت بھی نہیں رہا ہے۔" امی بولیں۔ "انہوں نے تو شاید ہال بھی بک کرا لیا ہے۔"

"وہ ان کی مرضی ہے بے شک وہ ہال سے بیٹی کو رخصت کریں۔ لیکن ہماری طرف سے چھوٹی سی برات جائے گی۔ نکاح ایک دن پہلے مسجد میں کر لیں۔"

"وہ یہ بھی ماننے کو تیار نہیں ہیں کہ اپنی بیٹی کو کچھ نہیں دیں گے وہ اسے مکمل جہیز دینا چاہتے ہیں۔"

"میں ان سے ایک سوئی بھی نہیں لوں گا۔ بہرحال آپ جا کر بات کریں اللہ بہتر کرے گا۔"

"میں کل جاتی ہوں۔" امی نے کہا۔ شادی میں دو ہفتے رہ گئے تھے۔ اگلے دن امی صبیحہ آنٹی کے پاس گئیں۔ اس دن چھٹی تھی اور میں گھر پر تھا امی نعمان کو لے گئی تھیں۔ وہ سترہ سال کا تھا بائیک چلا لیتا تھا۔ میں بے تابی سے امی کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ کیونکہ اب وقت نہیں تھا اگر میری سسرال والے میری بات ماننے سے انکار کر دیتے تو اب سب طے ہو چکا تھا اور اگر میں اپنے فیصلے پر قائم رہتا تو بڑی گڑبڑ ہو جاتی۔ شاید شادی ہو جاتی لیکن آنے والے دنوں میں تعلقات ہمیشہ کے لیے خراب ہو جاتے۔

امی آئیں تو ان کا چہرہ دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ بات نہیں بنی تھی۔ وہ اندر آئیں اور خاموش بیٹھ گئیں۔ "امی کیا ہوا؟" نعمان نے پوچھا۔

امی نے گہری سانس لی۔ "وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ انہوں نے صاف کہہ دیا ہے کہ وہ اسی طرح شادی کریں گے جس طرح ہوتی ہے۔"

"حالانکہ جس طرح ہونی چاہیے اس طرح نہیں

پروفیسر ڈاکٹر آفتاب احمد ملک

معلم، صحافی، سائنس دان اور عالم دین، وہ لاہور میں محمد اشرف ملک کے ہاں 1949ء میں پیدا ہوئے انہوں نے 1969ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی ایس سی اور 1971ء میں اسلام آباد یونیورسٹی سے ایم ایس سی اور 1973ء میں اسی یونیورسٹی سے ایم فل کی ڈگری لی۔ 1972ء میں انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں بطور لیکچرار تعیناتی ہوئی۔ 1975ء میں پاکستان ایڈمنسٹریٹو اسٹاف کالج لاہور سے ایڈمنسٹریشن اور مینجمنٹ کی خصوصی تربیت حاصل کی اور کورس پاس کیا۔ 1977ء میں اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ 1977ء ہی میں حکومت برطانیہ نے برٹش کونسل اسکالر شپ ایوارڈ دیا۔ تین سال کے عرصے میں یونیورسٹی آف کینٹربری انگلستان سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ انگلستان میں اپنے قیام کے دوران تحقیقاتی کام کے علاوہ تدریسی فرائض بھی انجام دیئے۔ کین کینٹربری یونیورسٹی میں 1978ء میں سینیٹر کا انتخاب ہوا جس میں بطور سینیٹر منتخب کئے گئے۔ کینٹ کاؤنٹی انگلینڈ میں تین سال تک درس قرآن پاک کے علاوہ نماز جمعہ میں خطبہ دیتے رہے۔ 1984ء میں پنجاب یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری لی۔ اسی دوران 1982ء میں ایسوسی ایٹ پروفیسر اور 1987ء میں انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں بطور پروفیسر تقرری ہوئی۔ قائداعظم لاء کالج اور پنجاب لاء کالج لاہور میں جیورس پروڈنس (اسلامک) اور اسلامی نظام قانون کے موضوعات پر بطور وزیٹنگ پروفیسر کئی لیکچر دیئے۔ قومی سیرت النبیؐ کانفرنس میں کئی مرتبہ مقالات پیش کئے۔ نویں، دسویں گیارہویں اور بارہویں جماعتوں کے لیے کمپیوٹر کی کتابیں بھی لکھیں۔ 1988ء انجینئرنگ یونیوسٹی کے ممبر سینٹ، ممبر اکیڈمک کونسل، ممبر بورڈ آف اسٹڈیز، ممبر فیکلٹی آف سائنس اینڈ اسلامک اسٹڈیز بھی ہیں۔ تصانیف، کمپیوٹر سائنس انجینئرنگ، میتھ میٹکس پر تین عدد کتب تحریر کیں۔ سو تحقیقی مقالے ان کے علاوہ ہیں۔ صدر مملکت سے چار دفعہ ایوارڈ حاصل کیا، ایک بار سیرت ایوارڈ بھی ملا۔

مرسلہ: ذیشان ہمدانی، سیالکوٹ

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوتی ہے۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "آپ کہیں تو میں ان سے بات کروں؟"

"نہیں اس طرح بات بگڑ نہ جائے آج بھی صدیق بھائی کا موڈ بہت خراب ہو گیا تھا۔ مجھے تو ڈر تھا کہ کہیں وہ انکار نہ کر دیں۔"

میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ "مجھے بھی لگ رہا ہے کہ وہ انکار ہی کریں گے کیونکہ میں نے جو کہہ دیا ہے میں وہی کروں گا۔"

اس وقت میں سچ مچ بہت پریشان ہو گیا تھا کیونکہ سائرہ مجھے اچھی لگی تھی۔ وہ صرف شکل و صورت کی اچھی نہیں تھی بلکہ ذہن کے لحاظ سے بھی ویسی تھی جیسی بیوی میں چاہتا تھا۔ وہ آج کل کی لڑکیوں سے بالکل مختلف تھی۔ اگر یہ رشتہ ٹوٹ جاتا تو مجھے بھی بہت افسوس ہوتا۔ انتشار اور پریشانی کے عالم میں مجھے شارق کا خیال آیا۔ وہ ابھی یہیں تھا اور اس کی روانگی ایک دن بعد تھی۔ میں اس کے گھر پہنچ گیا لیکن گھر نہیں گیا کال کر کے اسے نزدیکی مسجد میں بلوا لیا۔ وجہ وہی تھی کہ میں نہیں چاہتا کہ کسی کو علم ہو کہ میں نے شارق کے کہنے پر یہ فیصلہ کیا تھا ورنہ لوگ اس بات کو کسی اور طرف لے جاتے۔ شارق کے آتے ہی میں اس کے سامنے پھٹ پڑا تھا۔ میں بولتے ہوئے روہانسا بھی ہو رہا تھا۔

"شارق مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اگر اس معاشرے میں انسان ایک اچھی بات پر عمل کرنا چاہے تو اس کا ساتھ کوئی نہیں دیتا لیکن ہر شخص روڑے ضرور اٹکاتا ہے۔"

"ایسا ہی میرے بھائی۔" شارق نے آہستہ سے کہا۔ "آپ ﷺ کی پیش گوئی ہے جس کا مفہوم ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب کسی سنت پر عمل کرنا ایسا ہو جائے جیسے انسان مستقل اپنی مٹھی میں انگارا دبا کر رکھے۔"

"یقین کرو میرے ساتھ ایسا ہی ہے۔" میں نے بے ساختہ کہا۔ "میں مستقل اذیت میں ہوں اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا کیا کروں۔ امکان یہ ہے کہ چند دن میں رشتہ ہی ختم ہو جائے گا۔"

"صبر کرو عمران، اللہ تمام مشکلات کا حل کرنے والا ہے۔ جلد تمہاری مشکلیں بھی آسان ہونا شروع ہو جائیں گی۔"

"وہ کیسے؟"

"وہ ایسے کہ تم نے اپنے فیصلے کی تمام تر مخالفت برداشت کر لی ہے۔ یقیناً تمہیں سب نے مجبور کیا ہوگا کہ تم اپنے فیصلے سے پھر جاؤ۔"

"بالکل ایسا ہی ہوا ہے۔"

"تو مشکل گزر گئی نا اب تم ثابت قدم رہے تو یقیناً اللہ کی طرف سے مدد آئے گی۔ یہ رشتہ برقرار رہے گا اور شادی ویسے ہی ہوگی جیسے تم چاہتے ہو۔"

شارق کی باتوں اور تسلی سے میرے دل کا بوجھ ہلکا ہوا۔ میں گھر آیا تو کسی قدر پُرسکون تھا۔ دو دن خاموشی سے گزرے۔ تیسرے دن امی کو صبیحہ آنٹی کا فون آیا۔ انہوں نے امی سے کہا کہ سائرہ اور عمران کی شادی اسی طرح ہوگی جیسے عمران چاہتا ہے۔ امی حیران ہوئی تھیں۔ انہوں نے پوچھا تو صبیحہ آنٹی نے کہا کہ یہ اب سائرہ کی بھی خواہش ہے۔ اس نے عالمہ کا کورس کیا ہے اور اسی نے اپنے ماں باپ کو قائل کر لیا کہ میرا فیصلہ بالکل درست ہے اور وہ اس کی مخالفت نہ کریں۔ سائرہ کے زور دینے پر بالآخر اس کے گھر والے مان گئے اور شارق کی بات درست نکلی کہ مشکل دور گزر گیا ہے اور اب اللہ کی مدد آئے گی تو اللہ کی مدد وہاں سے آئی جہاں سے میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ یعنی سائرہ نے اسٹینڈ لے لیا۔ یوں میری سسرال کا مسئلہ بھی حل ہو گیا تھا۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لوگوں کی مخالفت ختم ہو گئی تھی۔ میرے خاندان والوں کے ساتھ اب سائرہ کے خاندان والے بھی شامل ہو گئے تھے۔ انہیں بھی ان سب باتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا جن کا میں اور اب میرے گھر والے سامنا کر رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ہم نے کوئی نیا رواج نکالا ہو۔ جس کی سب دل و جان سے مخالفت کر رہے تھے۔ ہمیں باتیں سنائی جا رہی تھیں۔ پھر شادی سے ایک ہفتے پہلے اچانک ہی سائرہ کے چچا ایک پک اپ میں فریج، واشنگ مشین اور ٹی وی اٹھا کر لے آئے۔ اتفاق سے میں گھر پر تھا۔

"محترم یہ کیا ہے؟"

"یہ میری طرف سے سائرہ کے لیے تحفہ ہے۔" انہوں نے کہا۔

"معذرت کے ساتھ، اب وہ میری ہونے والی بیوی ہے اور وہ وہی تحفہ قبول کرے گی جس کی واپسی کی مجھ میں استطاعت ہو۔"

"میں واپسی کے لیے تھوڑی دے رہا ہوں۔" وہ بولے۔

"نہیں جناب اگر آپ کی بیٹی کی شادی ہوگی تو اخلاقاً مجھے بھی ایسا ہی تحفہ دینا ہوگا اور میں اتنی حیثیت نہیں رکھتا ہوں اس لیے میں یہ تحفہ نہیں لے سکتا۔"

سائرہ کے چچا نے ہر ممکن کوشش کر لی لیکن میں اپنے موقف پر ڈٹا رہا۔ میں نے یہ چیزیں لینے سے انکار کیا اور وہ آزردہ و مایوس ہو کر واپس چلے گئے اور مجھے بعد میں پتا چلا کہ وہ ہمسائیگی میں پیچھے رہنے والے میرے تایا جان کے گھر چلے گئے تھے اور ان دونوں نے مل کر میرے خلاف دل کی بھڑاس نکالی تھی۔ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑا کیونکہ اب میں یہ سب اللہ کی خوشنودی کے لیے کر رہا تھا اس لیے اس کے بندے مجھے کیا کہہ رہے تھے اس کی مجھے پروا نہیں تھی۔ امی ڈر رہی تھیں کہ اس کا کوئی منفی ردعمل نہ ہو اور وہ اسے بے عزتی کا مسئلہ نہ بنا لیں۔ میں نے ان کو تسلی دی۔ "اللہ نے چاہا تو کچھ نہیں ہوگا، غلطی ان کی ہے پوچھے بغیر آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔"

"بس اللہ خیر کرے اور یہ شادی خیر و عافیت سے ہو جائے۔" امی نے کہا۔ امی کی بات سے پہلے مجھے دل میں یقین تھا کہ ایسا ہی ہوگا۔ شادی کے دن سے چار دن پہلے مزمل ہمارے گھر آیا۔ بہ ظاہر تو وہ نکاح نامے کا فارم بھروانے آیا تھا تاکہ عین موقع پر دیر نہ لگے اور بس نکاح کی رسومات ادا کی جائیں۔ لیکن جب فارم بھر لیا گیا تو اس نے جیب سے ایک لفافہ نکال کر میری طرف بڑھایا۔

"یہ امی نے آپ کے لیے بھیجا ہے۔"

میں نے لفافہ لیے بغیر پوچھا۔ "اس میں کیا ہے اور کیوں ہے؟"

"اس میں امی نے آپ کے کپڑوں اور شوز کے لیے رقم بھیجی ہے۔"

"ایک منٹ میرے ساتھ آؤ۔" میں نے کہا اور مزمل کو اپنے کمرے میں لے گیا جو بالکل نئے فرنیچر سے آراستہ تھا۔ یہ سادہ لیکن خوب صورت فرنیچر تھا۔ نعمان نے کمرے کی کچھ آرائش بھی کی تھی۔ مزمل متاثر ہوا تھا۔

"آپ نے کمرا تو خوب سجایا ہے۔"

میں نے الماری کھول کر اسے اپنا نکاح والا سوٹ دکھایا۔ "یہ میں نے کرتہ کارنر سے لیا اس کے ساتھ یہ کلاہ اور یہ جوتی بھی ہے۔ اب تم بتاؤ مجھے کسی چیز کی ضرورت ہے؟"

"نہیں۔" اس نے اعتراف کیا۔

"یہ لفافہ آنٹی کو شکریے کے ساتھ دے دینا۔ سائرہ کو یہاں سب ملے گا اور میری جتنی بھی حیثیت ہوگی وہ اس کے مطابق زندگی گزارے گی۔"

"عمران بھائی سچ کہوں تو میں بھی آپ کا حامی ہوں لیکن امی ابو کے ڈر سے کچھ کہہ نہیں پاتا تھا۔ میں اس بات پر

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ

(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 7,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 6,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35895313 فیکس: 35802551

WWW.PAKSOCIETY.COM

ساری عمر آپ سے اور سائرہ سے شرمندہ رہوں گا کہ اس مشکل وقت میں آپ کا ساتھ نہیں دیا۔"

"تم نے ساتھ دیا ہے یار۔" میں نے ہنس کر کہا۔"میری مخالفت نہ کر کے۔"

"مجھے یقین ہے سائرہ آپ کے ساتھ بہت خوش رہے گی۔"

امی نے سائرہ کے لیے کوئی بیس کے قریب جوڑے تیار کر لیے تھے۔ دفتر سے لیے جانے والے ستر ہزار سے میں نے فرنیچر لیا اور کچھ دوسرا سامان لیا جس کی ایک نئی دلہن کو ضرورت ہو سکتی ہے۔ گھر کو بھی وائٹ واش کرایا تھا۔ یہ سارے کام بغیر قرض لیے ہو گئے تھے۔ زیور میں امی نے ایک ہلکا سیٹ بنوا لیا تھا۔ نکاح اور رخصتی ایک ہی دن ہونی تھی۔ دوپہر میں ظہر کے بعد میں چند بزرگوں کے ساتھ مسجد گیا وہاں نکاح ہوا۔ انکل صدیق کا موڈ بھی ٹھیک ہو گیا تھا اور وہ بہت محبت سے ملے۔ نکاح کے بعد میں واپس گھر آ گیا۔ شام کو امی اور خاندان کی کچھ خواتین جو اس طرح شادی سے خوش تھیں چلی گئیں اور سائرہ کو رخصت کرا کے لے آئیں۔ انہوں نے برات کا کھانا کھانے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ سائرہ اپنے گھر سے جو واحد چیز لے کر آئی وہ اس کا برات کا جوڑا تھا۔ یہ بھی صبیحہ آنٹی نے بہت ضد کر کے بنوایا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو کم سے کم برات کا جوڑا تو دیں اور امی مان گئی تھیں اس لیے مجھے بھی مجبوراً ان کی بات رکھنا پڑی۔ یوں یہ ان ہونی ہو گئی کیونکہ اس سے پہلے ہمارے خاندان میں ایسی کوئی شادی نہیں ہوئی تھی۔ شادی کے اگلے دن میں گھر سے نکلا اور ایک ایسے ہوٹل پر جہاں غریب لوگ کھانے کے منتظر رہا کرتے تھے وہاں میں نے پچاس افراد کے ناشتے کا بندوبست کرایا۔ پھر ایک اور ہوٹل میں ایسے ہی پچاس افراد کے دوپہر کے کھانے کا اور ایک تیسرے ہوٹل میں پچاس افراد کے لیے رات کے کھانے کا بندوبست کرایا۔

میں بہت خوش تھا کہ اللہ نے میری مدد کی اور میں اس طرح شادی کر سکا جیسا میں نے چاہا تھا۔ واحد دکھ اس بات کا تھا کہ شارق اس موقع پر موجود نہیں تھا۔ وہ مسجد میں مجھ سے ملاقات کے اگلے روز ہی دبئی کے لیے پرواز کر گیا تھا۔ اس کی چھٹیاں ختم ہو گئی تھیں۔ میری شادی کے اگلے دن ایک اجنبی آدمی میرے گھر پر ایک پارسل دے گیا۔ یہ شارق کی طرف سے تھا میری شادی کا تحفہ۔ میں نے اسے کھولا تو اس میں ایک جیسی دو خوب صورت زنانہ اور مردانہ گھڑیوں کا سیٹ تھا اور ساتھ میں وہی لفافہ تھا جس میں شارق نے کبھی مجھے ایک لاکھ روپے دیے تھے اور میں نے سادگی سے شادی کرنے کا فیصلہ کرنے کے بعد سے یہ رقم واپس کر دی تھی۔ لفافے میں ایک لاکھ روپے اور شارق کا ایک چھوٹا سا رقعہ تھا۔

"عمران بھائی میری خواہش ہے تم اور بھابی کسی خوب صورت جگہ کچھ دن گزار کر آؤ اس کے لیے میری طرف سے یہ چھوٹا سا تحفہ قبول کرو تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔"

یہ تحفہ تھا اور اسے ٹھکرانا شارق کے خلوص کو ٹھکرانا تھا اس لیے میں نے یہ رقم لے لی۔ شارق کی خواہش کے مطابق میں اور سائرہ کچھ دن شمال کی خوب صورت وادیوں میں گزار کر آئے تھے۔ سائرہ بہت اچھی بیوی ثابت ہوئی اور اس نے چند دنوں میں مجھ سمیت سب گھر والوں کے دل اس طرح جیت لیے تھے کہ اب ہمیں اس کے بغیر اپنی زندگی ادھوری لگتی تھی۔ یہ سچ ہے کہ شادی کی اصل خوشی شادی کے بعد ہوتی ہے نہ کہ شادی کے دوران ان رسومات میں جو بلاوجہ اور بے اصل ہیں۔ یہ سوائے بوجھ کے کچھ نہیں ہیں، ذرا ان ماں باپ سے پوچھیں جو اپنی بیٹیوں کا جہیز اور شادی کے اخراجات پورے کرنے کے لیے کیا کیا جتن کرتے ہیں۔

شارق کی یہ بات بھی درست ثابت ہوئی کہ سادگی سے شادی کے بدلے اللہ نے اس میں اتنی برکت رکھی کہ میں اس کا شکر ادا کرنے سے قاصر ہوں۔ جب میری شادی ہوئی تو میری تنخواہ سولہ ہزار روپے تھی آج میں ساٹھ ہزار تنخواہ لے رہا ہوں۔ اُس وقت میرے پاس موٹر سائیکل تھی اب تقریباً نئی کورے کار ہے۔ میں نے مکان کو ری نیوٹ کرایا ہے اور اوپر بھی دو کمرے بنوائے ہیں کیونکہ چند سال بعد نعمان کی شادی کا ارادہ ہے۔ فرحانہ کی شادی ہو چکی ہے اور آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ اس کی شادی شارق سے ہوئی ہے یوں ہمارے درمیان رشتہ اور بھی مضبوط ہو گیا ہے۔ اللہ نے مجھے دو بیٹیوں سے نوازا ہے۔ یہ بیٹیاں میری پوری کائنات ہیں۔ صرف ایک سنت پر عمل کے بدلے اور ذرا سی مشکلات برداشت کرنے کے صلے میں اللہ نے اتنا نواز دیا۔ بے شک وہ بے حساب دینے والا ہے۔

حربہ

جناب معراج رسول
سلامِ تہنیت!
یہ سرگزشت میری نہیں ہے۔ میری ایک واقف کار کی ہے لیکن اس پورے واقعہ میں میں بھی شریک رہا ہوں۔ اس لیے ایک ایک بات جذبات کے ساتھ بتا سکتا ہوں۔ عذرا بہت معصوم بہت حسین تھی، اس کا یہ حسن ہی اس کا دشمن بن گیا۔ اپنے دشمن کو اس نے ایک عجیب انداز سے شکست دے دی۔ اس کا حربہ انتاہی موثر تھا کہ وہ زندہ بچ نہ پایا۔ اب وہ دونوں اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن ان کی باتیں یاد آتی ہیں۔
سہیل
(کراچی)

اُس کے پورے بدن پر نیل پڑے ہوئے تھے۔

اور میں اس کی حالت دیکھ کر کانپ رہا تھا۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو جس نے اس کا ایسا حال کیا تھا اس کا بھی یہی حال کر دیتا۔ اس کو اس حال میں دیکھ کر واقعی میں لرز اٹھا تھا۔

عذرا نام تھا اس کا۔ ایک خوبصورت، نازک اور ذہین لڑکی، جدید یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ میری اس سے ملاقات ایک ایسے فنکشن میں ہوئی تھی جس میں مجھے

WWW.PAKSOCIETY.COM

زبردستی مدعو کیا گیا تھا۔ جبکہ میں اس قسم کی تقریبات سے کترایا کرتا ہوں۔ وہ سامنے والی رو میں بیٹھی تھی۔

یونیورسٹی کی دوسری لڑکیوں کے ساتھ اور سنگر کی پرفارمنس کے ساتھ ساتھ تالیاں بجا رہی تھی۔ میں نے جب اس کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔

اس میں بلا کا چارم تھا۔ زندگی سے بھرپور وہ لڑکی مجھے بہت اچھی لگی۔ حالانکہ اس کے ساتھ اور بھی لڑکیاں تھیں۔ لیکن اس میں جو کشش تھی وہ کسی میں نہیں تھی یا پھر حسن دیکھنے والے کی نگاہوں میں ہوا کرتا ہے۔

عذرا مجھے ایک بار پھر ملی۔ اس کے بعد بھی ملی۔ اور میں اس کی صورت، ذہانت وغیرہ کا دیوانہ ہوتا چلا گیا۔ وہ ایک پڑھے لکھے خاندان کی لڑکی تھی۔ اس کے والد عروج صاحب کالج میں اردو ادب کے استاد تھے اور بہت اچھے شعر کہا کرتے تھے۔

یہ اتفاق ہے کہ میں عذرا سے ملاقات سے پہلے بھی عروج صاحب کی شاعری کا دیوانہ تھا اور ان کے درجنوں اشعار مجھے یاد تھے۔ اس لیے جب میں نے عذرا کو عروج صاحب کے اشعار سنانے شروع کیے تو وہ حیران رہ گئی۔

''واہ سہیل صاحب، آپ نے تو پاپا کو اچھی طرح پڑھ رکھا ہے۔'' اس نے کہا۔

''ہاں، بہت اچھی طرح... اور اب میں ان کی صاحبزادی کو پڑھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' میں مسکرا کر بولا۔

''بہت مشکل ہے۔'' وہ بھی مسکرادی۔ ''میں کوئی کتاب نہیں ہوں جس کو آپ ایک نشست میں پڑھ کر ختم کردیں۔''

''ہاں، یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''بقول پروین شاکر۔ حسن کے سمجھنے کو اک عمر چاہیے جاناں...... دو گھڑی کی چاہت میں لڑکیاں نہیں کھلتیں۔''

تو ہمارے درمیان اس قسم کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ میں اپنی زندگی کی ساتھی اسی کو بناؤں گا۔ عذرا تو اسی قابل تھی۔

مجھے یقین تھا کہ میرے یا اس کے گھر والے اس رشتے پر انکار نہیں کریں گے۔ ہم دونوں کے درمیان دوستی کی بہت خوبصورت راہیں طے ہو رہی تھیں کہ اچانک وہ سب کچھ ہوگیا جس کا تصور بھی نہیں ہوسکتا تھا۔

وہ میرے سامنے پورے بدن سے کانپ رہی تھی اور اس کے پورے جسم پر نیل پڑے ہوئے تھے۔ میں تو اس کا یہ حال دیکھ کر پاگل ہوگیا تھا۔ ''عذرا، کیا ہوگیا ہے تمہیں۔ خدا کے لیے بتاؤ، کیا ہوا ہے۔ کس نے تمہارا یہ حال کیا ہے؟''

''بے درد اور ظالم لوگوں نے۔'' اس نے بتایا۔

''کون بے درد اور ظالم لوگ؟''

''وہ بہت طاقت ور لوگ ہیں سہیل۔'' وہ ہچکیوں سے روئے جا رہی تھی۔ ''ہم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔''

''خدا کے لیے عذرا مجھے پوری بات بتاؤ۔''

پھر اس نے اپنی جو کہانی سنائی وہ انتہائی دل خراش تھی۔

اس نے بتایا۔ ''میں یونیورسٹی جانے کے لیے نیپا چورنگی کے پاس کھڑی تھی کہ اچانک مجھ سے کچھ فاصلے پر ایک گاڑی آکر رک گئی۔ اس کے شیشے اندھے تھے یعنی ان کے اندر دیکھا نہیں جاسکتا تھا۔ دو آدمی اتر آئے، میرے قریب آگئے اور بالکل میرے پاس آکر ان میں سے ایک نے گن نکال لی۔ ''چلو گاڑی میں بیٹھو، جلدی۔'' ایک نے کہا۔ ''ورنہ یہیں مار کر ڈال دوں گا۔''

''سہیل میں اس وقت اتنی خوفزدہ تھی کہ سکتے میں رہ گئی تھی۔ آس پاس اور بھی لوگ ہوں گے لیکن کسی کا دھیان ہماری طرف نہیں تھا۔ ''جلدی کرو۔'' وہ غرایا۔

میں مجبور ہوگئی تھی۔ جس طرح کسی پر ٹرانس کردیا جائے وہی کیفیت تھی میری۔ میں ان دونوں کے ساتھ گاڑی میں جا کر بیٹھ گئی۔ ان میں سے ایک ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھا تھا جبکہ دوسرا پچھلی نشست پر میرے برابر آکر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے گن کی نالی میری کمر سے لگا رکھی تھی۔

''بالکل خاموش رہنا۔'' اس نے دھمکی دی۔ ''ورنہ یہیں مار کر لاش سڑک پر پھینک دوں گا۔ نہ جانے کتنی لاشیں اس طرح پڑی ہوئی ملتی ہیں۔ ایک تمہاری بھی سہی۔''

گاڑی چلتی رہی۔ مجھے کوئی ہوش نہیں تھا۔ ایک سکتے کی سی کیفیت تھی۔ ہم یونیورسٹی سے بھی آگے بہت آگے چلے گئے۔ میرا ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔ کون تھے یہ لوگ۔ مجھے کہاں لے جا رہے تھے۔

بہت دیر بعد ایک ایسی بستی میں پہنچ گئے جہاں اکا دکا مکانات بنے ہوئے تھے۔ اس وقت مجھے ہوش آیا اور میں نے گاڑی سے اتر کر بھاگنے کی کوشش کی۔ اس وقت انہوں نے گاڑی ایک مکان کے سامنے روک لی تھی۔

جب انہوں نے مجھے گاڑی سے اتارا تھا اس وقت میں نے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ ان میں سے گن والے نے بڑی بے رحمی کے ساتھ مجھے اتنی زور کا تھپڑ مارا کہ میں

چکرا کر ایک طرف جا گری۔

اب میں اس قابل کہاں تھی کہ احتجاج کر سکتی۔ وہ مجھے اٹھا کر اندر لے گئے اور میرے ساتھ وہ سلوک ہوا جو بتا نہیں سکتی۔ سہیل تم یقین کرو کہ میں نے بہت احتجاج کیا، اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کی پھر انہوں نے مجھے اتنا مارا کہ میرے پورے بدن پر نیل پڑ گئے۔ تم خود دیکھ سکتے ہو میں کس کرب سے گزری ہوں۔''

وہ رو رہی تھی اور میرا خون کھول رہا تھا۔

اتنی اچھی، اتنی پیاری، مہذب اور اچھے خاندان کی لڑکی کے ساتھ ایسا سلوک۔ یہ دو کوڑی کے اجڈ، وحشی گنوار لونڈے اسے اٹھا کر لے جاتے ہیں اور اس کے بدن کو روند کر رکھ دیتے ہیں۔

میں بس کبھی کبھی پیار سے اس کا ہاتھ تھام لیا کرتا۔ جس پر وہ مسکرا کر رہ جاتی تھی اور ان غنڈوں نے اسے پامال کرکے رکھ دیا تھا۔

''عذرا بتاؤ، کون تھے وہ لوگ؟'' میں نے پوچھا۔

''سب فضول ہے۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''تم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ وہ ایک سیاسی پارٹی سے تعلق رکھنے والے بہت طاقت ور لوگ ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''یہاں کا قانون بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ پولیس ان سے خوفزدہ رہتی ہے۔''

''ایک بات بتاؤ۔'' میری آواز اس وقت کانپ رہی تھی۔ ''کیا وہ دونوں ہی اس جرم میں شریک تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، صرف وہ جو مجھے گن دکھا کر اپنے ساتھ لے گیا تھا۔'' عذرا نے بتایا۔ ''جبکہ دوسرا کمرے میں چلا گیا تھا اور میری چیخیں گونجتیں تو اس کے قہقہوں کی آواز سنائی دیتی۔ دوسرے کمرے میں بیٹھا ہوا وہ مجھے بے آبرو کرنے والے کی حوصلہ افزائی کیے جا رہا تھا۔''

اس کے بعد اس نے پھر رونا شروع کر دیا۔ ''اب میرا کیا ہوگا؟ میں تو کہیں کی نہیں رہی۔ کسی لڑکی کے پاس صرف اس کی عزت ہوتی ہے وہ بھی نہیں رہی، وہ بھی نہیں رہی۔ سہیل، میں نے انہیں بددعائیں دیں۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن کوئی اثر نہیں ہوا۔''

''بددعاؤں سے کچھ نہیں ہوگا۔'' میں تلخ ہوکر بولا۔ ''جب سے دنیا بنی ہے تب سے اب تک کچھ بھی ہوا، میں نے تو کبھی دیکھا اور سنا نہیں کہ کسی نے کسی لڑکی کو بے آبرو کیا ہو اور اس پر بجلی گر پڑی ہو یا وہ مفلوج ہوگیا ہو۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا ہے۔ وہ اپنا کام کرکے مونچھوں پر تاؤ دے کر کسی اور کی تلاش میں نکل جاتا ہے۔''

''خدا کے یہاں جواب تو دینا ہوگا۔''

''اس بحث کو چھوڑو۔'' میں نے کہا۔ ''وہ دیتا رہے خدا کے یہاں جواب، تم تو بے آبرو ہوگئیں۔ تمہاری زندگی تو برباد کردی نا اس نے... ... تم بتاؤ تم نے اس کا کیا بگاڑا تھا؟ یہی نا کہ تم کمزور تھیں۔ ایک نازک سی لڑکی تھیں اور اس نے تمہاری اس کمزوری اور نزاکت کا فائدہ اٹھالیا۔''

''سہیل، خدا کے لیے میری مدد کرو۔'' اس نے کہا۔ ''میں خودکشی بھی کرسکتی ہوں لیکن میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔''

''نہیں، یہ خیال بھی دل میں نہیں لانا۔ تم مر بھی گئیں تو اس کی صحت پر کیا اثر پڑے گا، کچھ بھی نہیں۔''

''تو پھر کیا کروں میں؟''

''وہی، جو دنیا کے ہر کمزور انسان کے نصیب میں لکھ دیا گیا ہے، صبر۔ صبر کرو اور کیا کرسکتی ہو تم۔''

میں اس کو بہت دیر تک تسلیاں دیتا رہا۔ لیکن میری تسلیوں کا کیا فائدہ۔ کچھ بھی نہیں۔ اس کے ساتھ جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔

میں اس سے یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اپنے گھر والوں کو اس حادثے کے بارے میں بتادے۔ اس کی زندگی تو برباد ہو ہی چکی تھی، پھر اس کے گھر والوں کی بھی ہوجاتی۔

میں اسے اس کے گھر پہنچا کر واپس آگیا۔ سوچتے سوچتے میرے دماغ کی رگیں پھٹنے لگی تھیں۔ میں اس کے لیے کیا کرسکتا تھا، کس طرح اس کی دل جوئی کرتا۔

جہاں تک اس کو اپنانے کا سوال تھا تو میں بدستور اس ارادے پر قائم تھا۔ کیونکہ اس کے ساتھ جو بھی ہوا وہ اس کے لیے بے قصور تھی۔ اس کے ساتھ زبردستی کی گئی تھی اور میں ایسا ہرگز نہیں تھا کہ اس کو اور دکھ دیتا۔

دو چار دنوں کے بعد پھر اس کا فون آیا۔ ''سہیل، مجھ سے فوراً ملو، بہت ضروری ہے۔''

میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس بار بھی میں نے ایک پُرسکون مقام کا انتخاب کیا تھا جہاں ہم آسانی اور آزادی کے ساتھ گفتگو کرسکتے۔

''سہیل، میں شاید مرنے والی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''میری موت قریب آگئی ہے۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

’’تم نے پھر وہی بات کی۔ اپنے ذہن سے جھٹک دو۔‘‘

’’بات کچھ اور ہے سہیل۔‘‘ وہ ہونٹ دبا کر بولی۔ ’’میں اپنے آپ کو بہت بیمار محسوس کر رہی ہوں۔ کچھ ایسی خرابیاں ہوگئی ہیں جن کے لیے کسی ڈاکٹر سے ملنا بہت ضروری ہے۔ کیا تمہاری جان پہچان کی کوئی ایسی لیڈی ڈاکٹر ہے جو پوری ہمدردی سے میرا معائنہ بھی کرے اور راز بھی رکھ سکے۔‘‘

مجھے افضل بھائی کی بیوی کا خیال آگیا۔

وہ میرے بھائی تو نہیں تھے، دوست تھے لیکن پورا حلقۂ احباب انہیں بھائی کہا کرتا تھا۔ ان کی بیگم تابندہ لیڈی ڈاکٹر تھیں اور میری ان سے بے تکلفی بھی تھی۔ میں انہیں بھابی کہا کرتا تھا۔

’’ہاں، ایک لیڈی ڈاکٹر ہیں۔‘‘ میں نے بتایا۔ ’’جو دونوں شرائط پر پوری اتریں گی۔‘‘

’’تو پھر لے چلو ان کے پاس۔‘‘ اس نے کہا۔ ’’ابھی اور اسی وقت، کیونکہ وقت ختم ہوتا جا رہا ہے۔‘‘

ہم وہاں سے افضل بھائی کے گھر آگئے۔

کلینک کا وقت نہیں تھا۔ اس لیے تابندہ گھر پر ہی تھیں اور افضل بھی تھے۔ میں نے دونوں سے کہا۔ ’’دیکھیں، آپ دونوں مجھ سے یہ نہیں پوچھیں گے کہ یہ کون ہیں اور کیا ہیں، بس ان کا معائنہ کرانا ہے۔‘‘

’’کیوں نہیں۔‘‘ تابندہ نے کہا۔ ’’پھر عذرا کی طرف دیکھا۔ ’’تم آؤ میرے ساتھ۔‘‘

وہ اسے لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ میں اور افضل اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ اس خدا کے بندے نے عذرا کے بارے میں کچھ بھی نہیں پوچھا تھا۔

وہ دونوں بہت دیر کے بعد کمرے سے باہر آئی تھیں۔ تابندہ بہت سنجیدہ دکھائی دے رہی تھی۔ میں نہیں جانتا کہ اس نے عذرا میں ایسی کون سی بات دیکھ لی تھی جس نے اس کو اتنا سنجیدہ اور فکرمند کر دیا تھا۔

اس وقت افضل نے ایک کام یہ کیا کہ وہ اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد تابندہ نے عذرا سے پوچھا۔ ’’تم یہ بتاؤ، کیا ہم یہ باتیں سہیل کے سامنے کر سکتے ہیں۔‘‘

’’ہاں، آپ ان کو سب کچھ بتا دیں۔‘‘ عذرا نے کہا۔ ’’جس طرح آپ نے مجھے بتا دیا ہے۔‘‘

’’سہیل، تمہاری یہ دوست H.I.V پازیٹو ہیں۔‘‘ تابندہ نے بتایا۔ ’’اس کا مطلب تو سمجھتے ہو کہ یہ ایڈز کی مریضہ ہیں۔‘‘

’’کیا؟‘‘ میں چکرا کر رہ گیا تھا۔ ’’یہ... یہ کیسے ممکن ہے۔‘‘

’’یہ بہت بدنصیب لڑکی ہے سہیل۔‘‘ تابندہ کی آواز میں دکھ تھا۔ ’’نہ جانے قدرت نے اس کے ساتھ ایسا ستم کیوں کیا ہے۔ جبکہ... کسی بھی معاملے میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اس کے باوجود یہ ناکردہ گناہوں کی سزا بھگت رہی ہے۔ اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ اب سے کئی سال پہلے اس کو ٹائیفائیڈ ہوا تھا۔ جس میں اس کو اینٹی بائیوٹک انجکشن دیے گئے اور ذرا سی بے پروائی نے اس کو ایڈز زدہ بنا دیا۔ کوئی ضروری نہیں ہے کہ یہ مرض غلط تعلقات کی وجہ سے ہوتا ہو۔ یہ مرض غلط سرنج کے استعمال سے بھی ہوتا ہے۔ ایسا ہی کچھ ان کے ساتھ ہوا ہے۔ یہ اسی وقت سے ایڈز کی مریضہ ہوگئی تھیں، آثار اب اس حادثے کے بعد نمایاں ہونا شروع ہوئے ہیں۔‘‘

عذرا اس دوران اپنی گردن جھکائے روتی رہی تھی۔ کیا آنسو تھے اس کے جو براہِ راست دل پر گر رہے تھے۔ موت اس کے قریب بہت قریب آگئی تھی، ایک سسکتی اور تباہ کرتی ہوئی موت۔

’’بھابی، کیا اس کا کوئی علاج ممکن ہے۔‘‘ میں نے پوچھا۔

’’نہیں۔‘‘ تابندہ نے اپنی گردن ہلا دی۔ ’’ہم کوشش کر سکتے ہیں لیکن حتمی طور پر نہیں کہہ سکتے۔ اس میں پیپلین کے انجکشن تو لگائے جاتے ہیں لیکن یہ طریقہ ابھی ابتدائی مراحل میں ہے سو فیصد کامیابی نہیں ہوئی ہے۔‘‘

’’سہیل۔‘‘ اس بار عذرا بول پڑی۔ ’’میں نے تم سے کہا تھا نا کہ میری موت میرے، بہت قریب آچکی ہے۔ میں آہستہ آہستہ موت کی طرف جا رہی ہوں۔‘‘

’’ایسا بھی نہیں ہے عذرا۔‘‘ تابندہ نے کہا۔ ’’میں نے ایڈز کے مریضوں کو برسوں زندہ رہتے ہوئے دیکھا ہے۔‘‘

’’لیکن کیسی زندگی ڈاکٹر۔‘‘ عذرا تلخ ہو کر بولی۔ ’’سسکتی ہوئی، رینگتی ہوئی، یہی ہوتا ہے نا۔‘‘

اس بات کا تابندہ کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے اپنی گردن جھکالی تھی۔ پورے کمرے میں موت کی سی خاموشی تھی۔ میں عذرا کو واپس لے آیا۔

ہم دونوں کے پاس کہنے سننے کے لیے کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ اس کی کہانی ختم ہو چکی تھی یا ختم ہونے والی تھی۔ ایسا دکھ

بھی شاید ہی کسی لڑکی نے برداشت کیا ہو۔

دو چار دنوں کے بعد عذرا نے مجھے پھر فون کیا اور اس بار حیرت انگیز طور پر اس کی آواز میں پہلے جیسی افسردگی نہیں تھی۔ اس نے مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔

میں نے اس سے ملاقات کی۔ اس نے ایک عجب بات بتائی۔ ’’سہیل، میں نے اس آدمی سے ملاقات کی ہے۔‘‘ اس نے بتایا۔

’’کس آدمی سے؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’وہی۔ جس نے میری عزت برباد کی ہے۔‘‘ اس نے بتایا۔

’’کیا؟‘‘ میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ ’’یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔‘‘

’’ہاں، میں مارکیٹ گئی تھی، وہاں میں نے اس کو دیکھ لیا۔ تم سوچ سکتے ہو کہ اس کو دوبارہ سامنے دیکھ کر میرا کیا حال ہوا ہوگا۔ میں بے پناہ خوفزدہ تھی۔ لیکن صرف تھوڑی دیر کے لیے۔ اس کے بعد میں ایک فیصلہ کر کے اس کے پاس چلی گئی۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر پریشان ہوگیا تھا۔ شاید اسے یہ خوف ہوگا کہ اب میں ہنگامہ کرنے والی ہوں یا میں کچھ آدمیوں کے ساتھ ہوں۔ لیکن جب میں نے مسکرا کر اسے مخاطب کیا تو وہ حیران رہ گیا۔

’’گھبراؤ نہیں۔‘‘ میں نے اس سے کہا۔ ’’میں تو کئی دنوں سے تمہیں تلاش کر رہی ہوں۔ مجھے تمہارا گھر یاد نہیں تھا ورنہ میں خود پہنچ جاتی۔‘‘

’’لیکن کیوں؟‘‘ اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

’’تم سے ملنے۔ تم سے باتیں کرنے۔‘‘ میں نے بتایا۔ ’’کچھ وقت تمہارے ساتھ گزارنے۔‘‘

جب اسے یہ احساس ہوگیا کہ میں کوئی ہنگامہ وغیرہ نہیں کرنے والی ہوں تو اس کے لہجے میں اعتماد آگیا۔ ’’کمال کی لڑکی ہو تم۔ اس دن کے بعد بھی تم مجھ سے ملنا چاہتی تھیں، کیوں؟‘‘

’’اس لیے کہ میری زندگی میں اس انداز سے آنے والے تم پہلے مرد ہو۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’یاد رکھو، عورت کی فطرت بہت مختلف ہوتی ہے۔ وہ اس کو کبھی نہیں بھلا پاتی جس نے پہلے پہل اس کے بدن کو دیکھا ہو۔‘‘

’’اوہ، اب سمجھا۔‘‘ وہ مسکرا دیا، تو پھر کیا ارادہ ہے تمہارا۔‘‘

’’وہی، جو میں تم سے کہہ چکی ہوں۔ کچھ وقت تمہارے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں... اور بار بار گزارنا چاہتی ہوں۔‘‘

’’بس، تو پھر دو منٹ ٹھہر جاؤ۔ ہم ساتھ چلتے ہیں۔‘‘ وہ خوش ہو کر بولا۔

جب وہ اس قسم کی باتیں کر رہی تھی تو میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اس کا گلا گھونٹ دوں۔ میرا خیال ہے کہ دنیا کی کوئی بھی غیرت مند لڑکی اس آدمی کے چہرے پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرے گی جس نے اس کی توہین کی ہو، جس نے زبردستی اس کی عزت برباد کی ہو لیکن وہ اس کی کہانیاں سنا رہی تھی۔

’’چلو بتاؤ، آگے کیا ہوا۔‘‘ میں نے پوچھا۔

’’آگے کیا ہونا ہے۔‘‘ عذرا نے کہا۔ ’’میں ایک بار پھر اس کے ساتھ اس کے گھر چلی گئی اور وہی سب کچھ ہوا جو پہلے ہوا تھا لیکن اب میری مرضی بھی شامل تھی۔

میں ایک عجیب کیفیت میں تھا۔ دل میں آئی کہ اس کو برا بھلا کہہ کر واپس آجاؤں۔ ایسی لڑکی کا خیال ہی ترک کر دوں جس کو اپنی عزت کا پاس ہی نہیں تھا۔

’’سہیل، وہ ایک پڑھا لکھا آدمی ہے۔‘‘ عذرا بتا رہی تھی۔ ’’اور پیسے والا بھی ہے پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کا تعلق اس گروہ یا برادری سے ہے جو بہت طاقت ور ہے۔ بہت تعلقات والا آدمی ہے۔‘‘

’’ٹھیک ہے عذرا۔‘‘ میں اکتا کر بولا۔ ’’اگر تم نے اس طرح خود کو خوش رکھنا سیکھ لیا ہے تو ایسا ہی سہی۔‘‘

میں اس کی باتوں سے اتنا بے زار ہوگیا تھا کہ میں اس کے پاس زیادہ دیر نہیں بیٹھ سکا۔ بہانہ کر کے اٹھ آیا۔ وہ

شمارہ جنوری 2013ء کی منتخب سچ بیانیاں

ہماری پیش کش...... آپ کا انتخاب

☆ اول: بے وفا ...... مدیحہ انور (راولپنڈی)

☆ دوم: مصلحتِ محبت ...... روبینہ ناز (لاہور)

☆ سوم: قربانی ...... سیما فاروقی (کراچی)

پہلے، دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ بیتی منتخب کیجیے
ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے

WWW.PAKSOCIETY.COM

تو میری توقع کے بالکل خلاف ثابت ہوئی تھی۔ میں نے اسے کیا سمجھا تھا اور وہ کیا ثابت ہو رہی تھی۔

عذرا نے انتہا کردی تھی۔ شاید اسے اپنی نسوانیت کی بار بار پامالی کا شوق ہوگیا تھا۔ بہرحال یہ تو طے تھا کہ اب میرے اور اس کے راستے بالکل ہی الگ ہو چکے ہیں۔ اب وہ میرے کسی کام کی نہیں رہی ہے۔ اب وہ کسی اور راستے پر چل نکلی ہے۔

پھر کئی دنوں تک اس کا کوئی فون نہیں آیا اور نہ ہی میں نے کوئی بات کی۔ اب میرا دل ہی نہیں چاہتا تھا، ہاں میرے دل میں جو خلش پیدا ہوگئی تھی وہ کس طرح جاتی۔ اس کا تو کوئی سدِباب نہیں ہوسکتا تھا۔

میں اب بالکل خالی ہو کر رہ گیا تھا۔ کسی پر کوئی بھروسا ہی نہیں رہا تھا۔

یہاں شاید کوئی اس قابل ہی نہیں تھا کہ اس کی پاکیزگی پر یقین کیا جاسکے۔ جب عذرا جیسی لڑکی کا یہ حال تھا تو پھر کس کے بارے میں یقین گوئی کی جاسکتی تھی۔

ایک بار پھر اس کا فون آیا۔ تقریباً دس دنوں کے بعد۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''کیا بات ہے سہیل، کیا تم مجھ سے ناراض ہو؟''

''نہیں تو۔'' میں نے کہا۔ ''تم سے کیوں ناراض ہونے لگا۔''

''تم کو دیکھنے، تم سے ملنے اور باتیں کرنے کی عادت پڑ گئی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''تم نہیں ملتے تو ویرانی سی محسوس ہوتی ہے۔'' کیا تم مجھ سے نہیں ملو گے؟ کیا چھوڑ دو گے مجھے؟''

اس نے اس انداز میں ایسی باتیں کیں کہ میں نے اس سے ملنے کا وعدہ کرلیا۔

میں جب اس سے ملا تو اس کے چہرے پر پہلے جیسی بے چینی اور پریشانی نہیں تھی۔ اس کے برعکس وہ بہت پُرسکون دکھائی دے رہی تھی۔

''سہیل، میں نے تمہیں یہ بتانے کے لیے بلایا ہے کہ میں نے اس آدمی سے شادی کا فیصلہ کرلیا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''کیا؟'' یہ خبر بھی میرے لیے ایک زبردست جھٹکے کی طرح تھی۔ ''تم اس آدمی سے شادی کرنے جارہی ہو جس نے تمہیں اس حال کو پہنچا کر رکھ دیا ہے۔''

''ہاں۔ کل صبح ہم کورٹ میرج کر رہے ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''ہم نے مل جل کر سارا انتظام کرلیا ہے۔ ایک چھوٹا سا فلیٹ بھی لے لیا ہے۔ یہ اس نے میرے لیے خریدا ہے اس کو ڈیکوریٹ بھی کردیا گیا ہے۔''

''چلو مبارک ہو'' میرے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔

''کیا تم یہ نہیں پوچھو گے کہ میں نے ایسا فیصلہ کیوں کیا؟''

''ظاہر ہے اس میں کئی خوبیاں ہیں۔ وہ ایک طاقت ور خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ پیسے والا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ تمہاری زندگی میں آنے والا پہلا مرد ہے۔''

''اس کے علاوہ ایک وجہ اور بھی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''کیا اگر کسی عورت کی ایسی بری طرح توہین کردی جائے تو کیا اسے اس ظالم سے بدلہ لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔''

''لیکن یہ کیسا بدلہ ہے۔''

''سہیل، تم یہ کیوں بھول گئے ہو کہ میں ایڈز کی مریضہ ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''اور خود اندازہ لگا لو کہ مجھ سے شادی کے بعد اس کا کیا حشر ہونے والا ہے۔''

میں کانپ کر رہ گیا۔ عذرا نے بدلہ لینے کی جو پلاننگ کی تھی وہ اس شخص کے پورے گھرانے کو تباہ کردیتی۔ وہ گھل گھل کر مرجاتا۔ ایسے لوگ اپنی ایسی بے بسی کہاں برداشت کرسکتے ہیں۔ انجام یہی تھا کہ وہ یا تو ملک چھوڑ کر فرار ہوجاتا یا پھر خودکشی کرلیتا۔

''عورت کبھی اپنی توہین نہیں بھولتی سہیل۔ قدرت نے مجھے ایڈز کی مریضہ بنا کر مجھ پر ایسا احسان کیا ہے کہ میں بتا نہیں سکتی۔ میرے سینے میں دبی ہوئی آگ اب اس کمینے کو مریض بنا کر ہمیشہ کے لیے ٹھنڈی ہوجائے گی۔''

یہ تھا ایک ایسی لڑکی کا انجام جو بہت خوبصورت اور بہت ذہین تھی۔ جس کو دیکھ کر اس کو حاصل کرنے کی خواہش کی جاسکتی تھی۔

خدا جانے تقدیر اس سے کیوں ناراض ہوگئی تھی۔

اس کے بعد پھر عذرا کا پتا نہیں چلا۔ وہ گھر سے غائب ہوگئی تھی۔ اس کے گھر والے بہت دنوں تک اسے تلاش کرتے رہے تھے۔ پھر تھک ہار کر خاموش ہوگئے تھے۔

خدا جانے وہ کہاں ہوگی، کس حال میں ہوگی۔ زندہ بھی ہوگی یا نہیں، یا شاید دونوں ہی ایڈز کے ہاتھوں اپنی توانائی کھو کر کسی محتاج خانے میں پڑے ہوئے ہوں۔ خدا جانے۔

نروان

جناب مدیر ماہنامہ سرگزشت

سلامِ تہنیت!

میں شوبز کی دنیا سے وابستہ ہوں۔ اچھی اور سچی کہانیوں کے شوق میں سرگزشت پڑھتا رہتا ہوں۔ تاکہ کوئی عمدہ آئیڈیا مل جائے۔ دوسروں کی کہانیاں پڑھتے پڑھتے سوچا کہ اپنی کہانی بھی سرگزشت کے قارئین کو سنادوں۔ یہ سوفیصد سچا واقعہ ہے جو میرے ساتھ گزرا ہے۔

شہزاد تبسم
(کراچی)

وہ مجھے کہا کرتی کہ میں اس کی پہلی محبت ہوں۔

وہ ایک دل کش لڑکی تھی۔ اسمارٹ، ذہین، خوش لباس اور ماڈرن۔ اس کو دیکھ کر دل کی دھڑکنیں تیز ہو جایا کرتیں تھیں۔ اس کا نام راحیلہ تھا، راحیلہ عاصم۔ عاصم اس کے والد کا نام تھا۔

اس کا تعلق میرے ہی علاقے سے تھا یعنی اسی محلے کی تھی جس میں میرا گھر تھا۔ اسی لیے ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے نہ سہی لیکن پہچانتے ضرور تھے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

ایک دن اس نے خود ہی مجھ سے بات کی۔ یہ ایک انوکھی بات تھی۔ میں جا رہا تھا کہ اس نے مجھے راستے میں دیکھ لیا اور جلدی سے میرے پاس آ گئی۔ "بات سنیں، مجھے آپ سے ایک ضروری کام ہے۔"

"مجھ سے!" میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

"جی ہاں آپ سے۔"

"فرمائیں، میں آپ کے کس کام آ سکتا ہوں۔"

"آپ شہزاد انور صاحب ہیں نا۔" اس نے پوچھا۔

"جی ہاں اتفاق سے میں وہی ہوں۔"

وہ ہنس پڑی۔ "اور آپ کا تعلق شوبز سے ہے۔" اس نے پوچھا۔

"جی ہاں شوبز سے ہی ہے۔"

"تو بس مجھے آپ ہی جیسے کسی آدمی کی تلاش رہی ہے۔ میں اس فیلڈ کی طرف جانا چاہتی ہوں۔"

اب میں نے اپنی پیشہ ورانہ مہارت سے اس کا جائزہ لیا۔ وہ واقعی اس قابل تھی کہ وہ اگر اسکرین پر آتی تو لوگ اسے دیکھنے کے لیے مجبور ہو جاتے لیکن میں عام طور پر اس بات کا قائل نہیں تھا کہ جان پہچان کی یا محلے کی کسی لڑکی کو اس طرف لایا جائے۔

"آپ کیا سوچنے لگے۔ کیا میں اس قابل نہیں ہوں؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں نہیں تم اس قابل ہو لیکن......"

"آپ ایسا کریں کسی دن میرے گھر آ جائیں بلکہ ابھی چلیں، میں اپنے والدین سے بھی آپ کو اجازت دلوا دوں گی۔ میرا خیال ہے کہ شاید آپ اسی لیے کچھ کہتے ہوئے جھجک رہے ہیں۔"

اور سچ بھی یہ تھا لڑکیاں عام طور پر اپنے شوق کی خاطر والدین کی مرضی کے خلاف اس طرف جانے کی کوشش کرتی ہیں اور بعد میں ڈائریکٹر اور پروڈیوسر وغیرہ ان کی وجہ سے مصیبت میں پھنس جاتے ہیں۔

میں اسے ٹالنا چاہ رہا تھا لیکن وہ زبردستی مجھے اپنے گھر لے گئی۔ اس کے گھر والے پڑھے لکھے اور بہت معقول سے تھے۔ اس کی ماں نے مجھ سے کہا۔ "شہزاد صاحب۔ یہ لڑکی بہت دنوں سے اس کوشش میں ہے۔ ہم تو اسے سمجھا چکے ہیں لیکن یہ سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہے۔"

"دیکھیں، اس فیلڈ میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" وہ لڑکی تڑخ کر بولی۔ "آدمی خود کو سنبھالنا چاہے تو ہر طرح سنبھال لیتا ہے۔"

پھر اس کی ماں نے بھی کہہ دیا کہ آپ اپنی نگرانی میں اس سے کام کروائیں اور ممکن ہو تو اس کی دیکھ بھال کرتے رہیں۔ گویا اس کے گھر والوں کی جانب سے اجازت مل گئی تھی۔

اس کے بعد راحیلہ اور میں ایک دوسرے کے قریب آتے چلے گئے۔

میں نے ایک سیریل میں اسے کاسٹ کر لیا جس کا ہدایت کار میں خود ہی تھا۔ اکثر ہم ساتھ ہی جایا کرتے اور ساتھ ہی واپس آتے۔ اس نے بہرحال یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ ایک باصلاحیت اور پیدائشی فنکارہ ہے۔ اس کے مکالمے بولنے کا انداز اور چہرے کے تاثرات انتہائی نیچرل تھے۔

اس کے ساتھ کام کرنے والے سینئر لوگ بھی اس کی تعریف کیا کرتے تھے۔ "شہزاد صاحب، اس لڑکی میں بے پناہ ٹیلنٹ ہے۔ ہماری اسکرین کو ایک زبردست اسٹار مل گئی ہے۔"

"یہ تو ہے۔" میں ان کی تائید کرتا۔

اس دوران میں نے ایک بات یہ نوٹ کی کہ اس کے تعلقات کسی سے بھی نہیں تھے۔ یعنی شاید کوئی لڑکا اس کی زندگی میں داخل نہیں ہوا تھا۔ عام طور پر اس کا اندازہ اس طرح ہو جاتا ہے کہ سیٹ پر آتے ہی لڑکیوں کے موبائل بجنے شروع ہو جاتے ہیں۔ اس کے پاس موبائل تو تھا لیکن صرف اس کے گھر والوں کے فون آیا کرتے۔

رفتہ رفتہ ہم میں بہت اپنائیت سی ہوتی چلی گئی اور میں نے یہ محسوس کر لیا کہ راحیلہ ایسی لڑکی ہے جس کو زندگی کا ساتھی بھی بنایا جا سکتا ہے۔

شوبز میں ہونے کے باوجود وہ شوبز کی معلوم نہیں ہوتی تھی حالانکہ وہ انتہائی ماڈرن قسم کے لباس پہنا کرتی۔ اس کے باوجود اس کے انداز میں جو رکھ رکھاؤ تھا وہ بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ وہ صرف مجھ سے بے تکلف تھی اور وہ بھی اس حد تک کہ وہ مجھ سے کہا کرتی۔ "میری پہلی محبت تو آپ ہیں۔"

سیریل کا کام ختم ہو گیا۔ صرف آؤٹ ڈور باقی تھا جو مجھے شمالی علاقہ جات جا کر کرنا تھا اور اس میں راحیلہ کا کام نہیں تھا۔ ایک مہینے کا کام تھا۔

میں جانے لگا تو اس نے کہا "شہزاد آپ جا تو رہے

ہیں لیکن یہاں جو لوگ میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اُن کا کیا کروں۔"

"کیا مطلب؟"

"اور بھی کئی آفرز آ رہی ہیں۔" اس نے بتایا۔ "سیریل۔ سیریز وغیرہ۔"

"راحیلہ اب تم نے یہ دنیا دیکھ لی ہے۔ اس لیے تم اپنے طور پر فیصلہ کرنے کی مجاز ہو۔" میں نے کہا "تم کو کچھ لوگوں کے بارے میں بھی معلوم ہو گیا ہے۔ اب اگر تمہارا دل چاہے تو ان کے ساتھ کام کرنا ورنہ انکار کر دینا۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں کسی اور کے ساتھ کام کروں۔" اس نے کہا۔ "آپ آ جائیں تو پھر دیکھی جائے گی۔ میرا تعلق آپ سے ہے صرف آپ سے۔"

میں یہ سن کر خوشی سے نہال ہو گیا تھا۔ راحیلہ جیسی لڑکی جب یہ کہہ رہی تو پھر اور کیا چاہیے۔ "اوکے، میرا انتظار کرنا۔" میں نے کہا۔ "میں تو زندگی بھر تمہیں ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔"

وہ مسکرا دی، ایک شرمیلی سی مسکراہٹ جو کسی لڑکی کے چہرے پر صرف اس وقت نمودار ہوتی ہے جب اسے پیار ملنے کا یقین ہو جائے۔

میں شمالی علاقہ جات کی طرف گیا۔ یہ اتفاق ہے کہ وہاں ایک مہینے کے بجائے ڈیڑھ مہینے لگ گئے۔ اس دوران راحیلہ سے موبائل پر بات ہوتی رہتی تھی۔

پھر یہ ہوا کہ اس کا موبائل بند ملنے لگا۔ نہ جانے کیا بات تھی۔ مجھے اس کی طرف سے تھوڑی پریشانی بھی ہو گئی۔ بہرحال جب واپس آیا تو اسی شام اس کے گھر پہنچ گیا۔

اس کی والدہ نے دروازے پر میرا استقبال کیا تھا۔ "ارے شہزاد صاحب، آپ کب آئے؟"

"آج صبح ہی پہنچا ہوں۔" میں نے بتایا۔ "راحیلہ کیسی ہے؟"

"بالکل ٹھیک۔ آئیں اندر آئیں۔"

میں ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھ گیا جہاں اس سے پہلے نہ جانے کتنی دفعہ آ چکا تھا۔ اس کی والدہ مجھے بٹھا کر اندر چلی گئیں۔ کچھ دیر بعد وہ میرے لیے چائے لے کر آ گئیں۔ "راحیلہ آپ کو سلام کہہ رہی ہے اور خیریت پوچھ رہی ہے۔"

"لیکن وہ ہے کہاں؟"

"اب وہ شاید آپ کے سامنے نہیں آ سکے گی۔" اس کی والدہ نے بتایا۔ "وہ پردہ کرنے لگی ہے۔"

"پردہ کرنے لگی ہے؟" میں یہ سن کر واقعی حیران رہ گیا تھا۔ "یعنی آپ کا یہ مطلب ہے کہ جس طرح پردہ کیا جاتا ہے اس طرح۔"

"ہاں میاں، اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ۔"

"یہ اچانک ایسی تبدیلی کیسے آ گئی۔"

"یہ مجھے خود نہیں معلوم۔ بس ایک دن باہر سے واپس آئی اور آتے ہی کہنے لگی کہ اب وہ باہر نہیں جایا کرے گی۔ میں نے اس بات کو خاص اہمیت نہیں دی لیکن اس دن کے بعد سے تو اس نے واقعی باہر جانا ترک کر دیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس نے ضد کر کے برقع منگوا لیا اور اب برقع میں جایا کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی نماز کی انتہائی پابند ہو گئی ہے۔"

"یہ سب تو خیر بہت اچھی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن حیرت یہ ہے کہ ایسی تبدیلی اچانک کیسے آ گئی۔"

"یہ تو میں بھی نہیں جانتی۔ آپ خود ہی پوچھ لیں۔"

"لیکن وہ میرے سامنے تو نہیں آئے گی نا۔"

"ہاں، سامنے تو نہیں آئے گی لیکن دروازے کے پیچھے سے بات کر سکتی ہے۔"

"چلیں، اس سے بات ہی کروا دیں۔"

راحیلہ کی والدہ اٹھ کر اندر چلی گئیں۔ میں سوچتا ہی رہا کہ آخر یہ سب کس طرح ہوا۔ راحیلہ تو بہت ماڈرن لڑکی ہے۔ بے دھڑک، بے باک۔ پھر اس میں ایسی تبدیلی کیوں آ گئی۔ ایسی کون سی بات ہو گئی جس نے اس کے شب و روز بدل دیے۔

یہ اچھا ہی ہوا کہ میں نے اس کے ساتھ سیریل کا کام مکمل کر لیا تھا ورنہ بہت پرابلم ہو جاتی۔ اس کے علاوہ میرے اور اس کے درمیان جو تعلق تھا، جو محبت پروان چڑھ رہی تھی اس کا کیا ہونے والا تھا۔

راحیلہ کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ دروازے کے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے سلام کیا۔ میں سلام کا جواب دینے کے بعد سوچنے لگا کہ اب میں اس سے کیا کہوں، کیا بات کروں؟

پھر اس نے خود ہی پوچھا۔ "آپ کو بہت حیرت ہو رہی ہو گی۔"

"ہاں، بہت زیادہ۔" میں نے کہا۔ "ویسے تم نے جو راستہ اختیار کیا ہے، یہ بہت نیک اور مبارک ہے لیکن الجھن یہ ہے کہ آخر اتنی اچانک تبدیلی تم میں کہاں سے آ گئی۔"

"درِ شہوار کی وجہ سے۔" اس نے بتایا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"درِشہوار۔" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "کون درِشہوار؟"
"وہ بھی شوبز کی ایک لڑکی ہے۔" اس نے بتایا۔
"میں نے آپ سے اس کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ وہ ریکارڈنگ کے دوران آتی رہتی تھی۔"
"پتا نہیں تم کس کی بات کر رہی ہو۔ خیر تو اس نے کیا کہا تھا؟"
"وہ ایک عجیب لڑکی ہے شہزاد صاحب۔" اس نے بتایا۔ "وہ جب پہلی بار مجھ سے ملی تو اس کی نگاہیں مسلسل مجھے دیکھے جا رہی تھیں۔ پھر وہ میرے قریب آ کر بیٹھ گئی اور اس نے مجھ سے کہا۔ "جانتی ہو، کسی لڑکی کی دلکشی کا راز اس کے چہرے کی معصومیت اور تازگی میں ہوا کرتا ہے۔"
"یہ تو ہے۔" میں نے اس کی تائید کی۔
"پھر اس نے کہا کہ ہر گناہ کے ساتھ یہ معصومیت اور تازگی آہستہ آہستہ ختم ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس لیے شوبز کی لڑکیوں میں حسن تو ملے گا معصومیت نہیں ملے گی کیونکہ اسکرین پر آنے کے بعد لاکھوں نگاہیں ان کو دیکھتی ہیں۔"
وہ اتنا بول کر باہر چلی گئی تھی اور میں سوچتی رہی کہ اس نے مجھ سے ایسا کیوں کہا تھا۔ یہ چونکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی اس لیے میں نے بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔
ایک دن وہ پھر آ گئی۔ اس بار میں خود اس سے کچھ پوچھنا چاہتی تھی۔ ایک سوال میرے ذہن میں تھا۔ میں نے اس سے پوچھا "تم یہ بتاؤ۔ کیا اس دور میں بھی کوئی لڑکی ایسی ہو سکتی ہے۔"
"کیوں نہیں۔" وہ مسکرا دی۔ "ہزاروں ہیں کہ سورج کی کرنیں تک جن کو دیکھنے کے لیے ترستی ہیں۔"
"تم بہت عجیب باتیں کر رہی ہو۔" نام کیا ہے تمہارا؟"
"درِشہوار۔" اس نے بتایا۔
"لیکن تم خود بھی تو شوبز میں چانس کے لیے چکر لگا رہی ہو۔" میں نے کہا۔
"چکر نہیں لگا رہی۔" وہ ہنس پڑی "بلکہ چکر سے نکال رہی ہوں۔" وہ ہنستے ہوئے بولی اور پھر باہر چلی گئی۔
میں اس کی باتیں سن سن کر حیران ہوتی جا رہی تھی۔ اس میں کوئی نہ کوئی خوبی ایسی تھی، کوئی ایسی کشش جو اپنی طرف متوجہ کرنے لگی تھی۔
"اس کا حلیہ کیسا ہے۔ اس کے نقوش کیسے ہیں؟" میں نے دریافت کیا۔
"حلیہ، نقوش! نہیں شہزاد صاحب۔ میں صرف اتنا کہہ سکتی ہوں کہ وہ بہت ہی پُرکشش ہے۔" راحیلہ نے بتایا۔ "لیکن میں اس کے نقوش کی وضاحت نہیں کر سکتی۔"
"اچھا چلو رہنے دو۔ تو پھر کیا ہوا؟"
آپ کے جانے کے بعد اس سے میری ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ وہ گھر پر کبھی نہیں آئی بلکہ مجھے فون کر دیا کرتی اور ہم کہیں باہر ملتے۔ اس کی باتیں اچھی ہوتی تھیں۔ دل میں اتر جانے والی۔
دھیما دھیما انداز۔ ایک قسم کی مسکراہٹ۔ آنکھوں کی چمک۔ میری یہ خواہش ہونے لگی کہ کاش وہ میری دوست بن جائے۔ میں نے ایک دن جب اس سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تو وہ ہنس پڑی۔ "ارے، اس میں کون سی بات ہے۔ تم میری دوست ہو لیکن گہری دوست بننے کی ایک اور شرط ہے۔"
"وہ کیا ہے۔ میں اسے بھی پورا کرنے کی کوشش کروں گی۔"
"وہ شرط یہ ہے کہ تم نماز شروع کر دو۔"
"اوہو، اب تم تبلیغ کرنے لگیں۔"
"سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ اس کے بعد دیکھ لینا کہ تمہاری زندگی میں کیسی تبدیلی آتی ہے۔"
خیر تو میں نے اس کے بعد نماز شروع کر دی۔ پابندی سے تو نہیں لیکن پڑھتی رہی۔ ایک دن اس نے مجھ سے کہا۔ "اگر تم ملنا چاہو تو میری امی سے مل لو۔ میں نے ان سے تمہارے بارے میں بہت کچھ کہا ہے۔ اس لیے وہ تم سے ملنا چاہتی ہیں۔"
مجھے چونکہ اس پر پورا بھروسا ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ جانے میں کوئی خدشہ بھی نہیں تھا اسی لیے میں اس کے گھر چلی گئی۔
بہت ہی نفاست اور سادگی سے سجا ہوا گھر تھا۔ پورے ماحول سے پاکیزگی کا احساس ہو رہا تھا اور میں درِشہوار کی امی کو دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی۔ آپ یقین کریں۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں اتنا نورانی چہرہ نہیں دیکھا ہوگا۔
نہ جانے کیوں انہیں دیکھ کر میں خود پر قابو نہیں رکھ سکی تھی۔ میں رونے لگی۔ بے تحاشا رونے لگی۔ روتی ہی چلی گئی۔ انہوں نے مجھے سینے سے لگا کر تسلی دی۔
اور اس کے بعد سے میری دنیا بدل گئی۔ نہ جانے دل پر کیا اثر ہوا تھا۔ وہ میں بتا نہیں سکتی اور اب میں نے نماز کی پابندی کر دی ہے اور پردہ کرنے لگی ہوں تاکہ بے پردگی سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

چہرے کے نقوش نہ بدل جائیں۔"
"مبارک ہو تمہیں کہ کسی کی نگاہوں نے تمہاری دنیا بدل دی۔ کیا اس لڑکی سے ابھی بھی ملاقات ہوتی ہے۔"
"نہیں، بہت دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی۔"
"میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"
"ضرور ملیں۔ اس سے مل کر آپ بھی متاثر ہوں گے۔" راحیلہ نے درِشہوار کا ایڈریس بتا دیا۔
مجھ میں اتنا زیادہ تجسس تھا کہ میں اس کے گھر سے نکل کر اسی ایڈریس پر آ گیا۔ وہ ایک عام سا مکان تھا جس کا دروازہ بند تھا۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ ایک بار۔ دو بار۔ تین بار۔ لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔
اتنی دیر میں ایک پڑوسی آ کر میرے پاس کھڑا ہو گیا تھا۔ "کیوں زحمت کر رہے ہیں جناب، یہ مکان تو بند ہے۔" اس نے بتایا۔
"بند ہے۔" میں حیران رہ گیا تھا۔ "کب سے بند ہے؟"
"تین سال ہو گئے۔" اس نے بتایا۔
"کیا تین سال سے یہاں کوئی نہیں رہتا۔"
"نہیں بھائی، مالک مکان ملک سے باہر ہے اور یہاں کوئی نہیں رہتا۔ اندر خاک اڑ رہی ہے۔"
اس انکشاف نے مجھے چکرا کر رکھ دیا تھا۔
کیسی حیرت کی بات تھی۔ پھر یہ راحیلہ کس سے ملتی رہی تھی۔
میں نے دوسرے دن شوبز کے لوگوں سے اور خاص طور پر اپنے یونٹ کے لوگوں سے درِشہوار کے بارے میں معلوم کیا لیکن کسی کو بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ اسے کوئی نہیں جانتا تھا۔
ایک دن میں پھر راحیلہ کے پاس پہنچ گیا۔ وہ پہلے کی طرح دروازے کے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے جب اسے یہ بات بتائی تو کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے کہا۔ "شہزاد صاحب، کیا آپ یقین کریں گے کہ اس قسم کی صورتِ حال کا مجھے پہلے سے اندیشہ تھا۔"
"کیا مطلب؟"
"مطلب یہ ہے کہ درِشہوار کی امی مجھے انسانوں میں سے تو نہیں معلوم ہوئی تھیں۔" اس نے بتایا۔ "ایسا بے پناہ نور میں نے شاید ہی کہیں اور دیکھا ہو۔ اب خدا جانے ان لوگوں کا کیا راز تھا۔ کون تھی درِشہوار اور وہ مجھ پر کیوں مہربان ہوئی۔ لیکن میں اتنا ضرور جانتی ہوں کہ اس نے جو مجھے راستہ دکھا دیا ہے وہ میری نجات کی راہ بن گیا ہے۔ خدا سے دعا کریں کہ میں اس راہ پر چلتی رہوں۔"
میں بہت بوجھل دل کے ساتھ وہاں سے واپس آ گیا۔
سیریل کی ایڈیٹنگ شروع ہونے والی تھی۔ اسی رات ایڈیٹر کا فون آ گیا۔ وہ گھبرایا ہوا تھا۔ "سر جی جلدی آ جائیں۔ ایک بہت بڑی پرابلم ہو گئی ہے۔ آپ خود آ کر دیکھ لیں۔"
اور جو کچھ میں نے وہاں جا کر دیکھا، اس نے تو میرے ہوش اڑا دیے تھے۔ کسی بھی فریم میں راحیلہ کا چہرہ نہیں آیا تھا۔ چہرے کی جگہ ایک دھندی تھی۔ ویسے اس کا پورا جسم فریم میں تھا۔ صرف چہرہ غائب تھا۔
میں اپنا سر تھام کر بیٹھ گیا۔ یہ ایک حیرت انگیز بات تھی۔
میں نے پروڈیوسر کو فون کر کے بلا لیا۔ وہ بھی ہانپتا کانپتا ہوا وہاں چلا آیا تھا۔ جب اس نے بھی وہ فریم دیکھے تو اس کے بھی ہوش اڑ گئے۔ "شہزاد صاحب، یہ سب کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔
"مجیب صاحب، مجھے خود بھی نہیں معلوم۔"
"کون ہے یہ لڑکی۔"
میں نے اسے راحیلہ کے بارے میں تفصیل سے بتا دیا۔ "خدا کی پناہ۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "شہزاد صاحب وہ لڑکی احترام کے قابل ہے۔ وہ اس دور کی ولیہ ہے۔ آپ اس کے پاس جائیں تو میرا سلام پہنچا دیں اور جہاں تک سیریل کا تعلق ہے تو میں کسی اور کو لے کر دوبارہ ریکارڈنگز کروا لوں گا۔ مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔"
یہ ایک بہت بڑا مرحلہ تھا جو اس طرح طے ہو گیا تھا۔
میں نے یہ بات جب راحیلہ کو جا کر بتائی تو وہ رونے لگی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ "خدا کا شکر ہے شہزاد صاحب کہ اس نے میری لاج رکھ لی۔"
اب میرے لیے فیصلے کا وقت تھا۔ راحیلہ جیسی لڑکی سے شادی ہو جاتی تو اس سے بڑی خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میرے رشتے کو قبول کر لیا جائے گا۔
لیکن میں نے اپنا رشتہ نہیں بھیجا کیونکہ میں کسی بھی حال میں اس کے قابل نہیں تھا اور آج بھی نہیں ہوں کیونکہ میں آج بھی دنیا سے چمٹا ہوا ہوں اور راحیلہ کو مجھ سے محبت کے بعد ایک دوسری محبت مل گئی ہے جو یقیناً ٹھوس، لافانی اور مبارک ہے۔

مماثلت

قابلِ احترام باجی عذرا رسول
آداب و نیاز
میں ایک ایسی روداد سنانے جا رہی ہوں جو اپنے آپ میں منفرد ہے گو کہ یہ قصہ پرانا ہے لیکن سبق لیے ہوئے ہے اور بزرگوں کی اس کہاوت کی تشریح ہے "پِتا پر پُوت، پر اپت گھوڑا، کچھ نہیں تو تھوڑم تھوڑا۔"

آصفہ ضیاء احمد
(حیدر آباد)

"خالقِ کائنات ہر ذی روح کی فطرت ایک دوسرے سے جدا جدا بناتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ طبعی تبدیلیاں تو رونما ہوتی ہیں لیکن فطرت کبھی نہیں بدلتی، بعض لوگوں کی فطرت میں سادہ لوحی، معصومیت ہوتی ہے جبکہ کچھ لوگ فطری طور پر مکار، ریاکار اور جھوٹے ہوتے ہیں۔ اسی طرح مختلف جانوروں کی فطرت بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے جیسے گائے کی فطرت میں جو سادہ لوحی ہے وہ ضرب المثل ہے۔ اسی طرح طوطے کی بے وفائی، لومڑی کی مکاری اور کُتّے کی وفاداری بھی

WWW.PAKSOCIETY.COM

ان کی فطرت کے عین مطابق ہے۔ ہم انہیں کتنا بھی بدلنا چاہیں لیکن بدل نہیں سکتے۔ انسان ہو یا حیوان دونوں میں یہ بات مشترک ہے۔ جس طرح پھل دیکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ کون سا درخت ہے اور اس کا کیا نام ہے اسی طرح نیک فطرت اور بدفطرت انسان سے اس کے قبیل اور معاشرے کا پتا چل جاتا ہے۔" وہ میرے ڈرائنگ روم میں بیٹھا اپنی سرگزشت سنا رہا تھا۔

"میرے ساتھ بھی ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا جس سے میں قائل ہو گیا کہ فطرت سے انسان فوراً پہچانا جاتا ہے چاہے وہ لاکھ پردوں میں چھپا ہو۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب پاکستان معرضِ وجود میں نہیں آیا تھا۔ انٹر کرنے کے بعد میرا ارادہ مزید تعلیم حاصل کرنے کا تھا لیکن اچانک والد محترم کی وفات نے سارے ارادوں اور خوابوں کو چکنا چور کر دیا۔ والدین کا بڑا بیٹا ہونے کی وجہ سے گھر کی ساری ذمے داریاں میرے کمزور کندھوں پر آن پڑیں۔ اپنے ایک استاد کے توسط سے مجھے ایک دیہی علاقے میں سرکاری اسکول میں ملازمت مل گئی جو کہ اس وقت میرے لیے ہفت اقلیم سے کم نہیں تھی۔ تمام خواہشات اور تمناؤں کو پس پشت ڈال کر میں روزی روٹی کے چکر میں شاداب نگر پہنچ گیا۔ شاداب نگر ایک پچھڑا ہوا علاقہ تھا۔ بس بھی وہاں تک نہیں جاتی تھی۔ کچھ کلو میٹر کے فاصلے پر مسافروں کو اتار کر آگے بڑھ جاتی اور مسافر ایک پتلی سی پگڈنڈی سے ہوتے ہوئے شاداب نگر پہنچتے۔ لیکن آدھے راستے میں ہی چھٹی کا دودھ یاد آ جاتا۔ میں جب پہلی بار شاداب نگر میں داخل ہوا تو میرے چہرے کی ساری شادابی رخصت ہو چکی تھی بلکہ یوں کہیے کہ میں ادھ مرا ہو چکا تھا۔ مگر بس مرتا کیا نہ کرتا۔

اسکول کل آٹھ جماعتوں پر مشتمل تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کو ملا کر کل چھ ٹیچرز تھے۔ جن جماعتوں میں طلبا کم تھے وہاں کمبائن جماعت کر دی جاتی اور ایک ہی ٹیچر کی ڈیوٹی ہوتی۔ اس زمانے میں طالب علم حقیقت میں طالب علم تھا اور اساتذہ بھی ایسی محنت سے پڑھاتے جیسے کہ وہ اپنی اولاد کو پڑھا رہے ہوں۔

پہلے دن سے ہی میں اسکول اسٹاف کے ساتھ گھل مل گیا تھا۔ تقریباً سب ہی ٹیچرز شاداب نگر کے قرب و جوار سے آئے تھے ماسوائے ہیڈ ماسٹر کے، وہ وہیں کے رہنے والے تھے۔ ان کا نام عبدالحئی شیخ تھا۔ بڑے دین دار شریف النفس اور اصول پسند انسان تھے۔ اسکول اوقات میں صرف طلبا پر ہی نہیں بلکہ اساتذہ پر بھی کڑی نظر رکھتے لیکن فرصت کے اوقات میں کبھی ان کے گھر جانا ہوتا یا اسکول کے باہر ملاقات ہوتی تو دوستوں کے دوست تھے۔ ہمہ وقت ہر گھڑی ہر کسی کی مدد کے لیے تیار رہتے بستی کے لوگ ان کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے۔ وہ حقیقتاً تھے بھی اخلاق، انکسار کا پیکر۔ میں آج تک ان کی شخصیت کو بھول نہیں پایا۔

میں اور میرے اسٹاف کے باقی ساتھیوں نے بستی کی مسجد سے ملحق دو کمرے کرائے پر لے لیے تھے۔ جس میں ہم پانچ افراد کا گزارہ اچھی طرح ہو جاتا تھا۔ مسجد انتظامیہ نے نہایت کم کرائے پر دو بڑے بڑے کشادہ کمرے ہم لوگوں کو دے رکھے تھے۔ گاؤں کے لوگ تمام ٹیچرز کو عزت کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے یہ علم کے اوتار ہیں جو علم کی روشنی پھیلانے اور بانٹنے ہمارے گاؤں آئے ہیں۔ آج اس دور میں وہ عزت و احترام نظر نہیں آتا۔

رہائش کا مسئلہ حل ہونے کے بعد پیٹ پوجا کا بھی انتظام کرنا تھا کیونکہ ابھی تک وہاں کی اکلوتی دکان سے کام چل رہا تھا۔ جہاں صرف پکوڑے اور چائے ملتی تھی۔ آخر کب تک اس پر گزارہ ہوتا۔ ہم ٹیچرز کے گروپ میں اسحاق احمد صاحب سینئر تھے۔ انہوں نے یہ تجویز رکھی کہ کچن کے سامان کی ایک لسٹ بنائی جائے اور پھر چار چار برتن ہر ٹیچر اپنے اپنے گھر سے لے آئے اور کام بھی اسی طرح تقسیم کیا جائے۔ صبح کا ناشتا بنانے سے لے کر رات کے ڈنر کے بعد کی چائے تک، انہوں نے سارا کام اس خوبی سے تقسیم کیا کہ کسی کو کسی سے کوئی شکایت کا موقع ہی نہیں دیا۔ مجھے چونکہ چولہا جلانے کا بھی سلیقہ نہیں تھا اس لیے مجھے ڈش واشر بنا دیا گیا۔ چولہے میں جلاؤ لکڑی کا استعمال ہوتا تھا۔ اس لیے برتن سیاہ ہو جاتے تھے۔ انہیں مانجھنا، چمکانا اور ان کی صفائی کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔ زندگی میں کبھی یہ کام نہیں کیا تھا مگر کرنا تو تھا۔ گھر کا آرام و آسائش ایک خواب سہانا بن گیا تھا۔

ہمارے ہیڈ ماسٹر عبدالحئی شیخ نہ خود بیٹھنا جانتے تھے اور نہ دوسروں کو بیٹھنے دیتے۔ "آرام حرام ہے" کے مقولے پر عمل کرتے ہوئے اساتذہ اور طلبا بلکہ چپراسی سے بھی ٹھیک ٹھاک محنت کرواتے۔ یہی وجہ تھی کہ اسکول کا رزلٹ ہمیشہ بہتر سے بہتر ہوتا۔ اس وقت آٹھویں جماعت کا امتحان بھی بورڈ سے ہوتا تھا۔ عبدالحئی صاحب چاہتے تھے کہ ضلع بھر میں ان کے اسکول کا رزلٹ سب سے بہترین ہو اور اس میں وہ کئی بار کامیاب ہوئے۔

اسکول میں انتھک محنت اس کے بعد کمرے میں داخل ہوتے ہی جھوٹے برتنوں کا ہمالیہ پہاڑ استقبال کرتا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی سب کچھ کرنا پڑتا۔ ناشتا، کھانا تو ریڈی میڈ مل جاتا مگر ڈشیں دھونے سے میرے ہاتھوں میں خارش رہنے لگی تھی۔ اس کے علاوہ کچھ آب و ہوا کی تبدیلی سے میری طبیعت عجب بوجھل بوجھل سی اور حرارت رہنے لگی۔ میری طبیعت کو دیکھتے ہوئے عبدالحئی صاحب نے میری ایک ہفتے کی چھٹی منظور کر لی۔ ماں اور بہنوں کے ہاتھ کا نرم گرم کھانا نصیب ہوا، اور پُرسکون نیند نصیب ہوئی تو طبیعت خود بخود بحال ہو گئی۔ پھر بھی امی نے احتیاطاً ڈاکٹر سے معائنہ کروایا اور وہ تمام دوائیں جو کہ ڈاکٹر نے لکھی تھیں امی نے ساری میرے بیگ میں رکھوا دیں اور اس کے ساتھ ایک ہدایت نامہ بھی جو کہ پرہیزی غذاؤں پر مشتمل تھا۔

شاداب نگر آ کر میں ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق دوائیں لیتا رہا۔ میرے ساتھیوں نے بھی میرے ساتھ کافی رعایت برتی اور ہر طرح کا تعاون کیا۔ برتنوں کی صفائی میں میرے ایک اور دوست شیئر کرنے لگے جنہیں گھر گرہستی کا تجربہ تھا۔ بقول ان کے ان کی والدہ ہمیشہ بیمار رہتی تھیں اس لیے وہ اور ان کے بھائی گھر کا بلکہ کچن کا بھی ہر کام بہ حسن و خوبی انجام دے لیتے تھے۔ میں اپنے دوستوں کا ہر طرح سے مشکور تھا۔ سردیوں کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ بچوں کے ششماہی امتحان سر پر تھے کہ میری طبیعت پھر سے ناساز رہنے لگی۔ بخار کے ساتھ نزلہ، کھانسی نے بھی آ گھیرا۔ عبدالحئی صاحب اس بار مجھے چھٹی دینے کے لیے قطعی تیار نہ تھے۔ اسکول میں ان کا ڈسپلن اتنا سخت تھا اور وہ اس قدر اصول پسند شخص تھے کہ میں نے دوبارہ چھٹی کے لیے اپلائی ہی نہیں کیا۔ میری ناسازیِ طبیعت کی بنا پر انہوں نے مجھے آرڈر دیا کہ "تم اپنا ضروری سامان لے کر میرے گھر آ جاؤ۔ وہاں تمہیں ہر قسم کا آرام ملے گا۔"

پہلے تو میں نے انکار کیا مگر انہوں نے اپنا دوٹوک فیصلہ سنا دیا کہ رخصت تو تمہیں کسی قیمت پر نہیں ملے گی کیونکہ ٹیچرز کی تعداد ویسے ہی کم ہے، اگر تم بھی چلے جاؤ گے تو دوسرے اساتذہ پر کام کا بوجھ بھی بڑھ جائے گا اور بچوں کا بھی بہت نقصان ہوگا۔ ان کی بات کافی حد تک صحیح تھی اس لیے میں نے بھی گھر جانے کا خیال ترک کر دیا اور عارضی طور پر عبدالحئی صاحب کے گھر شفٹ ہو گیا۔

عبدالحئی صاحب نے اپنے گھر پر میرا ہر طرح سے خیال رکھا۔ میرے لیے ایک علیحدہ کمرا مخصوص تھا۔ بچوں کے ہاتھوں مجھے ناشتا اور کھانا بھجوا دیا جاتا اور رات میں، میں جب سونے کے لیے لیٹتا تو بہ ذاتِ خود آ کر میری خیریت پوچھتے، دوائیں پابندی سے لینے کی ہدایات دیتے اور شب بخیر کہہ کر کمرے سے رخصت ہوتے۔ میرے خواب و خور کا انہوں نے جو خیال رکھا اسے میں تا زندگی نہیں بھول سکتا۔

عبدالحئی صاحب کی بیگم ویسے تو مجھ سے پردہ کرتی تھیں۔ لیکن اندر سے ان کے بولنے کی مسلسل آوازیں آتی رہتی تھیں۔ کبھی بچوں پر چیختی چلاتیں تو کبھی کبھی عبدالحئی صاحب کی شامت آ جاتی۔ گھریلو کام کاج کے لیے ملازم رکھے جاتے لیکن کوئی بھی مہینا دو مہینے سے زیادہ نہ ٹکتا۔ ایسا بھاگتا کہ پیچھے مڑ کر نہ دیکھتا۔ محلے کی خواتین بھی ان کے یہاں کم ہی آتی تھیں۔ کسی رشتے دار کو بھی میں نے ان کے یہاں آتے جاتے نہ دیکھا۔ بچے بھی ان کے گھر میں سہمے سہمے رہتے لیکن باہر شیطان کے بھی کان کاٹتے تھے۔ عبدالحئی صاحب اور ان کی بیگم دو متوازی خطوط تھے۔ دونوں میاں بیوی عادات و اطوار کے لحاظ سے میل کھاتے تھے اور نہ ان میں کوئی ذہنی ہم آہنگی تھی۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ کس طرح زندگی گزار رہے تھے یہ تو خیر وہ ہی جان سکتے تھے لیکن کبھی کبھی مجھے ان پر رحم بھی بہت آتا تھا۔ ان کے گھر کا ماحول دیکھتے ہوئے میں نے سنجیدگی سے یہ فیصلہ کیا کہ علاج کے علاوہ اپنی ڈائٹ پر بھی توجہ دینی ہوگی تاکہ جیسے ہی صحت بہتر ہو میں یہاں سے کھسک جاؤں..... میں بچپن سے ہی دواؤں کا چور تھا اور زبان کا چٹورا، لیکن حالاتِ کے پیشِ نظر ڈاکٹر کی ہدایات پر عمل کر رہا تھا۔

دو ہفتے بعد ہی میری طبیعت قدرے بہتر ہو گئی تو میں نے تہ دل سے عبدالحئی صاحب کا شکریہ ادا کیا اور رخصت کی اجازت مانگی لیکن فی الوقت وہ اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھے کہ میں اتنی جلدی ان کے گھر سے چلا جاؤں۔ انہوں نے مجھے روکنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن بالآخر میری ضد کے آگے ہار گئے۔ پھر بھی اپنے گھر سے رخصت کرتے وقت انہوں نے ڈھیروں نصیحتیں، ہدایات اور دعائیں دے کر مجھے الوداع کہا۔ ان کے اخلاق و محبت، انکسار اور مہمان نوازی سے میں بہت متاثر اور مرعوب ہوا۔ اس کے بعد میں اسکول کے کاموں میں ایسا منہمک ہوا کہ پتا ہی نہیں چلا کہ وقت کس طرح ہوا کے دوش پر سوار گزرتا چلا گیا۔ کہتے ہیں نا کہ وقت سب سے بڑا استاد ہوتا ہے اور وقت نے.....

WWW.PAKSOCIETY.COM

مجھے اسکول کی سخت محنت بلکہ دوستوں کے ساتھ رہ کر کافی حد تک گھریلو کام کاج کا بھی عادی بنا دیا تھا۔ اب کم از کم چائے اور آملیٹ تو میں بنا ہی لیتا تھا۔ اور بناتا بھی اتنے ذائقے دار کہ سب انگلیاں چاٹتے رہ جاتے۔ اس لیے اب میری ڈیوٹی جھوٹے برتنوں کے سر پر ہاتھ پھیرنے کی نہیں رہی تھی بلکہ اب میں چھوٹا موٹا شیف بن چکا تھا۔ اب اپنے تمام ساتھیوں کے لیے ناشتا بنانے کی ذمّے داری میرے سر تھی اور یہ کام نسبتاً مجھے آسان اور دلچسپ بھی لگا۔

اسی دوران 1947ء میں پاکستان معرضِ وجود میں آگیا اور لوگ جوق در جوق ہجرت کرکے پاکستان آنے لگے۔ میں نے بھی اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان کی راہ لی۔ مستقل رہائش کراچی میں اختیار کی۔ یہاں میں نے فزکس میں ایم ایس سی کیا اور بعد میں بی ایڈ کیا اور یہیں کے ایک مقامی کالج میں بحیثیت لیکچرار میرا تقرر ہوگیا۔ اسی اثنا میں والدہ نے میری شادی اپنی بھتیجی رقیہ سے کردی۔ یہ ایک مکمل ارینجڈ میرج تھی۔ لیکن شادی کو ایک عرصہ گزرنے کے بعد بھی ہم دونوں میاں بیوی اس طرح شیر و شکر ہو کے رہتے ہیں کہ بہت سے لوگوں کو یہی گمان ہوتا کہ ہماری لو میرج ہے اور ماضی میں ہم دونوں ضرور لیلیٰ مجنوں رہے ہوں گے۔ اچھے برے وقت میں نہ رقیہ نے مجھ سے کوئی شکایت کی اور نہ میں نے شوہروں والا رعب دکھایا۔ میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار تھا کہ بیگم عبدالحئی جیسی خاتون سے میرا واسطہ نہیں پڑا۔ عبدالحئی صاحب اور اپنے تمام کولیگ سے ملے ہوئے ایک زمانہ بیت گیا تھا۔ کبھی کبھی وہ سب بہت یاد آتے۔

اللہ تعالیٰ نے مجھے دو بیٹیوں سے نوازا تھا۔ رقیہ اور میں نے نہ صرف اپنی بچیوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی بلکہ ان کی شادیوں میں بھی ان کی مرضی اور رائے کو مقدم رکھا۔ ہم دونوں نے کسی بھی معاملے میں ان پر اپنی مرضی نہیں لادی اور یہ اس لحاظ سے بہتر بھی ہوا کہ ان میں خود اعتمادی اور حالات سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت پیدا ہوئی اسی لیے دونوں نے کبھی اپنی .... سسرال سے آکر کوئی شکایت نہیں کی بلکہ ہر معاملے کو خود ہینڈل کیا۔ ہم دونوں میاں بیوی اپنی بیٹیوں کی طرف سے بالکل بے فکر تھے۔ دونوں .... اپنے اپنے گھروں میں خوش و خرم تھیں۔

میرے بڑے داماد کے والد ایک مخیّر اور سوشل ورکر تھے۔ ہمیشہ کسی نہ کسی کارِ خیر میں لگے رہتے۔ ملک میں ناخواندگی کی شرح میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ اس سوچ کے حوالے سے وہ ہمیشہ پریشان رہتے اور اکثر و بیشتر مجھ سے ذکر کرتے رہتے۔ آخر ہم دونوں نے طے کیا کہ اس مسئلے کو لے کر ہمیں کوئی عملی قدم اٹھانا چاہیے۔ تاکہ ناخواندگی میں کمی ہو کیونکہ بڑے شہروں میں تو تعلیم عام ہو رہی ہے مگر بعض چھوٹے اور دیہی علاقوں میں علم کی روشنی ابھی تک نہیں پہنچ پائی ہے۔

سندھ کے ایک دیہی اور پس ماندہ علاقے میں ہم دونوں نے اسکول کی بنیاد رکھی۔ ہمارا مقصد یہی تھا کہ غریب و نادار لوگوں میں علمی شوق اور شعور اجاگر کیا جائے۔

جب میں اپنے نئے کام کے لیے عازمِ سفر ہوا تو مجھے برسوں پہلے کا وہ سفر یاد آگیا جب میں پہلی بار ملازمت کے لیے گھر سے نکلا تھا۔ ماہ و سال کی گردش نے ہر چیز کو بدل دیا تھا۔ شاداب نگر جاتے ہوئے میں ایک نوعمر اور ناتجربہ کار لڑکا تھا لیکن آج پختہ عمر کا تجربہ کار مرد جو زمانے کے سرد و گرم سے اچھی طرح آشنا ہو چکا تھا۔ سر کے بال کھچڑی ہو چکے تھے۔ جسم فربہی کی طرف مائل تھا مگر سیکھنے سکھانے اور درس و تدریس کا شوق جو میرے دل میں شروع سے موجزن تھا اس میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ میرا یہ سفر اسی شوق کا مرہونِ منت تھا۔

میں جس مقصد کے لیے گھر سے نکلا تھا رقیہ اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھی۔ اسے نہ صرف میری جدائی گوارا تھی بلکہ وہ میری صحت کی طرف سے بھی فکرمند تھی۔ مسلسل وہ مجھ سے یہی کہہ رہی تھی ”ایک ایسا علاقہ جہاں ہم رہنے کے عادی نہیں وہاں آپ کس طرح گزارہ کریں گے۔ گھر جیسا سکون، چین تو نہیں ملے گا۔“

میں نے اس کی بات نہایت سکون سے سنی اور سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”رقیہ اگر ہم اپنے ملک و قوم کے لیے تھوڑی بہت تکالیف برداشت کرکے مستقبل کے معماروں کے لیے کچھ کرسکتے ہیں تو اس میں بھلے ہی کوئی مالی فائدہ نہ ہو مگر جو اجرِ عظیم مجھے رب سے ملے گا اس کا تم اندازہ نہیں کرسکتیں۔“

رقیہ نے سب کچھ سن کر اپنا آخری ہتھیار پھینکا۔ ”وہ تو سب ٹھیک ہے جناب لیکن میں اتنے بڑے گھر میں تنہا کس طرح رہ سکوں گی۔ بیٹیاں اپنے اپنے گھروں کی ہو گئی ہیں۔ کرائے دار لاکھ اچھے سہی، ہیں تو غیر۔ آپ تو بس چھٹیوں میں ہی آئیں گے۔ میں تنِ تنہا کیا دیواروں سے باتیں کروں گی۔“

میں نے ہنس کر جواب دیا۔ ”بالکل نہیں، اس کا حل میں

سوچ چکا ہوں۔ فاطمی اور حماد (میری چھوٹی بیٹی اور داماد) کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ کرائے کے بغیر ہم اپنے گھر کی پیشکش کرتے ہیں۔ ان کے بچے بھی چھوٹے ہیں اور دونوں میاں بیوی ملازمت پیشہ ہیں۔ ان کے بچوں کا مسئلہ حل ہو جائے گا اور تمہاری تنہائی کا۔ انشا اللہ وقفے وقفے سے میں بھی آتا جاتا رہوں گا۔“ تھوڑی سی ردّ و کد کے بعد رقیہ راضی ہوگئی۔ ہم دونوں میاں بیوی نے جب اپنی تمام منصوبہ بندی سے فاطمی اور حماد کو آگاہ کیا تو فاطمی نے بے ساختہ کہا۔

”پاپا آپ جس عظیم مقصد کے لیے کام کر رہے ہیں اس میں اللہ آپ کو کامیابی عطا فرمائے۔ دیہات کی کھلی اور صاف ستھری آب و ہوا میں آپ کی صحت بھی بہتر ہو جائے گی۔ مما کو میں سنبھال لوں گی اور مما میرے بچوں کو سنبھال لیں گی۔ حساب برابر۔“

اس کی بات پر ہم دونوں میاں بیوی ہنس پڑے اور اس طرح یہ مسئلہ سلجھ گیا۔

میرے سمدھی حسن صاحب کے قائم کردہ اسکول کے لیے ایک زمین دار کا گھر کرائے پر لیا گیا۔ میرے اور حسن صاحب کے علاوہ تین نوجوان لڑکے جو کہ ابھی زیرِ تعلیم تھے انہوں نے بھی رضا کارانہ طور پر اسکول میں کام کرنا شروع کردیا۔ حسن صاحب نے فی الحال صرف پرائمری کلاسز سے اسکول شروع کیا تھا۔ ان کا ارادہ تھا کہ کچھ عرصے بعد مزید کلاسز بڑھائی جائیں لیکن سرمائے کی کمی کی وجہ سے بات آگے نہیں بڑھ پا رہی تھی۔ یہاں پر بھی میری اور حسن صاحب کی رہائش کا مسئلہ بنا ہوا تھا۔ کافی گھر تھے جو بہت کم کرائے پر مل سکتے تھے مگر حسن صاحب کے معیار پر کوئی پورا نہیں اتر رہا تھا۔ ایسے میں ان تینوں نوجوانوں میں سے ایک نوجوان جس کا نام احمر تھا اس نے ہم دونوں کو اپنے گھر کی بالائی منزل کی پیش کش کی۔ مجھے اور حسن صاحب کو گھر کی اتنی سخت ضرورت تھی کہ ہم فوراً ہی احمر کے گھر پہنچ گئے۔ احمر کا مکان گاؤں کے دیگر مکانات کی بہ نسبت کافی معقول تھا اور کرایہ بھی مناسب تھا اس لیے ہم دونوں فوراً ہی اپنا بوریا بستر سمیٹ کر نئے مکان میں شفٹ ہوگئے۔ حسن صاحب اور میں اپنا سامان ترتیب دے ہی رہے تھے کہ احمر اپنی والدہ کے ہاتھوں کا بنا گرم گرم ناشتا لے آیا۔ دل خوش ہوگیا۔ ہم دونوں نے اس کی والدہ کو مودبانہ سلام کہلوایا اور شکریہ ادا کیا۔ وقتاً فوقتاً وہ نیک دل خاتون کبھی چائے بھجوا دیتیں کبھی ناشتا اور بعض وقت تو کہلوا دیتیں کہ آج فلاں چیز پک رہی ہے۔ آپ

ڈاکٹر آغا سہیل

ادیب، افسانہ نگار، تنقید نگار اور معلم، وہ لکھنو میں آغا محمد صادق کے ہاں 6 جون 1933ء میں پیدا ہوئے۔ آباؤ اجداد ایران کے شہر اصفہان کے باسی تھے۔ لکھنو یونیورسٹی سے ایم اے اردو کیا۔ 27 دسمبر 1976ء کو پنجاب یونیورسٹی نے انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری دی۔ 1953ء تا 1961ء لاہور کے ایک اسکول میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ 1961ء میں ایف سی کالج لاہور بطور لیکچرار تقرری ہوئی اور اسی کالج سے شعبۂ اردو کے سربراہ کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔ انہوں نے تدریسی خدمات کے ساتھ ساتھ ادبی میدان میں بھی بڑا کام کیا، تقریباً 200 افسانے لکھے۔ تصانیف میں شامل کتاب ہیں: 1۔ بدلتا ہے رنگ آسماں۔ 2۔ کوچۂ جاناں (ناول)۔ 3۔ معارف سہیل (مقالات)۔ 4۔ سرمد سلطانی (تالیف)۔ 5۔ دبستانِ لکھنو کے داستان ادب کا ارتقاء (مقالہ پی ایچ ڈی)۔ 6۔ اردو کا لسانیاتی خاکہ (مقالہ)۔ 7۔ کہانی عہدِ زوال کی (ناول)۔ 8۔ ادب اور عصری حیثیت (تنقید)۔ 9۔ اگن کنڈلی افسانے۔

مرسلہ: فہیم الدین خان، کوٹ ادو

آفتاب احمد

عالمی شہرت یافتہ عکاس، وہ پشاور میں مشہور آرٹسٹ ایم ایم شریف کے ہاں پیدا ہوئے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد محکمہ پولیس میں بھرتی ہوگئے اور ڈی ایس پی کے عہدے پر فائز ہوئے۔ خطاط، مصور، Ceramist مصنف اور گلوکار بھی ہیں۔ خطاطی کو تمام طرزوں میں لکھتے ہیں۔ دھات سرامکس، چپ بورڈ اور چمڑے پر خطاطی کی۔ سرامکس پر تو خود ہی ڈیزائن اور خطاطی کرتے ہیں۔ نمائش خطاطی منعقدہ عجائب گھر لاہور 1981ء میں سرامکس کی ہی نمائش پر اول انعام حاصل کیا۔

مرسلہ: احسن خان، سرگودھا

WWW.PAKSOCIETY.COM

دونوں صاحبان کھانا یہیں کھائیے گا۔

ہم دونوں کی غیر موجودگی میں اپنی گھریلو ملازمہ کو بھیج کر کمرے کی صفائی بھی کروادیتی تھیں۔ میں اور حسن صاحب ان کے تہ دل سے مشکور تھے۔

احمر اور اس کی والدہ جتنے خوش اخلاق اور مہمان نواز تھے اور ہم دونوں کا جتنا خیال رکھتے تھے اس کے برخلاف احمر کے والد اتنے ہی چڑ چڑے اور بدمزاج تھے۔ انہوں نے ہمارا بھی کبھی نوٹس نہیں لیا بلکہ میں نے ہمیشہ ان کی آنکھوں میں بیزاری اور ناپسندیدگی ہی دیکھی۔ بستی والے احمر اور اس کی والدہ کو بہت پسند کرتے تھے جبکہ احمر کے والد سے گھر کے ملازمین تک نالاں تھے۔ وہ سارے گاؤں کے لیے فرعون بے سامان بنے ہوئے تھے۔ گھر میں بھی کسی نہ کسی پر دہاڑتے رہتے۔ زیادہ تر بیوی ہی تختہ مشق بنتی۔ احمر کے والدین کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ عبدالحئی صاحب اور بیگم عبدالحئی یاد آجاتے۔ میں ہمیشہ یہی سوچتا کہ وہاں شوہر انتہائی خلیق، انسان دوست اور سمجھدار انسان تھا۔ جبکہ بیوی انتہائی درجے کی زبان دراز اور تنگ ذہن خاتون تھی ۔ برخلاف اس کے یہاں بیوی بااخلاق، ملنسار اور خوش مزاج ہے تو شوہر بدمزاج اور حاکمانہ ذہن رکھنے والا انسان ہے۔

میں اور احمر اکثر صبح اٹھ کر گاؤں کی سیر کے لیے نکل جاتے تھے اور پھر وہاں سے آکر ناشتا کرتے۔ ایک دن حسبِ معمول ہم دونوں سیر کے لیے نکلے تو اِدھر اُدھر کی باتوں کے دوران میں نے اس سے اس کے والدین کی خیریت دریافت کی۔ احمر نے ایک اداس سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ''سر، آپ میرے بزرگ ہیں۔ اب آپ سے کیا چھپانا۔ میرے والد محترم کی موجودگی میں بھلا گھر میں خیریت ہوسکتی ہے۔''

اس کی بات سن کر میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا۔ ''احمر تمہارے والدین کو دیکھ کر مجھے بھولی بسری باتیں یاد آجاتی ہیں جن کا تعلق ایک ایسے ہی جوڑے سے تھا فرق صرف اتنا تھا کہ وہاں شوہر امن پسند اور مہمان نواز تھا بیوی اس کی ضد تھی۔ یہاں آپ کی والدہ اتنی اچھی خاتون ہیں تو آپ کے والد اُن کے بالکل متضاد۔''

احمر نے میری باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے جاننے والے ہیں وہ لوگ۔ کیا یہیں کراچی میں رہتے ہیں۔''

میں نے مسکرا کر کہا۔ ''نہیں دوست، میں نے تم سے کہا نا کہ کافی پرانی بات ہے۔ پاکستان بننے سے پہلے ہندوستان کے ایک دیہی علاقے سے میں نے اپنی ملازمت کا آغاز کیا تھا۔ وہاں جس اسکول میں، میں بحیثیت ٹیچر کام کرتا تھا وہاں کے ایچ ایم جن کا نام عبدالحئی شیخ تھا وہ نہایت اچھے انسان تھے مگر بیوی اللہ کی پناہ اور تمہارے یہاں تمہارے والدین کا بھی یہی معاملہ ہے مگر اس کے برخلاف آپ کی والدہ اتنی اچھی ہیں تو آپ کے والد الامان الحفیظ۔ جب بھی آپ کے والدین کو دیکھتا ہوں تو مجھے اکثر عبدالحئی صاحب اور بیگم عبدالحئی یاد آجاتے ہیں۔

احمر نے چونک کر مجھ سے پوچھا ''کہیں آپ شاداب نگر والے عبدالحئی صاحب کی تو بات نہیں کررہے ہیں۔''

میں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اس لڑکے کو دیکھا اور تعجب خیز لہجے میں کہا ''تمہیں کیسے معلوم کہ وہ شاداب نگر میں رہتے تھے۔''

احمر نے ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ''سر، میں انہیں نہیں جانوں گا تو اور کون جانے گا۔ دراصل آپ جن عبدالحئی صاحب کا ذکر کررہے ہیں وہ میرے سگے ماموں بھی ہیں اور پھوپا بھی۔ میری والدہ اور عبدالحئی صاحب دونوں سگے بہن بھائی ہیں اور میرے والد اور بیگم عبدالحئی سگے بہن بھائی ہیں۔ ایک زمانے میں ہمارے خاندان میں وٹے سٹے کی شادیوں کا رواج تھا... یہ بات تو یقیناً آپ جانتے ہی ہوں گے کہ خالقِ کائنات بہن بھائیوں کے عادات واطوار، مزاج، صورت شکل رنگ روپ میں مشابہت رکھتا ہے۔ دونوں جوڑوں میں جو مماثلت تھی وہ دراصل ان کے فطری رویے تھے۔ اسی لیے آپ کو میرے والدین کو دیکھ کر میرے ماموں ممانی یاد آجاتے تھے۔ کبھی کبھی انسان کی فطرت ہی اس کی شناخت بن جاتی ہے۔''

احمر کی بات بالکل صحیح تھی، انسان کہیں بھی رہے کتنا بھی وقت گزر جائے اس کی فطرت نہیں بدلتی۔ یہ قانونِ قدرت ہے ویسے اسے آپ اتفاقاتِ زمانہ یا فطرت کی کارسازی بھی کہہ سکتے ہیں۔ بہرحال مالکِ حقیقی ہر چیز پر قادر ہے۔

اس نے اپنی کہانی ختم کرکے میری طرف دیکھا تو میں مسکرا کر رہ گئی۔ کیونکہ ایسا تجربہ میری زندگی میں بھی ہوا ہے جسے پھر کبھی سناؤں گی۔

ہوس

محترم ایڈیٹر
سلامِ شوق!
اس بار جس سرگزشت کے ساتھ حاضر ہوا ہوں یہ خود میں سبق آموز ہے۔ ہوسِ زر میں لوگ اپنی بیٹیوں کو بڑے شوق سے غیرممالک بھیج دیتے ہیں۔ وہاں ان پر کیا گزرتی ہے آپ کے سامنے حاضر ہے۔
محمد سلیم اختر
(راولپنڈی)

میں ڈاکٹر بننے کے جو خواب دیکھتی تھی وہ ادھورے رہ گئے۔ کیونکہ نمبر بہت کم آئے تھے مجبوراً میں نے نرسنگ کورس میں داخلہ لے لیا تاکہ میرا ڈاکٹری کا شوق پورا ہوسکے۔

نرسنگ کی ٹریننگ کا عرصہ مکمل ہوا۔ اس اثنا جو کچھ تجربہ میں نے نرسنگ اسکول میں رہ کر حاصل کیا وہ ایک الگ داستان ہے۔ میں اس کا ذکر تفصیل سے نہیں کروں گی۔ مختصر یوں سمجھ لیں کہ شریف لڑکیوں کو آوارہ بنانے میں سب سے زیادہ ہاتھ چند نام نہاد اسکولوں کا ہے۔ جن میں سے ایک

WWW.PAKSOCIETY.COM

اسکول ہمارا بھی تھا جہاں اس مقدس پیشے کی آڑ میں گھناؤنے کھیل کھیلے جاتے تھا۔ ایسے کھیل کہ شیطان کی روح بھی انہیں دیکھ کر شرما جاتی ہوگی۔ بہر حال آپ یقین کریں کہ میں یہاں سے اسپتال پہنچنے تک پاک دامن رہی۔ اسپتال سے ملنے والی تنخواہ کا زیادہ حصہ میں اپنی ماں کو لاکر دے دیتی۔ وہ رقم میرے گھر کے اخراجات کے لیے ناکافی تھی۔ خدا جانے یہ پیسا کیا چیز ہے کہ ایک اچھے بھلے شریف گھرانے کو بھی بے غیرت بننے پر مجبور کردیتا ہے۔ میرے ماں باپ مجھے اتنے کم پیسے لانے پر کوسنے دیتے ...... وہ چاہتے تھے کہ میں بھی اتنے ہی پیسے کماؤں جتنے میری ساتھی نرسیں کماتی ہیں۔ میری ماں مجھے اکثر اس طرح کے طعنے دیا کرتی۔

"فلاں کی لڑکی نرس لگی تھی۔ دو مہینے میں ہی گھر کا نقشہ بدل کررکھ دیا۔ فلاں نرس کے گھر ایل۔ سی۔ ڈی اور نہ جانے کیا کیا ہے؟"

گھر کا یہ عالم تھا تو اسپتال کا اس سے بھی بُرا۔ میری ساتھی نرسیں اپنی تنخواہ سے زیادہ پیسے تو اپنے میک اپ پر خرچ کردیا کرتی تھیں۔ نئے نئے ڈیزائنوں کے کپڑے نئے نئے فیشن اور ٹیکسی میں آنا جانا۔ مجھے بخوبی علم تھا کہ اتنے پیسے کہاں سے آتے ہیں۔ لیکن میں نے کبھی اس بات سے غرض نہ رکھی۔ مجھے تو صرف اپنے آپ سے اور اپنے کام سے غرض تھی۔ میں دن رات اسی کوشش میں رہی کہ کسی نہ کسی طرح بی۔ ایس۔ سی کرکے کوئی اور اچھی نوکری ڈھونڈ لوں۔ میری ساتھی نرسیں مجھے چڑایا کرتی تھیں۔ انہوں نے میرے عجیب عجیب نام رکھ چھوڑے تھے۔ وہ میرے اصل نام خوش بخت کی بجائے مجھے بد بخت کہتیں۔ وہ مجھے "پینڈو" بھی کہا کرتی تھیں۔ مگر مجھے ان باتوں کی پروا نہ تھی۔ میں اپنی ڈیوٹی نہایت ایمانداری کے ساتھ سرانجام دیتی اور گھر لوٹ آتی۔

پھر میری زندگی کے افق پر بدنصیبی کا ایک ایسا دن طلوع ہوا جس نے میری زندگی کا رخ ہی موڑ دیا۔ اس روز اردو کے اخبار میں غیر ملک کے لیے نرسوں کی بھرتی کا اشتہار شائع ہوا جو ایک ریکروٹینگ ایجنسی کی طرف سے تھا۔ میرے باپ کی نظر اخبار کے اس اشتہار پر پڑگئی اور وہ اخبار گھر لے آئے۔ میں نے بھی وہ اشتہار پڑھا۔ کسی پرائیویٹ اسپتال کے لیے چند نرسوں کی ضرورت تھی۔ اشتہار میں بڑی شاندار تنخواہ اور دیگر سہولیات کا لالچ دیا گیا تھا۔ میں نے اس میں کوئی دلچسپی نہ لی اور اسے نظر انداز کردیا۔ لیکن میرے ماں باپ نے ضد کرنا شروع کردی کہ میں یہاں درخواست دے دوں۔ میں نے لاکھ سر پیٹا کہ میں جلد ہی بی۔ ایس۔ سی کرلوں گی اس کے بعد مجھے اچھی نوکری مل جائے گی۔ لیکن وہ تو ایک ہی رٹ لگائے ہوئے تھے کہ میں باہر جاؤں اور ان کے لیے قیمتی چیزیں لاؤں اور تحفے بھیجوں۔

میں نے بالآخر ان کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ ایجنسی والوں نے نرسیں نوجوان اور صحت مند مانگی تھیں اور ہر درخواست کے ساتھ درخواست دہندہ کی تازہ تصویر بھی ضروری تھی۔ مجھے اس وقت ان باتوں کی زیادہ سمجھ نہیں تھی۔ میرے ساتھ میرے اسپتال کی کئی نرسوں نے بھی درخواستیں دی تھیں۔ وہ سب تو انتظار کرتی رہیں مگر مجھے انٹرویو کی کال آگئی۔ انٹرویو والے دن میری ماں نے مجھے خاص طور پر اپنی نگرانی میں نہ صرف تیار کرایا بلکہ میک اپ کرنے کا حکم بھی دیا۔ میں جب بن سنور کر شیشے کے سامنے کھڑی ہوئی تو زندگی میں پہلی مرتبہ ...... مجھے اپنی خوبصورتی کا احساس ہوا۔ میری ماں مجھ سے زیادہ بنی سنوری میرے ساتھ ہی گئی تھی۔ جب ہم اس دفتر میں پہنچے تو میری ماں کی آنکھیں... پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ایسا دکھائی دے رہا تھا جیسے ہم کسی یورپی ملک میں آگئے ہوں۔ انٹرویو کے لیے صرف تین لڑکیوں کو بلایا گیا تھا۔ میرے علاوہ جو دو تھیں وہ اکیلی ہی آئی تھیں اور معمولی شکل و صورت کی مالک تھیں۔ ایک خوبصورت اور نازک اندام سیکریٹری نے ہماری رہنمائی ایک ائر کنڈیشنڈ کمرے کی طرف کی جہاں ایک میز پر تین مختلف رنگوں کے ٹیلی فون رکھے تھے اور کمرے کی سجاوٹ پر لاکھوں روپیا خرچ کیا گیا تھا۔ ہم دونوں ماں بیٹی وہاں بیٹھ گئے۔ کمرے میں کرسی خالی پڑی تھی کوئی کمرے میں موجود نہ تھا...... تھوڑی ہی دیر میں ہمارے پیچھے والا دروازہ کھلا اور ایک انتہائی قیمتی سوٹ میں ملبوس اسمارٹ سا نوجوان اندر داخل ہوا۔ اس کی شخصیت کچھ اتنی پُر فریب تھی کہ میں اور میری ماں دونوں اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔

"بیٹھیے بیٹھیے ...... تشریف رکھیے!" اس نے اپنے ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔

"آپ کی تعریف!" نظروں ہی نظروں میں میری کیفیت کا اندازہ لگاتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"جی، یہ میری بیٹی روزی ہے۔" میری ماں نے بڑی انکساری سے کہا۔

"کیا فرمایا ...... آپ کی بیٹی ...... معاف کیجیے میں تو آپ کو ان کی بڑی بہن سمجھ رہا تھا۔" اس نے عورت کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا اور ایک ہی فقرے میں میری ماں کو رام کرلیا۔

اسی اثنا میں ایک باوردی ملازم ہمارے لیے چائے لےکر آگیا۔ زندگی میں اتنے شاندار اور قیمتی برتنوں میں شاید ہم نے پہلی مرتبہ چائے پی تھی۔ میری ماں تو کیا، میں بھی آہستہ آہستہ اس کے طلسم میں پھنستی اور اس سے مرعوب ہوتی جارہی تھی...... چائے پینے کے دوران کم از کم پانچ چھ مرتبہ مختلف فونز کی گھنٹیاں بجیں اور ہر مرتبہ وہ نوجوان یہی کہتا تھا کہ ابھی ان کے پاس جگہ نہیں ہے۔

"نجانے کیسے بے وقوف لوگ ہیں، اب ہم نے کیا ٹھیکا لے رکھا ہے ہر ایک کو باہر لے جانے کا۔" اس نے آخری فون سن کر میری ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اور میری ماں نے اس کے جواب میں فوراً سر ہلادیا۔

"معاف کیجیے گا، آپ یہاں تشریف رکھیں۔ میں مس روزی کو انٹرویو کے لیے لے جاؤں گا۔" اس نے میری ماں سے بڑے مؤدب لہجے میں اجازت طلب کی۔

"کیوں نہیں، کیوں نہیں۔" میری ماں کی تو مراد بر آئی تھی۔ میں اس کے اشارے پر سحر زدہ سی اٹھ کر چلی دی۔

دوسرا کمرا بھی اس سے ملتا جلتا تھا اور انٹرویو لینے والا بھی وہی تھا۔ ایک لمحے کے لیے بھی میرے دل میں خیال نہ آیا کہ آخر اس نے میری ماں سے علیحدہ ہونا کیوں ضروری سمجھا تھا۔

"معاف کیجیے گا کیا آپ کی امی بھی باہر جائیں گی......؟" اس نے مجھے ایک آرام دہ صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے ایک قیمتی سگریٹ سلگا کر پوچھا۔

"جی نہیں۔" میں نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

"برا نہ مانیے میں نے اس لیے پوچھا تھا کہ وہ آپ کے ساتھ جو آئی ہیں۔" وہ مسکراتا ہوا میرے سامنے ہی ایک شاندار صوفے پر بیٹھ گیا۔

"جی نہیں، میں معافی چاہتی ہوں۔" میں نے نجانے کیوں یہ فقیرہ کہہ کر اس کی غلط فہمی میں مزید اضافہ کردیا۔

انٹرویو کے دوران سوائے اس نے مجھ سے "فری" ہونے کی کوشش کے اور کچھ نہ کیا۔ ایک بھی سوال اس نے نرسنگ کے بارے میں نہ پوچھا۔ پھر بھی میں سمجھ نہ سکی۔ واہ رے دولت، واہ رے ڈالر، واہ رے ریال، واہ رے پاؤنڈ۔

آدھے گھنٹے تک ہم دونوں گفتگو کرتے رہے۔ پھر وہ میرے ساتھ ہی اسی کمرے میں لوٹ آیا جہاں میری ماں بھی بے چینی سے نتیجے کی منتظر تھی۔

"آپ بے فکر رہیں آنٹی، مجھے آپ لوگوں سے انس سا ہوگیا ہے۔ آپ کے قریب ہی میرے ایک رشتے دار بھی رہتے ہیں۔ میں اس طرف سے گزرتا رہتا ہوں۔ جلد ہی ہم آپ کو نتیجے سے مطلع کردیں گے۔"

"بیٹے! ہمارے ہاں بھی ضرور آنا۔" بالآخر میری ماں اس کے جال میں مکمل طور پر پھنس گئی۔

اور پانچویں چھٹے روز ہی ان کا "بیٹا" ہمارے گھر آگیا۔

میں اس وقت گھر پر نہیں تھی۔ ڈیوٹی پر تھی۔ اس نے میری ماں سے کہا کہ وہ اس کمپنی کا منیجر ہے انٹرویو کا نتیجہ دیگر عہدے داروں کو بتادیا گیا ہے پھر بھی کچھ لوگ مان نہیں رہے ہیں۔ لیکن وہ روزی کو ضرور باہر بھیجے گا۔

اس نے چکنی چپڑی باتوں سے میرے گھر والوں پر جادو کردیا تھا اور ایسا کیوں نہ ہوتا۔ ہوس نے ان کی آنکھوں پر پٹی جو باندھ دی تھی۔ میری ماں بضد تھی کہ وہ اپنی مصروفیت کے باوجود روزی سے مل کر جائے۔ میری چھوٹی بہن نے مجھے اسپتال فون کرکے فوراً گھر آنے کو کہا۔

جب میں گھر پہنچی تو میرے والدین اس کے آگے بچھے جارہے تھے اور میری چھوٹی بہن اس کے لیے تیسری مرتبہ چائے بنا کر لارہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی میری والدہ کھل اٹھیں۔

"لو بھئی...... اب تم لوگ بیٹھو۔ مجھے تو گھر کا کام بھی کرنا ہے۔" میری ماں بہانہ بنا کر اٹھ گئی...... اب میں اور وہ اکیلے ہی کمرے میں موجود تھے۔ میری ماں مجھے برباد کرنے پر تل گئی تھی۔

"میرا نام رمیز ہے مس روزی! اور مجھے حیرانی ہے کہ آپ نے ابھی تک مجھ سے میرا نام کیوں نہیں پوچھا۔ آپ شاید یہ سوچ رہی ہیں کہ میں کوئی عام سا نوجوان ہوں اور آپ پر ڈورے ڈال رہا ہوں حالانکہ ایسی بات نہیں۔ شاید آپ کو اس بات کا علم نہ ہو کہ میرا تعلق جس فرم سے ہے وہاں مجھے روزانہ دنیا بھر کی خوبصورت لڑکیوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ مجھے کسی بھی چیز کی کمی نہیں ہے۔ مس روزی! اگر میرا کوئی ایسا ہی غلط ارادہ ہو تو آپ ہی سوچیے کہ میرے لیے رکاوٹ کیا ہے۔ شاید آپ کو میرے خلوص پر اب بھی یقین نہ آئے۔ لیکن میں آپ کو بتادینا چاہتا ہوں کہ آپ کی سادگی نے مجھے متاثر کیا ہے۔" اس نے بغیر کوئی تمہید باندھے ایک اچھا خاصا لیکچر دے ڈالا اور نہ جانے وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جب میں نے اس کے خلوص اور باتوں پر یقین کرلیا۔ بڑا ظالم صیاد تھا۔ ایسا داؤ پھینکا کہ میں تو کیا کوئی بھی لڑکی ہوتی اس موقع پر ضرور

WWW.PAKSOCIETY.COM

ڈگمگا جاتی۔ اس کی اس بات میں مجھے خاصی معقولیت نظر آئی کہ آخر اس کو کمی کس بات کی ہے۔ اگر اس نے کوئی غلط مقصد ہی حاصل کرنا ہے تو اس شہر کی درجنوں خوبصورت لڑکیاں اس سے دوستی کے لیے بے قرار رہتی ہوں گی۔ میں نے اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھنا شروع کردیا کہ اتنا بڑا آدمی مجھ پر مرمٹا ہے۔

تقریباً ایک گھنٹے تک ہم تنہائی میں گفتگو کرتے رہے اور جب وہ واپس جانے لگا تو میں واقعی اس کی گرویدہ ہو چکی تھی۔

جاتے جاتے اس نے اگلے روز باہر ملنے کا وعدہ لے لیا۔

اگلے روز میں ایک شاندار کار میں بیٹھ کر شہر کے سب سے مہنگے ہوٹل میں اس کے ساتھ کھانا کھا رہی تھی۔ مجھے اپنی قسمت پر رشک آنے لگا۔ کسی ایسے ہوٹل میں جانے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ یہاں آکر احساس ہوا کہ زندگی کتنی رنگین ہے۔ شاید اس ہوٹل کے بیرے رمیز کو پہلے سے جانتے تھے کیونکہ جہاں جہاں سے وہ گزرتا وہ باادب کھڑے ہو کر اسے سلام کرتے تھے۔ میں نے جلد ہی اس بات کا اندازہ لگا لیا کہ رمیز کوئی بہت غیر معمولی شخصیت کا حامل ہے اور میرے تصورات سے بھی بڑا آدمی ہے...... اس رات اس شاندار ہوٹل کے ایک کونے میں بیٹھے ہوئے ہم دونوں نے ہمیشہ کے لیے ایک ساتھ جینے مرنے کا عہد کیا...... اس نے مجھ سے نوکری چھوڑ دینے کا کہا...... اور میں نے اگلے روز نوکری سے استعفیٰ دے دیا۔

ملاقات کے بعد تیسرے روز ہی فرم کی طرف سے چالیس ہزار روپے کا ڈرافٹ اور ایک خط ملا جس میں لکھا تھا۔ کہ مجھے منتخب کرلیا گیا ہے اور اب مجھے ایک ماہ کراچی میں "خصوصی ٹریننگ" دینے کے بعد باہر بھیجا جائے گا۔ ٹریننگ کے اخراجات کمپنی برداشت کرے گی۔

میرے ماں باپ کے تو پاؤں ہی زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ وہ تو رمیز کو دعا دیتے نہ تھکتے۔

☆☆☆

تین دن کے بعد میں رمیز کے ہمراہ کراچی جا رہی تھی۔ ہوائی جہاز کا سفر...... شاندار لباس، پرس میں ڈھیر سارے نوٹ اور ایک خوبصورت دولت مند نوجوان کا ساتھ...... میرا دماغ جہاز کے ساتھ ساتھ عرش پر پرواز کر رہا تھا۔ سفر کے دوران رمیز نے بتایا کہ اس کا تبادلہ بھی باہر ہو رہا ہے جہاں ہم دونوں اکٹھے ہی جائیں گے۔ میں دل ہی دل میں مستقبل کے منصوبے بنانے لگی۔

"روزی ہم مڈل ایسٹ پہنچتے ہی شادی کرلیں گے۔" اس نے جہاز کے لینڈ کرتے وقت مجھے یہ خوشخبری سنائی۔

کراچی میں ہمارا قیام ایک بنگلے میں ہوا۔ جو شاید اس فرم نے اسی مقصد کے لیے حاصل کر رکھا تھا۔ دو تین دن تو اس نے صرف میرا اعتماد ہی حاصل کیا۔ اس اثنا میں اس نے مجھے یقین دلا دیا کہ...وہ فرشتہ ہے۔ کم از کم میں تو اسے ایسا ہی سمجھنے لگی تھی۔

چوتھے روز ایک شدید جذباتی کیفیت سے گزرنے کے بعد ہم نے بے حیائی کے تمام مراحل طے کرلیے۔ مجھے اپنے لٹنے کا اس وقت کوئی احساس نہ ہوا۔ کیونکہ رمیز نے مجھے یقین دلاتے ہوئے کہا۔ "ہم جلد ہی میاں بیوی کے رشتے میں بندھ جائیں گے۔" اور میں مطمئن ہوگئی۔

شیطانیت کا یہ کھیل پھر ہمارا معمول بن گیا۔ میں خوشی خوشی خود کو لٹاتی رہی۔ ایک ماہ پلک جھپکتے گزر گیا۔ سارا سارا دن کراچی کی سیر، سمندر کنارے عیاشیاں اور امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ سے کسی رانی کی طرح زندگی گزارتا...... ٹریننگ کب اور کہاں شروع ہوگی اس کا علم نہ تھا۔ جب بھی میں شادی کے لیے کہتی تو وہ دلاسا دیتا۔

"تم خواہ مخواہ گھبرا رہی ہو۔ بس کہہ جو دیا کہ تین ماہ کے اندر ہم باقاعدہ شادی کرلیں گے۔ میں تو تمہیں دلہن بنا کر اپنے ماں باپ کی اجازت سے لے کر جاؤں گا۔" اور میں مطمئن ہو جاتی۔ وقت گزرتا رہا ایک ماہ کے بعد میرا ویزا آگیا۔ ہوائی اڈے پر رخصت کرنے کے لیے رمیز بھی موجود تھا۔ میری دونوں ساتھی لڑکیاں میرے لیے اجنبی تھیں۔ ان کو غالباً کسی دوسرے شہر سے لایا گیا تھا۔ میرا اور ان کا تعارف بھی ہوائی جہاز پر ہی ہوا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ وہ دونوں مجھ سے کیا ایک دوسرے سے بھی کھچی کھچی تھیں۔ جیسے ان کو کسی نے خاص طور پر اپنے متعلق کچھ نہ بتانے کی ہدایت کی ہو۔ رمیز نے جاتے ہوئے مجھ سے کہا تھا کہ وہ بھی جلد ہی وہاں پہنچ جائے گا۔ اس اثنا میں اسے اپنے ماں باپ سے بھی شادی کی اجازت مل جائے گی۔ میں مطمئن ہو کر ایک شاندار مستقبل کی امید لیے مڈل ایسٹ جا رہی تھی۔

ہوائی اڈے پر ہمیں لینے کے لیے کسی اسپتال کی نہیں ایک عام سی مگر شاندار گاڑی آئی تھا۔

اس گاڑی کا ڈرائیور پاکستانی تھا۔ جس کی شکل ہی سے

...رات پہنچی تھی۔ اس نے ہمیں اس طرح للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا جیسے وہ ہمیں کھا ہی جائے گا۔ ہم تینوں کو ایک خوبصورت اور جدید طرز کی بنی ہوئی ایک کوٹھی میں پہنچا دیا گیا۔ میں تو اسے محل ہی کہوں گی۔ اس محل میں پہلے سے ہی بے شمار کمرے سجائے گئے تھے۔ کوٹھی کے اندر ہمارا استقبال ایک غیر ملکی خاتون نے مسکراتے ہوئے کیا۔ عمارت کے باہر نصب بورڈ پر "بورڈنگ ہاؤس" تحریر تھا۔ ایک بات میں نے خاص طور سے نوٹ کی کہ ہوائی اڈے سے یہاں پہنچنے تک ہمیں جتنے لوگوں سے بھی پالا پڑا انہوں نے ہمیں بالکل بیوپاریوں جیسی نظروں سے دیکھا تھا۔ ہوسٹل میں ہمیں سب سے اوپر والی منزل پر الگ الگ کمرے الاٹ کیے گئے۔ ایک بوڑھی ہماری انچارج تھی۔

وہ رات میں نے ڈرتے ڈرتے گزاری۔ یہاں دوسرے ممالک کی بھی دس بارہ لڑکیاں مقیم تھیں۔ لیکن میں نے وہاں کسی کو بھی ضرورت کے بغیر ایک دوسرے سے بات کرتے نہ پایا۔ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے انہیں سختی سے ایک دوسرے سے بولنے کی ممانعت ہو۔ کھانا کمرے میں پہنچایا گیا تھا۔ صبح ایک ویگن میں جس پر ریڈ کراس کا نشان بنا ہوا تھا مجھے ایک پرائیویٹ اسپتال میں بھیج دیا گیا۔ میں اسے اسپتال تو نہیں کہوں گی...... ایک ڈاکٹر کی دکان ہی کہہ لیں۔ جس میں شاید دو تین مریضوں کے داخلے کی گنجائش رکھی گئی تھی۔ یہاں اس پاکستانی مرد نے جو مجھے ہوائی اڈے پر لینے آیا تھا بتایا کہ مجھے چھ گھنٹے روزانہ کام کرنا پڑے گا اور شام کے وقت گاڑی واپس ہوسٹل چھوڑ آیا کرے گی۔ اس کی بے باک نظروں سے پہلے تو میں بری طرح خوفزدہ تھی۔ پھر تمام ڈر اور خوف دل سے نکل گیا۔ ظاہر ہے کمپنی ہی ہماری رہائش کی ذمے دار تھی۔ اس لیے انہوں نے اس کا بندوبست بھی کردیا تھا اور کام بھی بتا دیا تھا...... میں نے گھر فون کرکے گھر والوں کو اپنی خیریت سے آگاہ کردیا۔

شام کو ویگن مجھے واپس ہوسٹل لے آئی۔ پانچ چھ روز اسی طرح گزر گئے۔ ایک روز میں نے انچارج سے رمیز کے متعلق پوچھا تو اس نے فحش لہجے میں میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "آجائے گا، اتنی بے چینی بھی کیا......؟"

میرا جی چاہا کہ اس کا منہ نوچ لوں لیکن یہاں آنے سے پہلے رمیز نے مجھے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ وہاں کا ماحول بڑا آزاد ہے گھبرانا نہیں۔ بلکہ خود بھی اس رنگ میں رنگنے کی کوشش کرنا...... کاش میں نے اس کی کسی بات کو تو سمجھ لیا ہوتا۔

اس روز چھٹی تھی۔ صبح صبح ہی لڑکیوں نے خود کو بنانا سنوارنا شروع کردیا تھا۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اس نرسنگ ہوسٹل میں کاریں آنا شروع ہوگئی تھیں۔ کار دروازے پر رکتی اور کوئی ایک بنی سنوری لڑکی کار میں بیٹھ کر چلی جاتی۔

"یا اللہ! میں کس عذاب میں پھنس گئی ہوں۔" میں نے سوچا...... پھر خیال آیا کہ یہ سب کچھ کہاں نہیں ہوتا۔ ہر انسان کا اپنا کردار ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں بھی تو میری ساتھی نرسیں یہی کچھ کیا کرتی تھیں۔ لیکن سب کی سب نہیں صرف چند نرسیں۔ اگر میں وہاں محفوظ رہی ہوں تو یہاں بھی رہوں گی بہرحال اپنے کردار کو ٹھیک رکھنا اپنے بس میں ہوتا ہے۔ کوئی لٹھ لے کر تو میرے پیچھے نہیں گھوم رہا۔ پھر مجھے اس بات کا یقین بھی تھا کہ جلد ہی رمیز آجائے گا اور ہم شادی کرلیں گے۔

رمیز واقعی اس روز رات کی فلائٹ سے آگیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ میرے بغیر اس نے بڑی مشکل سے یہ ہفتہ گزارا ہے۔ میں نے اپنے پیٹ میں پلنے والے گناہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جب اس سے والدین کے فیصلے کے متعلق پوچھا تو اس نے ہنس کر بات ہی ٹال دی۔

"آؤ کہیں سیر کرنے چلتے ہیں۔"

بات آئی گئی ہوگئی۔ ہم دونوں ایک شاندار کار میں بیٹھ کر رمیز کے ایک دوست کے گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔ سارے راستے وہ مجھے بتاتا رہا کہ جو لڑکیاں یہاں "آزاد" ہو جاتی ہیں وہ بہت شاندار زندگی گزارتی ہیں۔ اس کے لہجے میں وہی ترغیب دلانے کا انداز تھا جو دلالوں کی گفتگو میں ہوتا ہے...... آج سوچتی ہوں تو اپنی سادگی پر خود ہی مر جانے کو جی چاہتا ہے۔ میں نے اس وقت بھی اس کی نیت پر شک نہ کیا۔

رمیز کا دوست پاکستانی سرمایہ دار تھا جس کی عمر کم از کم میرے والد کے برابر تھی۔ اس شخص کا شمار یہاں کے متمول لوگوں ہوتا تھا اور اسے اس ملک کی شہریت بھی حاصل تھی۔ مقامی لوگوں سے اس کی گاڑھی چھنتی تھی۔ ان ساری باتوں کا علم مجھے راستے میں ہی ہوگیا تھا۔ رمیز نے مجھے یہ سب کچھ کسی اور نقطۂ نظر سے بتایا تھا۔ لیکن میری بے وقوفی کا اندازہ فرمائیے کہ میں دل ہی دل میں اس بات سے مرعوب ہو رہی تھی کہ میرے محبوب کے تعلقات کتنے بڑے لوگوں سے ہیں...... اس شخص نے بڑی فراخدلی سے ہمارا استقبال کیا اور مجھ سے زبردستی مصافحہ بھی کرلیا۔ رمیز نے مجھے پہلے ہی کہہ رکھا تھا کہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

مجھے یہاں آکر مغربی طور طریقے اپنانے ہوں گے اور ایسی باتوں کا برا نہیں ماننا ہوگا۔ ہم ایک شاندار کمرے میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ یہاں ان دونوں نے شراب بھی پی تھی اور رمیز کے بہ ضد ہونے پر میں نے ہی ان کو شراب بنا کر پیش کی۔ مجھے شراب بنانے اور پیش کرنے کا طریقہ اس نے کراچی میں ہی سمجھا دیا تھا اور اس بات کی بھی قسم کھائی تھی کہ آج کے بعد وہ شراب کو ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔ مگر اب پی رہا تھا۔

"ضروری نہیں کہ جو چیز ہمارے یہاں معیوب ہو وہ دنیا بھر میں بری سمجھی جائے...... تمہارے ممی ڈیڈی تو اتنے ایڈوانس ہیں۔ انہوں نے کم از کم یہ تو بتا دیا ہوتا۔" اس نے غصے سے کہا تھا۔

آخر وہ میرا محبوب تھا۔ میں نے اس کی ناراضی مول لینا مناسب نہ سمجھا۔ شراب پینے کے دوران وہ شخص اپنی ہوسناک نظروں سے میرا جائزہ لیتا رہا...... رمیز نے مجھے خاص طور پر وہ لباس پہننے کو دیا تھا جو وہ خود میرے لیے لایا تھا۔ نجانے لباس پہن کر بھی میں کیوں خود کو برہنہ محسوس کر رہی تھی...... پھر رمیز ٹوائلٹ کے بہانے باہر چلا گیا۔

رمیز کے باہر جاتے ہی اس شخص نے مجھ پر دست درازی شروع کر دی۔ میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی۔ میں نے پہلے تو یہی سمجھا کہ وہ شراب کے نشے میں بہک گیا ہے۔ اس لیے اس کو خود سے دور رکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ جب وہ قابو نہ آیا تو میں اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی جہاں برآمدے میں رمیز کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ میں نے لپک کر اس کا بازو تھام لیا۔

"اوہ روزی! تمہیں نجانے کب سمجھ آئے گی۔ آخر پینڈو ہی نکلی نا......!" اتنا کہہ کر وہ مجھے بازو سے پکڑ کر تقریباً گھسیٹتا ہوا ایک کمرے میں لے آیا۔ یہ کمرا کیا تھا، چھوٹا سا سینما ہال دکھائی دے رہا تھا۔

"یہاں بیٹھو۔" اس نے مجھے ایک کونے میں رکھی ہوئی آرام دہ کرسی پر دھکیلتے ہوئے کہا۔

میں حیران و ششدر وہاں بیٹھ گئی۔ میرا ذہن ماؤف ہو چکا تھا، کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر وہ کیا کرنے والا ہے اور کیا چاہتا ہے۔ کمرے میں موجود ایک بڑے سے پروجیکٹر کا بٹن دبا کر وہ میرے قریب ہی بیٹھ گیا۔ ایک بڑی سی اسکرین پر فلم چلنی شروع ہو گئی تھی۔

چند لمحوں تک تو میری سمجھ میں ہی نہ آیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اس کے بعد جب رفتہ رفتہ گرد و پیش کا احساس ہوا تو مجھے جھٹکا سا لگا جیسے بدن بجلی کی ننگی تار سے چھو گیا ہو۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسکرین کو گھورنے لگی جہاں کراچی کے اس ہوٹل کے ایک کمرے کا منظر نظر آ رہا تھا جہاں میں نے رمیز کے ساتھ تنہائی میں کئی راتیں گزاری تھیں۔ کمرے کے کسی خفیہ گوشے میں چھپے کیمرے نے میرے سارے گناہ سلولائیڈ پر منتقل کر لیے تھے۔ جوں جوں فلم چلتی جا رہی تھی میری حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ جلد ہی محسوس ہونے لگا جیسے میں پاگل ہو جاؤں گی۔ کمرے کی ساری چیزیں گھومتی نظر آ رہی تھیں۔ میں زور سے چلا اٹھی۔ "بند کرو...... خدا کے لیے اسے بند کرو۔"

"چلاتی کیوں ہو......؟" اس نے پروجیکٹر بند کر دیا۔

"کمینے کتے...... ذلیل...... دھوکے باز......" نہ جانے دنیا جہان کے کون کون سے القاب سے میں نے اسے نوازا...... لیکن وہ بے غیرتوں کی طرح مسکراتا رہا۔ میں سسکیاں لیتی ہوئی اس کے قدموں سے لپٹ گئی اور گڑگڑاتے ہوئے التجا کی، میری کوکھ میں تمہاری نشانی ہے...... مجھ پر رحم کرو۔ مجھ سے شادی کر لو۔ مجھے پاکستان بھیج دو یا میرا اگلا دبا دو۔"

"اگر میرے کہنے پر عمل کرتی رہیں تو زندگی بھر عیش کرو گی۔ تمہاری ملازمت برقرار رہے گی اور ہر ماہ تمہارے والدین کو چالیس ہزار روپیا پہنچتا رہے گا۔ سال میں ایک بار چھٹی بھی اور زمانے بھر کی سہولتیں بھی لیکن صرف آمادگی کی صورت میں...... ورنہ! تمہارا پاسپورٹ ہمارے پاس ہے۔ یہاں کوئی تمہاری فریاد پر کان نہیں دھرے گا۔ الٹا تمہیں گرفتار کر لیا جائے گا اور جو حشر تمہارا ہوگا وہ تو ہوگا ہی...... لیکن تمہاری بہن اور تمہارے ماں باپ بے گناہ ہی مارے جائیں گے، وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ کیونکہ یہ فلم انٹرنیٹ پر چلا دی گئی تو تمام دنیا دیکھے گی۔"

میں اس کے خوفناک لہجے سے سہم گئی۔ میں بظاہر آزاد لیکن اندر سے مکمل قیدی بن چکی تھی۔

اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر باہر کی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ "سیدھی طرح سے ہمارے بتائے ہوئے راستے پر چلتی رہو۔"

مجھے تن بدن کا ہوش نہیں تھا۔ میں سحر زدہ سی اس کے پیچھے پیچھے کھنچی چلی جا رہی تھی...... اور وہ بول رہا تھا۔

"رہا بچے کا مسئلہ تو تم خود نرس ہو۔ اس کا علاج بخوبی جانتی ہو۔ اگر چاہو تو میں اس سلسلے میں تمہاری ہر طرح کی مدد کر سکتا ہوں۔" اس نے مجھے اسی کمرے میں جس سے میں نکل کر بھاگی تھی دھکیل دیا۔

کمرے میں وہ شیطان پہلے سے ہی میرا منتظر تھا۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ رمیز مجھے واپس اس کے پاس لے آئے گا...... ساری رات وہ میری بوٹیاں نوچتا رہا۔ میں روتی رہی...... سسکتی رہی اور لٹتی رہی...... پھر وہ مرحلہ بھی آ گیا جب آنسوؤں کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں، کوئی رونا بھی چاہے تو رو نہیں پاتا۔

اگلی صبح رمیز مجھے خود ہی ہاسٹل چھوڑ گیا۔ یہاں منتظم منتظر تھی۔ اس نے ایک مسکراہٹ کے ساتھ میرا استقبال کیا۔

"آرام کر لو۔ تھک گئی ہو گی۔ اب تمہیں ایک ہفتے کی چھٹی ہے۔ سیر کرنے کو دل چاہے تو مجھے بتا دینا۔" اس نے میری دلجوئی کرتے ہوئے کہا۔

"تین چار روز کے بعد میں نے اپنی زندگی کا بدترین گناہ بھی کر لیا اور اپنے گناہ کی نشانی کا اپنے ہی ہاتھوں گلا گھونٹ دیا۔

اس خطرناک گروہ کے شکنجے میں پھنس کر بغاوت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دو تین مہینے میں ہی مجھے ایسی ایسی باتوں کا علم ہوا کہ خوف کے مارے جان...... نکل جاتی تھی۔ انہیں جس لڑکی پر بھی شک گزرتا اس کی کسی نہ کسی بہانے دنیا سے چھٹی ہو جاتی تھی اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہو پاتی۔ بڑے بڑے افسران عیاشی کے لیے ان کے محتاج تھے۔

زندگی بڑی ظالم ہے۔ آپ کتنا ہی فرار حاصل کرنا چاہیں وہ آپ کو حالات سے سمجھوتا کرنے پر مجبور کر کے رہتی ہے۔ میری حیثیت ہی کیا تھی ایک ناتواں، بے کس، لاچار لڑکی...... میں ان کا کیا بگاڑ سکتی تھی۔ میں تو بزدل تھی۔ مرنے سے بھی ڈرتی رہی۔ میں نے بھی دوسری لڑکیوں کی طرح ہتھیار پھینک دیے۔ میرے ساتھ آنے والی دوسری لڑکیوں کی کہانیاں بھی بالکل میرے ہی جیسی تھیں۔ صرف کردار بدل گئے تھے۔

☆☆☆

میری زندگی کا اب صرف ایک ہی مقصد تھا اور وہ تھا رمیز سے انتقام لینا...... کیونکہ وہ میری بربادی کا ذمے دار تھا۔ مجھے اس کے لیے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا...... ایک شخص جس کی عمر کم از کم ساٹھ سال تھی اور اپنے ملک میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ کون جانے میری کون سی ادا اسے پسند آ گئی جو وہ مجھے اپنے ساتھ ہی لے گیا۔ میں اس کے بنگلے میں رہنے لگی۔

میں نے اس کا مکمل اعتماد آہستہ آہستہ حاصل کر لیا تھا۔ اس کا اپنا ایک حفاظتی دستہ تھا جو ہر وقت اس کے محل نما بنگلے میں موجود رہتا تھا۔ وہ مجھے بھی اہمیت دیتے تھے۔ مالک نے مجھ پر آہستہ آہستہ پابندیاں نرم کر دی تھیں۔ میں مہینے میں ایک آدھ بار ہوسٹل جاتی اور اپنی بدنصیب ساتھیوں سے مل آتی...... ان سے تو بہر حال میں زیادہ خوش قسمت تھی۔

ایک روز بازار میں میری ملاقات رمیز سے ہو گئی۔ اس نے دامن بچا کر نکلنا چاہا۔ لیکن میں نے آواز دے کر اسے پاس بلا لیا۔ میری گفتگو کا انداز بالکل بازاری ہو چکا تھا۔ میں نے اس کو یقین دلایا کہ میں اس سے بالکل ناراض نہیں بلکہ تجدید محبت کرنا چاہتی ہوں۔" میری چکنی چپڑی باتوں کے سامنے اس شیطان کی ساری مکاری دھری کی دھری رہ گئی۔

دو تین مرتبہ میں نے اس سے باہر ملاقات کی اور اپنی محبت کا یقین دلایا۔ اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لیے میں نے وہ دن منتخب کیا جب مالک دورے پر کسی دوسرے شہر جا رہا تھا۔ میں نے رمیز کو گھر آنے پر راضی کر لیا۔ پہلے تو اس نے انکار کیا۔ لیکن میری ضد کے سامنے اسے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ اُدھر میں نے حفاظتی دستے سے کہہ دیا کہ یہ بری نیت سے آ رہا ہے۔

جیسے ہی رمیز نے محل میں داخل ہونا چاہا اسے گرفتار کر کے میرے حضور پیش کیا گیا۔ پہلے تو میں نے اسے کوڑے سے جی بھر کر پیٹا اور اپنی مکمل بھڑاس نکالنے کے بعد اسے کتے کی موت مار ڈالا اور اس کی لاش سمندر کی لہروں کے حوالے کر دی۔

☆☆☆

زندگی سسک سسک کر رینگتی رہی...... اور رینگ رہی ہے، میں سال میں ایک بار اپنے ملک آتی ہوں۔ میرے ماں باپ آج شہر کے امیر ترین لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ زندگی کی وہ کون سی آسائش ہے جو انہیں میسر نہیں...... کیا ہوا جو اُن کی بیٹی کی کمائی ہے۔ آخر ان کا مجھ پر بھی تو کوئی حق ہے۔ انہوں نے مجھے پالا پوسا جوان کیا تعلیم دلوائی...... باہر بھجوایا۔

آپ اسے میرا گھٹیا پن کہہ لیں یا میرا جذباتی گدھا پن...... لیکن مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ میری بربادی میں سب سے زیادہ ہاتھ میرے ماں باپ کا ہے، ہوس نے انہیں اندھا کر رکھا تھا۔ ورنہ میرا یہ حشر نہ ہوتا۔

et

WWW.PAKSOCIETY.COM

محترم مدیر اعلیٰ
سلام مسنون!
ایک تازہ سچ بیانی ارسالِ خدمت ہے۔ یہ کہانی نہیں آئینہ ہے۔ پوری قوم اس آئینے میں خود کو دیکھے اور فیصلہ کرے کہ کیا ہم اس قابل ہیں کہ جنت نظیر پاک وطن میں ... رہیں؟ ہمارا حال تو دوسروں کو صدمہ پہنچانا ہی ہے۔ مستقبل کیسا ہوگا یہ سوچ کر دل دہل رہا ہے۔
بشیر احمد بھٹی، فوجی بستی (بہاولپور)

چارا

میں رحیم یار خان ریلوے اسٹیشن سے ٹرین میں سوار ہوا۔ سفر زیادہ طویل نہیں تھا اس لیے سیٹ بک کرانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ دروازے کے ساتھ ہی لیٹرین کی دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔ میرے سامنے ایک پچیس چھبیس سالہ نوجون دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا جو کراچی سے آرہا تھا اور ساہیوال جارہا تھا۔ اس کی آنکھ کے دائیں طرف گومڑ سا بنا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے زدوکوب کیا گیا ہو۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ وہ کراچی میں مزدوری کرتا ہے۔ مگر اب خطرے کے پیشِ نظر اپنے شہر واپس جارہا ہے۔ ٹارگٹ کلنگ کا خوف اس پر حاوی تھا۔ میں نے اس کا جائزہ لے کر پوچھا کہ تمہاری آنکھ کے قریب چوٹ کا جو نشان ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

میرے سوال پر بولا "میں کراچی میں کئی ماہ سے مزدوری کررہا تھا۔ دوسرے شہروں کی نسبت کراچی میں مزدوری کی اجرت زیادہ ملتی ہے۔ میری تین بہنیں ہیں۔ باپ فوت ہوچکا ہے۔ بہنوں کے ہاتھ پیلے کرنے کے لیے میں نے مزدوری کرکے اپنے ہاتھ نیلے کرلیے تاکہ ان کا جہیز بنایا جاسکے۔ دو دن قبل کی بات ہے، سیٹھ نے میرا حساب چکتا کرکے مجھے چھٹی دے دی کہ کچھ دن اپنے گھر رہ آؤ۔ ہمارا سیٹھ اچھا آدمی ہے۔ اس نے جو رقم مجھے دی وہ بارہ ہزار روپے تھے۔ رقم میں نے احتیاطاً شلوار کی جیب میں ڈال لی تاکہ محفوظ رہے۔ سیٹھ سے پیسے لے کر میں سڑک پر آیا۔ ایک ویگن میں صدر گیا۔ بہنوں کے لیے مہندی اور چوڑیاں خریدیں۔ کچھ اور تحفے تحائف لیے پھر پنجاب جانے والی بس میں سوار ہوگیا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ اس بس میں میری بدنصیبی میری منتظر ہے۔ مسافروں کا بہت رش تھا۔ سامان والا شاپر فرش پر رکھنے کے لیے میں تھوڑا سا جھکا تو میری نگاہ نے ایک خوش کن نظارہ دیکھا۔ ہر انسان خطا کا پتلا ہے۔ پیسے کا لالچ کسے نہیں ہوتا۔ سب پیسے کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ دنیا گول ہے، پیسا بھی گول ہے، انسان پیچھے اور پیسا اس کے آگے گھومتا ہوا چل رہا ہے۔ اس لیے میرا لالچ عود کر آیا۔ میں ایمان کی پٹری سے پھسل گیا۔ جس جگہ میں کھڑا تھا اس جگہ کے دائیں طرف والی سیٹ کا مسافر سو رہا تھا۔ اپنے دونوں بازو اگلی سیٹ کی ٹیکی پر ٹکا کے اس نے اپنا سر بازوؤں پر رکھا ہوا تھا۔ اس کی قمیص کی سائیڈ والی جیب سے ہزار روپے کا نوٹ آدھا باہر نکلا ہوا تھا۔ بالکل نواں نکور، نئی گڈی سے نکلا گیا نوٹ۔ نوٹ دیکھ کر میرے دل میں بے ایمانی آگئی۔ میں ایک شریف آدمی ہوں کوئی جیب کترا نہیں۔ جیب کاٹنا ایک فن ہے۔ سنا ہے اس فن کو سیکھنے کے لیے بڑے بڑے گھاگ استادوں کی شاگردی کرنا پڑتی ہے۔"

اس نوجوان کی گفتگو سے میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ وہ تعلیم یافتہ ہے۔ میں نے اس کی بات کاٹی۔ "تمہاری تعلیم کتنی ہے۔"

"مڈل فیل ہوں۔ سات کلاسوں تک میں فیل نہیں ہوا تھا۔ جب آٹھویں میں فیل ہوا تو دل ٹوٹ گیا۔ پھر والد بھی فوت ہوچکے تھے۔ گھر کی ذمے داری مجھ پر آپڑی تھی۔ اس لیے تعلیم کو خیرباد کہہ دیا۔ البتہ مجھے مطالعے کا بڑا شوق ہے۔ کتابیں اور ڈائجسٹ شوق سے پڑھتا ہوں تاکہ معلومات میں اضافہ ہوتا رہے۔"

نوجوان نے سگریٹ سلگا لیا تھا اور لمبے لمبے کش لے رہا تھا۔ اس کا وہ شاپر جس میں چوڑیاں، مہندی اور تحفے تحائف تھے ایک بڑے سے رومال میں بندھا ہوا تھا۔ رومال گٹھڑی کی صورت میں قریب پڑا تھا۔ بوگیوں کے جوڑ پر جو دروازہ ہوتا ہے اچانک وہ دروازہ کھلا اور ایک پولیس والا دوسری بوگی سے ہماری بوگی میں آگیا۔ اس کے ہاتھ میں بانس کی سونٹی تھی جس کے ایک کونے پر چمڑے کا دستہ بنا ہوا تھا جس میں پنجہ ڈال کر لاٹھی کو مضبوطی سے پکڑ کر لاٹھی چارج کیا جاتا ہے۔ اندر آتے ہی اس پولیس والے نے ہم دونوں کو غور سے دیکھا۔ ہم یوں بیٹھے ہوئے تھے جس طرح بھکاری دیوار سے ٹیک لگائے بھیک مانگ رہے ہوتے ہیں۔ اس نے بانس کی سونٹی نوجوان کے سامان پر ماری اور رعب دار آواز میں بولا۔ "اوئے ایس گنڈڑی (گٹھڑی) وچ کی اے۔" (اس گٹھڑی میں کیا ہے)

"سامان ہے جناب!" نوجوان لجاجت سے بولا پھر سگریٹ کا کش لگا کر اس نے گردن بیرونی دروازے کی طرف موڑ کر دھواں خارج کیا۔ مبادا معززِ صحت دھواں قانون کے رکھوالے کے منہ پر نہ جائے۔

"اینوں کھول۔" (اس کو کھول) آواز آئی۔

نوجوان نے سگریٹ ہونٹوں میں دبایا اور جلدی جلدی رومال کی گانٹھیں کھولنے لگا۔

"سگریٹ نہ پیا کر۔" پولیس والا بولا پھر اس کے ہونٹوں میں دبا ہوا سگریٹ نکال لیا اور... کش لگانے لگا۔ کش لگانے کے انداز سے پتا چلتا تھا کہ اسے شدت سے سگریٹ کی طلب ہورہی تھی۔ اس لیے تو اس نے نوجوان سے نفرت نہیں کی۔ اس کا جھوٹا سگریٹ اچک لیا۔ ایک بار پھر درمیان والا دروازہ کھلا۔ ایک موٹی توند والا اندر آگیا۔ وہ ریلوے ایس آئی لگتا تھا۔ اس نے سپاہی کو سگریٹ پیتے دیکھا تو فوراً بولا۔ "اوئے گلاب دینا کلے کلے سگریٹ پیتی جانا ایں۔ ساڈا کوئی خیال نہیں۔"

"ہر ٹیشن تے سگریٹ ملدے نہیں۔ میں سوچیا سی، کوئی وڈا ٹیشن آوے گا تے ہج کے سگریٹ لے آواں گا۔ حالی تک کوئی وڈا ٹیشن آیا ای نہیں، خان پور آیا سی تے

WWW.PAKSOCIETY.COM

گڈی کھلوتی نئیں۔ میں کی کردا۔ مجبور ساں۔ اے لوتسی دم مارو۔"

سپاہی نے سگریٹ اسے دے دیا۔ نوجوان نے اتنی دیر میں رومال کھول دیا۔شاپر کی گانٹھیں کھول کے اس نے تمام سامان سامنے کردیا۔

میں نے دیکھا، چند چوڑیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ سپاہی نے جوسوئی گٹھڑی پر ماری تھی۔ یہ سب اس سوئی کا کمال تھا۔

چوڑیاں اور مہندی دیکھ کر سپاہی بولا۔"لو جی منڈا ویاہ (شادی) کرن چلیا جے۔ اپنی منگیتر لئی سامان لے کے جاریا اے۔"

"نہیں جی ، یہ تو میں اپنی بہنوں کے لیے لے جارہا ہوں۔" نوجوان بولا۔

"اچھا کاکا ، ایس گٹھڑی نو بند کرلے۔" ایس آئی بولا۔" گلاب دین...... ایداں دے کم نہ کریا کر خانخواہ غریباں نوں تنگ نئیں کری دا۔"

"صاحب... میں سوچیا کی پتا ، گٹھڑی وچ بم شم نہ ہووے۔ دہشت گردی دا دور اے۔" سپاہی بولا۔

وہ آگے بڑھ گیا تو سپاہی نے لڑکے سے کہا۔"تیرے کول سگریٹ ہے......" دوچار سگریٹ مینوں پھڑا۔" لڑکے نے سگریٹ کی ڈبی نکالی۔ اس میں سے سگریٹ نکالنے کے لیے اس نے ابھی پیکٹ کھولا ہی تھا کہ سپاہی نے فوراً سگریٹ کا پیکٹ اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا پھر بولا۔"کاکا تو سگریٹ گھٹ پیا کر۔ صحت خراب ہوندی اے۔ ساڈے کول سگریٹ نئیں اے۔ دوران ڈیوٹی ٹیشن توں باہر جا نئیں سکدے۔ توں تے جاسکدا ایں۔ ہور خرید لویں۔" پیکٹ جھپٹ کر سپاہی بھی ایس آئی کے پیچھے چلا گیا۔ ہم ہونقوں کی طرح ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ گئے۔

میں نے لڑکے سے کہا۔" ٹرین کا سفر جاری ہے۔ گاڑی برق رفتاری سے منزل کی جانب رواں ہے۔ میری منزل قریب آتی جارہی ہے۔ شالیمار ایکسپریس رحیم یارخان سے چلتی ہے تو سیدھا بہاولپور جا کر رکتی ہے۔ لمبے اسٹاپوں والی ٹرین ہے، یہ نہ ہو کہ بہاول پور آجائے ، میں ٹرین سے اتر جاؤں اور کہانی ادھوری رہ جائے۔ اس لیے تم جلدی سے اپنی کہانی کے بقیہ واقعات سنادو۔

اس نے بولنے کے لیے منہ تھوڑا سا کھولا ہی تھا کہ بول نہ سکا۔ ایک بار پھر درمیانی دروازہ کھلا اور ٹکٹ چیکر ڈبے میں آگیا۔

"ٹکٹ......" رعب دار آواز آئی۔

میں نے جیب سے اپنا ٹکٹ نکالا اور چیکر کی طرف بڑھادیا۔

ٹکٹ چیکر نے میرا ٹکٹ پنچ کیا پھر اس نے نوجوان کی طرف ہاتھ بڑھایا وہ پریشان ہوگیا اور میری طرف دیکھنے لگا۔

"ٹکٹ چیک کراؤ۔" میں نے کہا۔

"ٹکٹ تو نہیں ہے۔" وہ نحیف سی آواز میں بولا۔

"ٹکٹ..... نہیں ہے۔ کیا مطلب؟" ٹی ٹی کرخت لہجے میں بولا۔

"وہ جی...... م...... میں......" لڑکا ہکلایا۔

"کیا میں ، میں لگا رکھی ہے۔" ٹی ٹی برہم ہوگیا۔

میں نے دخل اندازی کی۔" جناب...... ٹرین چل پڑی تھی ، یہ ٹکٹ خرید نہیں سکا۔ عجلت میں چلتی ٹرین میں سوار ہوا ہے۔"

"کہاں سے سوار ہوا ہے؟" مجھ سے سوال کیا گیا۔

"رحیم یار خان سے۔" میں نے جھوٹ بولا۔

"اونہہ" ٹی ٹی نے ہنکارا بھرا پھر بولا" کہاں جانا ہے۔"

"ساہیوال۔" میں نے وکالت کی۔

"ٹھیک ہے۔ ٹکٹ بنوالے۔" وہ لڑکے سے مخاطب تھا۔

میں نے جیب سے پانچ سو کا نوٹ نکالا اور ٹی ٹی کی طرف بڑھایا۔ اس نے نوٹ میرے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ پھر سو روپے کا ایک نوٹ نکال کر مجھے واپس کردیا۔"ٹھیک ہے ، میں مزید مسافروں کو چیک کرکے بنادیتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

میرے اندازے کے مطابق لڑکا کراچی میں نوسربازوں کے ہاتھوں لٹ چکا تھا۔ اس لیے میں نے ازراہِ ہمدردی اس کا ٹکٹ بنوایا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔"اب جلدی سے کہانی کا بقایا حصہ سنادو۔"

وہ بولا" سلسلہ کہاں منقطع ہوا تھا؟"

میں نے اسے یاد دلایا۔" سوتے ہوئے مسافر کی جیب میں ہزار روپے کا کڑکڑاتا نوٹ دیکھ کر تمہاری نیت میں بے ایمانی آگئی تھی۔"

"ہاں یاد آیا۔ میں نے نوٹ دیکھا تو نیت بے ایمانی پر تل گئی۔ میں تھوڑا سا اس مسافر کے قریب ہوگیا تاکہ صفائی سے نوٹ نکال سکوں اور کوئی مجھے یہ حرکت کرتے بھی نہ دیکھے۔ بس یہی میری غلطی تھی جس کا بعد میں مجھے خمیازہ بھگتنا پڑا۔ اس کے قریب ہوکر میں نے ہاتھ کی دو انگلیوں سے باہر نکلا ہوا نوٹ پکڑا اور آہستہ سے اسے باہر کھینچا تاکہ مسافر میری اس حرکت سے بے خبر رہے۔

ابھی نوٹ تھوڑا سا اوپر آیا تھا کہ اس مسافر نے ایک دم میری کلائی پر ہاتھ مارا اور سختی سے میری کلائی پکڑ لی۔ پھر اس نے شور مچادیا۔"جیب کترا۔ میری جیب کاٹ رہا تھا۔" بس میں ایک دم ہڑبونگ مچ گئی۔ تمام مسافر ہماری طرف متوجہ ہوگئے۔ میرے اوسان خطا ہوگئے۔ نوٹ میری انگلیوں میں پھنسا ہوا تھا اور میری کلائی نوٹ کے مالک کے ہاتھ میں جکڑی ہوئی تھی۔ سب نے یہ منظر دیکھا۔ صورتِ حال واضح تھی۔ کچھ مسافر اپنی سیٹوں پر کھڑے ہوگئے۔ دھول دھپے پڑنے لگے۔ کسی نے تھپڑ مارا ، کسی نے گھونسا، اس مسافر کے ہمراہ اس کے تین ساتھی اور بھی تھے۔ انہوں نے بھی مجھے زدوکوب کیا۔ سب باہمی آواز میں بولے۔ اسے حوالۂ پولیس کرو۔"

"بالکل...... بالکل......" نوٹ والا بولا۔" پہلے اس کی دھنائی کریں گے۔ گروپ کا پتا چلائیں گے۔ پھر یہ حوالۂ پولیس کیا جائے گا۔" کنڈیکٹر قریب آیا اور عجیب سی نظروں سے ان چاروں کو دیکھنے لگا جو مجھے زدوکوب کرچکے تھے ، پھر وہ آہستہ سے بولا۔" تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آؤ گے۔ کیوں خوانخواہ چکر بازیاں کرتے ہو۔"

"تم چپ رہو جی۔" ان چاروں میں سے ایک بولا۔" جیب کتروں کی حمایت نہ کرو بس روکو۔ ہم اسے پولیس کے حوالے کریں گے۔"

بس رک گئی۔ میں نے اپنی گٹھڑی اٹھائی تھی کہ وہ چاروں مجھے کھینچتے ہوئے نیچے لائے۔ بس چلی گئی۔ یہ تھوڑا سا ویران علاقہ تھا۔ اتنی گہما گہمی نہیں تھی۔ سڑک کے کنارے جھاڑیاں نظر آرہی تھیں۔ وہ مجھے پکڑ کر جھاڑیوں کی طرف لے گئے۔

سڑک کی ڈھلوان سے اتر کر ہم جھاڑیوں تک پہنچے۔ اب ہم ایسی جگہ کھڑے تھے جہاں سناٹا تھا۔ کسی کی نظر ہم پر نہ پڑسکتی تھی۔

نوٹ کے مالک نے میرے سامنے گھونسا لہرایا اور بولا۔" کب سے یہ دھندا کررہا ہے ، جلدی بتا۔ وقت کم ہے ، تجھے تھانے بھی پہنچانا ہے۔

ایک دوسرا لڑکا جس کے ہاتھ میں کتاب تھی اور انگلی میں انگوٹھی۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ میری کنپٹی پر ایک زوردار گھونسا جڑ دیا۔ میری تھوڑی سی مزید مرمت ہوئی تو میں رو پڑا اور گھگھیاتے ہوئے بولا۔" میں جیب کترا نہیں ہوں۔ نوٹ دیکھ کر طبیعت پر بے ایمانی کا دورہ پڑا تھا۔"

"مالِ مفت دلِ بے رحم۔" نوٹ والا بولا۔ پھر اس نے حکم صادر کیا۔"اس کی تلاشی لو۔"

تلاشی شروع ہوئی تو میں حواس باختہ ہوگیا۔ انہوں نے میرے بارہ ہزار روپے نکال لیے۔

نوٹ دیکھ کر وہی لڑکا بولا۔" پرانا پاپی لگتا ہے۔ تگڑا ہاتھ مار رکھا ہے۔ دیکھو، کسی غریب کے بارہ ہزار مار لایا ہے۔"

میری محنت کی کمائی اب ان کے ہاتھ میں تھی۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوا" آیندہ یہ مکروہ دھندا نہ کرنا۔ توبہ کرو ورنہ پولیس کے حوالے کردیں گے۔"

میں نے روتے ہوئے ان سے کہا۔" آیندہ نہیں کروں گا۔ میری توبہ، بھلے لاکھ روپے کا نوٹ جیب میں کیوں نہ نظر آئے۔"

"لاکھ روپے کا نوٹ تیرا باپ چھاپے گا۔" لمبے بالوں والا بولا۔ پھر وہ سب ہنسنے لگے۔ میں نے ان کی منت سماجت شروع کردی کہ میری رقم لوٹادو۔ میں پردیسی ہوں۔ دعائیں دوں گا۔ میری تین بہنیں ہیں۔ ان کی شادی کرنی ہے۔

"بارہ ہزار سے ان تینوں کو بیاہے گا۔" ایک بولا۔

میں ان کے پاؤں پڑ گیا۔ لمبے بالوں والے کو ترس آگیا۔ اس نے مجھے ہزار روپے کا نوٹ دیا اور بولا۔" یہ تیرا کرایہ ہے۔ کیا یاد کرے گا کسی سخی سے پالا پڑا ہے۔ اچھا اب ایسا کر ان جھاڑیوں میں منہ کے بل اوندھا لیٹ جا۔ ہم سڑک پر جارہے ہیں۔ جب تک ہم کسی وین میں سوار نہ ہوجائیں تو اسی کو اپنا مسکن سمجھ۔ یہیں پڑا رہ۔ جب ہم وین میں سوار ہوکر یہاں سے چلے جائیں۔ تب سڑک پر آنا۔ شور نہ مچانا ورنہ تھانے پہنچادیں گے ، کیا سمجھے۔ چل شاباش، دیر نہ کر۔"

ان کا نیا حکم پاکر میں زمین پر اوندھا لیٹ گیا اور آہستہ آہستہ رونے لگا۔ نوسرباز مجھے لوٹ کر جارہے تھے اور میں بے بس تھا۔ وہ سڑک پر جاکر کھڑے ہوگئے۔ میں کھڑا ہوا اور ان کو دیکھنے کی کوشش کی۔ ایک لڑکے نے میرا سر قد آور جھاڑیوں سے اوپر اٹھا دیکھا تو بھاگ کر آیا اور جوتا اتار کے میرے سر پر مارتے ہوئے بولا۔" تجھے نہیں کہا تھا

WWW.PAKSOCIETY.COM

کہ زمین پر لیٹا رہ۔ کھڑا ہو کے کیا دیکھتا ہے۔ تیری پھوپی کی برات جارہی ہے۔''

سر پہ جوتا لگا تو میں جلدی سے دوبارہ زمین پر لیٹ گیا۔ وہ سڑک پر چلا گیا تو میں بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ بہنوں کی فکر میں کچھ عرصہ پہلے مجھے ہلکی ہلکی شوگر کی شکایت ہوگئی۔ اٹھنے کو جی نہ چاہ رہا تھا کہ مبادا دوبارہ سر پر جوتا پڑے۔ دعا بھی مانگ رہا تھا کہ کوئی وین آئے، یہ نوسرباز دفع ہو جائیں تو اپنی جگہ سے اٹھوں پھر مجھے خیال آیا کہ جھاڑیاں بڑی بڑی ہیں، میں اٹھ کر بیٹھ سکتا ہوں۔ چنانچہ میں اپنی جگہ پر اٹھ بیٹھا اور ان ٹھگوں کو بددعائیں دینے لگا جو میرے گیارہ ہزار روپے ٹھگ کے جارہے تھے۔

چند لمحے بعد ایک وین سڑک پر رکی۔ وہ اس میں سوار ہوگئے۔ وین چلی گئی تو میں اپنے گالوں پر آئے ہوئے آنسو صاف کرتے ہوئے سڑک پر آیا۔ سڑک کے کنارے تارکول کے خالی ڈرم نصف زمین میں دبے ہوئے تھے۔ میں ایک ڈرم پر بیٹھ گیا اور وین کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد ایک وین آگئی، میں اس میں سوار ہوا۔ ہزار روپے کے علاوہ میری جیب میں کچھ ریزگاری تھی جو ٹھگوں نے نہیں لوٹی تھی۔ اس ریزگاری سے میں نے وین کا کرایہ ادا کیا۔ وین اسٹیشن پہنچی۔ میں وین سے اترا اور ٹکٹ خریدے بغیر پلیٹ فارم پر چلا گیا۔ ایک ہزار روپے کا نوٹ جیب میں تھا۔ میں نے ارادہ کرلیا تھا کہ بغیر ٹکٹ سفر کروں گا۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا میں ایک خالی بینچ پر میں بیٹھ گیا۔ ذرا دیر بعد ایک باریش بزرگ میرے قریب آبیٹھے۔ انہوں نے میری روتی صورت دیکھی تو ازراہ ہمدردی پوچھا۔ ''بیٹے کہاں جارہے ہو؟''

بزرگ کی بات سن کر میں رونے لگا۔ پھر ساری کہانی .... بزرگ کو سنادی۔ بزرگ میری کہانی سن کر مسکرانے لگے پھر...... میری پیٹھ تھپکی۔ مجھے تسلی دی اور کہنے لگے ''تم میرے گھر چلو میرے مہمان بن کر رہو۔ کھاؤ پیو، آرام کرو، مجھے ثواب کمانے کا موقع دو۔ میں تمہیں کل کی ٹرین میں سوار کرادوں گا۔ کل نور محمد سپاہی شالیمار میں روہڑی تک جائے گا۔ میں تمہیں ریلوے پولیس کے ساتھ بھیج دوں گا یا ٹکٹ خرید کے دے دوں گا۔ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔

اسٹیشن سے کچھ فاصلے پر..... مہربان بزرگ کا گھر تھا۔ وہ ریلوے کے ریٹائرڈ ملازم تھے اور پنشن پا رہے تھے۔ ان کا ایک بیٹا بھی ریلوے میں ملازم تھا۔ وہ نیک سیرت بزرگ مجھے اپنے گھر لے گئے۔ مجھے کھانا دیا۔ میں کھانا کھا چکا تو بزرگ بولے۔

''تو بہت سیدھا سادا بھولا بھالا آدمی ہے۔ اللہ کے بندے نوسرباز کی جیب سے آدھا نوٹ باہر دیکھ کر بھی تو نہ سمجھ سکا کہ یہ چارہ ہے۔ جس طرح مچھلی کا شکار کرنے والے شکاری کانٹے میں چارہ لگاتے ہیں، اسی طرح یہ نوسرباز جان بوجھ کر آدھا نوٹ جیب میں اور آدھا باہر کرکے بہانے سے آنکھیں بند کرلیتے ہیں۔ حالانکہ وہ شکار پھانسنے کا حربہ ہوتا ہے۔ بقول تمہارے جب تم نے نوٹ جیب سے نکالنے کی کوشش کی تو اس سوئے ہوئے آدمی نے فوراً تمہاری کلائی پکڑلی اور شور مچادیا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ وہ بہانے سے تمہیں وین سے اتار کر تمہاری جیب کا صفایا کرنا چاہتے تھے۔ جواری، شرابی قسم کے لڑکے اس طرح کا گورکھ دھندا کرکے لوگوں کو ٹھگتے رہتے ہیں۔ آیندہ ایسی غلطی نہ کرنا۔''

وہ تلقین کرکے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ ایک دن اور رات میں نے ان کے گھر پر گزاری۔ آج صبح کا ناشتا کراکے وہ مجھے اسٹیشن پر لے آئے اور نور محمد سپاہی سے کہہ کر مجھے ریلوے پولیس والے ڈبے میں بٹھادیا۔ میں نے روہڑی تک اس ڈبے میں سفر کیا۔ روہڑی اسٹیشن پر گاڑی کا تمام عملہ تبدیل ہوگیا۔ نئے پولیس والوں نے مجھے اس ڈبے سے اتاردیا۔ میں اس ڈبے میں آگیا۔ یہاں آپ سے ملاقات ہوگئی۔ آپ نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔ میرا ٹکٹ بنوانے کے لیے ٹی ٹی کو رقم دے دی۔ یہ تھی میری کہانی۔ آپ مجھے اپنا ایڈریس دے دو۔ میں خط لکھوں گا۔''

بہاول پور اسٹیشن گاڑی رکی تو میں نے ایک آدمی سے ایڈریس لکھنے کے لیے قلم لیا اور اسے اپنا ایڈریس لکھ دیا۔ گاڑی چلنے لگی تو میں نے اس لٹے پٹے نوجوان سے ہاتھ ملایا اور گھر کو روانہ ہوا۔ پندرہ دن بعد مجھے اس جوان کا خط ملا اس کا نام جمیل تھا۔ جمیل نے خط میں شکریہ ادا کیا تھا۔ آخر میں اس نے لکھا جب ٹرین خانیوال پہنچی تو ٹی ٹی مجھے ٹکٹ دے گیا تھا۔ آپ نے اسے رحیم یار خان تا ساہیوال تک کا کرایہ دیا تھا۔ جب میں نے ٹکٹ کو غور سے دیکھا تو لکھا تھا خانیوال تا ساہیوال۔ رحیم یار خان سے خانیوال تک کا کرایہ ٹی ٹی کی جیب کی نذر ہوگیا۔

خط پڑھ کے میں ایک پرانا فلمی نغمہ گنگنانے لگا ''اس دنیا میں سب چور، چور۔ کوئی چھوٹا چور کوئی بڑا چور، کوئی لاٹ صاحب کا سالا چور۔''

جناب معراج رسول!
السلام علیکم!
میں اپنی زندگی کا ایک اہم واقعہ سنا رہا ہوں جس نے میری زندگی بدل دی ہے۔ شاید یہ واقعہ آپ کو بھی پسند آجائے لیکن اس واقعہ نے مجھ جیسے ہنسنے ہنسانے والے شخص کو بالکل بدل کر رکھ دیا ہے۔
محمود شاہ
(میرپور خاص)

دماغ پھر جائے گا

کہانی صرف پانچ دنوں کی تھی۔ جو پانچ برسوں تک پھیلتی چلی گئی۔ یہ میرا دل ہی جانتا ہے کہ میرے یہ پانچ برس کس طرح گزرے تھے۔ اپنے آپ پر ماتم کرتے ہوئے۔ اپنی بدنصیبی پر روتے ہوئے۔
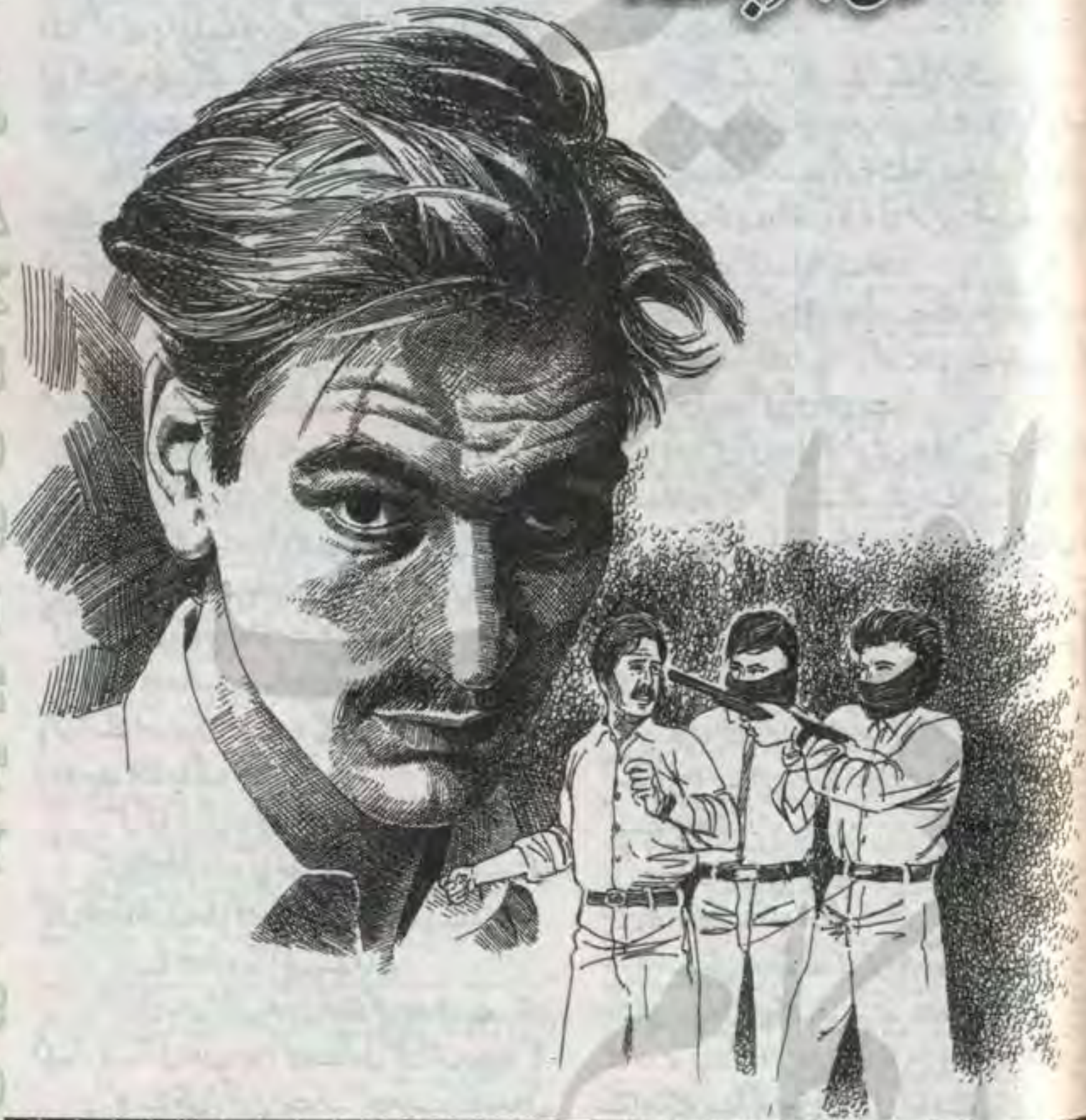
اس کہانی کی ابتدا ہائی وے سے ہوتی ہے۔ میں بس کے ذریعے کراچی سے لاہور جارہا تھا۔ میں عام طور پر بس کے ذریعے ہی سفر کیا کرتا ہوں۔ بہت لطف آتا ہے۔ بس چھوٹے چھوٹے شہروں اور دیہاتوں سے گزرتی ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

طرح طرح کے لوگوں کو دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ دور تک پھیلے ہوئے کھیت دکھائی دیتے ہیں۔ غرضیکہ میرے نزدیک بس کا سفر بہت پُرلطف ہوا کرتا ہے لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس بار کا سفر اتنا مہنگا پڑ جائے گا۔

رات کے تقریباً دس بجے تھے۔ بس اپنی پوری رفتار سے دوڑی چلی جارہی تھی۔ سڑک کے دونوں جانب دور دور تک پھیلے ہوئے میدان میں اندھیرا اترا ہوا تھا۔ کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بس کے مسافر سامنے لگے ہوئے ٹی وی اسکرین پر کوئی بے کار سی فلم دیکھنے میں مصروف تھے کہ اچانک بس ایک جھٹکے سے رک گئی۔ کچھ پتا نہیں چلا کہ کیوں روک دی گئی ہے۔

پتا اس وقت چلا جب کچھ لوگ بس میں داخل ہوگئے۔ یہ مسلح افراد تھے۔ جن کے چہروں پر ڈھاٹے بندھے ہوئے تھے اور جن کی سرخ آنکھیں چمک رہی تھیں۔

''خبردار...!'' ان میں سے ایک چیخ کر بولا۔ ''سب اپنے اپنے ہاتھ اوپر اٹھالو۔ ہمیں کسی سے کچھ نہیں لینا۔ ہمیں صرف ایک بندے کی تلاش ہے۔''

ہم سب پر سکتے کی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ ہم نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ سب نے اپنے اپنے ہاتھ اوپر کردیے۔ ان میں سے دو آدمیوں نے مسافروں کو غور سے دیکھنا شروع کردیا۔ نہ جانے ان کم بختوں کو کس کی تلاش تھی۔ ہوگا کوئی بے چارہ شامت کا مارا۔

یکے بعد دیگرے مسافروں کو دیکھتے ہوئے وہ میرے پاس آگئے اور میری صورت دیکھتے ہی ان دونوں کو ایک زبردست جھٹکا سا لگ گیا۔

''مل گیا...مل گیا۔ یہی بندہ ہے۔'' دونوں نے شور کیا۔

میں تو بوکھلا کر رہ گیا تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ ڈاکو میری تلاش میں ہوں گے۔

''اوئے چلو اترو۔'' ایک نے کہا۔

''بھائی جان، آپ لوگوں کو غلط فہمی ہورہی ہے۔ میں ایک شریف آدمی ہوں، میرا کسی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''اوئے چل، تقریر مت کر۔'' دوسرے نے بندوق کی نالی میرے سر پر رکھ دی۔ ''ورنہ یہیں بھیجا اُڑا دوں گا۔''

اب اس کے علاوہ کیا ہوسکتا تھا کہ میں ان کی بات مان لوں۔ بس سے اترتے ہوئے میں بری طرح کانپ رہا تھا۔ کون لوگ تھے یہ۔ مجھ سے کیا چاہتے تھے؟ میں تو اپنے راستے پر جارہا تھا کہ اس طرح زبردستی اتار لیا گیا تھا۔ انتہا یہ ہوئی کہ مجھے بس سے اتارنے کے بعد انہوں نے بس کو جانے کا اشارا کیا اور بس مجھے اس ویرانے میں ان لوگوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگئی۔

میں اس ویرانے اور اندھیرے مقام پر اُن خطرناک لوگوں کے درمیان رہ گیا تھا جن کی تعداد دس سے کسی طرح کم نہیں تھی اور وہ سب کے سب پوری طرح مسلح تھے۔

میرا ذہن کچھ بھی سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ میرے ساتھ جو کچھ بھی ہورہا تھا وہ بہت حیرت انگیز اور دل ہلا دینے والا تھا۔

''چلو آگے۔'' ایک نے آگے کی طرف دھکا دیا۔

اس کے ساتھ ہی دوسروں نے ٹارچ روشن کردی تھیں۔ سڑک کے کنارے کچھ فاصلے پر درخت دکھائی دے رہے تھے۔ شاید درختوں کا کوئی طویل سلسلہ تھا۔ ان کا اشارہ ان ہی درختوں کی طرف تھا۔

ہزار طرح کے خیالات آرہے تھے۔ یہ لوگ مجھ سے کیا چاہتے تھے؟ مجھے اپنے ساتھ کیوں لے جارہے تھے؟ میری تو کسی سے دشمنی بھی نہیں ہے۔

اگر دشمنی بھی ہوتی تو شہر میں ہوتی۔ یہ اس جنگل میں میرے کون دشمن نکل آئے تھے۔ میں نے ایک بار پھر انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ ''دیکھو بھائی، تم لوگ شاید کسی اور کے دھوکے میں مجھے لے جارہے ہو۔'' میں نے کہا۔ ''میں ایک بے ضرر سا غریب آدمی ہوں۔ میرے پاس تو پیسے بھی نہیں ہوتے۔ پھر تم لوگ مجھے کیوں اغوا کررہے ہو۔''

میری ان باتوں کا جواب اس طرح دیا گیا کہ مجھے آگے کی جانب اس طرح دھکا دے دیا گیا کہ میں گرتے گرتے بچا تھا۔

''بس چپ چاپ چلتے رہو۔'' کسی نے کہا۔ ''ورنہ یہیں مار کر پھینک دوں گا۔''

اب یہی ہوسکتا تھا کہ میں ان کی بات مان لوں۔ ورنہ ان سے کوئی بعید نہیں تھا۔ یہ میرے ساتھ کچھ بھی کرسکتے تھے اور میری لاش اس ویرانے میں پڑی رہتی۔ جنگل کے کتے اور بھیڑیے آکر میری تکا بوٹی کر ڈالتے۔

ہم سڑک سے اتر کر کچے میں آگئے۔ دو آدمی آگے ٹارچ روشن کرتے ہوئے چل رہے تھے۔ اس وجہ سے راستہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔

وہ ایک دشوار گزار راستہ تھا۔ قدم قدم پر کانٹے دار جھاڑیاں تھیں اور درخت تھے۔ اگر ٹارچوں کی روشنیاں نہ ہوتیں تو نہ جانے میں کتنی بار خود کو کانٹوں میں الجھا کر زخمی کرچکا ہوتا۔

نہ جانے یہ مجھے اور کتنی دور لیے جارہے تھے۔ منزل آنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ ایسی افتاد تو مجھ پر کبھی نہیں پڑی تھی۔

اس قسم کی کہانیاں اور واقعات پڑھتا چلا آرہا تھا اور اس وقت خود میرے ساتھ یہ تماشا ہورہا تھا۔ وہ مجھے کہاں لے جارہے تھے کوئی پتا نہ تھا لیکن میں ان کے ساتھ چلنے کے لیے مجبور تھا۔

بہت دیر کے بعد ایک جگہ روشنی سی دکھائی دی پھر وہ روشنی بڑھنے لگی۔ اس کا دائرہ وسیع ہونے لگا تھا۔ وہ کئی عدد پیٹرومیکس کی روشنیاں تھیں جن کی وجہ سے جنگل کا وہ حصہ روشن ہوگیا تھا۔

مٹی اور گارے کے کچھ گھر بنے ہوئے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق ان گھروں کی تعداد بیس سے زیادہ ہی ہوگی۔

اور ہر گھر کے سامنے لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ تنو مند آور، اسلحہ بردار، میں خدا جانے کس جرم کی سزا کے طور پر ان بھیڑیوں میں پھنس گیا تھا۔

کچے گھروں کے درمیان ایک چبوترا تھا، جس پر دری بچھی ہوئی تھی۔ گاؤ تکیہ تھا اور ایک آدمی بڑی شان کے ساتھ اس چبوترے پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔

وہ شخص شاید سب سے زیادہ دیو ہیکل تھا۔ مجھے اس کے سامنے لے جاکر کھڑا کردیا گیا تھا۔ ''سردار! ہم لے آئے ہیں اس بندے کو۔'' مجھے لانے والوں میں سے ایک نے کہا۔

''ہوں۔'' سردار نے ایک ہنکاری بھری اور اوپر سے نیچے تک مجھے دیکھا۔ پھر اپنے آدمیوں سے بولا۔ ''اس کو روٹی ٹوٹی کھلا کر کمرے میں بند کردو۔''

اس موقع پر میں بول پڑا۔ ''سردار، خدا جانے آپ لوگ مجھے کیوں لے آئے ہیں، میں تو ایک عام سا بندہ ہوں۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔''

''چلو چلو صبح بات ہوگی۔'' سردار نے کہا۔ ''اب بکواس مت بولنا۔ ورنہ میرا دماغ پھر جائے گا۔''

میں اس کے دماغ پھر جانے کے خوف سے خاموش ہوگیا۔ اس کے آدمیوں نے مجھے ایک کچے کمرے میں بند کردیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کمرے کی دیواریں اتنی کمزور ہیں کہ میرے ایک دھکے سے گر سکتی ہیں۔ لیکن کیا فائدہ، میں وہاں سے کیسے فرار ہوتا، وہ میری طرف سے غافل تو نہیں ہوں گے۔

ابھی تک تو انہوں نے کوئی سختی نہیں کی تھی لیکن میرے فرار کی کوشش کے بعد میری کھال ادھیڑ کر رکھ دیتے۔ اس لیے یہی بہتر تھا کہ میں خاموش رہوں اور خدا سے اپنی رہائی کی دعائیں مانگتا رہوں۔

اس کمرے میں فرش پر ایک چٹائی پڑی تھی جس پر ایک تکیہ تھا۔ گویا میرا بستر تھا اور مجھے اس پر رات گزارنی تھی اور صبح میرے ساتھ نہ جانے کیا ہونے والا تھا۔

ایک آدمی کچھ دیر بعد میرے لیے کھانا لے آیا۔ کھانا کیا تھا بیسن اور آٹے کی دو روٹیاں، جس پر ایک کچی پیاز رکھی ہوئی تھی اور ایک گلاس پانی۔

اس وقت دل تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن خود کو زندہ رکھنے کے لیے یہ ضروری بھی تھا۔ اس لیے میں نے خاموشی سے کھانا کھایا، پانی پیا اور چٹائی پر لیٹ گیا۔

کہتے ہیں کہ نیند سولی پر بھی آجاتی ہے۔ لہٰذا نیند آگئی اور میں بے خبر ہوگیا۔

مجھے صبح اس آدمی نے بیدار کیا تھا جو میرے لیے رات کو کھانا لے کر آیا تھا۔ ''چلو اٹھو دن ہوگیا ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔''

میں اس کے ساتھ اس کوٹھری سے باہر آگیا۔ اب دن کی روشنی میں دور تک دیکھا جاسکتا تھا۔ یہ ایک جنگل کا علاقہ تھا۔ فضا میں ہر طرف سبز گھاس کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ آس پاس درخت ہی درخت تھے۔ ان درختوں کے درمیان یہ ایک چھوٹی سی بستی بنائی گئی تھی۔

اس آدمی نے پانی کی ایک بوتل میرے ہاتھ میں پکڑا دی۔ ''یہ لو...اور درختوں کی طرف چلے جاؤ.... پانی بہت احتیاط سے خرچ کرنا، یہاں انسان سے زیادہ پانی قیمتی ہے۔''

کچھ دیر بعد میں پھر اس چبوترے پر بیٹھے ہوئے سردار کے سامنے تھا۔ جو بہت دلچسپی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ''جنجوعہ، تجھے صرف دو کروڑ دینے ہیں پھر ہم تجھے چھوڑ دیں گے۔''

''جنجوعہ'' میں نے چونک کر سردار کی طرف دیکھا۔ ''میں سمجھ گیا تھا جناب، آپ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔'' میں نے کہا۔

''میرا نام محمود شاہ ہے۔''

''خاموش'' وہ زور سے دہاڑا۔ ''اب اگر کچھ بولا تو میرا دماغ پھر جائے گا۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

”یہ تو ٹھیک ہے سردار کے تمہارا دماغ پھر جائے گا۔“ میں جھلا کر بولا۔ ”لیکن اس کہانی کا کوئی انجام تو ہوگا نا۔“

”انجام بس یہی ہے کہ تو ہمیں دو کروڑ دلوائے گا۔“ اس نے کہا۔

”کہاں سے دلواؤں گا۔“ اب تو میں رونے ہی لگا تھا۔ ”مجھ غریب کے پاس تو کبھی دو ہزار روپے بھی ایک ساتھ نہیں ہوتے۔ دو کروڑ کہاں سے آئیں گے۔“

”بہانے مت کر۔ ورنہ میرا دماغ پھر جائے گا۔ جا اپنے کمرے میں جا کر لیٹ جا۔ میں شام کے وقت بتاؤں گا کہ تجھے اپنے گھر والوں سے کیا بات کرنی ہے۔“

مرتا کیا نہ کرتا۔ میں دوبارہ اس کوٹھری میں آ کر لیٹ گیا۔ پتا نہیں کم بخت کس مزاج کا تھا۔ میں اسے اپنے جنجوعہ نہ ہونے کا ثبوت بھی دے رہا ہوں۔ اس کے باوجود وہ مان کر نہیں دے رہا تھا۔ اب میں اور کیا کر سکتا تھا۔

چٹائی پر لیٹ کر میں سوچتا رہا کہ میرا کیا ہونے والا ہے۔

اس نے یہ کہا تھا کہ وہ شام کے وقت میرے گھر والوں سے میری بات کروائے گا۔ کون سے گھر والوں سے، ظاہر ہے، جنجوعہ کے گھر والوں سے۔

اور بات ہوتے ہی پتا چل جائے گا کہ میں کوئی اور ہوں۔ اس خیال سے دل کو بہت تقویت مل گئی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس فون پر میری رہائی کا انحصار تھا۔

دوپہر میں کھانا دیا گیا۔ اس بار روٹی کے ساتھ کسی قسم کا ساگ بھی تھا۔ چونکہ مجھے اپنی آزادی کی ایک امید سی ہو چلی تھی اس لیے میں نے خوب پیٹ بھر کر کھایا۔ اس کے بعد سو گیا۔

اس کے علاوہ اور کوئی کام ہی نہیں تھا۔

شام کے وقت مجھے پھر سردار کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔ سردار نے ایک موبائل اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ ”دیکھ، جنجوعہ۔ میں جانتا تھا کہ تو اپنے گھر کا نمبر بہت مشکل سے بتائے گا اس لیے میں نے یہ نمبر پہلے ہی کہیں سے حاصل کر لیا تھا۔ اب میں یہ نمبر ملا دیتا ہوں تو اپنے گھر والوں کو سمجھا دینا کہ ضد نہ کریں۔“

میں نے کچھ نہیں کہا۔ سردار نے نمبر ملا کر کسی سے بات کی۔ ”جنجوعہ کی بیوی سے بات کرواؤ۔ اوئے یہ رہنے دے کہ میں کون ہوں۔ تو بات کروا۔ اچھا بات سن تیرا جنجوعہ ہمارے قبضے میں ہے۔ یہ لے اس سے بات کر کے اپنا اطمینان کر لے۔ اس کے بعد آگے کہوں گا۔“ اس نے موبائل میری طرف بڑھا دیا۔ ”لے بات کر۔“

موبائل لیتے ہوئے میرا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ ”آپ کہاں ہیں، کس کے قبضے میں ہیں؟“ دوسری طرف سے کسی عورت کی پریشان آواز سنائی دی۔

”دیکھیں خاتون۔ یہ لوگ مجھے جنجوعہ سمجھ کر اٹھا لائے ہیں۔ انہیں بتا دیں کہ میں جنجوعہ نہیں ہوں۔“

”کیا ہو گیا ہے آپ کو۔“ اس عورت نے کہا۔ ”کیا میں آپ کی آواز نہیں پہچانوں گی۔ آپ ہی میرے شوہر جنجوعہ ہیں۔“

”ارے یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔“ میں بری طرح بوکھلا گیا تھا۔

”لا ادھر دے۔“ سردار نے موبائل میرے ہاتھ سے چھین لیا پھر موبائل میں بولا۔ ”سنو، بات سنو۔ تم نے اپنے شوہر کی آواز سن لی نا، یہ ہمارے قبضے میں ہے۔ ہمیں صرف دو کروڑ کی ضرورت ہے۔ دو کروڑ کا بندوبست کرو اور لے جاؤ اس کو۔“

موبائل آف کر کے اس نے میری طرف دیکھا۔ ”کیا بات ہے تو کیوں کانپ رہا ہے، مرد کا بچہ بن۔ دو کروڑ نہیں ملے تو اس جنگل میں تجھے مار کر دبا دیں گے۔“

”سردار خدا کے لیے رحم کرو۔“ میں نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ لیے۔ ”میں محمود شاہ ہوں۔ نہ جانے یہ جنجوعہ کون ہے جس کی مصیبت میرے گلے پڑ رہی ہے۔“

”دیکھ... زیادہ بہانے مت کر... ورنہ میرا دماغ پھر جائے گا۔“ سردار نے کہا۔ ”اس عورت نے تجھے اپنا شوہر مان لیا ہے اور کیا ثبوت چاہیے۔“

”وہ جھوٹ بول رہی ہے سردار... یا اس نے میری آواز نہیں پہچانی ہے۔ فون پر آوازیں سمجھ میں نہیں آتیں۔“

”مجھے سائنس پڑھانے کی کوشش مت کر ورنہ میرا دماغ پھر جائے گا۔“ سردار دہاڑا۔ ”اب جا اپنے کمرے میں، آرام کر۔ تیرے گھر والوں سے کل صبح بات ہوگی۔ ایک رات بے چین رہنے دے۔“

پتا نہیں وہ بے چین تھے یا نہیں۔ لیکن میں ضرور بے چین تھا۔ ساری رات نیند نہیں آسکی۔ یہ امید تھی کہ فون لگتے ہی اس سردار کی غلط فہمی دور ہو جائے گی اور مجھے جانے کی اجازت دے دے گا۔ لیکن یہاں تو کہانی کچھ اور ہو گئی تھی۔

پتا نہیں جنجوعہ کی بیوی نے میری آواز سن کر مجھے جنجوعہ کیوں مان لیا تھا۔ اچانک ایک خیال میرے ذہن میں آ گیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کا شوہر جنجوعہ بھی کہیں غائب ہو گیا ہو اور سردار کے فون پر اس نے یہی سمجھ لیا ہو کہ یہ فون

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے شوہر ہی کے حوالے سے ہے۔

ایک امکان تھا۔ اگر ایسا تھا تو بھی میری آزادی کی باقی تھی۔ بہت ممکن تھا کہ صبح تک اس کا شوہر جنجوعہ گھر آجاتا۔ اس وقت یہ غلط فہمی دور ہو سکتی تھی۔

جیسے تیسے رات گزاری۔ دوسری صبح پھر یہی ہوا۔ سردار نے نمبر ملا کر بولنا شروع کر دیا۔ ”لے، اپنے شوہر سے بات کر... اور سن پورے دو کروڑ چاہئیں، پورے دو کروڑ۔ ورنہ میرا دماغ پھر جائے گا، سمجھی۔“

اس نے موبائل میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے اس عورت کی آواز پہچانتے ہی بولنا شروع کر دیا۔ ”دیکھیں، آپ ہی سمجھائیں۔ ان کو بتا دیں کہ میں جنجوعہ نہیں ہوں۔ یہ غلطی سے اٹھا کر لے آئے ہیں۔“

میری بات سن کر اس کم ہمت عورت نے واویلا شروع کر دیا۔ ”ارے کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ آپ کیوں جنجوعہ ہونے سے انکار کر رہے ہیں۔ میں کیا جھوٹ بول رہی ہوں کہ آپ میرے سہاگ نہیں ہیں۔“

”ارے خدا کے لیے رحم کریں مجھ پر۔“

”دیکھیں... ان سے بولیں کہ دو کروڑ بہت ہوتے ہیں۔ ہم صرف بیس ہزار دے سکتے ہیں۔ بیس ہزار میں آپ کو چھوڑ دیں۔ ان کی بہت مہربانی ہوگی۔“

بیس ہزار کا سن کر میں خود بھنا کر رہ گیا تھا۔ جنجوعہ کے گھر والے شاید پاگل ہو گئے تھے۔ سردار نے موبائل میرے ہاتھ سے لے کر بولنا شروع کر دیا۔ ”اب سودے کی بات کر۔ دو کروڑ چاہئیں۔ کیا کہا... بیس ہزار؟ دیکھ میرا دماغ پھر جائے گا۔ یہ تو کپڑے کا جوڑا خریدنے کی بات کر رہی ہے یا اپنے شوہر کا تاوان ادا کرنا ہے۔ ایسے نہیں سمجھے گی میں تیرے شوہر کو مارنا شروع کرتا ہوں۔ اس کی ہر چیخ پر پچاس پچاس ہزار روپے بڑھتے جائیں گے، سمجھی۔ لے سن۔“

اس کم بخت نے موبائل آن کر کے اپنے ایک بندے کو اشارہ کیا۔ اور اس کم بخت نے چمڑے کی موٹی بیلٹ میری کمر پر مارنی شروع کر دی۔

میں بری طرح چیخ رہا تھا۔ تڑپ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے پوری کمر پر زخم ہوں۔ اور ان زخموں پر نمک اور مرچیں چھڑک دی گئی ہوں۔ ایسی اذیت جو برداشت سے باہر تھی۔

سردار نے موبائل پر کہا۔ ”سن اپنے شوہر کی چیخ۔ اب بول۔“

دوسری طرف سے کچھ سن کر اس نے ایک موٹی سی گالی دیتے ہوئے موبائل میری طرف بڑھا دیا۔ ”لے۔ اب بات کر۔“

مارے تکلیف کے مجھ سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے موبائل تھام لیا۔ اس وقت میں رو بھی رہا تھا۔ ”خاتون، تم کیوں ایک بے گناہ کے پیچھے پڑی ہو۔ ان کو بتا کیوں نہیں دیتیں کہ میں تمہارا شوہر جنجوعہ نہیں ہوں۔ کوئی اور ہوں۔“

”خدا کے لیے ایسی بات نہ کریں۔“ اس عورت نے کہا۔ ”ہم نے اس ڈاکو کو اسی ہزار کی آفر دے دی ہے۔ اس کو سمجھائیں۔ وہ آپ کو چھوڑ دے گا۔ اس سے کہیں اسی ہزار میں مان جائے۔“

سردار نے پھر موبائل لے لیا۔ اور اس بار اس نے جو کچھ سنا اس نے واقعی اس کا دماغ پھیر دیا ہوگا۔ وہ برا بھلا بھی کہہ رہا تھا۔ گالیاں بھی دے رہا تھا اور خوفناک نتائج کی دھمکیاں بھی دے رہا تھا۔ ظاہر ہے وہ خوفناک نتائج کس کے ساتھ پیش آتے؟ میرے ساتھ۔ وہ کم بخت جنجوعہ تو نہ جانے کہاں مر کھپ گیا ہوگا۔ لیکن اس کی جگہ میں عذاب برداشت کر رہا تھا۔

مجھے ایک بار پھر اس کوٹھری میں پہنچا دیا گیا۔

تکلیف سے چٹائی پر لیٹنا بھی محال ہو رہا تھا۔ کیسی مصیبت میں پھنس گیا تھا اور وہ بھی بس یوں ہی۔ بغیر کسی سبب کے۔ اب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہوگا کیا۔

وہ عورت تو کسی طرح مجھے کوئی اور ماننے کو تیار ہی نہیں تھی۔ وہ تو مجھے جنجوعہ ہی کہے جا رہی تھی۔ اگر خود اس کا شوہر بھی کہیں غائب ہو گیا تھا تو اس میں میرا کیا قصور تھا؟

پتا نہیں... یہ کم بخت اور اس کے آدمی کس قسم کے تھے ان لوگوں کے پاس تو بہت کنفرم اطلاع ہوا کرتی ہے۔ یہ صرف اس بندے پر ہاتھ ڈالتے ہیں جس سے ان کو مطلب ہوتا ہے۔ میرے سلسلے میں انہیں اتنا بڑا دھوکا کیسے ہو گیا تھا۔

وہ دن اور وہ پوری رات اسی تکلیف میں گزر گئی۔ کم بختوں نے میرے علاج کی طرف بھی توجہ نہیں دی تھی۔ دوسری صبح ایک بار پھر میں اس جلاد کے سامنے تھا۔

اس بار چبوترے کے سامنے ایک کرسی بھی رکھی تھی۔

”بیٹھ جاؤ۔“ سردار نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

میں خاموشی سے بیٹھ گیا۔ ایک ڈاکو میرے لیے چائے لے آیا تھا۔ ”چائے پی لو۔“ سردار نے کہا۔ ”بعد میں بات کریں گے۔“ میں نے چائے کے گھونٹ لینے شروع

کردیے۔ کچھ دیر بعد سردار نے مجھے مخاطب کیا۔ ”دیکھو، تمہاری بیوی تمہارے ساتھ زیادتی کر رہی ہے۔“ سردار نے کہا۔ اس کا لہجہ بہت نرم تھا۔

”دیکھیں سردار، میں آپ سے سچ کہہ رہا ہوں اس عورت سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی میں جنجوعہ ہوں۔“

”دیکھو نرمی سے بات کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ تم اپنی بکواس کرتے رہو۔“ سردار نے کہا۔ ”اگر تم نے یہ بولنا نہیں چھوڑا تو میرا دماغ پھر جائے گا۔ چپ چاپ میری بات سنتے رہو۔“

”چلیں سنائیں۔“ میں نے بے بسی سے گردن جھکالی۔

”تم اس بے وقوف کو یہ بتاؤ کہ ہم تمہارے ساتھ بہت ظلم کررہے ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”مار مار کر تمہاری کھال ادھیڑ دی ہے۔ اب اگر اس نے بات نہیں مانی تو ہم تمہاری ایک انگلی کاٹ کر اس کے پاس بھیج دیں گے۔“

”کیا۔“ مجھے ٹھنڈے پسینے آنے لگے تھے۔ ”کیا کہہ رہے ہو سردار۔“ میں رو دینے والی آواز میں بول رہا تھا۔ ”میری انگلی کاٹ کر۔“

”ہاں، چھوٹی انگلی۔“ اس نے بہت اطمینان سے بتایا۔ ”شروع میں تکلیف ہوتی ہے۔ پھر ہم درد دور کرنے والی دوائی لگا دیتے ہیں۔“

”اس کے بعد کیا ہوتا ہے۔“ میں نے لرزتے ہوئے پوچھا۔

”عام طور پر پہلی ہی انگلی سے کام چل جاتا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”اگر گھر والے پھر بھی نہ مانیں تو پھر دو انگلیاں ایک ساتھ کاٹ کر بھیج دیتے ہیں۔“

”دیکھیں سردار، آپ چاہے میرے پورے جسم کے ٹکڑے کرکے بھیج دیں۔ وہ نہیں مانیں گے۔ کیونکہ ان کا مجھ سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ میں ان کا جنجوعہ نہیں ہوں، بلکہ ایک دوسرا بدقسمت انسان ہوں جو غلطی سے آپ لوگوں کے ہتھے لگ گیا ہے۔“ سردار نے اشارہ کیا کہ مجھے وہاں سے اٹھالیا جائے۔

اس کے آدمی ایک بار پھر مجھے اس کوٹھری میں چٹائی پر پھینک گئے۔ اپنی بے بسی پر بری طرح رونا آرہا تھا۔ ان سے نجات کی کوئی صورت ہی نظر نہیں آرہی تھی۔

میں تو بالکل ہی بے آسرا آدمی تھا۔ اگر میرے پاس کچھ روپے ہوتے تو میں جنجوعہ نہ ہوتے ہوئے بھی اپنی جان چھڑانے کے لیے وہ پیسے ان کم بختوں کے حوالے کردیتا۔

لیکن کیا کیا جائے۔ نہ تو میں جنجوعہ تھا اور نہ ہی میرے پاس پیسے تھے۔ نہ جانے وہ کم بخت عورت کیوں میرے پیچھے پڑگئی تھی۔ وہ صرف یہ تصدیق کردیتی کہ میں جنجوعہ نہیں ہوں تو میری جان چھوٹ جاتی لیکن وہ تو مجھے جنجوعہ بنانے پر تل گئی تھی۔

اس دن مجھے چھیڑا نہیں گیا۔ رات کا کھانا بھی بہت زبردست تھا۔ بریانی اور قورمہ نہ جانے کہاں سے لے کر آئے تھے۔ شاید قربانی سے پہلے جانوروں کو کھلایا پلایا جاتا ہے۔ وہی حال میرا ہونے والا تھا۔

اس تصور سے روح کانپنے لگی تھی کہ شام کے وقت میری انگلی کاٹ دی جائے گی۔ اس کے بعد دو اور انگلیاں۔ اس کے بعد۔ اس کے بعد میرا کیا حشر ہونے والا ہے کسے خبر۔

میں یہ بتا چکا ہوں کہ میں ایک غریب قسم کا آدمی تھا۔ ایک فرم تھی جس کی مارکٹنگ کے شعبے سے میرا تعلق تھا اور میں فرم کے کام ہی سے لاہور جارہا تھا۔ ویسے بھی اکثر جاتا ہی رہتا تھا لیکن کبھی اس قسم کی کوئی کہانی میرے ساتھ نہیں ہوئی تھی۔

معمولی سی تنخواہ تھی جس پر گزر ہورہا تھا۔ اگر یہ مان بھی لیتے کہ میں جنجوعہ نہیں بلکہ محمود شاہ ہوں تو ہوسکتا تھا کہ پھر محمود شاہ کی آزادی کے بدلے تاوان طلب کرتے اور دو کروڑ تو بہت دور کی بات ہے میرا... پورا خاندان مل کر بیس لاکھ بھی جمع نہیں کرسکتا تھا۔

اس قید میں مجھے صرف ایک کا خیال تھا اور وہ تھی حمیرا۔ جس سے میری منگنی ہوچکی تھی۔ اور اس سال ہم شادی کرنے والے تھے۔

حمیرا ایک اسکول میں ٹیچر تھی۔ ہمارے خواب بھی کوئی لمبے چوڑے نہیں تھے۔ ہمیں ایک عام سی زندگی گزارنی تھی۔ اور اس عام سی زندگی کے لیے ہم دونوں کی انکم بہت مناسب تھی۔ ہم ایک چھوٹا سا گھر لے کر آرام سے رہ سکتے تھے۔

اب تک تو اس بے چاری کو میرے اغوا کی داستان معلوم ہوگئی ہوگی۔ بہت ممکن ہے کہ بس والوں نے لاہور پہنچ کر یہ خبر دے دی ہو۔ اور میڈیا نے اس خبر کو دکھایا یا شائع بھی کیا ہو۔

لیکن اس کے بعد کیا ہوا ہوگا۔ کچھ بھی نہیں۔ ذرا سی دیر کے لیے پولیس نے ہاتھ پاؤں مارے ہوں گے۔ پھر خاموش ہوکر پولیس والے بیٹھ گئے ہوں گے۔

میں اس معاشرے میں ایک غیر اہم آدمی تھا۔ جب بڑے بڑے اہم لوگوں کی خبریں گرد بن کر رہ جاتی ہیں تو مجھ غریب کی کیا حیثیت تھی۔

یہ ڈاکو میری بوٹیاں کردیتے اور میں انہیں یقین دلاتا رہ جاتا کہ میں جنجوعہ نہیں ہوں۔ یہ کب یقین کرنے والے تھے۔ مجھے جنجوعہ بنانے میں سب سے بڑا ہاتھ جنجوعہ کی بیوی کا تھا۔ وہ کم بخت یہ مان کر نہیں دے رہی تھی کہ میں کوئی اور ہوں۔ وہ میری آواز سن کر بھی مجھے جنجوعہ ہی کہتی رہی تھی۔

کیا اس کا دماغ خراب ہوگیا تھا؟ یا خود اس کا جنجوعہ کہیں غائب تھا۔ نہیں، بات کچھ اور تھی۔ اور وہ بات میری سمجھ میں آتی جارہی تھی۔

بات صرف اتنی تھی کہ اس کم بخت جنجوعہ کو اپنے اغوا کا یقین ہوگیا۔ جب اس کی جگہ کوئی اور بندہ اغوا ہوگیا تو ان دونوں میاں بیوی نے مل کر یہ ڈراما رچا دیا۔ تاکہ اغوا کرنے والوں کا دھیان میری طرف لگا رہے اور وہ خاموشی سے غائب ہوجائیں۔ بلکہ ابھی تک تو وہ غائب بھی ہوچکے ہوں گے۔ ہوسکتا ہے کہ ملک ہی چھوڑ گئے ہوں۔ ایسی صورت میں یہی ہوا کرتا ہے۔

یہ سردار تو کسی طرح بات ماننے کو تیار ہی نہیں ہورہا تھا۔

اس رات ایک معجزہ ہی ہوگیا۔ سردار خود میرے کمرے میں آیا تھا۔ اس کو دیکھ کر میں لرز اٹھا تھا۔ ”گھبراؤ نہیں۔“ اس نے مسکرا کر کہا ”تم آؤ میرے ساتھ۔“

میں اس کے ساتھ ہولیا۔ ہمارا رخ اس چبوترے کی طرف تھا جہاں اس کے کئی ساتھی بھی کھڑے ہوئے تھے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ میری انگلیوں کی قربانی کا وقت آگیا ہے۔

”بیٹھ جاؤ۔“ اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا اور خود چبوترے پر بیٹھ گیا۔

اس دوران اس کے آدمیوں نے ہمارے سامنے ایک میز لاکر رکھ دی۔ پھر رات کا کھانا آگیا۔ اس رات کھانے میں بہت کچھ تھا۔ بریانی قورمہ اور چکن تکا کے ساتھ ساتھ کھیر بھی تھی۔

”چلو شروع ہوجاؤ۔“ سردار نے اشارہ کیا۔ ”تمہارے لیے ایک اچھی خبر ہے۔“

”خدا کے لیے بتادیں سردار۔“ میں نے کہا۔ ”پھر میرا کچھ کھانے میں بھی دل لگے گا۔“

”وہ خبر یہ ہے کہ ہمارے آدمیوں نے اصل جنجوعہ کا پتا لگالیا ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”تم واقعی کوئی اور ہو اور میرے

کیا آپ
لبوب مقوی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے۔ اعصابی کمزوری دور کرنے۔ ندامت سے نجات، مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے۔ کستوری، عنبر، زعفران جیسے قیمتی اجزاء سے تیار ہونے والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ یعنی ایک انتہائی خاص مرکب خدارا۔۔۔ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے اور خاص لمحات کو خوشگوار بنانے کیلئے۔ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ آج ہی صرف ٹیلیفون کرکے بذریعہ ڈاک VP وی پی منگوالیں۔

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی طبی یونانی دواخانہ)
ضلع وشہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0301-6690383
فون صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک کریں

WWW.PAKSOCIETY.COM

آدمی تمہیں غلطی سے اٹھا کر لے آئے تھے۔"

واہ! ایک لمحے میں مجھے نئی زندگی کی نوید مل چکی تھی۔

میں ایک دم سے ہلکا ہو گیا تھا۔ سارا بوجھ جیسے ایک ہی پل میں اتار کر ایک طرف پھینک دیا گیا ہو۔ میرے اندر کا پوشیدہ پُرمزاح محمود شاہ ایک دم سے بے دار ہو گیا تھا۔

میں ایک بذلہ سنج اور پُرمزاح انسان تھا۔ ہزاروں لطیفے یاد تھے مجھے۔ میرے احباب مجھے بلبل ہزار داستان کہا کرتے لیکن اس قید میں آنے کے بعد میں خوف اور دہشت سے بجھ کر رہ گیا تھا۔

ہنسی تو بہت دور کی بات ہے، میرے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ بھی نہیں آیا کرتی تھی۔ ظاہر ہے ان حالات میں سوائے اپنی موت کے انتظار کے اور کیا ہو سکتا تھا۔

میں نے کھانے کے بعد سردار کی طرف دیکھا۔ "سردار، اب بتائیں اب میرے لیے کیا حکم ہے۔"

"حکم کیا ہے بابا۔" سردار مسکرا دیا۔ "کل صبح تم جا رہے ہو یہاں سے۔ میرے بندے تمہیں بس تک بٹھا آئیں گے۔ اور تمہیں میں اپنی طرف سے ایک لاکھ روپے بھی دوں گا۔ وہ اس بات کا کہ تم یہاں خوار ہوتے رہے ہو۔"

اب تو میں ترنگ میں آ چکا تھا۔

اس دوران چائے بھی آ گئی۔ اور میں نے اپنی فطرت اور عادت کے مطابق چائے پینے کے دوران سردار کو دس بارہ لطیفے سنا دیے۔

سردار اور اس کے ساتھی میرے لطیفوں کو سن کر ہنس ہنس کر بے حال ہو گئے تھے۔ ان کی خوشیاں دیکھنے والی تھیں انہیں شاید برسوں کے بعد ایسا موقع ملا ہو گا کہ وہ اتنا ہنس رہے ہوں گے۔

سردار تو میرا گرویدہ ہو کر رہ گیا تھا۔ "ارے بابا، تم نے اپنا یہ فن کہاں چھپا کر رکھا ہوا تھا۔"

"میرا یہ فن تمہارے خوف سے ایک طرف جا کر چھپ گیا تھا سردار۔" میں نے بتایا۔

میری اس بات پر پھر ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا۔ یہ ہنسی رات گئے تک جاری رہی۔ پھر مجھ سے کہا گیا کہ میں اپنے کمرے میں جا کر آرام کروں۔

میں اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ اس وقت میں بے انتہا خوش تھا۔ اچانک ہی سارا ماحول بدل کر رہ گیا تھا۔ اب میں ایک طرح سے ان خوفناک لوگوں کا دوست بن گیا تھا۔

نہ جانے کس وقت نیند آ گئی تھی۔

دیر تک سویا رہا۔ خود سردار نے آ کر جگایا تھا مجھے۔

"کیا بات ہے شہزادے۔" اس نے کہا۔ "کیا بہت دیر تک جاگتے رہے ہو۔"

"ہاں سردار! یہ سوچ کر خوشی سے نیند نہیں آ رہی تھی کہ آج مجھے جانا ہے۔"

"لیکن تم تو کہیں نہیں جا رہے۔" سردار نے کہا۔

"کیا؟" میں جیسے مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ "سردار! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ نے تو مجھے چھوڑ دینے کا وعدہ کیا تھا۔"

"ہاں وعدہ تو کیا تھا لیکن اب معاملہ کچھ اور ہو گیا ہے۔"

"اب کون سی نئی بات ہو گئی۔"

"دیکھ بھائی، بات یہ ہے کہ ہم لوگوں کی زندگی میں کوئی تقریب نہیں ہے، کوئی خوشی نہیں ہے۔ تم نے کل رات جس طرح ہم لوگوں کو ہنسایا ہے تو ہم پھر سے جوان ہو گئے۔ ہم اپنے سارے دکھ بھول گئے۔ ہمیں تمہاری وجہ سے نیا حوصلہ مل گیا، نئی زندگی مل گئی۔ تم خود سوچو ہم تمہیں کس طرح جانے دیں۔ تم ہمارے لیے خوشی بن کر آئے ہو تو ہم اپنی خوشی کو کیسے جانے دیں۔"

"ارے خدا کے لیے رحم کرو مجھ پر۔" میں نے واویلا شروع کر دیا۔ "مجھے واپس جانے دو۔"

"بس...! اب کچھ مت بولنا۔" وہ زور سے دہاڑا۔ "ورنہ میرا دماغ پھر جائے گا۔"

اور میں اس کے دماغ پھر جانے کے خوف سے پھر خاموش ہو گیا۔

بات صرف پانچ دنوں کی تھی۔ یعنی ٹھیک پانچویں دن مجھے رہائی مل جاتی لیکن انہوں نے مجھے پورے پانچ برس۔۔ کے بعد جانے کی اجازت دی تھی۔ میں پانچ برس تک ان ڈاکوؤں کے ساتھ رہا تھا۔

پھر ایک دن مجھے چھوڑ دیا گیا۔

اس کے بعد میرے ساتھ کیا بیتی۔ وہ ایک الگ کہانی ہے لیکن اب حال یہ ہے کہ دوستوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے اگر کسی دوست کو کوئی لطیفہ یاد آ جائے اور وہ مجھے سنانے کی کوشش کرے تو میں اسے گالیاں دے کر کہتا ہوں کہ خبردار! مجھے لطیفہ مت سنانا۔ اگر سنایا تو میرا دماغ پھر جائے گا۔"

❖

دوہرا معیار

محترم مدیر سرگزشت
سلامِ تہنیت!
لوگ ہر کام کے لیے دوہرا معیار رکھتے ہیں۔ یہ بات میں نے قدم قدم پر محسوس کی ہے۔ ایک ہومیوڈاکٹر ہونے کی وجہ سے محلے بھر کی عورتیں مجھ سے قریب ہیں۔ ان لوگوں کے ذریعہ میں پورے معاشرے کی تصویر دیکھ چکی ہوں۔ ایسا ہی ایک واقعہ پیشِ خدمت ہے۔

ڈاکٹر مہرین مہرو
(فیصل آباد)

یوں تو میں روزانہ ہی اپنا کلینک تو سوا نو بجے بند کر دیتی تھی۔ بیس بائیس برسوں سے یہ معمول تھا۔ میری پریکٹس خوب چل رہی تھی۔ یہ کلینک محلے میں ہی دو کمروں کے کوارٹر میں تھا۔ اس کالونی میں پس ماندہ اور متوسط طبقہ رہتا تھا۔ لیکن جب سے ملک میں چینی، آٹے، بجلی اور سیاست کے بحرانوں نے جنم لیا ہے تب سے میں ساڑھے دس اور پونے گیارہ بجے اٹھنے لگی تھی۔ کیونکہ مریضائیں جو آتی تھیں وہ مہنگائی اور بحرانوں کے موضوع پر بات کر کے، سوالات کر کے دل کا بوجھ ہلکا کرتی تھیں۔ تھوڑی دیر کے لیے وہ بھول جاتی تھیں کہ انہیں کیا مرض ہے اور وہ کس لیے آئی ہیں۔

"باجی! یہ کیسی حکومت ہے جو شوگر مافیا کے آگے بے بس ہو گئی ہے اور اس کا اعتراف بھی کر رہی ہے۔"

میں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی رو میں بولے جا رہی تھی۔ "خدانخواستہ کسی دشمن نے ملک پر حملہ کر دیا تو کیا ہماری حکومت یہ کہہ کر ہتھیار ڈال دے گی کہ ہم دشمن سے اس لیے نہیں لڑ سکتے اس کے پاس جدید ترین ہتھیار اور

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس کی پشت پر غیر ملکی طاقتیں ہیں؟ ہم پہلے انگریزوں کے غلام تھے اب ڈالروں کے غلام ہیں اور کشکول لیے بھیک مانگتے پھر رہے ہیں۔ آنکھیں بند کر کے ذلت آمیز شرائط مان رہے ہیں؟"

"تمہاری باتیں سو فیصد صحیح ہیں۔" میں نے کہا۔

"جی باجی، یہ لوگ جو غریب عوام کو لوٹ کھسوٹ رہے ہیں کیا یہ پیسا قبر میں لے جائیں گے؟ کیا دنیا کے کسی ملک میں ایسا ہوتا ہے کہ روزانہ کئی گھنٹوں کی لوڈ شیڈنگ ہو اور بجلی کے نرخ بھی بڑھا دیے ہیں؟ اوپر سے نیچے تک ہر کسی کو لوٹ کھسوٹ کا لائسنس ملا ہوا ہے۔ احتساب کرنے والا کوئی نہیں ہے۔"

جب سے ہر گھر میں ٹی وی آیا ہے اس نے خصوصاً عورتوں میں احساس اور شعور پیدا کر دیا ہے۔ دو تین برس پہلے یہ مریض عورتیں ایسے موضوع پر بات نہیں کرتی تھیں۔ صرف دوا لے کر چلی جاتی تھیں۔ اب جو بھی آتی ہے وہ دل کی بھڑاس نکال کر ہی جاتی ہے۔ میں سن کر ہوں ہاں کرتی رہتی تھی۔ وہ جو کچھ کہتی تھیں وہ غلط نہ تھا۔ چونکہ ان کی باتیں سننا پڑتی تھیں اس لیے دیر ہو جاتی تھی۔ وہ اپنے گھریلو مسائل بھی بیان کر جاتی تھیں۔

رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ میں آخری مریضہ کو دوا دینے کے بعد اسے پرہیز کے بارے میں بتا رہی تھی کہ میری پڑوسن زاہدہ میری کلینک میں داخل ہوئی۔ اس کا چہرہ بجھا ہوا تھا۔ اس پر ایک افسردگی سی چھائی ہوئی تھی جو اس کی آنکھوں سے بھی عیاں تھی۔ پھر وہ بڑی خاموشی سے خالی کرسی پر جا بیٹھی۔ وہ آج میرے کلینک میں ایک مہینے میں دوسری مرتبہ آئی تھی۔ مگر میرے گھر میں دن میں دو تین مرتبہ کسی نہ کسی کام سے آتی رہتی تھی۔ جب وہ شام کے وقت آئی تھی تو مریضوں کا بہت رش تھا۔ تب وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں رکی واپس چلی گئی۔ اب آئی تو آخری مریضہ تھی۔ اس لیے وہ چپ چاپ ایک طرف بیٹھ گئی۔

اس مریضہ کے جانے کے بعد میں نے زاہدہ کی طرف دیکھا۔ اس کی نظریں فرش پر گڑی ہوئی تھیں۔ وہ گم صم بیٹھی تھی جیسے کہیں کھو گئی ہو یا پھر یہاں آ کر سب کچھ بھول گئی ہو۔ وہ بہت گری گری اور اندر سے ٹوٹی ٹوٹی سی لگ رہی تھی۔ میں نے میز کی دراز سے رقم نکال کر گنے بغیر ہی پرس میں رکھ دی۔ پھر میں نے پرس کی زپ لگاتے ہوئے گہرے سکوت کو توڑا۔ "زاہدہ! کیا بات ہے۔ آج تم کچھ پریشان دکھائی دے رہی ہو؟ خیریت تو ہے نا؟"

وہ چونک کر خیالوں کی دنیا سے نکل آئی اور دبی زبان سے بولی۔ "ہمارے نصیبوں میں بد نصیبی ہی تو لکھی ہے۔"

"خیریت تو ہے؟" میں نے میز کی دراز بند کرتے ہوئے کہا۔

"خیریت؟" اس نے میری طرف متوحش نظروں سے دیکھا۔ "بس خیریت ہی نہیں ہے آپا...... میں آپ کے پاس اس وقت......" اس کی آواز جیسے حلق میں اٹک رہی تھی۔ وہ صرف اتنا ہی کہہ سکی۔

میں اپنی کرسی سے اٹھ کر اس کے پاس والی کرسی پر جا بیٹھی "کیا بات ہے بولو؟"

چند لمحے گہری خاموشی طاری رہی۔ اس نے اچانک اٹھ کر کلینک کا بیرونی دروازہ بند کر دیا۔ پھر اپنی کرسی پر آ بیٹھی اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہا۔ "میں آپ سے ایک بات......" اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

آج اس کی باتوں کا انداز بہت عجیب اور پُراسرار سا تھا۔ اس نے مجھ سے کبھی اس انداز سے بات نہیں کی تھی۔ میں نے بڑی نرمی سے کہا۔ "کہو...... کیا کہنا چاہتی ہو......؟ ہم دونوں کے سوا یہاں کوئی نہیں ہے؟"

اس نے پہلے اس دروازے کی طرف دیکھا جو میرے گھر کے اندر کھلتا تھا۔ پھر وہ میری طرف جھک کر سرگوشی میں بولی۔

"میں آپ کے پاس بہت امید لے کر آئی ہوں۔" پھر اس نے توقف کر کے ایک گہری سانس لی۔ "آپ مایوس تو نہیں کریں گی نا؟"

معلوم نہیں اس نے مجھ سے کیا توقع وابستہ کی ہوئی تھی۔ میں کچھ اندازہ نہ کر سکی کہ وہ میرے پاس کیا امید لے کر آئی ہے۔ کہیں وہ بڑی رقم مانگنے تو نہیں آئی ہے؟ میں تو ایک معمولی سی لیڈی ہومیو پیتھک ڈاکٹر تھی۔ میں نے انسانیت کی خدمت کے لیے یہ شفا خانہ کھولا تھا۔ کوئی بیس برس کے لمبے عرصے سے چلا رہی تھی۔ شام چھ بجے سے رات نو بجے تک یہ شفا خانہ کھلا رہتا تھا۔ بہت معمولی رقم دوا کے عوض لیتی تھی۔ میرے پاس غریب اور متوسط طبقے کی لڑکیاں اور عورتیں علاج معالجے کی غرض سے آتی تھیں۔ جبکہ زاہدہ پروین کے شوہر کی دکان جو مارکیٹ میں تھی وہ خوب چلتی تھی۔ باپ اور بیٹا مل کر اسے چلا رہے تھے۔ خوش حالی، آسودگی اور فراغت تھی۔ کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ وہ مجھ سے مالی مدد کیا لے سکتی تھی۔

"اگر میرے بس میں ہوا تو تمہیں مایوس نہیں کروں گی۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں مرکوز کر دیں۔

"آپ کے بس میں تو ہے......" اس نے اپنا سر کسی مجرم کے انداز میں جھکا لیا۔ اس کے بشرے سے پتا چل رہا تھا کہ دل کی بات زبان پر لانے میں اسے تذبذب سا ہو رہا ہے۔ میں دل میں حیران تھی کہ آخر ایسی کون سی بات ہے جو وہ کہنے سے ہچکچا رہی ہے۔ پھر اس نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ "مجھے زہر چاہیے۔"

"زہر......؟" میں ایک دم سے اچھل پڑی۔ میرے سارے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ دوسرے لمحے مجھ پر سکتہ سا چھا گیا۔ میں اپنی جگہ دم بخود بیٹھی رہی۔ چند لمحوں کی اذیت ناک خاموشی کے بعد پوچھا۔ "زہر کس لیے چاہیے؟ اپنے لیے یا کسی دوسرے کے لیے؟"

اس نے اپنا جھکا ہوا سر آہستہ سے اوپر اٹھایا۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں سے حزن و ملال جھانک رہا تھا۔ وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتی ہوئی میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ "خانم کو دینے کے لیے۔"

"خانم کو......؟" مجھے بجلی کا سا جھٹکا لگا۔ میرا سارا وجود کانپ اٹھا۔ "زاہدہ......! تم اپنی بیٹی کو زہر دو گی......؟"

"ہاں ......" اس نے سر ہلایا۔ "پھر میں بھی زہر کھا لوں گی......"

"تمہارا دماغ ٹھکانے ہے......" میں نے تیز لہجے میں کہا۔

"میرا دماغ ٹھکانے نہیں ہے آپا!" وہ بے یقینی کے لہجے میں بولی۔ "دکھ کی...... ستم کی...... صدمے کی...... ذلت و رسوائی کی بھی تو حد ہوتی ہے۔ اس کے سوا کوئی راستہ بھی نہیں رہا کہ میں اپنی بیٹی کو زہر دے دوں اور خود بھی زہر کھا لوں۔"

"آخر ہوا کیا......؟" میرے حواس کام نہیں کر رہے تھے۔ "کہیں خانم کوئی لغزش تو نہیں کر بیٹھی۔"

"ہوا یہ کہ آج جو لوگ خانم کو دیکھنے آئے تھے انہوں نے بھی اسے ناپسند کر دیا۔" وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔

"اتنی سی بات پر تم اپنی بیٹی کو زہر دینا چاہتی ہو۔" میں نے گہری سانس لی۔ "زاہدہ......! تم نے تو مجھے دہلا دیا۔ خدا کے لیے آئندہ ایسی اور اس انداز سے باتیں نہ کرنا۔" میں نے عرق آلود پیشانی صاف کی۔

"آپ کے نزدیک یہ اتنی سی بات ہے آپا......!" اس کی آواز میں صرف دکھ اور لرزیدگی ہی نہیں تھی بلکہ سارے جہاں کا درد اور کرب ناک اذیت تھی۔ "پورے دس برسوں سے میری بیٹی کو دنیا والوں نے تماشا بنا رکھا ہے۔ اسے قربانی کا جانور سمجھ لیا ہے۔ نفرت اور حقارت سے اسے دیکھا جا رہا ہے۔ اسے ذلیل کیا جا رہا ہے۔ اس لیے کہ......" وہ سانس لینے رکی۔ اس کی سانسیں پھول رہی تھیں۔ اس کا چہرہ تمتما اٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں گھٹا چھا گئی۔ وہ جذبات کی رو میں بہنے لگی۔ "وہ کالی ہے...... کیا ایک لڑکی کا کالا ہونا اس دنیا میں سب سے بڑا جرم ہے؟ کیا ایک کالی لڑکی انسان نہیں ہوتی؟ اس کے سینے میں دل نہیں ہوتا؟ اس کے جذبات و احساسات نہیں ہوتے؟ کیا اسے خواب دیکھنا نہیں چاہیے؟ کیا یہ اس کا حق نہیں ہے کہ اس کا بھی اپنا گھر ہو؟"

"ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے زاہدہ!" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "اس کا وقت آئے گا تو اس کی شادی ہو جائے گی۔ اس کا گھر بھی بس جائے گا۔ تم خدا کی ذات سے ناامید کیوں ہوتی ہو؟"

"میں اسی امید پر...... پورے دس برس سے اپنے دل کو تسلی دے رہی ہوں، سمجھا رہی ہوں، خود فریبی میں مبتلا ہوں۔" وہ ایک سرد آہ بھر کے شکستہ لہجے میں بولی۔ "آخر میں کب تک اپنے آپ کو جھوٹی تسلیاں اور فریب دیتی رہوں گی؟ وہ پورے اٹھائیس برس کی ہو رہی ہے۔ اس کی عمر ڈھل رہی ہے۔ دس سالوں سے میری بیٹی میرے سینے میں خلش کے خنجر کی طرح پیوست ہے۔ آخر کب تک میری بیٹی یہ زہر پیتی رہے گی؟ آخر کب تک یہ انگارا میرے وجود پر دہکتا رہے گا۔"

"یہ ایک تمہاری... بیٹی کا مسئلہ تو نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "کون سا گاؤں، شہر اور قصبہ ہوگا جہاں ایسی لڑکیاں بیٹھی ہوئی نہیں ہیں...... یہ ہر گھر کا مسئلہ ہے ایک نہیں، ہزاروں، لاکھوں لڑکیوں کا مسئلہ ہے۔ وہ والدین کے سینے پر چٹان جیسا بوجھ بنی ہوئی ہیں...... تم اس منجدھار میں اکیلی نہیں ہو...... پھر کیوں غم کرتی ہو۔"

"لوگ لڑکی کی صورت کیوں دیکھتے ہیں...... سیرت کیوں نہیں دیکھتے؟ کیا سیرت کے لحاظ سے میری بیٹی لاکھوں میں ایک نہیں ہے؟ کتنی سگھڑ اور سلیقہ مند ہے۔ کھانے کیسے شاندار، عمدہ اور لذیذ بناتی ہے۔ سلائی کڑھائی میں کتنی ماہر ہے؟ اس نے گھر کو کیسا جنت کا نمونہ بنا رکھا ہے؟ یہ آپ اچھی طرح جانتی ہیں۔"

"ہاں! میں جانتی ہوں۔" میں نے سر ہلایا "خانم ایک

WWW.PAKSOCIETY.COM

انمول ہیرا ہے۔ ایسے ہیرے دنیا میں بہت کم ہوں گے۔"

"پھر ہر لڑکے کی..... ماں چاند سی دلہن کی تلاش ہی میں کیوں نکلتی ہے؟ وہ کالی لڑکی کے اجلے من اور اس کی سیرت کو کیوں نہیں دیکھتی اور ظاہری چیزوں پر جان کیوں دیتی ہے؟ یہ جانتے ہوئے بھی کہ حسین بہوئیں اور بیویاں، ساس اور شوہروں کی خدمت نہیں کرتی ہیں بلکہ انہیں تگنی کا ناچ نچاتی ہیں۔ پھر ان کے حُسن کا سحر جلد ہی ماند پڑ جاتا ہے۔ اس لیے کہ انہیں اپنے حسن پر بڑا ناز و غرور ہوتا ہے۔ سیرت نہیں ہوتی ہے۔ وہ اپنے آگے کسی کو کچھ نہیں سمجھتی ہیں اور اپنے شوہروں کو ان کے ماں باپ اور بھائی بہن سے چھین کر لے جاتی ہیں۔ اپنا الگ گھر بسا لیتی ہیں...... محلے میں ایسی کتنی مثالیں موجود ہیں۔ وہ حسین لڑکیوں کو بیاہ کر.... آج تک پچھتا رہی ہیں۔ پھر بھی لڑکے کی ماں اور بہنیں ایسی ہی لڑکیوں کے پیچھے کیوں بھاگتی ہیں؟"

"یہ اپنی اپنی پسند کی بات ہے۔"

"یہ کیسی پسند ہوتی ہے آپا!" اس کے لہجے میں تلخی تھی۔ یہ کالا رنگ یوں تو ہر کسی کو بہت پسند ہوتا ہے۔ کالی کالی آنکھیں...... کالے بال...... کالے رنگ کی گاڑی...... کالے رنگ کا قلم...... کالا فرنیچر اور بہت ساری چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو کالے رنگ کی وجہ سے اپنے اندر حُسن اور کشش رکھتی ہیں اور رنگ کی وجہ سے پسند بھی کی جاتی ہیں۔ پھر کالی لڑکی پسند کیوں نہیں کی جاتی؟"

زاہدہ کی بیٹی خانم ہر لحاظ سے لاکھوں میں ایک تھی۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسی سلیقہ مند، سگھڑ، صابر و شاکر لڑکی شاید ہی کوئی دیکھی ہو۔ گھر میں نوکر نہ تھا سارے کام وہ خود ہی کرتی تھی۔ ایک منٹ کے لیے بھی اسے فارغ بیٹھا نہیں دیکھا۔ گھر آئینے کی طرح چمکتا تھا۔ کھانے ایسے.... لذیذ اور ذائقے دار پکاتی تھی کہ کھانے والا انگلیاں چاٹ لے۔ اس کے علاوہ کفایت شعاری کا ہنر بھی جانتی تھی۔

ان تمام خوبیوں کے باوجود آج تک اس کی شادی نہ ہوسکی تھی۔ کہیں رشتہ نہ طے ہوسکا۔ اس کی اچھائیوں پر اس کے کالے رنگ نے پردہ ڈال دیا تھا۔ یوں تو اس کے سلیقے اور سیرت کا چرچا رشتہ داروں اور ملنے والوں میں تھا۔ کون ایسا تھا جو اس کی تعریف نہ کرتا ہو۔ مثال نہ دیتا ہو، مگر کوئی بھی اسے اپنی بہو بنانے کے لیے تیار نہ تھا۔

میں جب کبھی خانم کے بارے میں سوچتی تو میرے دل میں دکھ کی لہر اٹھتی۔ خانم میری بیٹی نہ تھی مگر میں اسے بیٹی سے بھی بڑھ کر چاہتی تھی۔ میں سوچتی تھی کہ کاش! میں اس بچی کے لیے کچھ کرسکتی۔ میرے اختیار میں ہوتا تو دنیا کے سب سے خوبصورت مرد سے اس کی شادی کرا دیتی۔

آخر اس کے نصیب جاگ اٹھے۔ ایک روز اس کا رشتہ طے ہوگیا۔ لڑکا کسی بینک میں ملازم تھا۔ وہ خوبصورت تو نہ تھا لیکن قبول صورت اور وجیہہ تھا۔ عمر بھی زیادہ نہ تھی۔ وہ دنیا کا خوش نصیب ترین لڑکا تھا جسے خانم جیسی لڑکی کی رفاقت ملی تھی۔ مجھے اس لڑکے پر بڑا رشک آیا۔ آخر ایک جوہری نے کھرے کھوٹے کی تمیز کرلی تھی۔ ایک ہیرے کی قدر جان لی تھی۔

زاہدہ نے خانم کی شادی بڑی دھوم دھام سے کی۔ اس نے پیسا پانی کی طرح بہایا۔ جہیز ایسا شاندار اور بیش قیمت دیا کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ وہ دل کھول کر خرچ کیوں نہ کرتی۔ آخر اس کی ایک ہی بیٹی تھی۔

شادی کو چھ ماہ کا عرصہ پلک جھپکتے گزر گیا۔ میں زاہدہ کے ساتھ دو ایک مرتبہ خانم کی سسرال گئی۔ اس کی سسرال کا کون سا ایسا فرد تھا جس نے خانم کی دل کھول کر تعریف نہ کی ہو۔ اس نے اپنی سسرال والوں کا دل جیت لیا تھا۔ وہ وہاں بہو بن کر نہیں بیٹی بن کر رہ رہی تھی۔ بہت خوش تھی وہ۔

زاہدہ نے اپنے اکلوتے بیٹے اکبر کی شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کا رنگ روپ بھی اپنی بہن جیسا ہی تھا۔ اسے ایک اچھی بیوی کی تلاش تھی۔ میرے جاننے والوں میں ایک لڑکی رشیدہ تھی۔ وہ بھی بالکل خانم کی طرح ہی تھی۔ اس کے چہرے پر اتنا نمک اتنی کشش تھی کہ حسین لڑکیاں بھی اس کے سامنے ماند پڑ جاتی تھیں۔ اس کی شادی اس کے کالے رنگ کی وجہ سے ہو نہیں پا رہی تھی۔ میں نے زاہدہ کو لے جا کر اسے دکھانے کا فیصلہ کرلیا۔ اس ہیرے کی قدر زاہدہ ہی کرسکتی تھی۔

اتفاق سے رشتے داروں میں شادی کی ایک تقریب تھی۔ رشیدہ بھی اس شادی میں آرہی تھی۔ میں زاہدہ کو اس تقریب میں لے گئی۔ رشیدہ کو دکھانے سے پہلے اس کی تعریف میں زمین آسمان ایک کردیے۔ رشیدہ اپنے گھر والوں کے ساتھ آئی تو میں نے اسے قریب سے دکھایا۔ "یہ دیکھو...... یہ ہے وہ لڑکی جو تمہارا گھر جنت بنا دے گی۔ تمہیں خانم کی کمی محسوس ہونے نہیں دے گی۔"

زاہدہ نے بڑے غور اور توجہ سے اسے دیکھا۔ پھر وہ شکایتی لہجے میں بولی۔ "آپا...... آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ میرا ایک ہی تو بیٹا ہے...... کیا میرا بیٹا ہی رہ گیا ہے کالی لڑکی سے شادی کرنے کے لیے...... آپ کوئی گوری لڑکی دکھایئے نا......"

☆

کیسا اپنا پن

محترم مدیر اعلیٰ سرگزشت

سلام تہنیت!

لوگ دوسروں کے حالات زندگی کو بطور کہانی لکھ کر بھیجتے ہیں لیکن میں نے اپنے حالات زندگی کو کہانی کی شکل دی ہے۔ امید ہے آپ کے قارئین کو پسند آئے گی۔

ارسلان احمد

میں اس دن پھر لیٹ ہوگیا تھا اور مجھے شرمندگی ہو رہی تھی۔ اس ہفتے میں یہ تیسرا موقع تھا جب مجھے تاخیر ہوئی تھی۔

میں ان دنوں کراچی یونیورسٹی میں پڑھتا تھا اور اپنے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے ایک اسکول میں سیکنڈ شفٹ میں پڑھاتا تھا۔ ٹیچنگ کے پیشے سے عموماً خواتین وابستہ ہوتی ہیں۔ وہ کوشش کرتی ہیں کہ فرسٹ شفٹ میں پڑھا کر فارغ ہوجائیں، سرکاری اسکول تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

مجھے بھی بس اتفاق سے یہ جاب مل گئی تھی۔

میرا اپائنٹمنٹ فرسٹ شفٹ میں ہی ہوا تھا لیکن جب میں نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو درخواست دے کر اپنی شفٹ تبدیل کرالی۔

یوں پہلی دفعہ مسز ساجدہ علی سے میرا تعارف ہوا۔ وہ اس اسکول کی ہیڈ مسٹریس تھیں جہاں میرا تبادلہ ہوا تھا۔

وہ خاصی حسین اور پُرکشش خاتون تھیں، بہت دھیمے لہجے میں گفتگو کرتی تھیں اور ان کا اندازِ گفتگو بھی بہت متاثر کن تھا۔

میں پہلی ہی ملاقات میں ان کی شخصیت سے متاثر ہوگیا۔ میں نے جوائننگ رپورٹ انہیں دی تو وہ بولیں۔ ''دیکھیے ارسلان صاحب! میرا پورا اسٹاف خواتین پر مشتمل ہے، آپ یہاں واحد مرد ہوں گے۔ کیا آپ لڑکیوں کے ساتھ گزارہ کرلیں گے؟ میرا مطلب ہے کہ آپ کو الجھن تو نہیں ہوگی؟ اگر ایسا ہے تو میں آپ کو جوائن نہیں کرتی۔''

''نہیں میڈم! مجبوری ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ ٹرانسفر میں نے خود ہی کرایا ہے، میں دراصل صبح یونیورسٹی جاتا ہوں۔''

''اچھا، آپ یونیورسٹی کے طالب علم ہیں؟'' وہ ہنس کر بولیں۔ ''اسی لیے اتنی سلجھی ہوئی گفتگو کررہے ہیں، چلیے، اگر آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہے تو موسٹ ویلکم!'' پھر وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔ ''آیئے، میں اسٹاف اور بچوں سے آپ کا تعارف کرادوں۔''

یہ کہہ کر وہ مجھے ایک ایک کلاس میں لے گئیں۔ وہاں مسز ساجدہ سمیت پندرہ خواتین تھیں۔ ان میں سے کچھ تو روایتی قسم کی خرانٹ سی ٹیچرز تھیں۔ بچوں پر چیخ چیخ کر ان کی آوازیں اور چہرے کرخت ہوگئے تھے۔ کچھ ٹیچرز ایسی تھیں کہ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ ٹیچر ہیں۔ وہ بالکل عام گھریلو خواتین کی طرح سیدھی سادی مگر اپنے مطلب کی چوکس تھیں۔

پانچ چھ لڑکیاں ایسی بھی تھیں جنہیں بچوں کی تعلیم سے زیادہ اپنے بناؤ سنگھار کی فکر تھی۔

تمام استانیوں نے حیرت اور دلچسپی سے مجھے دیکھا، چند ایک کی آنکھوں میں مجھے جھجک سی نظر آئی۔

اسکول کا راؤنڈ لگانے کے بعد مسز ساجدہ دوبارہ اپنے کمرے میں آگئیں اور مجھ سے بولیں۔ ''ارسلان صاحب! یہ بتایئے کہ آپ کس کلاس کو پڑھائیں گے؟''

''کیا مجھے کسی ایک کلاس کو پڑھانا ہوگا؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''میرا مطلب ہے کہ آپ کو کس کلاس کا چارج دیا جائے؟''

''میڈم!'' میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''آپ مجھے کسی بھی کلاس کا چارج نہ دیں کیونکہ کلاس ٹیچر کی بہت ذمے داریاں ہوتی ہیں۔ مجھے بعض اوقات یونیورسٹی سے یہاں پہنچنے میں تاخیر بھی ہوسکتی ہے۔ ویسے میں ہر کلاس کو انگریزی، ریاضی، معاشرتی علوم، اردو اور اسلامیات پڑھا سکتا ہوں۔ آٹھویں کلاس کے بچوں کو سائنس بھی پڑھا سکتا ہوں۔''

''ارسلان صاحب! مجھے آپ کی صاف گوئی پسند آئی۔ آپ چونکہ طالب علم ہیں اس لیے اتنی رعایت تو میں آپ کو ضرور دوں گی کہ آپ کی تعلیم میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔''

''بہت بہت شکریہ! میڈم!'' میں نے ممنونیت سے کہا۔

''آج اسکول میں آپ کا پہلا دن ہے اس لیے آج میں آپ کو کسی کلاس میں نہیں بھیج رہی ہوں۔ کل آپ کو ٹائم ٹیبل مل جائے گا کہ آپ کون سا پیریڈ، کس کلاس میں لیں گے۔'' پھر انہوں نے گھنٹی بجائی تو تئیس چوبیس سال کی ایک لڑکی اٹھلاتی ہوئی اندر آگئی۔ ''شگفتہ، ارسلان صاحب آج ہمارے مہمان ہیں، ان کے لیے ذرا اچھی سی چائے بنا کر لاؤ۔''

''ارے میڈم! یہ چائے وغیرہ کا تکلف نہ کریں۔'' میں نے کہا لیکن شگفتہ اس سے پہلے ہی ہوا کے جھونکے کی طرح کمرے سے نکل گئی۔

''ارسلان صاحب! اس لڑکی سے ہوشیار رہیے گا۔'' میڈم نے ہنس کر کہا۔ ''یہ لگائی بجھائی میں ماہر ہے۔ میٹرک پاس ہے، یہ بیچاری بھی ٹیچر بننا چاہتی تھی لیکن ملازمت ہی نہیں ملی، میں کوشش کررہی ہوں کہ یہ کسی طرح سی ٹی کا امتحان... پاس کرلے تاکہ میں اس کا پروموشن کرادوں، ویسے بہت ذہین لڑکی ہے لیکن......''

''میں سمجھ گیا میڈم!'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''یہ لگائی بجھائی دوسری ٹیچرز کے درمیان کرتی ہوگی۔ میرا تو اس سے کوئی تعلق ہی نہیں ہوگا۔ ویسے میں یونیورسٹی میں پڑھتا ہوں جہاں کلاس میں سات آٹھ لڑکے اور پچاس لڑکیاں ہیں۔ میں ہر قسم کی لڑکیوں کی نفسیات سمجھتا ہوں۔''

شگفتہ چائے لے آئی۔ تھوڑی دیر بعد ہاف ٹائم ہوگیا۔ وہ مخلوط تعلیمی ادارہ تھا۔ اصل میں وہ اسکول پہلے نجی انتظامیہ چلا رہی تھی، جب حکومت نے تعلیمی ادارے قومی ملکیت میں لیے تو یہ اسکول بھی سرکاری ہوگیا۔

ہاف ٹائم کے بعد لڑکیاں اور لڑکے باہر نکل آئے۔ میٹرک کی کئی لڑکیاں تو اتنی بڑی تھیں کہ انہیں کالج یا یونیورسٹی میں ہونا چاہیے تھا۔

''آپ دوسری ٹیچرز کے ساتھ اسٹاف روم میں بیٹھنا پسند کریں گے یا آپ کے لیے علیحدہ سے کوئی بندوبست کردوں؟'' میڈم نے پوچھا۔

''ارے، اس کی ضرورت نہیں ہے، ہاں، اگر کوئی ٹیچر پردے کی پابند ہو تو پھر میں کسی کلاس میں بیٹھ کر یا باہر جاکر بھی وقت گزار سکتا ہوں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

میڈم ساجدہ مجھے اسٹاف روم میں لے گئیں اور بولیں۔ ''دیکھیے، مسٹر ارسلان ہمارے نئے ساتھی ہیں، اگر یہ ہاف ٹائم میں یا خالی پیریڈ میں اسٹاف روم میں بیٹھنا چاہیں تو آپ لوگوں کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟''

سب نے ہی کہا کہ جب ارسلان صاحب کو کوئی اعتراض نہیں ہے تو بھلا ہمیں کیوں اعتراض ہوگا؟

دوسرے دن میں نے باقاعدگی سے اسکول میں پڑھانا شروع کردیا۔ میں کوشش یہی کرتا تھا کہ ایک، سوا ایک بجے تک اسکول پہنچ جاؤں۔ اس کے لیے مجھے اپنے آخری دو پیریڈ چھوڑنا پڑتے تھے۔

ایک دن میں نے اس مسئلے کے بارے میں میڈم کو بتایا تو وہ کچھ سوچ کر بولیں۔ ''آپ کب تک اسکول آسکتے ہیں؟''

''میڈم اگر میں دونوں پیریڈ لوں تو مجھے دو بجے والی پوائنٹ کی بس ملے گی۔''

اس زمانے میں یونیورسٹی کے طلبا کے لیے ہر علاقے میں سرکاری بسیں چلتی تھیں۔ ان کے مختلف روٹس تھے اس لیے انہیں پوائنٹ کی بس کہا جاتا تھا۔

''اس طرح تو آپ تین بجے تک اسکول پہنچیں گے۔ میں زیادہ سے زیادہ آپ کو یہ رعایت دے سکتی ہوں کہ آپ دو بجے تک اسکول پہنچ جائیں۔''

''شکریہ میڈم!'' میں نے کہا۔ ''تو اس صورت میں مجھے کسی اور ذریعے سے اسکول آنا پڑے گا، اخراجات بھی زیادہ ہوں گے لیکن میں دو بجے تک پہنچ جاؤں گا۔''

پھر میں آخری پیریڈ آدھا چھوڑ کر یونیورسٹی سے نکل جاتا تھا۔ اس زمانے میں یونیورسٹی پہنچنا بھی ایک مسئلہ تھا۔ وہاں سے ایک ہی بس چلتی تھی۔ پوائنٹ کے علاوہ کسی کو کہیں جانا ہوتا تھا تو وہی ایک روٹ تھا۔

میرا اسکول فیڈرل بی ایریا میں تھا۔ وہاں تک جانے میں مجھے آدھا گھنٹا لگ جاتا تھا۔

میں نے کچھ دن تو اس پر عمل کیا لیکن اس کا فائدہ کوئی نہیں تھا۔ اسکول پہنچتے پہنچتے مجھے کبھی ڈھائی اور کبھی پونے تین بج جاتے تھے۔

اس وقت ہاف ٹائم ہوتا تھا۔ تین بجے کلاسیں دوبارہ شروع ہوتی تھیں۔

میں تنگ آکر پھر آخری دو پیریڈ چھوڑنے پر مجبور ہوگیا۔

ایک دن میں اسکول پہنچا تو خلافِ معمول کافی گہما گہمی تھی۔ میڈم ساجدہ نے بھی اس روز خصوصی اہتمام کیا تھا۔

وہ اس نئے روپ میں بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ وہ خود بھی خاصی حسین خاتون تھیں، شادی شدہ تو وہ مجھے لگتی ہی نہیں تھیں۔ انہوں نے اس دن بال کھلے چھوڑ دیے تھے۔ میں ان کے گھنے، سیاہ چمک دار بال دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اتنے گھنے اور لمبے بال میں نے بہت کم لڑکیوں کے دیکھے تھے اور ان کے سرخ و سفید رنگ پر سیاہ بالوں کی لہراتی ہوئی لٹیں بہت خوب صورت لگ رہی تھیں۔ وہ ساڑی میں ملبوس تھیں۔ اس دن پہلی دفعہ مجھے احساس ہوا کہ میڈم کا جسم کسی بھی لڑکی سے زیادہ متناسب ہے۔

میں نے مسکرا کر پوچھا۔ ''میڈم، آج کیا کوئی خاص بات ہے؟ اسکول میں خصوصی صفائی کا اہتمام ہے، ہر ٹیچر مجھے بنی سنوری نظر آرہی ہے۔''

''ہاں، کل آپ نے چھٹی کرلی تھی اس لیے میں آپ کو بتا نہ سکی۔ شکر ہے، آج آپ وقت پر آگئے، آج ایجوکیشن آفس کی انسپکشن ٹیم یہاں آرہی ہے۔ میں نے تو آپ کی طرف سے دیر سے آنے کی درخواست بھی لکھ دی تھی کہ اگر ایجوکیشن آفیسر یہ پوچھیں کہ مسٹر ارسلان کہاں ہیں تو میں وہ درخواست انہیں دکھا کر مطمئن کرسکوں۔''

''ارے، تو آپ مجھے ہوسٹل کے فون نمبر پر اطلاع دے دیتیں۔'' میں نے کہا۔ میں ان دنوں یونیورسٹی کے ہوسٹل ہی میں مقیم تھا۔ ''میں بھی ذرا ڈھنگ کے کپڑے پہن لیتا۔''

میں نے یہ بات ازراہِ انکساری کہی تھی کیونکہ میں ہمیشہ بہترین تراش کے کپڑے پہنتا تھا۔ مجھے اچھے لباس،

WWW.PAKSOCIETY.COM

اچھے جوتوں اور مہنگے پرفیوم کا شوق جنون کی حد تک تھا۔

یونیورسٹی میں بھی لڑکیاں میری خوش لباسی کی مثال دیا کرتی تھیں۔ اگر آپ اسے خودستائی نہ سمجھیں تو میں کہوں گا کہ میری شخصیت بھی اتنی ہی بہترین تھی۔ خاص طور پر صنفِ نازک کے لیے مجھ میں بہت کشش تھی۔ میں دراز قد اور ورزشی جسم کا مالک تھا۔ جلد کی رنگت کھلتی ہوئی گندمی تھی اور بال براؤن تھے۔ یونیورسٹی میں کئی لڑکیاں مجھ سے دوستی کی خواہش مند تھیں۔

یہ بات نہیں ہے کہ میں بہت پارسا تھا یا لڑکیوں سے دور بھاگتا تھا۔ ہاں، یہ ضرور تھا کہ جو لڑکی مجھے پسند آتی تھی، اس سے دوستی کر لیتا تھا۔

اسکول میں بھی کئی ٹیچرز نے مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے کسی کو قابلِ توجہ نہیں سمجھا۔

میڈم میری اس بات سے بہت خوش تھیں کہ میں ٹیچرز سے زیادہ بے تکلف نہیں ہوتا، اپنے کام سے کام رکھتا ہوں۔

''ارے، آپ تو ہمیشہ بہترین لباس میں ہوتے ہیں۔'' میڈم نے کہا۔ ''زیادہ اہتمام کیا کرتے کیا سوٹ یا شیروانی پہن کر آتے؟''

''ویسے آپ آج بہت اچھی لگ رہی ہیں۔'' یہ جملہ بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔

میرے اس جملے پر میڈم بری طرح شرما گئیں۔

پھر اسکول کا معائنہ ہوا، ایجوکیشن آفیسر مس نورین شاہ کا تعلق دادو سے تھا۔ میں نے بھی ایک عرصہ لاڑکانہ میں گزارا تھا اس لیے سندھی بہت روانی سے بولتا تھا۔

میں نے مس شاہ سے سندھی میں بات کی تو وہ سارا وقت مجھی سے بات کرتی رہیں۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ میرا تعلق لاڑکانہ سے ہے تو وہ بہت خوش ہوئیں اور مجھ سے بولیں۔ ''ادا ارسلان، آپ تو ہمارے پڑوسی نکلے۔''

انہوں نے سرسری انداز میں اسکول کا ایک راؤنڈ لگایا، ان کے ساتھ دو تین خرانٹ قسم کی خواتین بھی تھیں لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ مس شاہ اسکول کے معائنے میں زیادہ سرگرمی نہیں دکھا رہی ہیں تو وہ بھی خوش گپیوں میں مصروف ہو گئیں۔

ان لوگوں نے چائے اور دوسرے لوازمات کے ساتھ ساتھ پورا انصاف کیا، میڈم کو تحریری طور پر بہترین کارکردگی کی سند دی اور جاتے جاتے ان سے کہا۔ ''مسز ساجدہ! ارسلان کا خیال رکھیے گا۔ اسے کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔'' پھر وہ مجھ سے سندھی میں بولیں۔ ''ارسلان! کبھی آفس کا چکر لگاؤ۔''

''جی میڈم! ضرور!'' میں نے جلدی سے کہا۔

وہ نوجوان لڑکی تھی اور نہ جانے کس کی سفارش سے ایجوکیشن آفیسر بن بیٹھی ورنہ اس میں مجھے ایسی کوئی صلاحیت تو نظر نہیں آئی تھی، البتہ میں نے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے توصیفی چمک ضرور دیکھی تھی۔ وہ بیچاری دادو سے شاید پہلی مرتبہ کراچی آئی تھی۔ میں نے بھی اپنی لچھے دار گفتگو سے اسے شیشے میں اتار لیا تھا۔

میڈم کو شاید یہ بات ناگوار گزری تھی۔ نورین کے جانے کے بعد ان کا موڈ آف ہو گیا تھا۔ وہ خود کلامی کے انداز میں بولیں۔ ''میں نے تو انسپکشن کا اتنا بہترین اہتمام کیا تھا لیکن ان صاحبہ کو آپ سے سندھی میں گفتگو کرنے کے علاوہ کچھ سوجھ ہی نہیں رہا تھا۔''

''میڈم، انہوں نے آپ کو بہترین کارکردگی کی سند تو دے دی ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''تو اس نے کون سا احسان کیا ہے، مجھے یہ سند پہلے بھی کئی مرتبہ مل چکی ہے اور وہ سند دینے والے مس نورین سے زیادہ قابل، زیادہ اہل اور بہت تجربے کار تھے۔''

مجھے ان کے غصے کی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اسی وقت ہاف ٹائم ہو گیا اور میں اسٹاف روم کی طرف چل دیا۔

''مجھے سلمٰی کی آواز سنائی دی۔ ''لو، وہ تمہارا ہیرو آ گیا۔'' وہ ایک ٹیچر نازیہ سے مخاطب تھی۔

اس نے بہت آہستہ سے یہ جملہ ادا کیا تھا لیکن میں نے سن لیا لیکن ظاہر یہ کیا کہ میں نے کچھ نہیں سنا ہے۔

نازیہ، نازک سی چھریرے جسم کی پُرکشش لڑکی تھی۔ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لیے میں لاتعلق سا ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا۔

پورے اسکول میں صرف ایک ٹیچر ثمرہ ایسی تھی جو میرے معیار پر پوری اترتی تھی یا پھر میڈم ساجدہ تھیں، ظاہر ہے میں میڈم ساجدہ سے تو فلرٹ کر نہیں سکتا تھا اور ثمرہ مجھ سے زیادہ بے تکلف نہیں تھی۔ میں نے کبھی کسی کو بھی بے تکلف ہونے کا موقع نہیں دیا تھا۔

اس دن ثمرہ بھی خصوصی اہتمام کے ساتھ آئی تھی۔ اس زمانے میں کھلے پائنچوں کی شلواروں اور چھوٹی قمیصوں کا فیشن تھا جن کے چاک بہت زیادہ کھلے ہوئے ہوتے تھے، ثمرہ اسکن ٹائٹ قمیص میں ملبوس تھی اور اس کے چاک اتنے

کھلے ہوئے تھے کہ اس کی کمر کی جلد نظر آ رہی تھی۔ اس کے چہرے سے زیادہ جسم پُرکشش تھا۔

میں نے اچانک کہا۔ ''ثمرہ! مجھ سے پہلے آپ ہی میٹرک کو میتھس پڑھاتی تھیں؟''

اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں حیرت بھر کے مجھے دیکھا، پھر بولی ''جی ہاں، میں نے کچھ غلط پڑھا دیا؟''

''ارے نہیں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''آپ تو بہت اچھا پڑھاتی تھیں۔ مجھے ایک دو سوال سمجھ میں نہیں آ رہے ہیں۔ کیا آپ میری کچھ مدد کر سکتی ہیں؟''

''ضرور!'' ثمرہ نے کہا۔ وہ دوسری ٹیچرز کے معاملے میں زیادہ پُراعتماد بھی تھی۔ ''بتائیے، کیا پرابلم ہے؟'' وہ اٹھ کر میری طرف آ گئی۔

اس کی چال دیکھ کر میرا دل اتھل پتھل ہو گیا۔

''میتھس کی کتاب ہے آپ کے پاس؟''

''جی نہیں، میں ابھی کسی بچے سے منگوا لیتا ہوں۔''

''آپ بیٹھیں، میں منگواتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ گویا لہراتی، بل کھاتی باہر کی طرف بڑھی۔

چلتے ہوئے اس کی کمر کے نچلے حصے میں بھنور سے پڑتے تھے۔ فوراً ہی وہ میٹرک کے کسی بچے سے کتاب منگوا کر واپس آ گئی اور میرے نزدیک بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''بتائیے کیا پرابلم ہے؟''

میں نے کتاب کھولی اور یوں ہی ایک مشکل سا سوال نکال کر اسے دکھایا۔ ''مجھے یہ سوال حل کراتے ہوئے کچھ پرابلم ہو رہی ہے۔'' میں نے کہا، حالانکہ وہ سوال تو ایسا تھا کہ میں نے زبانی.... حل کر لیا تھا، میرا میتھس شروع ہی سے بہت اچھا تھا۔

اس نے اپنے ہاتھ میں موجود رجسٹر میں سے ایک صفحہ نکالا اور وہ سوال حل کرنے لگی۔ ویسے وہ خاصا مشکل سوال تھا، کئی جگہ ثمرہ بھی الجھن کا شکار ہوئی لیکن اس نے وہ سوال حل کر ہی لیا۔

''دیکھیے میں نے اس سوال کو اسی طریقے سے حل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن میں کہیں نہ کہیں غلطی کر رہا تھا۔ اب میں اچھی طرح سمجھ گیا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ!''

''ارے، اس میں شکریے کی کیا بات ہے؟'' ثمرہ چہک کر بولی۔ اس بات سے بے نیاز کہ شگفتہ سمیت ہر ٹیچر کی نظریں ہم دونوں ہی پر جمی ہوئی ہیں۔

اسی وقت میڈم ساجدہ اسٹاف روم میں داخل ہوئیں، انہوں نے مجھے ثمرہ سے یوں ہنس ہنس کر باتیں کرتے دیکھا تو وہ قدرے سخت لہجے میں بولیں۔ ''مسٹر ارسلان! آپ ذرا میرے آفس میں آیئے۔''

''جی میڈم!'' میں نے کہا۔ ''ابھی حاضر ہوا۔'' میں نے کہا اور ثمرہ سے وہ کاغذ لے لیا جس پر اس نے سوال حل کیا تھا پھر میں اسٹاف روم سے باہر نکل گیا۔

''جی میڈم!'' میں نے میڈم کے دفتر میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''ارسلان، تم بھی کمال کرتے ہو۔'' انہوں نے پہلی دفعہ مجھے ''آپ'' کی بجائے ''تم'' سے مخاطب کیا تھا۔ ''میں یہاں چائے پر تمہارا انتظار کر رہی ہوں اور تم غائب ہو۔''

''تو آپ مجھے بلوا لیتیں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''ویسے ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے اتنا کھا لیا ہے کہ اب چائے کی گنجائش بالکل نہیں ہے۔'' انہوں نے مجھے گھورا تو میں نے جلدی سے کہا۔ ''ویسے آپ کے ساتھ چائے ضرور پیوں گا۔ میرا بھی مقولہ ہے کہ چائے اچھی اور خوش ذائقہ ہو تو بار بار پینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے اور باس کے ساتھ تو بالکل بھی نہیں۔''

وہ بے اختیار مسکرانے لگیں اور بولیں۔ ''ویسے تم باتیں بنانے میں ماہر ہو۔''

''یہ آپ میری تعریف کر رہی ہیں یا مجھ پر طنز کر رہی ہیں۔''

''میں تم پر طنز کر سکتی ہوں؟'' وہ سنجیدہ ہو گئیں۔

''جی؟'' میں نے الجھ کر پوچھا۔

''بھئی، تم تو اب مس شاہ کے خاص آدمی ہو، ان کے گرائیں ہو۔ تم سے تو اب ڈرنا ہی پڑے گا نا!''

''سندھ میں گرائیں نہیں ہوتے میڈم!'' میں نے کہا۔ ''وہاں گوٹھائی ہوتا ہے۔''

''کچھ بھی ہوتا ہو گا، ویسے تم نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میں ''آپ'' سے ''تم'' پر کیوں آ گئی؟''

''آپ مجھ سے بڑی ہیں، میری باس ہیں۔ ویسے بھی مجھے اپنے لیے آپ کے منہ سے ''تم'' ہی اچھا لگ رہا ہے۔''

ان کے چہرے پر پھر ایک رنگ سا آ گیا۔

میں چائے پی ہی رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، میڈم نے ریسور اٹھایا اور بولیں۔ ''السلام علیکم!'' یہ ان کا خاص انداز تھا، وہ ہیلو، کی بجائے ہمیشہ سلام کرتی تھیں، جو اُن کے منہ سے بہت اچھا لگتا تھا..... ''ہاں بیٹا ابھی تو میں اسکول میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوں...... اچھا، تمہیں کب جانا ہے؟ ہاں تو آجاؤ نا!" انہوں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا، پھر مجھ سے بولیں۔ "میری بیٹی سعدیہ کا فون تھا۔ اسے کچھ کتابیں لینا ہیں۔"

مشکل سے دس منٹ بعد آٹھ نو سال کی خوب صورت سی ایک لڑکی دفتر میں داخل ہوئی۔ اس کی گھنی پلکیں، سفید رنگ اور چمک دار بال دیکھ کر مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہی میڈیم کی بیٹی ہے۔

میڈم نے اس سے میرا تعارف کرایا اور بولیں "یہ میری چھوٹی بیٹی سعدیہ ہے۔"

سعدیہ نے مجھے بہت ادب سے سلام کیا اور بولی۔ "مما! نے آپ کی بہت تعریف کی تھی۔ آپ تو اس سے بھی اچھے ہیں ارسلان بھائی!"

وہ شاید کچھ پیسے لینے آئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد میڈم نے مجھ سے کہا۔ "اور یہ تم ثمرہ کے ساتھ سر جوڑ کے کیا مذاکرات کر رہے تھے؟"

"کچھ بھی نہیں۔ میں اس سے میتھس کا ایک سوال سمجھ رہا تھا۔ مجھ سے پہلے میٹرک کو میتھس وہی پڑھاتی تھی۔"

"بہرحال، اس کے ساتھ زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" میڈم نے کہا۔ "وہ اچھی لڑکی نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے چونک کر پوچھا۔ "کیا اس کا چال چلن خراب ہے؟"

"وہ انتہائی خود پسند اور منہ پھٹ لڑکی ہے۔ خود کو حسینۂ عالم سمجھتی ہے، چال چلن کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتی کیونکہ میں کسی پر بغیر کسی ثبوت کے بہتان لگانے کے خلاف ہوں۔ بس مجھے پسند نہیں آیا، تمہارا اس کے ساتھ یوں فری ہونا۔"

"اب ہم ایک ساتھ کام کرتے ہیں تو بات چیت تو ہوگی۔ خیر آپ کو پسند نہیں آیا ہے تو میں آیندہ اس سے بات بھی نہیں کروں گا۔ ویسے بھی وہ خود ہی سمجھ گئی ہوگی۔ آپ نے جس انداز میں مجھے بلایا تھا، اس سے تو وہی کیا، شبنم تک سمجھ گئی ہوگی کہ میڈم نے برا مان کر یہ بات کی ہے۔"

"ارے نہیں۔" وہ جلدی سے بولیں۔ "میرا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا۔ میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم محتاط رہو۔"

میں وہاں سے اٹھ کر کلاس میں آگیا اور بچوں کو پڑھاتے ہوئے سوچنے لگا کہ آخر میڈم چاہتی کیا ہیں؟ جب میں مس شاہ کے ساتھ گھل مل کر باتیں کر رہا تھا تو ان کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات تھے۔ بعد میں انہوں نے یہ بہانہ بنایا کہ مس شاہ نے اسکول کا معائنہ کیے بغیر ہی سند جاری کردی۔ پھر انہوں نے اس کی برائیاں شروع کردیں۔ اب وہ مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ میں ثمرہ سے محتاط رہوں۔

"سر!" اچانک کسی کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ وہ رضوانہ تھی۔ "آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے سر؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں، آج میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"تو سر، پھر آپ آرام کریں، کلاس میں کوئی شور نہیں کرے گا۔ ہم خاموشی سے اپنا کام کرتے رہیں گے۔"

"تھینک یو بیٹا!" میں نے کہا حالانکہ وہ "بیٹا" عمر میں مجھ سے چند ہی سال چھوٹی ہوگی۔

مجھے ایک دفعہ پھر اسکول آنے میں تاخیر ہوگئی تھی۔ اب مجھے شرمندگی ہو رہی تھی۔

میں اسکول میں داخل ہوا تو ہاف ٹائم ختم ہوا تھا اور بچے کلاسوں میں جا رہے تھے۔

میں نے پہلے میڈم کو سلام کرنا ضروری سمجھا تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ میں اسکول آچکا ہوں، اسکول آنے سے پہلے میں نے ایک جگہ رک کر ہاتھ منہ دھویا تھا اور بال سنوارے تھے۔

مجھے دیکھ کر میڈم کی آنکھوں میں عجیب سی چمک لہرائی۔ میں آنکھوں کی اس چمک کو پہچانتا تھا۔ لرز کر رہ گیا، انہوں نے مجھے محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ارسلان! تم نے آج بال بنائے ہیں؟"

میں ان کے اس غیر متعلق سوال پر حیران رہ گیا۔ "جی ہاں، وہ دراصل آج بہت گرد اڑ رہی ہے۔ ہوا بھی بہت تیز ہے، میں نے منہ ہاتھ دھویا تو بال بھی سنوار لیے۔"

"بال تو وہی اچھے لگتے ہیں، بکھرے ہوئے۔" انہوں نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

میں گڑبڑا کر رہ گیا۔ میں لاکھ فلرٹ سہی لیکن ان کا تو میں بہت احترام کرتا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "آپ پوچھیں گی نہیں کہ آج میں دیر سے کیوں آیا ہوں؟"

"بھئی تمہاری کوئی مجبوری رہی ہوگی۔" میڈم نے کہا۔ "پھر تم پر تو اب پابندی لگا بھی نہیں سکتی، تمہاری سفارش تو مس شاہ بھی کرچکی ہیں۔" پھر وہ سنجیدہ ہو کر بولیں۔ "ارسلان! یہ سندھی تم نے کہاں سے سیکھی، تمہارے گھر والے کہاں کے ہیں، والد کیا کرتے ہیں۔ تم نے آج

تک کچھ بھی نہیں بتایا۔"

"آپ نے کبھی پوچھا بھی تو نہیں۔" میں مسکرا کر بولا۔ "چلیے، اب بتائے دیتا ہوں۔" میں نے ہنس کر کہنا شروع کیا۔

"میرے والد آرمی میں ہیں، میرے دادا بھی آرمی میں تھے۔ انہیں سندھ میں اچھی خاصی زرعی زمین الاٹ ہوئی تھی کیونکہ انہوں نے جنگِ عظیم دوم میں ملٹری کراس لیا تھا۔

یوں ہم لوگ لاڑکانہ آگئے۔ یہاں ہمیں زمین کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کی ایک مشترکہ حویلی بھی الاٹ ہوگئی۔

میں اپنے بہن بھائیوں میں تیسرے نمبر پر ہوں۔ مجھ سے بڑی ایک بہن اور بھائی ہیں، مجھ سے چھوٹے بھی دو بھائی اور دو بہنیں ہیں۔

پاپا آج کل سیالکوٹ میں ہیں، وہ چاہتے تھے کہ میں پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لوں لیکن مجھے کراچی یونیورسٹی میں پڑھنے کا شوق تھا اس لیے میں ضد کرکے کراچی آگیا۔ بابا نے مجھے دھمکی بھی دی کہ اگر تم نے کراچی میں ایڈمیشن لیا تو اپنے تعلیمی اخراجات بھی خود ہی برداشت کرنا۔

میں نے ان کی اس بات کا بھی کوئی اثر نہ لیا اور یہاں ایڈمیشن لے لیا۔ میں جانتا تھا کہ ان کا غصہ عارضی ہے۔ چند دن بعد وہ خود ہی مجھے رقم بھیجنے لگیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ شاید انہیں یہ اطلاع مل گئی تھی کہ میں کسی اسکول میں ملازمت کر رہا ہوں۔

ان دنوں سندھ کے ڈومیسائل کی بہت اہمیت تھی کیونکہ حکومت نے کوٹہ سسٹم شروع کردیا تھا۔ ہمارا آبائی گھر چونکہ لاڑکانہ میں ہے اس لیے مجھے بھی وہاں کا ڈومیسائل مل گیا، بس پھر مجھے یہ ملازمت بھی مل گئی۔ میرے دادا ابھی ماشاءاللہ حیات ہیں۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ بابا مجھے تعلیمی اخراجات نہیں بھیج رہے ہیں تو وہ مجھے ہر مہینے ایک معقول رقم بھیجنے لگے۔ بس یہ ہے میرا خاندانی پس منظر!

"تمہارے پاپا آرمی میں ہیں، دادا بھی آرمی میں تھے۔ پھر تم نے آرمی جوائن کیوں نہیں کی؟" میڈم نے پوچھا۔

پاپا تو چاہتے تھے کہ میں آرمی جوائن کرلوں لیکن میں نے صاف انکار کردیا کہ مجھے قیدیوں والی یہ زندگی پسند نہیں ہے۔ آرمی میں جاکر تو آدمی ایک طرح سے اصولوں اور ضابطوں میں جکڑ ہی جاتا ہے۔ پھر پاپا نے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا کہ جو کچھ کرنا ہے خود کرو اور خوب سوچ سمجھ کر کرو۔

مجھے بچپن ہی سے جرنلسٹ بننے کا بھوت سوار تھا۔ میں اسکول اور کالج کے زمانے میں مضمون نویسی کے مقابلوں میں انعامات بھی جیت چکا تھا اور سیالکوٹ کے کالج سے کالج کا ایک اخبار بھی نکالا تھا۔ لوگوں نے میرے کام کی تعریف کی، خاص طور پر میرے اساتذہ نے میرے کام کو بہت سراہا تو میں نے باقاعدہ جرنلسٹ بننے کا عظم کرلیا اور کراچی یونیورسٹی کے ماس کمیونیکیشن ڈپارٹمنٹ میں داخلہ لے لیا۔"

"تم سندھی تو نہیں ہونا؟" میڈم نے پوچھا۔

"میڈم میں تو کراچی ہی میں پیدا ہوا ہوں۔ ان دنوں پاپا کی پوسٹنگ یہیں تھی، پھر سندھ میں پلا بڑھا ہوں، ہمارا آبائی گھر سندھ میں ہے تو میں سندھی ہی ہوا۔ ویسے دادا جان یوپی سے ہجرت کرکے سندھ آئے تھے۔"

"تم تو چھپے رستم نکلے ارسلان!" میڈم نے ہنس کر کہا۔ "میں خواہ مخواہ تم پر آنسو بہاتی رہی کہ بے چارہ ضرورت مند ہے۔ اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لیے ملازمت کر رہا ہے۔"

"آپ نے اگر ترس کھا کر مجھے کچھ رعایات دی ہیں تو انہیں واپس لے لیں۔" میں ایک دم سنجیدہ ہوگیا۔ مجھے پسند نہیں تھا کہ کوئی مجھ پر ترس کھائے۔ میں اب بھی اپنے اخراجات سے دو تین غریب طلبا کی مدد کرتا تھا۔ "اگر آپ کہیں گی تو میں ملازمت بھی چھوڑ دوں گا۔"

"ارے ارے، تم تو برا مان گئے۔" میڈم ہنس کر بولیں۔ "بھئی اگر تمہیں میری یہ بات بری لگی ہے تو میں معذرت چاہتی ہوں۔" انہوں نے شوخی سے کہا اور اپنے دونوں کان پکڑ لیے۔

مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔

"ویسے ارسلان، تم غصے میں بہت اچھے لگتے ہو۔" انہوں نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "لیکن کبھی کبھی غصہ اچھا لگتا ہے، ہمیشہ نہیں۔ تم ہنستے ہوئے اس سے بھی زیادہ پیارے لگتے ہو۔" ان کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی۔

میرے اوسان خطا ہوگئے، مجھے لڑکیوں کا خوب تجربہ تھا۔ وہ جذبات میں آکر اس قسم کے مکالمے بولا کرتی تھیں لیکن کوئی عورت مجھ سے کبھی اس قسم کے مکالمے بولے گی، اس کا تو میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔

انہوں نے اچانک کہا۔ "کیا سوچنے لگے؟"

"کچھ بھی نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"اچھا، میرا ایک کام کرو گے؟"
"آپ ایک نہیں، دو کام بتائیں۔" میں نے ہنس کر کہا۔
"مذاق نہیں ارسلان!" وہ بولیں۔ "میں سنجیدہ ہوں، پہلے تم وعدہ کرو کہ انکار نہیں کرو گے؟"
"یہ تو آپ کے کام پر منحصر ہے۔ ممکن ہے وہ کام میرے بس کا نہ ہو۔" میں نے محتاط انداز میں کہا۔
"وہ کام تمہارے بس کا ہے، تم کر سکتے ہو؟" میڈم نے کہا۔
"تو پھر بتایئے۔ پہیلیاں کیوں بجھوا رہی ہیں۔"
"مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہاری انگلش بہت اچھی ہے۔" انہوں نے کہا۔
"جی ہاں، بہتر ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے کانونٹ اسکول میں تعلیم حاصل کی ہے لیکن آپ کے کام کا میری انگلش سے کیا تعلق؟"
"بھئی، میری بڑی بیٹی سیکنڈ ایئر میں پڑھتی ہے، اس کی انگلش بہت کمزور ہے، فرسٹ ایئر میں بھی اس کا انگلش کا پیپر رہ گیا تھا۔ تم تھوڑا سا وقت نکال کر نادیہ کو انگلش پڑھا دیا کرو۔"
"میڈم! میرے پاس وقت ہی تو نہیں ہے۔"
"اب تم اتنے مصروف بھی نہیں ہو۔" وہ منہ بنا کر بولیں۔
"میری مصروفیات کا علم ہوگا تو آپ ایسی بات نہیں کریں گی۔" میں نے کہا۔ "میں صبح سات بجے اٹھتا ہوں، پھر ایک بجے تک یونیورسٹی میں کلاسیں لیتا ہوں۔ اس کے بعد یہاں آ جاتا ہوں۔ یہاں سے میں اخبار کے ایک دفتر جاتا ہوں، ہماری ٹریننگ شروع ہو گئی ہے۔ ٹریننگ کیا، اسے بغیر تنخواہ کی بیگار سمجھ لیں۔ اخبار والے کام ہم سے پورا لیتے ہیں۔ آپ یہ بھی جانتی ہیں کہ اخبارات کی آخری کاپی رات کے ڈھائی، تین بجے سے پہلے پریس نہیں جاتی۔ یوں میں رات کو بلکہ صبح کو چار بجے تک ہوسٹل پہنچتا ہوں۔ اب آپ ہی بتایئے میں وقت کہاں سے نکالوں۔"
حالانکہ میں نے غلط بیانی سے کام لیا تھا، جرنلزم والوں کی ٹریننگ ضرور ہوتی ہے لیکن وہ آخری سال میں ہوتی ہے۔ میں تو ابھی فرسٹ ایئر ہی میں تھا۔
"تم واقعی ٹھیک کہہ رہے ہو ارسلان! لیکن اتنا کام کرو گے تو بیمار پڑ جاؤ گے۔"
"ارے میں کیا سبھی کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "کوئی بیمار نہیں پڑتا۔"
"ان میں سے کوئی ملازمت بھی تو نہیں کرتا۔" میڈم نے کہا۔ "وہ سب یونیورسٹی کے بعد سو جاتے ہوں گے اور پھر شام کو تازہ دم ہو کر اٹھتے ہوں گے۔"
"اب ایسا بھی نہیں ہے۔ کئی لڑکے ایسے ہیں جو ٹیوشنز پڑھاتے ہیں، کئی لڑکے کوئی اور چھوٹا موٹا کام کرتے ہیں۔"
"بہرحال، تم اپنی صحت کا خیال رکھو! اگر چاہو تو ہفتے میں ایک دن اسکول آ جاؤ اور حاضری لگا دیا کرو۔"
"جب ہمت نہیں رہے گی تو یہ بھی کر لوں گا۔" میں نے منہ بنا کر کہا۔ "آپ پھر مجھ پر ترس کھا رہی ہیں؟"
"اچھا بابا، تمہاری مرضی ہے جب دل چاہے اسکول آ جاؤ، جب دل چاہے نہ آؤ۔"
وہ بات اس دن ختم ہو گئی۔ پھر کئی دن یونہی گزر گئے۔ ہاں ثمرہ میرے کچھ اور قریب آ گئی تھی لیکن میں نے ابھی اسے ایک فاصلے پر رکھا ہوا تھا۔
ایک دن میں اسکول پہنچا تو گیٹ سے باہر نکلنے والی ایک لڑکی کو دیکھ کر میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ وہ اتنی ہی حسین تھی جب مجھ سا حسن پرست شخص یہ کہہ رہا ہو تو آپ سمجھ لیں کہ وہ لڑکی کتنی حسین ہو گی۔ وہ سرو قد تھی، جسم گویا سانچے میں ڈھلا ہوا تھا، اس کے ہونٹ اتنے خوب صورت تھے کہ ان کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ سرخ و سفید رنگت اور سیاہ بالوں میں اس کا چہرہ چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ اس ظالم نے سیاہ رنگ کا دھوپ کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ وہ چشمہ اس کے دمکتے ہوئے چہرے پر بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔
اس نے ایک اچٹتی ہوئی نظر مجھ پر ڈالی، پھر بے نیازی سے باہر کی طرف بڑھ گئی۔
اس کے اس انداز سے میری انا کو شدید ٹھیس پہنچی۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ کوئی لڑکی مجھے یوں نظر انداز کر دے۔
میں اسکول میں داخل ہوا تو میڈم دفتر کے باہر ہی کھڑی تھیں۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بولیں۔ "ارسلان! تم چند منٹ لیٹ ہو گئے ورنہ آج میں تمہیں اپنی بڑی بیٹی نادیہ سے بھی ملوا دیتی۔"
"کیا وہ یہاں آئی تھیں؟" میں نے کہا۔
"ہاں، ابھی ابھی تو باہر نکلی ہے۔" میڈم نے کہا۔
"میں نے انہیں شاید دیکھا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "انہوں نے کالج... یونیفارم پہن رکھا تھا اور چہرے پر سیاہ رنگ کا چشمہ تھا۔"
"ہاں ہاں، وہی۔" میڈم نے کہا۔ "تم نے کہاں دیکھا؟"

WWW.PAKSOCIETY.COM

"میں جب اسکول کی طرف آ رہا تھا تو وہ اسکول کے گیٹ سے باہر نکل رہی تھیں۔"

اس کا حسنِ بلاخیز دیکھ کر مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے اسے پڑھانے سے انکار کیوں کیا؟ اب میڈم سے کچھ کہنا بھی اپنی ہی ہتک کرانے کے مترادف تھا، میں کسی ایسے موقع کی تلاش میں رہا جب میں انہیں بتا سکوں کہ آج کل میں فرصت سے ہوں۔

پھر یہ موقع خود ہی نکل آیا۔ اسکولوں میں گرمیوں کی تعطیلات ہونے والی تھیں۔

میڈم نے مجھ سے کہا۔ "ارسلان اب تو کم سے کم دو مہینے تک تمہاری شکل نظر نہیں آئے گی۔"

"کیوں میڈم؟ کیا آپ مجھے ملازمت سے نکال رہی ہیں؟" میں نے ہنس کر کہا۔

"بالکل بدھو ہو۔" انہوں نے مجھے محبت پاش نظروں سے دیکھا۔ "ارے اسکولوں کی چھٹیاں ہونے والی ہیں۔" پھر وہ ہچکچاتے ہوئے بولیں۔ "ارسلان، اگر تم برا نہ مانو تو اب نادیہ کو کچھ وقت دے دو۔"

"ہاں، اب تو میرے پاس وقت ہے۔" میں نے دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "میں نادیہ کے لیے بھی وقت نکال سکتا ہوں۔"

"تو پھر کب سے آ رہے ہو؟" میڈم نے پوچھا۔

"جس دن چھٹیاں شروع ہوں گی، میں اسی دن آجاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "ہاں، میں نے آپ کا گھر تو دیکھا ہی نہیں ہے۔"

"میرا گھر یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔" میڈم نے کہا۔ "مشکل سے دو منٹ کی ڈرائیو ہوگی۔" پھر وہ کچھ سوچ کر بولیں۔ "آج تم میرے ساتھ ہی گھر چلو، میرا گھر بھی دیکھ لینا اور بیرسٹر صاحب سے بھی مل لینا۔"

"بیرسٹر صاحب؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں، نادیہ کے ابو! وہ بیرسٹر ہیں نا! میں نے شاید تمہیں بتایا تو تھا۔"

"آپ نے مجھے کبھی ان کے بارے میں نہیں بتایا۔" میں نے کہا۔

"چلو، پھر آج اگر وہ گھر پر ہوئے تو ان سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔ بیرسٹر علی احسان کا نام تو تم نے سنا ہوگا۔"

میں نے ان کا نام سن رکھا تھا، وہ خاصے معروف بیرسٹر تھے اور ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے فوج داری مقدمات ہی لڑتے تھے۔

میں آپ کو شاید بتانا بھول گیا کہ ٹرانسپورٹ کے چکر سے تنگ آ کر میں نے ہنڈا 175 خرید لی تھی۔ وہ اس دور کی بہت مہنگی اور بھاری موٹر سائیکل تھی۔ اس کی رقم مجھے دادا جان نے بھیجی تھی۔

"آپ میرے ساتھ بائیک پر کیسے بیٹھیں گی؟" میں نے کہا۔ "پھر آپ کے ساتھ خاصا سامان بھی ہے۔"

وہ گھر سے وقتاً فوقتاً جگ، گلاس، پلیٹیں اور ٹیبل فین وغیرہ منگاتی رہتی تھیں۔

"ارے، تم اس کی فکر مت کرو، یہ سارا سامان تو ڈرائیور لے جائے گا۔ تم بھی میری گاڑی کے پیچھے پیچھے آجاؤ یا ایسا کرو، میں سامان گاڑی میں بھیج دیتی ہوں اور خود تمہارے ساتھ بائیک پر چلتی ہوں ورنہ تم راستہ بھٹک جاؤ گے۔"

میں پھر وحشت زدہ ہو گیا، ان کے ساتھ بائک پر بیٹھنے کے تصور ہی سے مجھے وحشت ہو رہی تھی۔

چھٹی کے بعد وہ کچھ دیر تک آفس میں بیٹھی اپنے کام نمٹاتی رہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ میں باہر ہوں، جب آپ جائیں تو مجھے بلوا لیجیے گا۔

میں باہر نکلا تو ثمرہ سے ٹکراؤ ہو گیا، وہ گھر جا رہی تھی۔

ارسلان صاحب!" ثمرہ نے میرے نزدیک رک کر آہستہ سے کہا۔ "آپ کا کوئی رابطے کا ٹیلی فون نمبر ہے؟"

"میں ہوسٹل میں رہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "وہاں بعض اوقات پیون بلا دیتا ہے۔ اور بعض اوقات ہولڈ کرا کے بھول جاتا ہے۔ تم مجھے اپنا نمبر دے دو۔" میں نے پہلی دفعہ اسے تم کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

"ہاں لکھو۔" وہ شوخی سے بولی۔ پھر اس نے مجھے اپنے گھر کا ٹیلی فون نمبر لکھا دیا۔

اس کے جاتے ہی میڈم ساجدہ باہر نکلیں اور بولیں۔ "کس سے باتیں کر رہے تھے۔"

"میٹرک کی ایک بچی تھی۔ وہ ہوم ورک کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔" میں نے یہ کہہ کر انہیں ٹال دیا ورنہ ثمرہ کا نام سن کر وہ مجھے پھر ایک لمبا لیکچر پلا دیتیں۔

☆☆☆

میڈم کا بنگلا خاصا وسیع و عریض تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ کم سے کم ایک ہزار گز پر تو ہوگا۔ سامنے کے حصے میں خوب صورت لان تھا۔ پھر بہت خوب صورت کار پارکنگ۔۔ اس میں اوپر نیچے آٹھ بیڈ روم تھے۔

اچانک لان کی کیاریوں میں سے نکل کر مالی ہماری طرف بڑھا۔ اس نے کھرپی نیچے رکھی، پانی سے ہاتھ دھوئے اور ہمارے نزدیک آگیا۔

"یہ ارسلان صاحب ہیں!" میڈم نے بتایا۔ "میں نے بتایا تھا نا کہ یہ بنیادی طور پر صحافی ہیں۔" اس شخص نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا، مجھے حیرت تھی کہ میڈم اس مالی سے میرا تعارف کیوں کروا رہی ہیں۔ میں نے بھی اخلاقاً اپنا ہاتھ آگے بڑا دیا بعد میں اس نے اپنے سوکھے ہاتھ سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا قد میرے مقابلے میں اتنا چھوٹا تھا کہ وہ باقاعدہ گردن اٹھا کر مجھے دیکھ رہا تھا۔

"یہ میرے شوہر بیرسٹر علی احسان ہیں!"

"اچھا، تو یہ ہیں بیرسٹر صاحب!" میں نے اپنی حیرت پر تھوڑا قابو پالیا۔ "آپ کا بہت نام سنا تھا۔ آج آپ سے ملاقات بھی ہوگئی۔"

"آپ نے میرا نام کہاں سن لیا؟" بیرسٹر کی آواز بہت پاٹ دار تھی، اس کے بولنے کے انداز سے مجھے احساس ہوا کہ واقعی وہ بیرسٹر ہے۔

"آپ شاید میرے دادا کو جانتے ہوں۔" میں نے کہا۔ "وہ لاڑکانہ میں زمینداری کرتے ہیں اور کئی کیس آپ کے ذریعے جیت چکے ہیں۔"

"آپ کرنل افتخار صاحب کی بات کر رہے ہیں؟" بیرسٹر علی نے پوچھا۔

"جی ہاں، وہ میرے دادا ہیں۔" میں نے کہا۔

"اس لیے مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں نے آپ کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔" بیرسٹر صاحب نے کہا۔ "آپ کا قد و قامت خاص طور پر آنکھیں کرنل صاحب سے بہت مشابہ ہیں۔"

میں اس کے مشاہدے کا قائل ہو گیا۔ اس نے چند ہی منٹ میں اندازہ لگا لیا تھا کہ میری آنکھیں دادا جان سے مشابہ ہیں۔ وہ مدقوق سا شخص جو دیکھنے میں میڈم کا ملازم لگتا تھا، ذہنی طور پر بہت مضبوط تھا۔

"علی!" میڈم نے کہا۔ "کل سے اسکول کی چھٹیاں ہو رہی ہیں، میں نے ارسلان صاحب سے وعدہ لے لیا ہے کہ وہ نادیہ کو انگلش پڑھا دیا کریں گے۔"

"ارے ان کے پاس وقت کب ہوگا۔" بیرسٹر نے کہا۔ "یونیورسٹی کے بعد انہیں ٹریننگ کے لیے کسی اخبار کے دفتر جانا پڑتا ہوگا۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "کیوں میاں، تم کس اخبار میں ٹریننگ کر رہے ہو؟"

میں نے انگریزی کے ایک کثیر الاشاعت روزنامے کا نام بتایا۔

"ویری گڈ!" وہ توصیفی انداز میں بولا۔ "بیٹا، ویسے تو تم خود سمجھ دار ہو میرا مشورہ یہ ہے کہ تم ڈیسک کی بجائے رپورٹنگ میں مہارت حاصل کرو۔ ڈیسک پر کام کرنے والے صحافی دنیا سے کٹ کر رہ جاتے ہیں، انہیں یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ نیویارک یا لندن میں کیا ہوا یا کراچی میں حالات کیسے ہیں لیکن یہ نہیں معلوم ہوتا کہ خود ان کے گھر میں کیا صورتِ حال ہے۔ ان کی سماجی زندگی بری طرح متاثر ہوتی ہے۔ وہ کسی تقریب میں شرکت نہیں کر سکتے کیونکہ ساری تقریبات شام کو ہوتی ہیں۔ وہ اپنے کسی رشتے دار سے ملاقات نہیں کر سکتے کیونکہ جس دن ان کا آف ہوتا ہے، اس دن دوسرے لوگ ڈیوٹی پر ہوتے ہیں۔"

"ارے کیا ساری باتیں یہیں کھڑے کریں گے؟" میڈم نے انہیں ٹوکا۔

وہ چونک کر بولے "سوری بیٹا! مجھے دھیان نہ رہا کہ...... چلو، اندر چلو، وہیں باتیں ہوں گی۔ میں منہ دھو کر ابھی آتا ہوں۔"

میں میڈم کے آراستہ ڈرائنگ روم میں جا بیٹھا، فوراً ہی سعدیہ آگئی، اس نے بہت ادب سے مجھے سلام کیا۔ میں نے جواب دے کر اسے اپنے پاس ہی بٹھا لیا اور اس سے اس کے اسکول کے بارے میں اس کے کورس کے بارے میں پوچھنے لگا۔

میں باتیں تو سعدیہ سے کر رہا تھا لیکن میری نظریں اس دشمنِ جاں نادیہ کو تلاش کر رہی تھیں۔ اس کی ایک ہی جھلک دیکھ کر میں پاگل ہو گیا تھا۔

"زینت!" میڈم نے کسی کو آواز دی۔ "بھئی، ذرا اچھی سی چائے بناؤ، یہ ارسلان صاحب پہلی دفعہ ہمارے گھر آئے ہیں۔" پھر وہ کچھ توقف کے بعد بولیں "ہاں، یہ نادیہ کہاں ہے؟"

"نادیہ بی بی اپنے کمرے میں ہیں، شاید وہ سو رہی ہیں؟"

"اگر سو رہی ہے تو اسے اٹھا دو، یہ سونے کا کون سا وقت ہے۔ کہنا کہ مما بلا رہی ہیں۔"

"جی بیگم صاحبہ!" زینت نے کہا اور وہاں سے چلی گئی۔

"لگتا ہے، آپ بھی شوقیہ جاب کرتی ہیں؟" میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

نے ہنس کر کہا۔
"ہاں، مصروف رہنے کے لیے کوئی بہانہ تو چاہیے، علی صاحب تو شروع ہی سے بہت مصروف رہے ہیں۔ میری شادی بھی بہت چھوٹی عمر میں ہوگئی تھی۔ میں گھر میں اکیلی پڑی پڑی اکتا جاتی تھی، علی نے مجھے مشورہ دیا کہ تم کسی اسکول میں جاب کرلو، اس وقت یہی ایک جاب تھی جسے لوگ خواتین کے لیے اچھا سمجھتے تھے۔" وہ بولنے پر آئیں تو بولتی چلی گئیں۔

میں بیرسٹر صاحب اوران کا موازنہ کررہا تھا۔ وہ شادی کے وقت خاصی حسین رہی ہوں گی۔ شوہر کو دیکھ کران کے سارے ارمان جھاگ کی طرح بیٹھ گئے ہوں گے۔ بزرگ اس دور میں یہی دیکھتے تھے کہ لڑکا اچھے خاندان کا ہے۔ پڑھا لکھا، کماؤ ہے۔

بیرسٹر صاحب میں یہ تینوں خوبیاں موجود تھیں۔

ہمارے یہاں بے شمار لڑکیوں کی شادیاں اسی طرح ہوتی ہیں، ان میں سے نوے بلکہ پچانوے فی صد لڑکیاں حالات سے سمجھوتا کرلیتی ہیں۔ بقیہ یا تو لڑ جھگڑ کر دوبارہ گھر آجاتی ہیں یا پھر زیادہ آئیڈیل پرست یا حسن پرست ہوں تو اپنی دلچسپیوں کے دوسرے ذرائع ڈھونڈ لیتی ہیں۔

اسی وقت بیرسٹر صاحب آگئے، اب وہ خاصے معقول لباس میں تھے لیکن لباس سے اگر مردانہ وجاہت پیدا ہوسکتی تو آج دنیا کا ہر دولت مند آدمی مردانہ وجاہت کا نمونہ ہوتا۔ بیرسٹر صاحب کا رنگ سانولا آدھا سر گنجا، منحنی جسم اور بوٹا قد شاید میڈم جیسی خاتون کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگا۔

"اور ارسلان میاں، کرنل صاحب کیسے ہیں؟ ان کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"جی انکل!" میں نے کہا۔ "ابھی پچھلے ہی مہینے ان سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ مجھ سے ملنے کراچی آئے تھے، وہ اس عمر میں بھی ہلکی پھلکی ایکسر سائز اور واک کرتے ہیں اور ماشاء اللہ بالکل صحت مند ہیں۔"

"میاں، اب ملاقات ہو تو میرا اسلام کہنا۔ ان سے ایک عرصے سے ملاقات نہیں ہوئی۔" پھر انہوں نے گھڑی دیکھی اور چونک کر بولے۔ "بیٹھو! مجھے ایک کلائنٹ سے ملنا ہے، میں اب چلتا ہوں۔"

"ارے چائے تو پیتے جائیں۔" میڈم نے کہا۔ "زینت لا ہی رہی ہوگی۔"

"نہیں، اب چائے کا وقت نہیں ہے۔" بیرسٹر صاحب نے کہا۔ "چائے وہیں آفس میں پی لوں گا۔" یہ کہہ کر وہ اٹھے تو میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ "تم بیٹھو میاں۔" انہوں نے کہا۔ "اب تو تم سے روز ہی ملاقات ہوگی، اگر تم نے نادیہ کو کچھ وقت دینے کا فیصلہ کرلیا ہے تو!" انہوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور باہر نکل گئے۔

میں اس وقت میڈم کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ ان کے چہرے پر عجیب سی بیزاری اور ناگواری کے تاثرات تھے۔

ان کے جانے کے بعد سعدیہ بولی۔ "مما! ابھی تک باجی نہیں آئیں، میں جا کر دیکھتی ہوں۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھی ہی تھی کہ مجھے وہ دشمنِ جاں نظر آگئی۔ وہ خراماں خراماں سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ اس نے ہاتھ منہ دھولیا تھا لیکن اس کے باوجود اس کی آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ اس حالت میں وہ پہلے سے بھی زیادہ حسین لگ رہی تھی، میں نے بھی دانستہ اسے نظر انداز کردیا اور سعدیہ سے بولا۔ "سعدیہ! آپ کی بھی تو چھٹیاں ہوگئی ہیں، ان چھٹیوں میں کیا کریں گی آپ؟"

"کچھ بھی نہیں۔" سعدیہ نے منہ بنا کر کہا۔ "میری ساری فرینڈز ان چھٹیوں پر ہل اسٹیشن پر جاتی ہیں، ہمارے پاپا کے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہے کہ وہ ہمیں کہیں لے جاسکیں۔"

اس وقت تک نادیہ نیچے آچکی تھی۔ اس کے باوجود میں نے اسے نظر انداز کردیا اور سعدیہ سے کہا۔ "یہ تو حقیقت ہے سعدیہ! آپ کے پاپا بہت مصروف آدمی ہیں۔ وہ اپنے کیس چھوڑ کر کیسے جاسکتے ہیں۔"

"ارسلان!" میڈم نے مجھے پکارا تو میں نے چونکنے کی اداکاری کی۔ "یہ ہے میری بیٹی نادیہ!" انہوں نے نادیہ کی طرف اشارہ کیا۔ وہ خاصی چست اور کھلے گلے کی قمیص اور بڑے پائنچوں کی شلوار پہنے ہوئے تھی۔ "اور نادیہ! یہ ارسلان ہیں، تمہارے سر! میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ یہ تمہیں انگلش پڑھائیں گے۔"

نادیہ نے اپنی مترنم آواز میں مجھے سلام کیا۔

میں نے سپاٹ چہرے کے ساتھ کہا۔ "وعلیکم السلام! نادیہ کیسی ہیں آپ؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں، آپ کیسے ہیں؟"

"آئی ایم فائن!" میں نے خالص امریکی لہجے میں کہا۔

"مما! ارسلان بھائی نے تو ابھی سے انگلش کی کلاس شروع کردی۔"

اس پر سب ہی ہنس دیے۔

پھر میں وہاں جتنی دیر رہا، نادیہ کو نظر انداز کرتا رہا اور سعدیہ اور میڈم سے باتیں کرتا رہا، میں بچپن سے مخلوط تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کرتا آیا تھا اور لڑکیوں کی نفسیات سے اچھی طرح واقف ہوگیا تھا، کسی حسین لڑکی کو اگر نظر انداز کیا جائے تو وہ اتنی ہی شدت سے آپ کی طرف بڑھتی ہے، یہی سلوک نادیہ نے پہلے دن میرے ساتھ کیا تھا لیکن اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اب وہ ہر ایرے غیرے کو تو نظر بھر کر دیکھنے سے رہی۔

جب اس نے دیکھا کہ میں نے اسے بالکل نظر انداز کردیا ہے تو وہ اکتا کر اٹھ گئی اور بولی۔ "مما! میں اپنے کمرے میں جارہی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

میرے اس رویے کو میڈم نے بھی محسوس کیا لیکن بولیں کچھ نہیں۔ کچھ دیر بعد میں بھی وہاں سے آگیا۔

دوسرے دن سے میں نے نادیہ کو پڑھانا شروع کردیا۔ پھر وہی ہوا جو میں چاہتا تھا۔ وہ میری محبت میں گرفتار ہوگئی۔ وہ اتنی حسین اور سلجھی ہوئی لڑکی تھی کہ میں نے فیصلہ کرلیا کہ وہ ہی میری زندگی میں آنے والی آخری لڑکی ہوگی۔ میں اس حد تک سنجیدہ تھا کہ فوری طور پر اس کے ساتھ منگنی کرنا چاہتا تھا۔

مجھے یقین تھا کہ بیرسٹر صاحب اور میڈم کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ بیرسٹر صاحب، دادا جان کو اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ ایک آدھ دفعہ پاپا سے بھی مل چکے تھے۔

میں اور نادیہ نہ جانے کب اور کیسے محبت کی اُن راہوں پر آگے بڑھ گئے کہ ایک دوسرے کے بغیر جینے کا تصور بھی محال لگنے لگا۔

ایک دن میں پڑھانے پہنچا تو دن کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ اس دن شدید گرمی تھی، ملازم نے یہ بتا کر میرا موڈ خراب کردیا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے۔ "میر پور خاص میں بیرسٹر صاحب کے کسی عزیز کا انتقال ہوگیا ہے اور سب لوگ وہیں گئے ہوئے ہیں۔"

"اچھا!" میں نے کہا، بائیک اسٹارٹ کی اور اسے موڑ ہی رہا تھا کہ اوپر ٹیرس پر مجھے نادیہ دکھائی دی، وہ مجھے آنے کا اشارہ کررہی تھی۔ ملازم اندر جاچکا تھا۔

نادیہ عقبی دروازے سے نکل کر لان میں آئی اور عقبی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے مجھ سے بولی۔ "ارسلان، یہاں سے نکلو۔"

"کہاں جاؤ گی؟" میں نے پوچھا۔

"تم یہاں سے تو نکلو!"

اس وقت وہ اسکن جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس تھی۔

میں نے بائیک باہر نکالی تو گھر سے کچھ فاصلے پر آنے کے بعد وہ بولی۔ "میں نے پاپا سے بہانہ کیا تھا کہ شام کو میری ایک دوست کی منگنی ہے۔ اس منگنی میں شریک ہونا میرے لیے بہت ضروری ہے۔ پاپا نے کہا کہ تم چاہو تو رک جاؤ۔ تمہارا ہمارے ساتھ جانا اتنا ضروری نہیں ہے۔"

"تو پھر اب کہاں جارہی ہو؟" میں نے جھنجلا کر کہا۔ "اتنی شدید گرمی ہے۔ گھر میں اطمینان سے لان میں بیٹھ کر باتیں کرتے۔"

"میں گھر کے گھٹے گھٹے ماحول سے تنگ آگئی ہوں۔ مجھے کہیں لانگ ڈرائیو پر لے چلو۔"

"اس گرمی میں؟" میں نے جھنجلا کر کہا، اگر بائیک پنکچر ہوگئی تو ساری لانگ ڈرائیو نکل جائے گی۔"

پھر میں نے اپنی بائیک کا رخ سینڈز پٹ کی طرف کردیا۔

ان دنوں وہ سی سائیڈ اتنی عام نہیں تھی، وہاں صرف وہی لوگ جاتے تھے جن کے پاس اپنی سواری ہوتی تھی۔

شیر شاہ سے آگے بڑھنے کے بعد میں نے کہا۔ "نادیہ! اب ذرا سنبھل کر بیٹھنا کیونکہ میری بائیک ٹیک آف کرنے والی ہے۔"

"ایک منٹ!" نادیہ نے کہا۔ "ذرا بائیک روکو!"

میں نے بائیک روک دی۔

وہ لڑکوں کی طرح پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی اور بولی۔ "اب کرو ٹیک آف!"

میں نے بائیک کو طوفانی انداز میں دوڑانا شروع کردیا۔

نادیہ کے سُریلے قہقہے میرے کانوں میں گونج رہے تھے اور اس کا گداز جسم میرے جسم سے چپکا ہوا تھا۔

وہ مخمور لہجے میں بولی۔ "ارسلان، کاش کہ..... یہ سفر کبھی ختم نہ ہو، ہم دونوں یونہی چلتے رہیں۔"

"کیا میں تمہیں پشاور لے چلوں۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "وہاں پہنچنے میں کم سے کم اڑتالیس گھنٹے تو لگ ہی جائیں گے۔"

میری بات پر اس نے محبت سے مجھے پکڑ لیا اور اپنا سر میری پیٹھ سے لگا دیا۔

سینڈز پٹ پر گنتی کے چند لوگ تھے۔ یہاں کئی ہٹ

WWW.PAKSOCIETY.COM

بھی بنے ہوئے تھے۔ میں نے ایک ہٹ کے چوکیدار سے بات کی تو وہ سو روپے لے کر شام تک کے لیے ہٹ ہمارے حوالے کرنے پر آمادہ ہوگیا۔

ہم دونوں دیر تک سمندر میں نہاتے رہے، پانی کی لہریں ہمیں اچھالتی تھیں تو نادیہ خوف زدہ ہوکر مجھ سے لپٹ جاتی تھی۔

کافی دیر بعد ہم دوبارہ ہٹ میں آئے تو چوکیدار پھر آگیا۔ وہ کھانے پینے کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ میں نے اس سے برگر اور کولڈ ڈرنک کے بارے میں کہا تو وہ بولا۔ ”صاحب! یہاں بوتل تو مل جائے گی لیکن برگر نہیں ملے گا، ہاں بسکٹ کے ڈبے مل جائیں گے۔“

”چلو، تم دو تین ڈبے بسکٹ کے اور دو ٹھنڈی بوتلیں لے آؤ۔“

کھانے پینے کے بعد میں نے اپنا بنیان اور شرٹ اتار کر ایک طرف ڈال دیا اور نادیہ سے کہا۔ ”میں باہر جارہا ہوں، تم بھی اپنا لباس سکھالو۔“

”پاگل ہوگئے ہو، میں اتنی دیر کیا یوں ہی بیٹھی رہوں گی۔ باہر چلو، ہوا میں کپڑے فوراً ہی سوکھ جائیں گے۔“

”یہاں کیا اعتراض ہے؟“ میں نے اچانک اس کے شانے تھام لیے۔

اس کا جسم جذبات کی حدت سے گویا سلگ رہا تھا۔ اس نے کمزور لہجے میں کہا۔ ”ارسلان! ایسا مت کرو۔“ لیکن میری دست درازیاں بڑھتی ہی گئیں۔

”ارسلان پلیز!“ نادیہ نے کہا۔ ”میں تمہاری امانت ہوں۔ اگر تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو تو ابھی ایسا کچھ مت کرو۔“

میں نے ایک جھٹکے سے اسے چھوڑ دیا۔ میں واقعی اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ وہ میری تو تھی پھر ابھی جلدی کیا تھی۔

نادیہ کے چہرے پر پسینے کے قطرے جھلملا رہے تھے اور وہ گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔

میں نے مزید وہاں رکنا مناسب نہ سمجھا اور نادیہ سے کہا۔ ”چلو نادیہ، واپس چلیں۔“

وہ بغیر کچھ کہے میرے ساتھ ہولی۔ واپسی میں بھی وہ بہت شوخ ہورہی تھی۔ میں بہت خوش تھا کہ میں نے اپنی زندگی کا بہترین دن گزارہ تھا۔ نادیہ کو گھر چھوڑ کر میں ہوسٹل واپس چلا گیا۔

دوسرے دن میں پڑھانے پہنچا تو نادیہ موجود نہیں تھی۔ میں نے میڈم سے نادیہ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ نادیہ کی کسی دوست کے والد کا انتقال ہوگیا ہے۔ اسے اچانک وہاں جانا پڑا۔

”اچھا، پھر میں بھی چلتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”ارے اتنی گرمی میں آئے ہو، کچھ دیر بیٹھو، میں تمہارے لیے کولڈ ڈرنک لاتی ہوں۔“

وہ مجھے اپنے بیڈ روم میں لے گئیں اور ٹھنڈی بوتل میرے حوالے کرتے ہوئے بولیں۔ ”...گزشتہ سال مجھے بہترین کارکردگی پر ایوارڈ ملا تھا، اس کا وڈیو کیسٹ موجود ہے، میں تمہیں دکھاتی ہوں۔“ یہ کہہ کر انہوں نے کمرے کے پردے کھینچے اور کیسٹ پلیئر میں کیسٹ لگا کر ٹی وی آن کردیا۔

وہ اسکول کی کوئی تقریب تھی۔ مجھے اس بور تقریب سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

پھر وہ بولیں۔ ”اچھا ٹھہرو میں تمہیں ایک اور وڈیو دکھاتی ہوں۔“ یہ کہہ کر انہوں نے الماری سے دوسرا وڈیو لاکر وی سی آر میں لگادیا۔

اسی وقت باہر سے بیرسٹر صاحب کی پاٹ دار آواز سنائی دی۔ ”سجو!“

میڈم نے پھرتی سے وہ کیسٹ نکال کر پرانا کیسٹ لگادیا اور ایک دفعہ پھر اسکول کی وہی بورنگ تقریب میرے سامنے تھی۔

بیرسٹر صاحب دوسرے ہی لمحے بیڈ روم میں آگئے۔ مجھے وہاں دیکھ کر وہ چونکے تو میڈم جلدی سے بولیں۔ ”میں ارسلان کو اپنی وہ وڈیو دکھارہی تھی جس میں مجھے ایوارڈ ملا تھا۔“ پھر وہ موضوع بدلتے ہوئے بولیں۔ ”آج گرمی بھی تو بہت ہے۔“

”میں ذرا فریش ہوجاؤں۔“ بیرسٹر صاحب باتھ روم کی طرف بڑھ گئے۔ میڈم بھی نہ جانے کسی کام سے باہر نکل گئیں، میں نے اٹھ کر وہ وڈیو کیسٹ دیکھی، جو میڈم مجھے دکھانا چاہتی تھیں۔ اس کا کور دیکھ کر اے سی کی خنکی کے باوجود میری پیشانی پسینے میں بھیگ گئی۔

وہ انگریزی کی ایک تھرڈ کلاس فحش فلم تھی۔ میں دوبارہ اپنی جگہ آکر بیٹھ گیا۔ میڈم کمرے میں داخل ہوئیں۔ انہوں نے وی سی آر آف کیا، پھر ان کی نظر اس وڈیو کیسٹ پر پڑی تو انہوں نے جلدی سے اسے اٹھا کر الماری میں رکھ دیا، اور اسے لاک کرنے کے بعد مجھ سے بولیں۔ ”چلو ارسلان، ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہیں، میں وہاں کا اے سی آن کرآئی ہوں، اب تک کمرا ٹھنڈا ہوگیا ہوگا۔“

میں فوراً ہی وہاں سے نکلنا چاہتا تھا لیکن یہ سوچ کر رک گیا کہ بیرسٹر صاحب نہ جانے کیا سوچیں کہ مجھے دیکھتے ہی بھاگ گیا۔ وہ تازہ دم ہوکر ڈرائنگ روم میں آگئے۔ ان کے آنے کے بعد میں نے اجازت طلب کی اور گھر سے نکل آیا۔

مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ میڈم اتنی گری ہوئی حرکت بھی کرسکتی ہیں، میں ان کا کتنا احترام کرتا تھا لیکن اب وہ میری نظروں سے گرگئی تھیں۔

دوسرے دن وہاں جانے کو میرا دل تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن وہاں نادیہ بھی تو تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں ان کے گھر کی طرف چل دیا۔

میں ان کے گھر پہنچا تو میڈم ڈرائنگ روم ہی میں موجود تھیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے کراہیت سی آئی۔

میں عموماً نادیہ کو ڈرائنگ روم میں ہی پڑھایا کرتا تھا۔ مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا جب مجھے کمرے میں وی سی آر اور ٹی وی سیٹ نظر آیا۔ وی سی آر کے ساتھ اسی فحش فلم کی وڈیو کیسٹ رکھی تھی۔

میں بھنّا گیا اور کچھ کہنے ہی والا تھا کہ نادیہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ستارے سے جگمگانے لگے۔ اس کا معصوم چہرہ اور مسکراہٹ دیکھ کر فوری طور پر میرا غصہ سرد ہوگیا۔

”آؤ نادیہ!“ میڈم نے کہا۔ ”تم نے تو یہ وڈیو شاید پہلے بھی ایک دو دفعہ دیکھی ہے۔ میں ارسلان کو بھی یہ وڈیو دکھانا چاہتی ہوں۔“

انہوں نے میری طرف دیکھے بغیر وڈیو کیسٹ وی سی آر میں لگائی اور اسے آن کردیا۔

مجھے حیرت ہورہی تھی کہ میڈم نادیہ کی موجودگی میں وہ وڈیو چلائیں گی؟

وہ بھی... اسکول کی کسی تقریب ہی کی وڈیو تھی۔ اس میں میڈم نے مختصری تقریر بھی کی تھی جسے انہوں نے فارورڈ کردیا۔ پھر وہ محکمہ تعلیم کے کسی بڑے افسر کے ساتھ نظر آئیں۔ وہ اسے اسکول کا معائنہ کرا رہی تھیں۔ چلتے چلتے ان کا پیر پھسلا اور اس سے پہلے کہ وہ گرتیں، محکمہ تعلیم کے اس افسر نے انہیں بانہوں میں سمیٹ لیا۔

وڈیو میں تو مزید بھی بہت کچھ تھا لیکن سب کچھ بورنگ تھا۔ مجھے ان کے ایوارڈ یا تقریب سے کیا دلچسپی ہوسکتی تھی۔

وڈیو فلم ختم ہوئی تو میڈم نے نادیہ سے کہا۔ ”بیٹا، ارسلان کے لیے کوئی کولڈ ڈرنک اور کچھ کھانے کو لے آؤ۔ یہ دوپہر میں کھانا تو کھاتے ہی نہیں ہیں۔“

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی نادیہ وہاں سے اٹھ گئی۔ میڈم نے مجھ سے کہا۔ ”اصل میں علی کو نہ صرف اس سین سے نفرت ہے جس میں، میں گری اور اور شہزاد صاحب نے مجھے سنبھال لیا تھا بلکہ انہیں شہزاد صاحب سے بھی نفرت سی ہوگئی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ شہزاد صاحب کا کریکٹر اچھا نہیں ہے لیکن ارسلان، تم ہی بتاؤ، اس میں میرا کیا قصور تھا؟“

”آپ یہ سین ہی نکلوا دیں۔“ میں نے کہا۔

”میں نے وڈیو والے سے یہی کہا تھا کہ اس میں سے وہ نکال دو۔ دوسری کیسٹ میں وہ سین نہیں ہے لیکن فوری طور پر وہ کیسٹ مجھے ملی ہی نہیں۔ دراصل، یہ اب سے دس بارہ سال پرانی وڈیو ہے اور مجھے بہت پسند ہے۔ میں نے علی سے چھپانے کے لیے عجلت میں اس کا کور تبدیل کیا تھا تو اسے اس کور میں رکھ دیا۔“

میں نے خود کو لعنت ملامت کی کہ میں خوامخواہ انہیں برا سمجھتا رہا۔ اس کے بعد غصے اور جھنجلاہٹ کی جگہ ندامت نے لے لی۔

ملازم ٹرالی میں کولڈ ڈرنک اور دوسرے لوازمات لے کر آیا۔ اس کے پیچھے پیچھے نادیہ بھی تھی۔

میڈم نے ملازم سے وی سی آر اور ٹی وی وہاں سے ہٹانے کو کہا اور خود بھی باہر چلی گئیں۔

”مما بھی بعض اوقات بہت بور کرتی ہیں۔“ نادیہ نے منہ بنا کر کہا۔ ”یہ مووی وہ نہ جانے کتنی دفعہ دیکھ چکی ہیں اور ہمیں بھی دکھاتی ہے۔“

”اس میں ایسی کیا خاص بات ہے؟“ میں نے ہنس کر پوچھا۔

”پہلی خاص بات تو یہ ہے کہ یہ مووی بارہ سال پرانی ہے۔ مما اس میں بہت کم عمر نظر آرہی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس میں ان کی ایک بیسٹ فرینڈ بھی ہیں جن کا انتقال ہوچکا ہے۔“

”اچھا چھوڑو اس موضوع کو، اب کچھ پڑھائی کرلو۔“

میں چاہتا تھا کہ نادیہ کو سنجیدگی سے پڑھاؤں۔ میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ اگر اس مرتبہ بھی امتحان میں تمہارے نمبر کم آئے تو میری عزت، خاک میں مل جائے گی۔

نادیہ بہت ذہین تھی اور ہر بات کو پہلی ہی کوشش میں سمجھ لیتی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اگر محبت کے اس چکر میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

گرفتار نہ ہوتی تو اس کے نمبر بہت اچھے آتے۔

پھر کئی دن یونہی گزر گئے۔ میں نادیہ کو پڑھاتا رہا۔ انگریزی بھی اور پیار کا سبق بھی!

ایک دن پڑھانے کے بعد میں اس سے باتیں کررہا تھا۔ اس کے ہاتھ بہت خوبصورت تھے۔

میں نے جذبات میں آکر اچانک اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''چھوڑیں ارسلان...... کوئی دیکھ لے گا۔'' وہ کسمسا کر بولی۔

میں نے ہنس کر کہا۔ ''میں نے یہ ہاتھ چھوڑنے کے لیے تو نہیں پکڑا ہے۔''

اچانک میڈم کمرے میں داخل ہوئیں۔ دروازے کی طرف نادیہ کی پشت تھی۔ میں اچانک سٹپٹا گیا اور اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''تم ایک دفعہ دس، بارہ سال کی عمر میں شدید بیمار پڑی تھیں۔''

''ہاں، مجھے بھی یاد ہے لیکن......''

''ہاتھ کی لکیریں کبھی جھوٹ نہیں بولتیں۔'' میں نے کہا۔ ''تمہارے ہاتھ میں، دولت کی فراوانی کی لکیر بہت نمایاں ہے...... ہاں، تم زندگی میں غیر ممالک کے کئی سفر بھی کروگی۔''

نادیہ حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھی کہ رومینٹک باتیں کرتے کرتے میں اچانک دست شناس کیوں بن گیا۔

میڈم ٹھٹک کر دروازے ہی میں رک گئی تھیں۔ میں نے بھی یوں ظاہر کیا تھا جیسے انہیں دیکھا ہی نہ ہو۔ پھر میں نے چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے انہیں دیکھا اور بولا۔ ''آیئے میڈم!''

نادیہ گھبرا گئی لیکن میں نے اس کا ہاتھ دبا کر پُرسکون رہنے کا اشارہ کیا۔

''ارے، ارسلان! تمہیں پامسٹری بھی آتی ہے؟'' میڈم نے ہنس کر کہا۔

''بس یونہی تھوڑا بہت دیکھ لیتا ہوں۔'' میں نے کہا اور آہستگی سے نادیہ کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

''کبھی فرصت میں، میں بھی اپنا ہاتھ دکھاؤں گی۔'' میڈم نے کہا اور ہنستی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئیں۔

اس دن میں ہوسٹل پہنچا ہی تھا کہ نادیہ کا ٹیلی فون آگیا۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ میں نے گھبرا کر پوچھا۔ ''کیا ہوا نادیہ؟''

''تمہارے جانے کے بعد مما نے مجھے بہت بری طرح ذلیل کیا ہے ارسلان!'' وہ روتے ہوئے بولی۔ ''وہ کمرے کے باہر کھڑی نہ جانے کب سے ہماری باتیں سن رہی تھیں۔ اب وہ شاید تمہیں بھی آنے سے روک دیں۔''

''تم فکر مت کرو نادیہ!'' میں نے کہا۔ ''اپنے امتحانوں سے فارغ ہوتے ہی میں لاڑکانہ جاؤں گا اور دادا جان کو رشتے کے لیے تمہارے گھر بھیجوں گا۔''

''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے ارسلان!'' نادیہ نے کہا۔

''ڈرنے کی کیا بات ہے نادیہ!'' میں نے کہا۔ ''سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔'' اسے تسلی دلا سے دے کر میں نے سلسلہ منقطع کردیا۔

اسکولوں کی چھٹیاں ختم ہونے والی تھیں۔ میں دوسرے دن نادیہ کو پڑھانے پہنچا تو میڈم نے ڈرائنگ روم میں میرا استقبال کیا۔

پھر وہ ہنس کر بولیں۔ ''بھئی تمہاری شاگرد تو اب نہیں پڑھے گی۔''

''کیوں؟'' میں نے کہا۔

''ارے بھئی، کل سے تو اسکول کھل رہے ہیں، پھر علی نے کسی ٹیوٹر کا بندوبست کردیا ہے کیونکہ تمہارے پاس تو ویسے بھی ٹائم نہیں ہوگا۔''

''جی ہاں، ٹائم تو واقعی نہیں ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن میں نے نادیہ کو اتنا پڑھا دیا ہے کہ وہ اس مرتبہ پاس ضرور ہوجائیں گی۔''

پھر میڈم نے ہمارے ملنے پر پابندیاں لگادیں لیکن ہم ملتے رہے۔ البتہ میں نے میڈم سے بات کرنا بالکل چھوڑ دی۔

میں نے ثمرہ سے تعلقات بڑھا لیے۔ انہیں چڑانے کے لیے میں اس کے ساتھ ہنسی مذاق کرتا۔ وہ مجھے دیکھ دیکھ کر کھولتی رہتیں۔

ایک روز وہ بولیں۔ ''ارسلان! تم کل دو بجے گھر آسکتے ہو؟ مجھے تم سے ایک بہت ضروری بات کرنا ہے۔''

''جی ہاں، آجاؤں گا۔'' میں نے کہا۔

دوسرے دن میں اُن کے گھر پہنچا تو وہ ڈرائنگ روم کی بجائے مجھے اپنے کمرے میں لے گئیں اور مجھ سے بیٹھنے کو کہا۔ پھر وہ اچانک خود بھی میرے ساتھ بیٹھ گئیں۔

میں دم بہ خود رہ گیا۔ میں نے بوکھلا کر اٹھنا چاہا لیکن انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا اور بولیں۔ ''بیٹھے رہو ارسلان!''

''مجھے جانے دیں۔'' میں نے مشتعل ہوکر کہا۔

''میں تمہیں کیسے جانے دوں، کیسے جانے دوں ارسلان! میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میں زندہ نہیں رہوں گی۔''

''میڈم!...... یہ آپ......''

''ہاں ارسلان...... میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میں نے تمہاری پوجا کی ہے۔ میں نے تمہیں ٹوٹ کر چاہا ہے۔ تمہاری خاطر میں اس گھر کو، علی کو، بچوں کو، سب کو ٹھکرا دوں گی، سب کو چھوڑ دوں گی ارسلان۔ تم مجھے مایوس نہ کرو۔''

میں نے زبردستی اُن سے ہاتھ چھڑایا اور انہیں دھکیل کر باہر کی طرف بھاگا۔

باہر آکر بھی میں وہاں رکا نہیں بلکہ سیدھا ہوسٹل چلا گیا۔ میں نے سوچا کہ اب میں کل ہی لاڑکانہ جاؤں گا اور دادا جان کو لے کر ہی آؤں گا۔ پھر مجھ سے صبر نہ ہوسکا اور میں اسی رات لاڑکانہ روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

دادا جان اس وقت میڈم کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ بیرسٹر صاحب ان سے مل کر بہت خوش ہوئے تھے۔ دادا جان نے کہا۔ ''بھئی علی! میں فوجی آدمی ہوں۔ مجھے زیادہ باتیں بنانا بھی نہیں آتیں۔ میں اصل میں اپنے پوتے کا رشتہ لے کر آیا ہوں۔ میں تمہاری بیٹی نادیہ کو اپنی بہو بنانا چاہتا ہوں۔''

''ارے کرنل صاحب!'' بیرسٹر صاحب کھِل اٹھے۔ ''آپ کی بات سرآنکھوں پر لیکن مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت تو دیجیے۔''

''چلیے میں آپ کو دس منٹ دیتا ہوں۔'' دادا جان نے کہا۔

اسی وقت میڈم بھی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں۔ دادا جان کو سلام کیا اور بولیں، انکل! آپ نے انہیں کس سوچ میں ڈال دیا۔''

''کرنل صاحب۔'' بیرسٹر صاحب نے کہا۔ ''یہ کوئی کمانڈو آپریشن تو ہے نہیں کہ میں دس منٹ میں اپنا فیصلہ سنا دوں۔ آخر بیٹی کا معاملہ ہے۔ مجھے کم سے کم ایک دن تو دیں۔''

''کیسی شادی، کس کی شادی؟'' میڈم نے کہا۔

''بھئی نجو! کرنل صاحب نادیہ کے لے ارسلان کا رشتہ لائے ہیں۔ مجھے اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اچھا خاصا لڑکا ہے اور......''

''لیکن مجھے اعتراض ہے؟'' میڈم نے تڑخ کر کہا۔

''بیٹا، آپ کو کیا اعتراض ہے؟'' دادا جان نے پوچھا۔

''میں نہیں چاہتی کہ میری بیٹی آپ جیسے لوگوں کے گھر میں جائے۔''

''نجو!'' بیرسٹر صاحب گرج کر بولے۔ ''یہ کیا طریقہ ہے؟''

دادا جان بھی فوجی آدمی تھے۔ وہ بھی تلملا کر کھڑے ہوگئے اور مجھ سے بولے۔ ''تو اسی لیے مجھے یہاں لایا تھا کہ اس عمر میں مجھے ذلیل کرائے، چل اٹھ یہاں سے۔''

''کرنل صاحب! میری بات تو سنیں...... میں......''

بیرسٹر صاحب دادا جان کو روکتے ہی رہ گئے لیکن وہ تقریباً باہر نکل چکے تھے۔ میں گویا ان کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔

مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ میڈم یوں دادا جان کو بے عزت کردیں گی۔ انکار کرنے کے مہذب طریقے بھی تو ہوتے ہیں۔ دادا جان جب بھی کراچی آتے تھے، انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں ہی ٹھہرتے تھے جو آج کل پرل کانٹی نینٹل یا پی سی کے نام سے مشہور ہے۔ اس دوران میں بھی ان کے ساتھ ہی رہتا تھا۔

انہوں نے سارے راستے مجھ سے بات نہیں کی۔ میں نے بھی بات کرنے کی کوشش نہیں کی ورنہ وہ اتنے غصے میں تھے کہ شاید مجھ پر ہاتھ چھوڑ دیتے۔

وہ سیدھے اپنے کمرے میں پہنچے اور کپڑے تبدیل کرکے بیڈ پر لیٹ گئے۔

''دادا جان!'' میں نے خوشامد بھرے انداز میں کہا۔ ''مجھے معاف کردیجئے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ نادیہ کی ماں اتنی گھٹیا عورت ہے۔ میں تو سمجھتا تھا کہ وہ پڑھی لکھی اور سلجھی ہوئی عورت ہے لیکن اس نے تو آپ کی بے عزتی کردی۔ دادا جان میری وجہ سے آپ کو بہت تکلیف ہوئی ہے پلیز، مجھے معاف کردیجئے۔'' میں نے دادا جان کے پیر پکڑ لیے۔

''غلطی تیری نہیں ہے بیٹا!'' دادا جان نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''پھر تو کیوں معافی مانگ رہا ہے۔ میں تجھ سے ناراض نہیں ہوں۔ میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ اس گھمنڈی عورت کو سبق کیسے سکھایا جائے۔''

''دادا جان! اب اس سے میں خود نمٹ لوں گا۔ کوئی آپ کی بے عزتی کردے، میں کیسے برداشت کرسکتا ہوں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"لیکن بیٹا، ایسی کوئی حرکت مت کر بیٹھنا کہ قانون کی گرفت میں آجاؤ۔"

"ایسا کچھ بھی نہیں کروں گا دادا جان!" میں نے کہا۔

مجھے بھی اس واقعے سے گہرا صدمہ پہنچا تھا۔ میں نے کئی مرتبہ نادیہ سے ٹیلی فون پر بات کرنے کی کوشش کی لیکن مجھے ہر مرتبہ ٹیلی فون مصروف ہی ملا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ ابھی جاؤں اور اس میڈم کا گلا دبا دوں۔ جو بہ ظاہر تو عزت دار بنتی تھی لیکن اندر سے اتنی ہی غلیظ تھی۔ وہ مجھے فحش فلم دکھانا چاہتی تھی۔

رات کو کھانے کے وقت دادا جان مجھے لینے کمرے میں آئے ورنہ شاید میں کھانا بھی نہ کھاتا۔

میں نے دادا جان کے اصرار پر دو چار لقمے زہر مار کیے، پھر ہاتھ کھینچ لیا۔

اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ "ہیلو؟" دادا جان نے ریسیور اٹھا کر کہا۔ "کون؟...... اچھا انہیں میرے روم میں بھیج دیں۔"

"کون ہے دادا جان؟" میں نے پوچھا۔

"بیرسٹر صاحب ہیں۔"

میں مٹھیاں بھینچ کر کھڑا ہوگیا۔ "اب یہاں کیا لینے آیا ہے۔"

"ارسلان!" دادا جان نے بلند آواز میں کہا۔ "ابھی میں موجود ہوں۔ خاموشی سے بیٹھ جاؤ۔"

تھوڑی دیر بعد کمرے میں بیرسٹر صاحب داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے چادر میں لپٹی نادیہ کو دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا۔

"کرنل صاحب!" بیرسٹر صاحب نے کہا۔ "اپنی پڑھی لکھی جاہل بیوی کی طرف سے میں آپ سے معافی مانگتا ہوں اور آپ کی امانت آپ کے حوالے کرنے آیا ہوں۔"

"میں سمجھا نہیں۔" دادا جان نے کہا۔

"ارے کرنل صاحب! اس میں نہ سمجھنے والی کون سی بات ہے۔ ابھی کسی قاضی کو بلائیں۔ ان دونوں کا نکاح پڑھوا دیں اور اپنی بہو کو ساتھ لے جائیں۔"

"بیرسٹر صاحب! کیا آپ سنجیدہ ہیں؟" دادا جان نے پوچھا۔

"میں بھلا آپ سے مذاق کرسکتا ہوں۔" بیرسٹر صاحب نے کہا۔ "میں زندگی میں پہلی دفعہ آج ہی تو سنجیدہ ہوا ہوں ورنہ اس خودسر عورت نے زندگی بھر جو چاہا وہ کیا لیکن میں اپنی اولاد کو اس کے ظلم کا نشانہ نہیں بننے دوں گا۔ جلدی سے قاضی کا بندوبست کیجیے۔"

☆☆☆

مجھے اپنی اور نادیہ کی شادی ایک خواب لگ رہا تھا۔ دادا جان نے اسی وقت انتظامیہ سے بات کرکے قاضی بلایا تھا پھر گواہوں کی موجودگی میں نکاح ہوگیا۔ بیرسٹر صاحب نے روتے ہوئے نادیہ کو رخصت کیا تھا۔

دادا جان نکاح کے فوراً بعد گھر کے لیے روانہ ہوگئے تھے۔ دوسرے دن علی الصباح ہم لاڑکانہ پہنچ گئے۔

یہاں ملازمین نے نہ صرف میرے کمرے کو بلکہ حویلی کو بھی دلہن کی طرح سجا دیا تھا۔

شام تک امی، پاپا اور گھر کے اور دوسرے لوگ بھی پہنچ گئے۔ یہ شادی کیونکہ دادا جان کی مرضی اور ان کی موجودگی میں ہوئی تھی اس لیے کسی نے کچھ بھی پوچھنے کی جرأت نہیں کی۔

رات کو نادیہ نے ایسے ایسے انکشافات کیے کہ میں دم بہ خود رہ گیا۔ اس نے بتایا۔

"پاپا کے ہاتھ امی کی ایک ڈائری لگ گئی تھی۔ اس ڈائری میں امی نے نہ جانے کیا کیا لکھ دیا کہ میں دہرانا بھی چاہوں تو... دہرا نہ سکوں۔ انہوں نے لکھا تھا کہ میں ارسلان سے محبت کرنے لگی ہوں۔ وہ مجھے بیس سال پہلے کیوں نہیں ملا وغیرہ وغیرہ۔ یہ پڑھ کر پاپا معاملے کی تہ تک پہنچ گئے۔ وہ سیدھے میرے پاس آئے اور بولے، نادیہ کیا تم واقعی ارسلان سے محبت کرتی ہو میں نے سر جھکا کر اقرار کرلیا۔ انہوں نے پھر پوچھا۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ ارسلان تمہارے ساتھ مخلص ہے۔"

میں نے کہا۔ "دو سو فیصد یقین ہے، ارسلان میرے بغیر نہیں رہ سکے گا۔"

امی کے انکار کی وجہ بھی پاپا کی سمجھ میں آگئی تھی۔ انہوں نے اسی وقت مجھے ساتھ لیا اور آپ لوگوں کے پاس پہنچ گئے"

"ارے چھوڑو یار۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "یہ رات نہیں وہ جو کہانی میں گزر جائے۔" یہ کہہ کر میں نے لائٹ آف کر دی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM